رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز
رکن چیمبر آف کامرس

پاکستان (فی پرچہ)..........50 روپے
پاکستان (سالانہ)..........600 روپے

اشتہارات اور دیگر معلومات
0300-8264242

جلد	39
شمارہ	08
جولائی	2015

aanchalpk.com
aanchalnovel.com
naeyufaqonlinemagzine
aanchalpk.com/blog
onlinemagazinepk.com/recipes

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ صدر کراچی

بھرم	ابو حق	150
ستم	[illegible] جبیں تارا	158
ایجنسی	ایم خالد	168
بیگم شیطان	اقبال بھٹی	186
گمنام سپاہی	زرین قمر	194
تکمیل تمنا	حسام بٹ	222
ذوق آگہی	مینا سن گل	250
خوشبو سخن	[illegible]	252
فلسطین	[illegible]	254

خط و کتابت کا پتہ: "آنچل" پوسٹ بکس نمبر 75، کراچی 74200 فون: 021-35620771/2
فیکس: 021-35620773 کے از مطبوعات نئے افق پبلی کیشنز۔ ای میل info@aanchal.com.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

کلیسائی آقاؤں کی پاکستان میں دہشت گردی

امریکا قطعی نہیں چاہتا کہ پاکستان اپنے خطے میں کسی بھی طرح قدم جما سکے امریکیوں کی تو خواہش ہمیشہ سے یہی رہی ہے کہ پاکستان ان کی جوتیوں کے تلوے چاٹتا رہے۔ بے دام کے غلام کی مانند ان کے سامنے ہمیشہ سر جھکائے ہی رکھے۔ ان کے سامنے کسی بھی طرح کبھی بھی سر اٹھانے کی جرأت نہ کرے۔ غالباً اسی سلسلے کی ایک کڑی گلگت بلتستان میں ایرانی فقہ یعنی فقہ جعفریہ کے لوگوں کو حالیہ دنوں میں چن چن کر ہلاک کرنے والی دہشت ناک واردات بھی ہے۔ سی آئی اے کی یہ کارروائی ایران اور پاکستان کے بہتر ہوتے تعلقات کی راہ روکنا اور پاکستان کے طول و عرض میں شیعہ سنی فسادات کی آگ بھڑکانے کی مذموم سازش ہے۔ امریکا نہیں چاہتا کہ پاکستان کسی بھی طرح خود کفیل ہو سکے۔ موجودہ حکومت کے دور میں ہونے والی مہنگائی، بجلی، پانی اور گیس کا بحران بھی غالباً اس سلسلے کی کڑی ہے۔ جس کے باعث نہ حکومت چین سے ہے نہ عوام ہی کو سکون میسر ہے۔ چونکہ عوام بجلی، گیس مہنگائی کے ہاتھوں پریشان ہیں اس لیے وہ اپنا غم و غصہ اس طرح کی دہشت گردی میں ملوث ہو کر نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وطنِ عزیز میں پھیلائی گئی بدامنی، دہشت گردی، مہنگائی ایک بہت سوچا سمجھا منصوبہ ہے۔ وہ ملک جو ہر طرح کے قدرتی وسائل سے مالا مال ہے۔ جس میں قدرت نے ہر قسم کی معدنیات جس میں لوہا، سونا، تانبہ، یورینیم، پیٹرولیم، ماربل غرض کونسی معدنی دولت ہے جو پاکستان کو نصیب نہیں لیکن اس سے پاکستان جیسا زرخیز ملک جو اپنی زرعی پیداوار میں بھی خود کفیل تھا کو پانی کی قلت پیدا کرا کر غیروں کا محتاج بنایا جا رہا ہے۔ اب آلو، پیاز، گندم جیسی ضروریات کے لیے ہندوستان سے مدد لی جا رہی ہے اور چیزوں کی قلت پیدا کر کے ان کی قیمتوں کو آسمان تک پہنچا دیا گیا ہے یہ سب بہت سوچا سمجھا منصوبہ ہے کہ اہلِ پاکستان اپنے روزمرہ کے مسائل میں اس قدر الجھا دیے جائیں کہ وہ بیرونی سازشوں پر توجہ دینے کے قابل ہی نہ رہیں اور امریکا اور اس کے حواری پاکستانی حکمرانوں پر اپنا دباؤ بڑھاتے جائیں تاکہ انہیں اپنا دست نگر رکھنے میں کسی دشواری کسی مطالبے کا سامنا نہ ہو۔ پاکستان کے دائیں بائیں سرحدیں بھارت، ایران اور افغانستان سے مل رہی ہیں یہی وہ ممالک ہیں جو پاکستان پر براہِ راست اثر انداز ہو سکتے ہیں اس لیے امریکن نہیں چاہتے کہ ایران پاکستان کے بھارت اور افغانستان سے تعلقات اس حد تک بہتر ہوں کہ وہ اپنے معاملات میں خود کفیل ہو سکے۔ ویسے بھی پاکستان جوہری قوت رکھنے والا ملک ہے۔ امریکی یا اس کے دوست یہ کیسے برداشت کر سکتے ہیں کہ پاکستان اس خطے میں کسی طرح مستحکم و مضبوط ہو اور اپنے قدموں پر کھڑا ہو سکے شاید یہی وجہ ہے کہ قرضوں کی وصولیابی نہ ہونے کے باوجود آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک جو تمام تر امریکی سرپرستی میں چلنے والے ادارے ہیں مزید قرضوں پر قرضے پاکستان کو دے کر اپنا دست نگر بنا رہے ہیں ان کی ہی مرضی اور حکم سے اب پاکستان میں اشیائے ضروری کی قیمتوں کا تعین کیا جانے لگا ہے۔ پانی پر کس قدر اور کتنا ٹیکس وصول کیا جائے گا یا پیٹرولیم کی مصنوعات کی کیا قیمت رکھی جائے گی۔ بجلی گیس کے نرخ کیا ہونے چاہئیں۔ یہ تمام معاملات اب براہِ راست ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کے کارندے چلا رہے ہیں۔ حکمران یا وزارت خزانہ تو ان کے بنے بنائے منصوبوں کو وطنِ عزیز میں نافذ کرنے والا ادارہ بن کر رہ گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہمارے وطنِ عزیز کو ہر بلا و آفت سے محفوظ فرمائے اور ہمیں اپنے قدموں پر کھڑا ہونے والا بنائے آمین

گفتگو

عمران احمد

''حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے لہٰذا نہ خود اس پر ظلم وزیادتی کرے نہ دوسروں کو ظالم بننے کے لیے اس کو بے یارو مددگار چھوڑے نہ اس کی تحقیر کرے (آپؐ نے تین مرتبہ سینے کی طرف اشارہ کرکے فرمایا) ''تقویٰ یہاں ہوتا ہے'' کسی شخص کے لیے یہی برائی کافی ہے کہ وہ اپنے کسی مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے اور اس کی تحقیر کرے ہر مسلمان کا دوسرے مسلمان کے لیے حرام ہے اس کا خون اس کا مال اور اس کی آبرو۔'' (مسلم)

عزیزان محترم ...... سلامت باشد

ہمارے پیارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ اے رب عظیم، میری امت پر وہ عذاب نازل نہ کرنا جو پچھلی امتوں پر نازل کیے تھے اور اللہ تعالیٰ نے اس کا وعدہ کیا تھا۔ بے شک وہ اپنے وعدہ پر قائم ہیں۔ اس کے باوجود ہم وہ امت ہیں جو کسی طرح بھی اس رحمتوں، نعمتوں کا شکر ادا نہیں کر سکے۔ اللہ پر یہ نہ کرالزام تراشی کررہے ہیں۔ یہ سب اللہ کی طرف سے ہیں، کیا عالم انسانیت کے سینے پر اسرائیل کا ناسور اللہ نے پیدا کیا؟ کیا اتنے امیر اور طاقت ور مسلمان حکمرانوں کی موجودگی میں برما کے مسلمانوں پر انسانیت سوز مظالم اللہ کے حکم سے ہورہے ہیں؟ جو ہم سے ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے کا دعویٰ کرتا ہے کیا پشاور، کوئٹہ اور کراچی میں قتل عام اللہ کی مرضی سے ہورہا ہے؟ آج کراچی کو سمندری طوفان سے خطرہ محسوس ہورہا ہے۔ آلودگی ہم پھیلائیں جنگل ہم کاٹیں فطرت میں مداخلت ہم کریں اور اس کے نتیجے میں آنے والی آفات سے بچنے کے لیے اپیلیں اللہ تعالیٰ سے کریں۔ کیا ہم اپنے رب سے مذاق نہیں کررہے؟ فرصت کی گھڑیوں میں سے چند لمحے کشید کرکے ذرا اس پر بھی سوچیے اپنے کردار پر ضرور نگاہ ڈالیں۔

نئے افق میں ہونے والی تبدیلیوں کو قارئین نے پسند کیا اس کے لیے ہم شکر گزار ہیں۔ یہ تبدیلیاں ہم نے قارئین کی خواہش پر ہی کی ہیں اور کرتے رہیں گے۔ ہم نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ہم نئے افق کو پاکستان کا نمبرون ڈائجسٹ بنادیں گے البتہ ہماری ہمیشہ سے کوشش رہی ہے کہ ہم ڈائجسٹوں کی بھیڑ میں اپنے قارئین کو اچھا صاف ستھرا مواد پڑھنے کو دیں، ہمیں فخر ہے کہ ہم اس میں ہمیشہ کامیاب رہے ہیں ان شاء اللہ آئندہ بھی کامیاب رہیں گے۔

ہم علی میاں پبلی کیشنز لاہور کے محترم عبدالغفار کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اپنے ادارے کے تحت شائع ہونے والے ناول دیدبان اور خناس ارسال کیے۔ واضح رہے کہ دیدبان محترم ارشد علی ارشد کا تحریر کردہ ہے جو نئے افق میں سلسلہ وار شائع ہوچکا ہے۔ جسے قارئین نے خاصا پسند کیا۔

(اس ماہ کا انعام یافتہ خط)

محترم قارئین! آپ کے ذوق کو دیکھتے ہوئے ادارہ "نئے افق" نے منتخب خط پر انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے.

ابن مقبول جاوید احمد صدیقی ...... راولپنڈی۔ محترم عمران احمد واقبال بھٹی صاحب السلام علیکم۔ جون کا نئے افق دیکھتے ہی لگا کہ یہ کوئی غیر ملکی رسالہ مل گیا ہے رنگوں کا امتزاج انتخاب اور استعمال انتہائی مہارت اور خوب صورتی سے کیا گیا ہے اور محترمہ کی تصویر زبردست پرکشش اور ہلکی سبز آنکھوں کے ساتھ ٹائٹل کو چار چاند لگ گئے ہیں۔ محترم مشتاق صاحب نے دستک میں انتہائی گمبھیر اور معاشرے میں جڑوں سے نیچے تک گئے ناسور کو قلم سے بے نقاب کیا۔ وہ کان کس لیے دیے ہیں عقل و فہم کیوں عطا کی گئی ہے۔ صرف اپنی ذات کے مفادات کے لیے سوچ ان کی تشریح انوکھے انداز میں کی گئی ہے جو ہمارے موجودہ

حالات پر صد فیصد پوری اترتی ہے اور دنیا کھینچنے کے لیے اور دریا بہنے کے لیے ہوتا ہے اور کبھی کنوؤں کی کوسے بھی ڈھور مرتے ہیں۔ زبردست جناب مشتاق صاحب اور حاصل مطالعہ تو یہ رہا کہ اپنے اپنے گریبانوں میں جھانکیے اور دوسروں کی اصلاح کی توقع سے پہلے خود ہمیں اپنی اصلاح کر لینا چاہیے۔ اسی طرح گفتگو میں حدیث شریف کے مطابق یقین کریں ہمارے معاشرے کی خرابی ہی "ریا" میں ہے جسے حضور پاک ﷺ نے شرک اصغر کا نام دیا ہے اللہ کریم ہمیں اس سے اپنے فضل و کرم سے بچائے کہ ہم صرف اسٹیٹس کے لیے نہ مرتے رہیں کہ کسی یتیم، غریب، بھوکے، ننگے اور لاچار کی مدد کا خیال تک نہ آئے۔ عمران جی جیسا کہ آپ نے کہا ہے تبصرہ کے آخر میں کچھ اور بھی تجاویز عرض کروں گا ہاں تو عمر فاروق ارشد آپ نے اپنے غصے بھرے سوالوں کا جواب آخر میں جناب مشتاق احمد قریشی کی زبانی پڑھ لیا ہوگا آتے آگے چلیے ہمارا میگزین پاکستان کے نمبرون میگزین کو بھی پیچھے چھوڑ جائے گا۔ ان شاء اللہ آپ کی شکایات اور تجاویز کا بھی خیر مقدم کیا ہے۔ انجم فاروق ساحلی جی سلامت رہیں کہ اتنی پرانی یادیں دوبارہ یاد کرا دیں اور ذہن میں پوری ایک فلم چل نکلی۔ آپ کی تجاویز اور مشورے زبردست ہیں۔ بالخصوص معیاری تراجم سسپنس اور تھرل سے بھرپور کہانیاں ہی معیار کو اور بہترین کریں گی۔ ریاض حسین قمر نے تبصرہ کے شروع میں خوب صورت حکایت لکھی ہے مگر اللہ نہ کرے ایسا ہو۔ خوش سخن کا معیار تو اچھا خاصا بڑھ چکا ہے ہاں صیغہ کا مغالطہ ضرور کمپوزنگ کی غلطی کا شاخسانہ ہوگا۔ عمر کے اس حصہ میں بھی اتنا غیر حاضر دماغ نہیں ہوں آپ کی شاعری تو ہر مرتبہ نہایت خوب رہتی ہے اس دفعہ بھی غزل زبردست رہی۔ عبدالمالک کیف بہت دنوں کے بعد حاضر ہوئے ہیں آپ کے غائب ہونے کے بعد فون پر آپ کو یاد کرتا رہا ہوں مگر کوئی جواب نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ نئے افق تک پہنچنے کے لیے بقول آپ کے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں اس میں اب ذرا بھی حقیقت نہیں آپ آ ئیں پھر دیکھیں عمران صاحب اور خاص کر اقبال بھٹی صاحب آپ کا والہانہ استقبال کریں گے۔ آپ نے جس تبدیلی کی بات کی ہے وہ غلطی کا شاخسانہ تھا اور عمران خان کے دھرنوں کا نتیجہ معروف اور گمشدہ لوگوں کو واپس آ جانا چاہیے۔ رونق بڑھے کی یاد کرنے کا بے حد شکریہ اب آتے رہیں گا۔ جعفری صاحب آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ اس دفعہ کہانیوں کے ساتھ اسکیچز اور تراشوں میں صحیح طور پر کام کیا گیا ہے میرے حساب سے تو اشتہارات بھی بڑھے ہیں۔ اقرا تو ہمیشہ کی طرح دل و دماغ پر چھا گیا۔ اس دفعہ ابن صفی پر محمد عارف کا مضمون تو یقین کریں پچھلی بے تحاشہ یادوں کے در وا کر گیا۔ چالیس پچاس سال کا عرصہ آنکھوں میں گھوم گیا۔ اردو ادب اور بڑے بڑے جغادری تو اپنی پھیکی دکان کو سہارا دینے کے لیے اور شرمندگی سے بچنے کے لیے یہ بیانات دیتے ہیں۔ 1983ء کا ادبی رسالہ چند روز قبل ہاتھ آیا تو پڑھ رہا تھا۔ اس میں پچھلے شمارے میں محترم مشتاق احمد قریشی کا زبردست مضمون ابن صفی اور ان کے ادب کو بہت سے پھنے خانوں نے تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ یہ صرف اور صرف ابن صفی کی بین الاقوامی شہرت اور زبردست بڑی اشاعت ناول پر جل رہے تھے۔ یہ ہمیشہ اس کو تنقید کا نشانہ بنائیں گے اور مخیر حضرات کی خیرات پر اپنی دکان کو سجائیں گے۔ اتنے زیادہ یہ رسالے مجھے تو پنڈی میں اور اسلام آباد میں (سوائے ایک دو کے) کہیں نظر نہیں آئے اور پچھلے پندرہ سال سے یہی حال ہے بہرحال چھوڑیں بولنے دیں انہیں اور ہم سنتے رہیں گے۔ ڈاکٹر ایم اے قریشی کی ڈبل ٹیم صحیح معنوں میں جاسوسی، سسپنس اور تھرل سے بھرپور کہانی تھی شروع کریں تو قاری آخر تک پڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہ نئے افق میں اس طرح کی کہانیوں میں بہترین رہی۔ ساتھ ہی معاشرتی کہانیوں میں خوب رہی اور بڑے لوگوں کے لیے ایک نصیحت کا تازیانہ بھی۔ خلیل جی ویل ڈن، بے حد گڈ۔ ہمیشہ کی طرح سلیم اختر پھر زبردست کہانی لے کر آئے ہیں۔ آخر ایک بدقسمت کی قسمت بدل گئی اور انجام اچھا پڑھ کر دل کو بڑا سکون ہوا۔ آخر کار مکافات عمل کے ذریعے ہر چال انجام کو پہنچ گئی۔ سید احتشام کی ڈبل کراس خوب رہی۔ تھرل اور سسپنس سے بھرپور گھنیڈی ایٹر بھی احمد سجاد بابر نے خوب لکھی ہے اور پڑھتے ہوئے مجھے تو بھرپور مزہ آیا اور اب ہمارے محبوب رائٹر ریاض بٹ صاحب کا شاہکار چراغ سامنے ہے اور آپ نے بھرپور طریقے سے جاسوسی اور سسپنس سے بھرپور کہانی لکھی ہے۔ ایسی کہانیاں ہی اس طرح کی تحریروں میں نئے افق کی شہ رگ ہیں۔ ریاض بٹ جی پھر سب پر چھا گئے ہیں۔ بے حد مبارک، طلب ہمارے معاشرے کی دکھتی رگ کی کہانی ہے کہ صنف نازک جتنا بھی پہاڑ جتنا صبر کرے مگر ممتا کو تو وہ بھی ترستی ہے اور ماں بننا تو انسانیت کی معراج ہے حسیب جواد جی خوب لکھا ہے۔ حسام بٹ بھی نیا موضوع اور نئی کہانی لے کر تشریف لائے ہیں تو بات یہ ہے کہ میں تو ان کے طرز تحریر اور انداز کا پرانا فین ہوں آسٹرولوجسٹ کا ورق ڈائری، بہت خوب اور وقتی جذباتی فیصلے اکثر زندگی بھر کا روگ بن کر چمٹ جاتے ہیں اس کے باوجود کہ نتیجہ کیا ہوگا یا آخر حاصل کیا ہوگا۔ ان سب سے انجان بے خبر اپنے ہی فیصلے پر چلے جانے کا شاخسانہ کیا ہوگا۔ حسام بٹ جی ہر ماہ آیا

کریں۔ میری ایک تجویز محترم مشتاق احمد قریشی صاحب کی خدمت میں یہ بھی ہے کہ آپ حسام بٹ جی کی تحریر کا معاہدہ ہر ماہ قارئین کی خوشنودی اور بے حد اچھی تحریر حاصل کرنے کے لیے کرلیں۔ یعنی معاہدہ ہو چکا ہو۔ ہر ماہ آئیں۔ یہ تمین عدد درخواست ہیں شکریہ۔ ساحل ابڑو نازک احساس سے بچی کہانی بڑے اچھے طریقے سے لکھ کر حاضر ہوئے ہیں اور دل کے تاروں کو چھوگئی اور ٹوئیشن کی جگہ میری مختصر کہانی ایمانداری لگا کر شکریہ کا موقع دیا۔ بے حد شکریہ۔ سلسلہ وار بدف بھی نوشاد عادل نے انتہائی خوبی اور خوب صورتی سے انجام تک پہنچائی ہے۔ بہت ہی اچھا سلسلہ رہا۔ باقی فلسطین، قلندر ذات دونوں خوب ہیں اور قارئین کی پسند کے مطابق چل رہے ہیں۔ خوشبوئے سخن کو چار صفحوں تک پھیلانے کا شکریہ۔ معیاری اور معلوم ہوتا تھا کہ ماہر نگراں کے ہاتھوں سے نکل کر شائع ہوئی ہیں۔ اسی طرح ذوق آگہی بھی زبردست تحریروں سے سجا ہمارے سامنے ہے۔ یہ بھی تو سباس گل کی توجہ اور محنت کا نتیجہ ہے امید کی کونپل بھیجنے والی محترمہ مسکان احزام ہیں۔ ان کے نام کا حصہ احزام کا مطلب کیا ہے؟ اور چند تجاویز حاضر خدمت ہیں اول تو اداریہ میں آپ نے تینوں ہی بتادیے ہیں۔

۱) سسپنس، جاسوسی اور تھرل کی کہانیاں علیحدہ ہوں اور دوسرا حصہ معاشرتی اور انسانیت کے ناتے سے کہانیوں سے مزین ہو۔
۲) پھر ایک صفحہ تک کی منی کہانیاں بھی لکھوائیں جیسے نصیحت آموز کہانیاں، پراسرار کہانیاں وغیرہ، یہ ایک صفحہ تک محدود ہوں اس سے نئے موضوعات سے آگاہ ہوں گے۔
۳) گفتگو میں اداریہ مشتاق صاحب کا ہو اور پورے ایک صفحے کا۔
۴) ٹائٹل اس دفعہ جیسا ہی ہونا چاہیے۔
۵) سال میں دو دفعہ پرانے، اچھے اور یاد کرنے والے لکھاریوں کا گوشہ رکھا جائے ان پر مضامین اور معلوماتی تحریریں ہوں اس طرح نئے لوگ بھی ان سے متعارف ہوسکیں گے۔ باقی ہمارے بہت سے لکھاری عرصہ دراز سے غیر حاضر ہیں براہ کرم جلد از جلد حاضری لگوائیں۔

☆ محترم جاوید صدیقی صاحب بہترین تبصرہ کا شکریہ، ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ہم ہر شمارہ قارئین کی آرا کی روشنی میں ہی تیار کریں اور ہر ماہ خوب سے خوب تر تحریریں تلاش کر کے پیش کریں آپ کی تجاویز کا خیر مقدم آپ کی چار تجاویز کا جواب تو پرچے میں موجود ہے امید ہے آپ باقاعدگی سے نئے افق کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں گے۔

ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا...... رجب والا ملتان ۔ پیارے عمران، طاہر صاحب سلام محبت! اُمید کرتا ہوں خیر و عافیت سے ہوں گے۔ نئے افق کی نگری میں پہلی بار دستک دے رہا ہوں۔ میں شاعری کرتا تھا اور شاعری میری پاس موجود بھی ہے لیکن کبھی شائع نہیں کروائی۔ اس بار دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر حاضری دے رہا ہوں۔ ماہ مئی میں حقیقی مسیحا آپ نے شائع کی۔ مجھے نہیں معلوم مجید احمد جائی نے کب لکھی اور آپ کو کب بھیجی۔ مجھے تب معلوم ہوا جب پہلی کال آزاد کشمیر سے آئی اور انہوں نے بتایا کہ حقیقی مسیحا مجید احمد جائی کی کہانی لگی ہے اور آپ کا نمبر آیا ہے۔ دعاؤں کے نذرانے شروع ہوگئے۔ میں تو صرف اور صرف وسیلہ بنا ہوں، شفا دینے والی ذات رب رحمان ہوں۔ اس ذات نے مجھے اس قابل بنایا، شکر ادا کرتا ہوں۔ میں منظر عام پر نہ آتا اگر یہ تحریر نہ شائع ہوتی لیکن اس تحریر سے ہزاروں لوگوں نے رابطہ کیا اور اپنی بیماری بتائی۔ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے شفایابی بھی ہورہی ہے۔ بیرونی، اندرونی کالز کا سلسلہ رواں دواں ہے۔ میں آپ کو اور مجید احمد جائی کو دعائیں دے رہا ہوں اور جن مریضوں نے رابطہ کیا وہ بھی آپ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کررہے ہیں اور دعائیں دے رہے ہیں۔ آپ اس کار خیر میں اپنا حصہ ڈال کر بہت بڑی نیکی کمائی ہے اور اس کا اجر اوپر کھڑی ذات نے دینا ہے۔ آج کے اس زمانے میں اگر کوئی صدق دل سے دعا دے دیتا ہے تو زندگی اور آخرت سنور جاتی ہے۔ میں اپنی جگہ رہتے ہوئے انصاف کرنے کی پوری کوشش کررہا ہوں اور میرا رب مجھے ناکام نہیں کرتا۔ آپ کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ بھلائی کے اس کام میں آپ نے حصہ ڈالا۔ گاہے بگاہے نئے اُفق پڑھ رہا ہوں، میں نے 60 کاپی خریدی ہیں اور ہر آنے والے مریض کو بطور گفٹ دی۔ میں اپنی شاعری آپ کو بھیجوں گا، اُمید ہے شائع کریں گے۔ ادارے کے لیے تہہ دل سے کامیابی کی دعائیں کرتا ہوں۔ خدمت خلق کرنا ہی سب سے بڑی نیکی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو برائیوں سے محفوظ رکھے اور نیکی کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین ثم آمین! والسلام!

☆ ڈاکٹر صاحب نئے افق پڑھنے اور دعاؤں کا شکریہ آپ شاعری ارسال کردیں، انشاء اللہ ضرور شامل اشاعت ہوگی

ان صفحات پر خوب صورت انتخاب سے آپ خود قائل ہو جائیں گے بس غیر جانبدار ہو کر مطالعہ کرتے رہیے۔ خواتین میں بھی بڑی باکمال ہستیاں موجود ہیں پرچہ بہت پسند آیا آئندہ بھی زیر مطالعہ رہے گا آپ نے تعاون کیا تو سب دوستوں کا داب۔
☆ بے فکر رہیں آپ دیکھیے گا ہمارے دیگر قارئین بھی رنگ پکڑیں گے اور ہمیں گفتگو کے صفحات میں اضافہ کرنا پڑے گا۔

ریاض حسین قمر ۔۔۔ منگلا ڈیم محترم عمران احمد صاحب السلام علیکم! امید واثق ہے کہ آپ مع اپنے محنتی عملے کے بالکل خیریت سے ہوں گے۔ ماہ جون کا نئے افق میرے سامنے ہے۔ اس دفعہ ٹائٹل روشن سے ذرا ہٹ کے ہے کافی عرصہ کے بعد صنف نازک کسی صورت ٹائٹل میں موجود ہیں۔ بہرحال ٹائٹل شاندار ہے۔ دستک میں جناب مشتاق احمد قریشی صاحب بڑے اہم مسئلہ کو شامل کیا ہے۔ گفتگو کے شروع میں بیان کردہ حدیث سے ایمان تازہ ہوگیا۔ آپ نے گفتگو کے آغاز میں جو انعامات کا اعلان فرمایا ہے وہ بہت ہی خوش آئند ہے۔ بیشک عمران بھائی بظاہر یہ انعام ایک معمولی چیز نظر آتا ہے مگر یہ انسان میں ہمت اور حوصلہ پیدا کرتا ہے اور انسان اپنی پوری صلاحیتیں بروئے کار لاتے ہوئے بہترین چیز تخلیق کرنے کی کوشش کرتا ہے آپ کے اس عمل سے نئے افق کو بہت معیاری چیزیں ملیں گی کرسی صدارت پر براجمان محترم عمر فاروق ارشد نے بہت سی چیزوں کی نشاندہی کی ہے۔ ان کا ازالہ بہت ضروری ہے۔ ان تجاویز نے ثابت کردیا ہے کہ وہ نئے افق کا کس طرح بغور مطالعہ کرتے ہیں۔ عمران بھائی آپ نے ہم قارئین کے چھپنے والے خطوط پر اپنا مختصر تبصرہ شائع فرما کر ہم قارئین پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اس سے ہمارے حوصلے بہت بلند ہوئے ہیں۔ جناب محمد عمران پہلی بار محفل میں تشریف لائے خوش آمدید عمران بھائی امید ہے بر باقاعدہ تشریف لاتے رہیں گے جناب دستگیر صاحب اپنے مختصر نامے کے ساتھ تشریف لائے اپنے خطوط وزر اخوات عطا فرمائیے گا۔ انجم فاروق ساحلی صاحب چند تجاویز کے ساتھ تشریف لائے۔ وہ معروف اور جانے پہچانے لکھاری ہیں جن کی نگارشات مختلف جرائد کے صفحات کی زینت بنتی رہتی ہیں۔ محفل میں تشریف لانے کا شکریہ۔ پیارے بھائی عبدالمالک کیف صاحب بڑے ہی خوب صورت اور مختصر تبصرے کے ساتھ تشریف لائے ہیں کیف بھائی آپ تو میرے دل کی دھڑکنوں میں بستے ہیں۔ یاد فرمانے پر میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔ رب ذوالجلال آپ کو دائمی خوشیاں عطا فرمائے آمین۔ اس ماہ ریاض بٹ صاحب چراغ کے عنوان سے بہت اچھی تحریر لائے ہیں۔ بٹ صاحب مبارک ہو اور آپ محفل سے غیر حاضر نہ ہوا کریں۔ رونق رہتی ہے اور ابن مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب بھی خوط لگ جاتے ہیں پیارے بھائی ایسا نہ کیا کریں۔ اقرا ایمان کو تازہ کرنے والا ایک اچھا سلسلہ ہے خوشبوئے سخن میں تمام انتخاب بہت اچھا ہے۔ اس سیکشن کے صفحات میں اضافہ کرکے بہت سے قارئین کی دیرینہ خواہش کو پورا کیا گیا ہے۔ ذوق آگہی میں شائع ہونے والی ہر تحریر بہترین اور سبق آموز ہے۔ میری دعا ہے کہ رب قدوس اس جریدے کو ترقی کی شاہراہ پر گامزن رکھے آمین۔
☆ قمر صاحب آپ کا نئے افق سے رشتہ پرانا ہے آپ آتے رہا کریں آپ کی وجہ سے ان صفحات میں برکت ہوگی۔

ایم ایچ کاشف ۔۔۔۔۔ جعفر آباد محترم عمران صاحب السلام علیکم عرض ہے کہ ماہنامہ نئے افق میرے والد صاحب کا خواب ہے جو میں بچپن سے پڑھتے آرہے ہیں اس سے ادب کی روشنی پائی اور اسے لکھنے کی کوشش کی جب لکھنے کی جسارت کی تو الفاظ نے ساتھ نہیں دیا کیونکہ میں کوئی ادیب نہیں میں نے اس مقالے کی تمہید آفاق افسانہ نگار و مصنف محمد سلیم اختر صاحب کا ایک مضمون سے اقتباس ہے جو انہوں نے اپنے الفاظ میں تجزیہ کیا ہے اور تحریر کے ضروری عناصر کیا ہیں تحریر رائٹر کی آئینہ ہوتی ہے اس تمہید سے آپ حاضرین کو میرے مقالے کے عنوان کا بخوبی اندازہ بھی ہوگیا ہوگا جی ہاں میں آج اس تبصرے میں (گلیڈی ایٹر) ہی کے بارے میں لب کشائی کی جسارت کروں گا۔ جو جون کے تازہ شمارہ نئے افق میں احمد سجاد بابر کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ یہ تحریر ماہنامہ سچی کہانیاں کے صفحہ نمبر 144 (میڈل آف لو) کے نام سے اسی مہینہ جون میں شائع ہوئی ہے میں یہ بات صرف احمد سجاد صاحب کو نہیں کہتا بلکہ مجید احمد جائی بھی اپنی تحریریں بار بار شائع کراتا ہے ایک تحریر 4،3 انجمنوں میں ایک ہی ساتھ شائع کرنا یہ باتیں رائٹر کو زیب نہیں دیتیں اور ان دونوں کا دعویٰ ہے کہ ہم پاکستان کے معروف ناول نگاروں ادیبوں میں سے ایک ہیں اور ان کے بارے میں بھی دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ان کا تعلق نہ صرف ادبی حلقے سے ہے بلکہ ان کا گھرانہ بھی اردو ادب میں بھی معروف و مقبول ہے۔ لیکن ناول یا افسانہ لکھنے کے لیے یہ کوئی بہانہ یا معیار بھی نہیں ہے کہ تعلق ضرور علمی یا ادبی گھرانے سے ہو۔ کیونکہ تاریخ نے اس معیار کو پاؤں کی نوک پر رکھا ہے مجید احمد جائی کی ہر تحریر میرے علم اور بساط کے مطابق ایسی تحریر روایتی طور پر لکھی جاتی ہے

جواب عرض ٹائپ کے پرچوں میں شائع ہوتی ہے۔ نئے افق میں نہیں، نئے افق وہ ادبی جریدہ ہے جس کا معیار دوسرے پرچوں سے الگ ہے۔ بہر حال میری کسی سے ذاتی دشمنی نہیں اگر میری وجہ سے کسی بھی رائٹر کی دل آزاری ہوئی ہے تو میں معذرت چاہتا ہوں کیونکہ ہم ادب دشمن نہیں بلکہ ادب دوست ہیں۔ محمد سلیم اختر (سمجھوتہ) زبردست تحریر لکھی گئی۔ اس معاشرے کی عکاسی تھی۔ سلیم اختر کی تخلیق میں ایک ایسا درد چھپا ہوتا ہے جو ہم نوجوان نسل کی تعمیراتی سوچ کو بھی تعمیری بنا دیتی ہے اور سبق آموز بھی۔ ساحل ابڑو (ویران شام) نے تو دل کے اندر کسک پیدا کر دی۔ کہتے ہیں کہ افسانہ مختصر ہوتا ہے جس کے مرکزی کرداروں کو رائٹر سسپنس میں رکھتا ہے اور جو باقی کردار سپورٹ کے لیے دیے جاتے ہیں تو وہ رائٹر کی مہارت ہوتی ہے۔ (ویران شام) بھی ایسی تحریر پڑھنے کو ملی جو کئی سالوں سے میں نے نئے افق میں نہیں پڑھی۔ ساحل ابڑو نے آزادی کے حوالے سے خوب لکھا اور زبردست دل ہلانے والی تحریر تخلیق کی ساحل بھائی آپ ہر مہینے اسی ٹیپ کی کہانیاں لکھا کریں ہم آپ کی تحریریں شوق سے پڑھتے کیونکہ آپ کی تخلیق حقیقت کے قریب ہوتی ہے۔ خلیل جبار بھی ہمارے استاد کا درجہ رکھتا ہے جن کی کہانیوں میں اکثر سسپنس ہوتا ہے۔ نوشاد عادل نے بھی خوب نام کمایا ادب کی دنیا میں باقی تمام کہانیاں بھی اچھی اور سبق آموز تھیں تمام کے تمام سلسلے بھی اچھے چل رہے ہیں۔ عمران بھائی وقت کی بہت کمی ہے۔ جس کی وجہ سے پورا تبصرہ نہ کر سکا زندگی باقی رہی تو آئندہ ماہ ملاقات ہوگی۔ والسلام

☆ کاشف صاحب! آپ کے خیالات اور احساسات ان سطور کے ذریعے سجاد بابر اور مجید جانی تک پہنچ گئے ہیں امید ہے وہ اپنی حرکت کی خود وضاحت کر دیں گے۔

عمر فاروق ارشد...... فورٹ عباس۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔ جون کا نئے افق توقع سے بہت پہلے ہاتھوں میں آ گیا۔ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے والا محاورہ گویا سچ ثابت ہو گیا۔ انتہائی خوشی کی بات ہے کہ اس دفعہ بہت مثبت تبدیلیاں نظر آ رہی تھیں۔ خصوصاً کہانیوں کے ایکسچینج بنا کر اور محترم قریشی صاحب نے اولین صفحات پر اپنی کہانی دے کر یہ ثابت کر دیا کہ وہ نئے افق کی بہتری اور ترقی کے لیے پر خلوص ہیں۔ امید ہے کہ ہماری دیگر تجاویز پر بھی عمل درآمد ہوگا جو کہ ہم نے اپنے کسی ذاتی مفاد کے لیے نہیں بلکہ اپنے اس رسالے کی بہتری کے لیے دی ہیں۔ خیر اب بڑھتے ہیں گفتگو کی طرف، گنتی کے چند ساتھی شامل محفل ہیں۔ میری یہ تجویز ہے کہ دونوں سلسلے وار ناولز سے پانچ صفحات کم کیے جائیں اور ان کو مستقل سلسلوں میں تقسیم کیا جائے۔ گفتگو اور خوشبوئے سخن کے صفحات میں خاطر خواہ اضافہ ضروری ہے۔ ورنہ تشنگی کا احساس مجھ کو لگاتار رہتا ہے دوسری بات ریاض حسین قمر صاحب کے حوالے سے کروں گا جنہوں نے اپنے خیال میں بڑا گولڈن مشورہ دیا ہے کہ ہر ماہ سلسلہ خوشبوئے سخن کسی ایک جیالے شاعر کے حوالے کر دیا جائے اور وہ بلبل چمن بن کر اکیلا ہی سریلے گیت بکھیرتا رہے جا ہے باقی لوگ بے چارے سر دھنتے ہوئے اگلے جہاں سدھار جائیں میں شدت کے ساتھ اس تجویز کو رد کرتا ہوں۔ آپ خود سوچیں کہ اس طرح آپ صرف چند معروف اور پرانے شاعروں کو نمائندگی دے سکیں گے۔ نئے لکھنے والوں کو تو پھر اس دوڑ سے باہر ہی سمجھیے۔ عبدالمالک کیف بھائی دوبارہ آمد پر خوش آمدید یقیناً آپ کا شمار پرانے قارئین میں ہوتا ہے سو آپ کی تجاویز قابل قدر ہیں۔ انجم فاروق صاحب یادِ ماضی عذاب ہے یارب کی عملی تفسیر بنے ہوئے تھے واقعی پرانے لکھاریوں کے قلم میں جو جان ہوتی تھی وہ نئی نسل میں کہاں۔ قریشی صاحب اب خود واپس آ گئے ہیں تو انہیں چاہیے کہ وہ پرانے لکھاری جو وقت کی گرد میں گم ہو گئے ہیں ان کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر واپس لایا جائے اب بڑھتے ہیں کہانیوں کی طرف سب سے پہلے سلسلے وار ناول کی بات کروں گا۔ قلندر ذات ناول کے متعلق مجھے یقین ہے کہ اب اس میں کوئی تھرل یا ٹرننگ پوائنٹ نہیں آنے والے واقعات کا تسلسل ناول کا بیڑہ غرق کر رہا ہے۔ امجد جاوید صاحب سے گزارش ہے کہ ایک مناسب سا انجام دے کر ناول کا اختتام کر دیں اللہ آپ کو جزائے خیر دے اس کی جگہ یعقوب بھٹی صاحب سے کچھ لکھوائیں یا پھر ابن صفی مرحوم کا کوئی ناول شامل کریں۔ الماس ایم اے کے ناول فلسطین کے بارے میں ابھی کوئی حتمی رائے نہیں دی جا سکتی تھوڑا آگے چلے گا تو کچھ اندازہ قائم ہو سکے گا اور تنقید و تعریف کے دروازے کھلیں گے۔ دیگر کہانیوں میں ریاض بٹ صاحب حسب معمول اچھی کہانی لے کر آئے۔ ریاض بھائی آپ گفتگو میں حاضری دینے کی پوری کوشش کیا کیجیے اللہ آپ کو خوش رکھے۔ اب بات کرتے ہیں خوشبوئے سخن کی۔ اس مرتبہ اس سلسلے کو کافی وسعت عنایت کی گئی۔ نئے شاعر زیادہ تعداد میں موجود تھے۔ گزارش ہے کہ ریاض حسین قمر جیسے سینئر اور معتبر شاعر کو اس سلسلے کے آغاز میں نمایاں جگہ ملنی چاہیے۔ پرانے اور اچھا لکھنے والوں کا کم از کم اتنا حق تو بنتا ہے تا کہ آپ ان کی آزاد نظمیں لکھنے والوں کے ہجوم میں گم کر دیں۔ ریاض حسین قمر کوئی نئے شاعر نہیں میں تب سے ان کی شاعری پڑھ رہا ہوں جب مجھے شاعری کے اصولوں سے دوری کی

بھی آگاہی نہیں تھی۔ خیر، دیگر غیر حاضر ساتھیوں میں جاوید احمد صدیقی صاحب سے گزارش ہے کہ ہر ماہ تبصرہ کیا کریں، بھی آپ درمیان سے غائب ہو جاتے ہو، بہرحال وقت کی قلت کی وجہ سے اس مرتبہ تبصرہ قدرے مختصر ہے ان شاء اللہ آئندہ ماہ اس تھوڑی بہت کمی کو دور کر دیا جائے گا تمام ساتھیوں کو سلام ادارے کے منتظمین کے لیے ڈھیروں دعائیں۔ والسلام

☆ عمر فاروق! جی آپ یا نوں محترم پرچے کو بہتر سے بہتر بنانے میں آپ قارئین کا بھی ہاتھ اور تعاون ہوتا ہے اگر آپ گفتگو اور دیگر سلسلوں میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں گے تو صفحات میں بھی ضرور اضافہ ہوگا۔

ریاض بٹ..... حسن ابدال۔ السلام علیکم! ماہ جون کا شمارہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہو کر ہماری منتظر نگاہوں کے سامنے آیا اور انتظار کی کٹھن گھڑیاں اختتام پذیر ہوئیں۔ تقریباً چار ماہ بعد اپنی کہانی پرچے میں دیکھ کر غم کے بادل چھٹ گئے اور خوشی کی رم جھم نے اپنی بہار دکھا دی۔ بہت شکریہ امید ہے میری باقی تحریریں بھی باری باری شائع ہوتی رہیں گی۔ اس بار پرچے میں جو تبدیلیاں کی گئیں انہوں نے پرچے کی خوب صورتی اور رعنائی میں چار چاند لگا دیے۔ اب آگے بڑھتے ہیں محترم مشتاق احمد قریشی صاحب نے افسر بے کار خاص لکھ کر ارباب اختیار حضرات کو آئینہ دکھانے کی سعی کی ہے۔ ادھر ادھر سے حقائق تلاش کر کے جو کہانی بنتی ہے اس کی بالکل درست عکاسی کی گئی ہے۔ خدا ہی ہمارے ارباب اختیار کو صحیح راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔ گفتگو میں عمران بھائی نے انعامی سلسلوں کا ذکر کر کے قارئین کے دل جیت لیے ہیں۔ اس سے مقابلے کار جحان بڑھے گا اور یہ رسالے کے لیے مزید بہتری اور ترقی کا ضامن بنے گا۔ بہت خوب عمر ارشد صاحب آپ نے اچھا لکھا ہے آپ کے خیالات اور تحفظات سر آنکھوں پر۔ ویسے پرچے میں کی گئیں تبدیلیوں کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ اس پر لفظوں کی روشنی ضرور ڈالیے گا۔ محمد عمران بھائی محفل میں خوش آمدید امید ہے آئندہ بھی محفل میں آتے رہیں گے۔ انجم فاروق ساحلی صاحب مجھے پتا ہے آپ کا نئے افق کے ساتھ تعلق بہت پرانا ہے آپ کی تحریریں جاندار ہوتی تھیں اب بھی ہیں آپ کی تجاویز اچھی ہیں۔ ریاض حسین قمر بھائی یاد کرنے کا بے حد شکریہ آپ نے خوب کہاوت لکھی ہے بھائی میں کوشش کروں گا کہ تفتیشی کہانیوں سے ہٹ کر بھی کچھ لکھوں، بہرحال اللہ آپ کو خوش و خرم رکھے آمین۔ عبدالمالک کیف بھائی بڑے عرصے بعد آپ محفل میں آئے آپ نے مصروفیات اور پرچے کی بروقت دستیابی کے متعلق ذکر کیا تو اس کا شکار تو ہم بھی ہوئے ہیں۔ اس چکر میں کئی ماہ تبصرہ رہ جاتا ہے آپ نے میرے خط اور کہانیوں کی تعریف کی بہت بہت شکریہ اور مہربانی۔ بہرحال ایک بات ہے مختلف نمبروں کی وجہ سے اب میری بہت کم کہانیاں شائع ہوتی ہیں۔ اب بات ہو جائے باقی موضوعات کی۔ ذوق آگہی میں زبیر احمد خان کی خوب صورت باتیں نئی ہونے کی وجہ سے بہت اچھی لگیں۔ مسجد نبوی کی تعمیر ریان عدیل کی اپنی مثال آپ ہے۔ ایسی تحریریں ذہن کے دریچے وا کرتی ہیں۔ بہرحال ذوق آگہی کا سارا انتخاب اپنی مثال آپ ہے۔ خوشبوئے سخن میں گل ارباب کی نظم عمر فاروق ارشد کی غزل ٹاپ پر ہیں۔ خاص کر عمر فاروق ارشد کی غزل موضوع کے لحاظ سے منفرد ہے باقی انتخاب میں قدیر رانا، ریاض حسین قمر کا انتخاب بھی قابل دید ہے۔ صفحہ بہ صفحہ بکھری کترنیں بھی اچھی ہیں۔ کہانیاں سب ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ کسی ایک کی تعریف کرنا زیادتی ہوگی۔ مجموعی طور پر اس بار پرچے میں جو تبدیلیاں کی گئیں قابل ستائش ہیں آخر میں ایک چھوٹی سی ننھی منی سی ہے کہ آج کل نہ تو ذوق آگہی میں میرا انتخاب شامل ہوتا ہے نہ ہی کترنوں میں مجھے جگہ دی جاتی ہے۔

☆ بٹ صاحب خوش آمدید آپ کی شکایات سر آنکھوں پر کہانیوں سے متعلق آپ کو شکایت نہیں ہوگی اگر ہو سکے تو فون پر رابطہ کریں۔

سانحہ ارتحال

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ

ادارہ نئے افق کے رکن نور الدین (شہروز) کی والدہ رضا الٰہی سے وفات پاگئی ہیں۔ ادارہ ان کے غم میں برابر کا شریک ہے اور اللہ سے دعاگو ہے کہ وہ مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل پر اجر عظیم عطا فرمائے۔ (آمین)

اقرأ

ترتیب: طاہر قریشی

مشتاق احمد قریشی

اللہ

ذاتِ باری تعالیٰ کا نور وہ نور ہے جس سے کائنات کا ذرہ ذرہ منور اور روشن ہے اس کے دم سے ہی کائنات کی ظلمتیں اور تاریکیاں دور ہوجاتی ہیں۔ یہ وہ نور ہے کہ جس کی حقیقت کو انسانی ذہن نہیں پہنچ سکتا۔ بس یہ ایک کوشش ہے کہ دل اس ذاتِ عالی کے ساتھ متعلق ہو اور تاکہ اس کی ذات کے ادراک کی کوشش کرتے رہیں اور اپنا تعلق ذاتِ الٰہی سے مضبوط سے مضبوط تر قائم رکھیں۔

آیت مبارکہ کے اس فقرے سے انسانی ذہن کی تاریکی صاف ہوجاتی ہے کہ "اس کے نور کی مثال ایسی ہے" اس جملے سے وہ تمام غلط فہمی دور ہوجاتی ہے جو "اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔" کے جملے سے کسی کو ہو سکتی ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوگیا ہے کہ "اللہ کو نور" کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ معاذ اللہ اس کی حقیقت ہی "نور" ہے۔ جبکہ حقیقت میں تو وہ ایک ذاتِ کامل و اکمل ہے وصاحبِ علم وقدرت ہے صاحبِ تدبیر وحکمت ہونے کے ساتھ ساتھ وہ صاحبِ نور بھی ہے۔ اور اسے نور اس کے کمالِ نورانیت کے باعث کہا گیا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا نورِ مطلق سارے جہانوں کو منور کر رہا ہے مگر اس کا ادراک ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتا۔ اس کے ادراک کی توفیق اور اس کے فیض سے مستفیض ہونے کی نعمت اللہ ہی جس کو چاہتا ہے بخشتا ہے۔ ورنہ جس طرح اندھے کے لیے دن رات برابر ہوتے ہیں اسی طرح بے بصیرت انسان جب تک یہ نہ سمجھ لے کہ بجلی چاند تارے سورج کی روشنی تو روشنی ہے مگر اللہ کا نور اسے جھائی نہیں دیتا۔

اللہ تعالیٰ جو کائنات کا اور کائنات کی ہر چیز ہر ذرے تک کا خالق و مالک ہے انسان جب تک یہ نہ سمجھ لے اور اس عقیدے پر مضبوطی سے نہ قائم ہو کہ وہی مالک وخالق ہے وہی ذاتِ باری ہماری نگہبانی و پرورش کرنے والی ہے وہی حاکم ومختار بھی ہے اور ہر ہر طرح سے مکمل اختیار کی مالک بھی ہے۔ اس کے علم کی نہ کوئی حد ہے نہ انتہا اس کے اقتدار و اختیار پر نہ کسی کی روک ٹوک ہے نہ اسے کسی طرح تھکن ہوتی ہے۔

قرآن کریم میں ربِ کائنات نے ذہن انسانی کی فطرت وساخت اس کے علم وفہم کے ساتھ ساتھ اس کے محسوسات مدرکات جذبات واحساسات اور وجدان کی محدود دنیا کے پیشِ نظر ذاتِ الٰہیہ کے اثبات میں تشبیہ وغیرہ سے کام لیا ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ ذاتِ الٰہی کا ہم قیاس اپنے مدرکاتِ علم اور مشاہدات تجربات یا اپنے ذوق وجدان کی بنا پر کرسکیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ جو انسانی عقل وفہم اور ادراک کا خالق ہے وہ خوب جانتا ہے کہ انسان کو کس طرح مطمئن کیا جاسکتا ہے اس لیے انسانی استعداد اور فہم کے مطابق اللہ اس سے خطاب فرماتا ہے تاکہ بندوں کے ذہن میں اس کی ہستی کا شعور پیدا ہوسکے۔ گو کہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی انسانی فہم وادراک وہم وخیال سے بلندتر ہے بے شک انسان اللہ کی ذات سے بے خبر ہے لیکن اللہ بندوں کی رہنمائی انسان کی عقل فکر علم وعمل کے ذریعے کرتا ہے اس کے ذریعے اتنا تو جان سکتا ہے کہ اللہ کی ذات ایک کامل ومکمل ذات ہے جو سراسر محمود ہستی ہے۔ جسے ہر اچھے نام سے پکارا جاسکتا ہے۔

اس سلسلہ تشبیہ کا چونکہ انسانی ذات اور کائنات سے نہایت گہرا تعلق ہے اس لیے جو تعلق انسانی ذات، کائنات کا ذاتِ الٰہی سے ہے اس سے انسان سمجھ سکتا ہے کہ اس کے اور اس کے خالق ورب کے درمیان کیسا اور کیا رشتہ ہے اگر

انسان اس رشتے کو سمجھ لے جس نے ایمان و یقین کو سہارا دے رکھا ہے تو انسان کو ذاتِ الٰہی سے اپنے مضبوط و مستحکم رشتے کا ادراک ہو جاتا ہے۔

اللہ کی ذات کے بارے میں قرآن کریم کیا کہتا ہے؟

اللہ کے اختیار کی مٹھی میں اس کی قدرت کی گرفت میں ساری کائنات ہے زمین و آسمان اور ان کے درمیان کی ہر چیز پر اسے پورا پورا اختیار و اقتدار حاصل ہے۔ اللہ جل شانہ اپنی تعریف قرآن کریم میں کئی جگہ فرما رہے ہیں۔ جیسا کہ سورۃ الحشر کی آخری آیات میں ارشاد ہو رہا ہے۔

ترجمہ:۔ وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہر پوشیدہ اور ظاہر ہر چیز کا جاننے والا وہ بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔ (۲۲) وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ بادشاہ ہے نہایت مقدس (حقیقی ہر عیب سے پاک) سراسر سلامتی امن دینے والا نگہبان سب پر غالب اپنا حکم بزور نافذ کرنے والا اور بڑا ہی ہو کر رہنے والا۔ پاک ہے اللہ اس شرک سے جو لوگ کر رہے ہیں۔ (۲۳) وہ اللہ ہی ہے جو تخلیق کا منصوبہ بنانے والا اور اس کو نافذ کرنے والا اور اس کے مطابق صورت گری کرنے والا ہے۔ اس کے لئے بہترین نام ہیں۔ ہر چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہے اس کی تسبیح کر رہی ہے اور وہ زبردست اور حکیم ہے۔ (۲۴) (الحشر۔۲۲ تا ۲۴)

تفسیر:۔ ان آیاتِ مبارکہ میں جہاں اللہ تبارک و تعالیٰ کی عظمت و شان بیان کی گئی ہے وہیں ہمیں یہ بھی بتایا اور سمجھایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کون ہے؟ اور اللہ تعالیٰ کیسا معبود ہے اور اس کی صفاتِ عالی کیا ہیں اور کیسی ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بابرکات ہی ہے جس نے اپنے بندوں کی بہتری اور بھلائی کے لئے اپنا کلام قرآن کریم کے ذریعے بھیجا ہے اللہ تعالیٰ نے جو ذمہ داری اہلِ ایمان پر ڈالی ہے جس سے منکرین ملحدین مشرکین سرتابی و انحراف کرتے ہیں ۔ وہ اس لئے کہ ایک روز جب یوم آخر ہوگا سب کو اللہ کے حضور پیش ہو کر اپنے تمام اعمال و افعال کی جوابدہی کرنا ہوگی آیات میں جن صفاتِ الٰہی کا بیان آیا ہے اور جس طرح سے آیا ہے اس کا اثر قلب مومن پر از خود بڑا گہرا احساس پیدا کرتا ہے۔ اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کا سابقہ جس ہستی سے ہے وہ کوئی معمولی ہستی نہیں ہے بلکہ بڑی ہی عظیم اور جلیل القدر ہستی ہے۔ قرآنِ کریم میں جگہ جگہ بار بار اللہ تعالیٰ کی صفات کو بے نظیر طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ جس سے ذاتِ الٰہی کا نہایت ہی واضح تصور حاصل ہوتا ہے۔

اس سے پہلے کہ آیت کی تشریح و تفسیر کی طرف بڑھیں ضروری معلوم ہوتا ہے ذاتِ باری تعالیٰ کی صفاتِ عالی کے بارے میں قرآن حکیم کی ایک اور آیتِ مبارکہ جو افضل آیت قرار پائی ہے اور آیت کرسی کے نام سے جانی جاتی ہے کو بھی شامل تشریح کر لیا جائے تا کہ بات کی اہمیت واضح ہو کر سامنے آ جائے۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ جلال اور علو شان اور اس کی قدرت و عظمت پر مبنی نہایت جامع آیت ہے۔

ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ ہی وہ زندہ جاوید ہستی ہے جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے وہ نہ سوتا ہے اور نہ اسے اونگھ آتی ہے زمین و آسمان میں جو کچھ بھی ہے اسی کا ہے۔ کون ہے جو اس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے؟ جو کچھ بندوں کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے اس سے بھی وہ واقف ہے اور اس کی معلومات میں سے کسی چیز کا (کوئی دوسرا) احاطہ نہیں کر سکتا مگر جتنا وہ چاہے اس کی کرسی (حکومت) کی وسعت نے زمین و آسمان کو گھیر رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت سے نہ تھکتا ہے اور نہ اکتاتا ہے۔ وہ بہت بلند اور بہت بڑا ہے۔ (البقرۃ۔۲۵۵)

جاری ہے

اجنبی

ڈاکٹر ایم اے قریشی

حرص اور طمع جب کسی ذہن پر حاوی ہو جائیں تو وہ شخص آدمیت کی معراج سے اتر کر جرائم کی دنیا کا اسیر بن جاتا ہے' پھر وہ نہ تو انسانیت کی زبان کو سمجھتا ہے نہ رشتوں کی خوشبو کو محسوس کرتا ہے بس وہ اپنی ذات کو بچانے اور بڑھانے کے لیے اندھا دھند جرم پر جرم کیے جاتا ہے۔

ایک آشفتہ سر حسینہ کی روداد' اسے اپنے شوہر کے قاتل کی تلاش تھی۔

دولت کی ہوس میں رشتوں کا تقدس پامال کرنے والوں کا فسانہ۔

نئے افق کی روایتوں کا امین' مغربی ادب سے منتخب ناول جسے آپ فراموش نہیں کرسکیں گے۔

وہ چیسٹر نٹ کراس کے زمین دوز پلیٹ فارم پر کھڑا تھا اور میں اسے دیکھتے ہی پہچان گئی تھی کہ وہ وان ہے۔
آج سے ایک سال پہلے جب مجھے اس کے مرنے کی اطلاع ملی تھی تو میرا جسم برف کی طرح منجمد ہو کر رہ گیا تھا اور میرے حواس مفلوج ہو گئے تھے لیکن آج اس پر نظر پڑتے ہی میرے اندر حیات نو کا جوالا مکھی پھر سے دہک اٹھا اور قلب و روح پر جمی ہوئی برف تیزی سے پگھلنے لگی۔ وان کو زندہ پا کر میں پھر سے زندہ ہو گئی۔ میری رگ رگ میں زندگی کی حرارت پھیل گئی تھی۔

لمحہ بہ لمحہ قریب آتی ہوئی ٹرین کی آواز کا ارتعاش میری سماعت سے ٹکرا رہا تھا۔ لوگ تیزی سے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے لیکن میں اس تمام شور و غل سے بے نیاز وان پر نظریں مرکوز کیے کھڑی تھی۔ میرے اندر جذبات کا طوفان سا اٹھنے لگا اور میری حالت عجیب ہونے لگی۔ یوں لگتا تھا جیسے اسٹیشن کی عمارت کسی پھرکی کی طرح گھومنے لگی ہو اور اِدھر اُدھر دیواروں پر چسپاں رنگین پوسٹر بجلی کے کوندے کی طرح مجھ پر لپک رہے ہوں۔ جگمگاتی روشنیوں نے بھی مجھ پر یورش سی کر دی۔ مجھے اپنے وجود کا احساس ہو گیا تھا۔ وان کی طرح میں بھی پھر سے جی اٹھی تھی۔ فرط جذبات سے دل میں ٹیسیں سی اٹھنے لگی تھیں اور میرا جی چاہتا تھا کہ چیخ چیخ کر اپنی مسرت کا اظہار کرنے لگوں لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں تیزی سے وان کی طرف لپکی کہ اسے اپنی بانہوں کی قید میں لے کر جھومنے لگوں۔

میں لوگوں کو دھکیلتی ہوئی تیزی سے اس کی طرف لپکی لیکن اس سے قبل کہ میں اسے چھوتی وہ عجلت سے آگے بڑھ گیا اس خوف سے کہ کہیں وہ ہجوم میں گم نہ ہو جائے۔ میں نے اسے زور سے پکارا مگر میری آواز پلیٹ فارم پر پھیلے ہوئے شور و غل میں دب کر رہ گئی۔ ٹرین پلیٹ فارم میں داخل ہو رہی تھی اور لوگ ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے ٹرین کی طرف بڑھنے لگے تھے۔ پلیٹ فارم پر ایک عجیب سی ہلچل مچی ہوئی تھی۔

اچانک ایک ٹرین جھٹکے سے رک گئی۔ بریکیں چیخ اٹھیں اور ڈبے پٹری پر جم کر رہ گئے۔ روشن ڈبوں میں بیٹھے ہوئے مرد اور عورتیں پلیٹ فارم پر جھانکنے لگے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو گرد و پیش سے بے نیاز اخبارات و رسائل کی ورق گردانی میں مصروف تھے۔ میں نے وان کو نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ ڈبوں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہا تھا اور میں اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ میرے اور اس کے درمیان چار ڈبوں کا فاصلہ تھا۔ وہ پوری طرح میری نظروں کی زد میں تھا۔ وہ بھورے رنگ کی برساتی پہنے ہوئے تھا اور سیاہ گھنے بال بڑی نفاست سے سنورے ہوئے تھے۔ میں جلد از جلد اس تک پہنچنا چاہتی تھی لیکن مسافروں کا ہجوم راہ میں دیوار کی طرح حائل ہو جاتا تھا۔ ہر کسی کو ٹرین میں سوار ہونے کی جلدی تھی۔ سبھی اپنی اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے بے تاب تھے اور میری منزل قریب آ کر بھی مجھ سے دور بھاگ رہی تھی۔

یہ دیکھتے ہوئے کہ فاصلہ یوں کم نہیں ہوگا، میں نے پلیٹ فارم پر دوڑنا شروع کر دیا۔ جو کوئی میرے سامنے آتا میں اسے زور سے اِدھر اُدھر دھکیل کر آگے بڑھ جاتی۔ میرے ہاتھ لوگوں کو راستے سے ہٹاتے ہٹاتے تھک گئے تھے اور آنکھیں مسلسل ارتکاز کے سبب دکھنے لگی تھیں۔ میں اسے دوبارہ نہیں کھونا چاہتی تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر میں چوک گئی تو وہ مجھ سے ایک بار پھر بہت دور چلا جائے گا۔ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ اسی ٹرین میں سوار ہونا چاہتا ہے، اس لیے مجھے یہ اندیشہ بھی تھا کہ اگر وہ کسی ڈبے میں سوار ہو گیا اور مجھے اس ڈبے میں جگہ نہ مل سکی تو میں ایک بار پھر تنہا رہ جاؤں گی اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں ہو سکے گا کہ وقت

کی بے رحم آندھی اسے کہاں اڑا لے گئی ہے؟

اچانک وہ تیزی سے ایک ڈبے میں گم ہوگیا' میرا دل اُچھل کر حلق میں اٹک گیا۔ میں پوری قوت سے لپکی اور اسی ڈبے کے پائیدان پر جا کھڑی ہوئی۔ اسی دم کسی نے مجھے متوجہ کیا۔

"اس ڈبے میں اب کوئی گنجائش نہیں' کوئی دوسرا ڈبہ تلاش کرو۔"

میں ایک بار پھر پلیٹ فارم پر کھڑی تھی اور میری نظریں اس ڈبے کے اندر تک جانے کی کوشش کررہی تھیں' جس میں وان سوار ہوا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ وان اس وقت کہاں ہوگا؟ کیا اس نے مجھے نہیں دیکھا؟ میری آواز نہیں سنی؟ میرا دل کہتا تھا کہ اس نے مجھے ضرور دیکھا ہوگا اور وہ ابھی میرے پاس لوٹ آئے گا' وہ مجھے یوں تنہا چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔

میں انہی خیالات میں گم تھی کہ اچانک مجھے یوں لگا جیسے ٹرین کے دروازے آہستہ آہستہ بند ہونے لگے ہوں' اب سوچنے کا وقت نہیں تھا ایک پل کی تاخیر بھی مجھے وان سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا کرسکتی تھی اور میں اسے کسی قیمت پر بھی دوبارہ نہیں کھونا چاہتی تھی۔ اس سے پہلے کہ تمام دروازے بند ہوجاتے میں بجلی کی سی تیزی سے ٹرین کی طرف لپکی اور لوگوں کو دھکیلتی ہوئی ایک ڈبے میں گھس گئی۔

❁......❁......❁
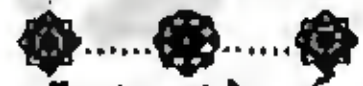
جوں ہی ٹرین کسی اسٹیشن پر ٹھہرتی' میں کھڑکی سے سر نکال کر پلیٹ فارم پر نظریں دوڑانے لگی اور جب ٹرین حرکت میں آتی تو دوبارہ خیالوں میں کھو جاتی آخر میں جب ٹرین کیو پر رکی تو میں تیزی سے نیچے آگئی کیونکہ مجھے یہیں اترنا تھا۔ میں ادھر اُدھر نگاہ دوڑا رہی تھی کہ ایک شخص بہت تیزی سے میرے قریب سے گزر گیا۔ میں نے پیٹ کر دیکھا تو فرط مسرت سے اچھل پڑی وہ وان ہی تھا جو پلیٹ فارم کی زرد زرد روشنیوں میں تیزی سے چلا جارہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو میرے پاؤں پلیٹ فارم پر جم کر رہ گئے لیکن دوسرے ہی لمحے میں اس کے تعاقب میں دوڑنے لگی۔ میں ابھی چند ہی گز دور تھی کہ میرے راستے میں ایک لحیم شحیم عورت حائل ہوگئی۔ میں اس کے بھاری بھرکم سینے سے جاٹکرائی اس نے چیخ کر مجھے زور سے دھکا دیا اور میں لڑکھڑاتی ہوئی دور جا گری لیکن گرتے ہی میں تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور وان کے تعاقب میں دوڑنے لگی۔

پلیٹ فارم سے باہر آئی تو دور دور تک گہری تاریکی مسلط تھی۔ راستے کے دونوں طرف پیڑوں کی اونچی اونچی قطاریں دور تک پھیلتی چلی گئی تھیں۔ شاخوں کے بیچ ہوا دھیرے دھیرے سرسرا رہی تھی۔ وان کے قدموں کی چاپ بہت مدھم ہوگئی تھی' میں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کررہی تھی۔ اسی وقت ایک کار میرے قریب سے گزری تو اس کی ہیڈ لائٹس میں وان کا ہیولا نمایاں ہوگیا۔ میں نے وان کو زور سے پکارا لیکن مجھے خود اپنی ہی آواز کی بازگشت کے سوا کچھ سنائی نہیں دیا۔ میں حیران تھی کہ وہ میری آواز کیوں نہیں سن رہا؟ کیا اسے مجھ سے محبت نہیں رہی؟ وہ مجھ سے اس طرح کیوں بھاگ رہا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ میری نظروں سے پوشیدہ رہنا چاہتا ہو؟ اور اپنی موت کو راز میں رکھنا چاہتا ہو؟ مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ مرچکا ہے لیکن وہ تو زندہ ہے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ اگر وہ مجھ سے پوشیدہ رہنا چاہتا ہے تو کیو میں کیا کرنے آیا ہے؟ میں چونکہ اونچی ایڑی کے سینڈل پہنے ہوئے تھی اس لیے زیادہ تیز نہیں دوڑ سکتی تھی۔ دوڑتے دوڑتے میری پسلیوں میں ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں اور میرے لیے سانس لینا دشوار

ہوتا جارہا تھا۔ میں نے اسے ایک بار پھر پکارا مگر وہ نہیں رکا اور اندھیرے میں ایک طرف مڑ گیا۔

بھاگتے بھاگتے اب میں اس راستے پر آگئی تھی جو گروہاؤس کی طرف جاتا تھا۔ گروہاؤس جہاں میں وان کے ساتھ رہتی آئی تھی۔ وان کے ڈیڈی اور بھائی انتھونی بھی یہیں رہتے تھے میں چونکہ اب بُری طرح ہانپنے لگی تھی اس لیے آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ میں ادھر اُدھر دیکھے بغیر گروہاؤس کی طرف چلی جارہی تھی۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اب میں وان کو کبھی نہیں پاسکوں گی۔ سینے میں درد کی لہریں اٹھنے لگی تھیں اور فرط غم سے آنکھیں آنسوؤں سے تر ہوگئی تھیں۔ آج سے ٹھیک ایک سال پہلے وان کی موت کی خبر نے مجھے مفلوج کرکے رکھ دیا تھا آج اسے دیکھ کر مجھے اپنی زیست کا احساس ہوا تھا لیکن اب یہی احساس میری رگ رگ سے لہو نچوڑ رہا تھا۔ پارک کے گیٹ کے نزدیک پہنچ کر اچانک مجھے خیال آیا کہ ممکن ہے مجھے غلط فہمی ہوئی ہو۔ میں نے کسی اور کو وان سمجھ لیا ہو؟ وان کی موت محض ایک مفروضہ نہیں تھا اٹلی کے شہر میلان میں جب اس کے مکان میں آگ بھڑک اٹھی تھی وہ اس میں جل کر راکھ ہوگیا تھا اگرچہ اس کی لاش نہیں مل سکی تھی لیکن ایک نہیں چار آدمیوں نے اس بات کی تصدیق کی تھی کہ آتشزدگی کے وقت وان اپنے کمرے میں موجود تھا۔

اچانک بادل چھٹنے لگے اور زرد زرد چاندنی ہر سو پھیلنے لگی میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو ایک بار پھر حیرت زدہ رہ گئی۔ وہی شخص دروازے کی طرف منہ کیے کھڑا تھا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں تیزی سے بڑھی اور اس کے قریب پہنچ کر پوچھنے ہی والی تھی کہ کسی نے دروازہ کھول دیا کمرے سے باہر آتی ہوئی روشنی نے اس شخص کا ایک ایک نقش نمایاں کردیا تھا۔ نہیں وہ وان نہیں تھا وہ کوئی اجنبی تھا۔

وہ اجنبی تھا لیکن دور سے وان ہی دکھائی دیتا تھا اس کے بال وان کے بالوں جیسے ہی تھے اور انہیں اسی کے انداز میں بڑی نفاست سے سنوارا گیا تھا۔ اس کا چہرہ وان کے چہرے سے ذرا مختلف تھا۔ یہ فرق ٹھوڑی اور پیشانی میں زیادہ نمایاں تھا آنکھیں وان کی آنکھوں سے زیادہ روشن اور تیکھی تھیں۔ ایسی آنکھیں جو سیدھی دیکھنے والے کے دل میں اتر جاتی ہیں وہ میری طرف بڑی غور سے دیکھ رہا تھا اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرا وجود لحظہ بہ لحظہ پگھلتا جارہا ہو۔

جس ملازمہ نے دروازہ کھولا تھا وہ ہم دونوں کی طرف عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی شاید وہ سمجھ رہی تھی کہ میں اس شخص کو اپنے ساتھ لائی ہوں پھر وہ ہم دونوں کو وہیں چھوڑ کر واپس چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں اس اجنبی سے کچھ پوچھنے ہی والی تھی کہ وہ بول اٹھا۔

''مجھے مائیکل کیڈ کہتے ہیں۔'' اس نے مہذبانہ لہجے میں کہا اس کی آواز خاصی پرکشش تھی۔

''اور مجھے ایمنڈا ہر کورٹ کہتے ہیں۔'' میں نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ مجھے دراصل اپنی آواز کے زیروبم پر قابو نہیں رہا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ میرا وجود ریزہ ریزہ ہوگیا تھا اور جذبات کانٹوں پر کھینچے گئے کپڑے کی طرح تار تار ہوکر رہ گئے تھے۔

''آپ غالباً وان کی بیوہ ہیں۔'' اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''آپ حیران تو ہوئی ہوں گی کہ میں نے آپ کو کیسے پہچان لیا دراصل میں نے وان کے پاس آپ کی چند تصویریں دیکھی تھیں میرے متعلق وان نے آپ کو بتایا ہوگا۔''

مجھے یاد آیا کہ وان نے میلان سے لکھا تھا کہ کسی ماہر آثار قدیمہ نے اس کے ساتھ تعاون کا وعدہ کیا ہے اور وہ شخص مقامی یونیورسٹی میں پروفیسر ہے لیکن اس

نے یہ نہیں لکھا تھا کہ پروفیسر کا نام مائیکل کیڈ ہے میرا خیال تھا کہ وہ شخص بھی میرے سسر کی طرح کوئی بوڑھا ہوگا لیکن یہ شخص تو......

"وان...... ہاں وان اپنے خطوط میں اکثر آپ کا ذکر کیا کرتا تھا۔" میں نے کہا۔ "معذرت چاہتی ہوں کہ مجھے آپ کا نام یاد نہیں رہا تھا لیکن......"

"لیکن...... لیکن کیا؟" وہ حیرت بھری آواز میں بولا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے اپنے اضطراب پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "اندر تشریف لے چلیے۔"

میں دراصل یہ بھول ہی گئی تھی کہ کسی اجنبی شخص سے مخاطب ہوں۔ میں اسے سب کچھ بتا دینا چاہتی تھی کہ پلیٹ فارم سے لے کر یہاں تک مجھ پر کیسی قیامت خیز ساعتیں گزری ہیں' میں اسے ایک بار پھر وان ہی سمجھ بیٹھی تھی۔

"میری وجہ سے آپ پریشان تو نہیں ہیں؟" اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ اس نے شاید اضطراری کیفیت کا اندازہ لگا لیا تھا جب ہم کمرے میں داخل ہوئے تو ٹیبل لیمپ کے سوا کمرے کی تمام بتیاں بجھی ہوئی تھیں' کھڑکیوں کے پردے ہٹا دیئے گئے تھے اور رات کی سیاہی شیشوں کو چیرتی ہوئی کمرے میں در آئی تھی۔ میں اپنی برساتی اتارنا چاہتی تھی کہ مائیکل آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

"لائیے میں اتار دوں۔" اس کے ہاتھ میری شانوں کو چھونے لگے۔

میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ مجھے وان ہی کی طرح لگا' اس کے ہاتھ بھی وان کے ہاتھوں کی طرح مضبوط مگر بے حد نرم تھے۔ میں دوسری بتیاں روشن کرنے کی غرض سے آگے بڑھی تو اس نے میرا راستہ روک لیا اور ملائمت آمیز لہجے میں بولا۔

"بس یہی لائٹ کافی ہے' مجھے نیم روشن کمرے زیادہ اچھے لگتے ہیں۔ اس قسم کی فضا میں مجھے عجیب سا سکون ملتا ہے۔"

میں بیٹھ گئی اور اپنے سامنے بیٹھے ہوئے اس اجنبی شخص کو غور سے دیکھنے لگی۔ اس کی عمر وان سے کچھ زیادہ تھی' آنکھوں کے گوشوں پر ہلکی ہلکی جھریاں ابھر آئی تھیں اور بالوں میں کہیں کہیں سفیدی سی جھانکتی معلوم ہوتی تھی۔

"میرا خیال ہے مجھے اپنی آمد کا مقصد بیان کر دینا چاہیے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔ "میں دراصل آپ کے...... میرا مطلب ہے وان کے ڈیڈی سے ملنے آیا ہوں۔" مائیکل نے آہستہ سے کہا۔ "چاہیے تو یہ تھا کہ میں اپنی آمد سے پہلے آپ لوگوں کو آگاہ کر دیتا لیکن نہ جانے کیوں میں نے اسے ضروری نہیں سمجھا۔ میں آج دوپہر ہی لندن پہنچا تھا اور ارادہ یہ تھا کہ کل یہاں آؤں گا لیکن پھر خیال آیا کہ کل کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔" وہ یک لخت رک گیا۔ لگتا تھا اسے شاید اپنی کسی غلطی کا احساس ہو گیا ہے' میری نظریں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ میں نے اسے ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا اور اس کے بولنے کا انتظار کرتی رہی اگرچہ میرا اضطراب خاصا کم ہو گیا تھا اور میں خود کو خاصا پرسکون محسوس کر رہی تھی لیکن اس کے باوجود میرے دل میں جذبات کا تلاطم ابھی تک باقی تھا۔

"معاف کیجیے گا۔" وہ ندامت آمیز انداز میں مسکرایا۔ "ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا؟"

"آپ کہہ رہے تھے کہ آپ کو وان کے ڈیڈی سے ملنا تھا۔" میں نے اسے یاد دلایا۔ "لیکن افسوس کہ وہ گھر پر نہیں ہیں' وہ اپنے دوسرے بیٹے یعنی وان کے بھائی انتھونی کے ساتھ ڈیون گئے ہوئے ہیں۔ ہفتے کے آخری دو روز وہ ہمیشہ گھر سے باہر گزارا کرتے ہیں۔"

"اچھا...... ہاں انتھونی۔" لگتا تھا وہ ایک بار پھر اپنے ہی خیالوں میں کھو گیا ہے۔

"آپ انتھونی سے واقف ہیں؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"جی ہاں، میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔" اس نے یہ بات کچھ اس انداز میں کہی تھی جیسے انتھونی کے نام سے اسے چڑ ہو یا انتھونی کا نام اسے گراں گزرا ہو۔ "لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ مجھ سے ملنا پسند فرمائیں گے بھی یا نہیں؟ خیر چھوڑیئے اس بات کو یہ بتائیے کہ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میری طبیعت ناساز ہے؟"

"جب میں نے آپ کو پہلی بار دیکھا تھا تو مجھے یوں لگا جیسے آپ کسی گہرے صدمے کی زد میں ہیں اور جب میں نے ذرا غور سے آپ کے چہرے کا جائزہ لیا تو مجھے یوں محسوس ہوا...... یوں محسوس ہوا جیسے آپ مجھے کوئی دوسری شخصیت سمجھ بیٹھی تھیں، میرا مطلب ہے مجھے دیکھ کر آپ کو دھچکا سا لگا' کیوں کہ میں وہ نہیں تھا جو آپ سمجھ رہی تھیں۔"

میں نے شیمپئن کا گلاس تیزی سے میز پر رکھ دیا کیونکہ مائیکل کی بات سن کر میرے ہاتھ بُری طرح کانپنے لگے تھے اور میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ میری اس کمزوری کو بھانپ لے۔

"مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ راستے میں کسی جگہ آپ نے مجھے وان کہہ کر بھی آواز دی تھی۔" وہ دھیمی آواز میں بولا۔ "میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" میں نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ "دور سے مجھے آپ پر وان ہی کا دھوکا ہوا تھا آپ دونوں میں بلا کی مشابہت ہے۔"

"یہ بات تو ہے۔" مائیکل بولا۔ "جب ہم دونوں ایک ساتھ کام کر رہے ہوتے تھے تو اکثر لوگ دھوکا کھا جاتے تھے۔ کبھی وان کو مائیکل اور مائیکل کو وان سمجھ لیتے تھے۔" وہ دم بھر کو رکا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "بہر حال مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے آپ کو یہ صدمہ اٹھانا پڑا۔"

"میں جانتی ہوں کہ وان مر چکا ہے۔" میں نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ "مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ جب اس کے کمرے میں آگ بھڑک اٹھی تو وہ کمرے ہی میں تھا اور اس کے بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا انتھونی نے مجھے یہی بتایا تھا۔"

"یہ خبر آپ کو صرف انتھونی نے سنائی تھی؟"

میں نے جواب دینے کی کوشش کی لیکن فرط جذبات سے میرا گلا رندھ گیا اور دل میں درد کی ایسی تیز ٹیس اٹھی کہ مجھے اپنی سانسیں گھٹتی ہوئی محسوس ہونے لگیں پھر جوں ہی یہ ٹیس مدھم ہوئی میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"صبر سے کام لیجیے مسز وان!" وہ مجھے دلاسہ دیتے ہوئے بولا۔ "جو ہونا تھا ہو چکا اب آپ کو صبر اور حوصلے سے جینا ہوگا۔ مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے آپ کو یہ دکھ پہنچا' مجھے آپ کا غم تازہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میرا خیال ہے میں نے آپ کو بہت آزردہ کر دیا ہے اس لیے مجھے واپس چلے جانا چاہیے۔ میں مسٹر کورٹ سے پھر مل لوں گا۔" یہ کہتے ہوئے وہ کھڑا ہو گیا۔

"ابھی مت جائیے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "مجھ سے باتیں کیجیے' وان کے بارے میں نہیں صرف اپنے بارے میں۔ میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ لندن میں آپ کی مصروفیات کیا ہیں؟" اس نے آبدیدہ آنکھوں کی طرح دیکھا اور میرے کرب کا اندازہ کرتے ہوئے بولا۔

"انکار کر کے میں آپ کو مزید دکھ پہنچانا نہیں چاہتا۔"

اس کے بیٹھتے ہی میں بھی اپنی کرسی میں دھنس گئی۔

"میرے اندازے کے برعکس آپ کی عمر خاصی کم ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "کچھ دیر پہلے میں نے جان بوجھ کر یہ جھوٹ بولا تھا کہ میں نے آپ کی تصویریں دیکھی تھیں' حقیقت یہ ہے کہ میں نے آپ کی ایک تصویر بھی نہیں دیکھی البتہ وان آپ کے متعلق بہت سی باتیں کیا کرتا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ میری بیوی حسن و جمال کا نمونہ ہے خاص طور پر وہ آپ کی آنکھوں کی بہت تعریف کیا کرتا تھا۔ کہتا تھا میری بیوی کی آنکھیں بنفشی ہیں' میرا خیال تھا کہ وان شاید مبالغہ آرائی سے کام لیتا ہے لیکن آج پتا چلا کہ وہ مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیتا تھا بلکہ اس قسم کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں' ابھی آپ نے کہا تھا کہ اپنے شوہر کے متعلق کوئی بات نہیں کرنا چاہتیں لیکن میں تو......"

"اس وقت میں بے حد جذباتی ہو رہی تھی' صدمے کے باعث مجھ میں تاب شنیدن نہیں ہو رہی تھی۔ مجھے دراصل ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔"

"کیا آپ سنجیدگی سے کہہ رہی ہیں؟"

"ہاں۔" میں نے ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "پہلے ہی بہت تاخیر ہو چکی ہے' آپ وان کے متعلق جو کچھ بھی کہنا چاہتے ہیں۔ بے جھجک کہہ دیں کاش مجھے پہلے ہی سب کچھ بتا دیا گیا ہوتا۔" جواب میں وہ دیر تک میری طرف دیکھتا رہا اور پھر بڑے ہی نرم لہجے میں بولا۔

"آپ کو وان سے بہت محبت تھی؟"

"یہ آپ نے کیا پوچھ لیا؟" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "سچ تو یہ ہے کہ مجھے آج تک یہ اندازہ نہیں ہوا کہ مجھے اپنے شوہر سے کتنی محبت تھی؟ میرا خیال ہے دنیا میں ایسے کسی پیمانے کا وجود نہیں جو محبت کا احاطہ کر سکے۔ شادی کے وقت میں اٹھارہ برس کی تھی' انتھونی کا دعویٰ ہے کہ......"

"قطع کلامی کی معافی چاہتا ہوں۔" مائیکل کا لہجہ قدرے سخت ہو گیا۔ "میں انتھونی کو جانتا ہوں' مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس نے آپ کے متعلق بتایا تھا کہ شادی کے وقت آپ ذہنی اعتبار سے بالغ نہیں تھیں۔ ایک ماہر نفسیات کی حیثیت سے اس نے مجھے یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ اپنے شوہر کی موت پر آپ کو محض ایک سطحی سا صدمہ پہنچا تھا ویسے میں سمجھتا ہوں کہ اس کا اندازہ درست نہیں تھا۔ محبت کی طرح درد بھی احاطۂ پیمائش سے بالاتر جذبہ ہے۔"

میں نے آنکھیں بند کر لیں' انتھونی نے مجھ سے یہی بات کہی تھی جسے مائیکل دہرا رہا تھا۔ مجھے انتھونی کی ذہنیت پر غصہ آنے لگا' اسے یہ حق کس نے دیا تھا کہ وہ اپنے اور بیگانوں کے درمیان میرے جذبوں کا تمسخر اڑاتا پھرے؟

"معاف کیجیے گا۔" مائیکل نے تاسف آمیز لہجے میں کہا۔ "میں نے جو کچھ کہا۔ اس میں میرے دل کا کھوٹ یا ارادے کی کدورت شامل نہیں۔ میں نے محض انتھونی کا بیان دہرایا ہے' میں آپ کو حقائق بتانے آیا ہوں۔ اس سچ سے آگاہ کرنے آیا ہوں جو میرے سینے میں آگ کی طرح سلگ رہا ہے' کیا آپ وہ حقیقت جاننا چاہتی ہیں؟"

"کیوں نہیں۔" میں نے بے تابی سے کہا۔ "میں حقیقت جاننا چاہتی ہوں۔"

"تو پھر سنئے۔" اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں لندن اس یقین سے آیا ہوں کہ وان کی موت محض اتفاقی حادثہ نہیں تھی بلکہ اسے قتل کیا گیا تھا۔"

"قتل...... اُف میرے خدا۔" مجھے اپنا جسم ٹھنڈے ٹھنڈے پسینے میں بھیگتا محسوس ہونے لگا۔

❁......❁......❁

میری دونوں سانسوں کا درمیانی فاصلہ طویل ہو کر

حشر تک پھیلتا چلا گیا۔ میرے ہاتھ غیر اختیاری طور پر اپنے لبوں تک پہنچ گئے اور میرے ہونٹ، میری انگلیوں کی برف کو محسوس کررہے تھے۔ میرا پورا وجود برف کی طرح منجمد ہوتا جارہا تھا۔

"مجھے افسوس ہوا مسز ایمینڈا!" مائیکل بولا۔ "مجھے یقین ہے کہ آپ کے شوہر کو قتل کیا گیا ہے لیکن اس یقین کی حد میرے دل و دماغ تک ہے۔ فی الوقت میں اسے ثابت نہیں کرسکتا یہ بھی ممکن ہے مجھے محض دھوکا ہی ہوا ہو۔"

میں اس کی طرف غیر یقینی انداز سے دیکھ رہی تھی، آج سے ایک برس پیشتر جب مجھے وان کی موت کی اطلاع دی گئی تھی تو میرا دل بھی نہیں مان رہا تھا۔ میں بار بار ایک ہی فقرہ دہرا رہی تھی۔

"آخر کیوں...... وہ کیسے مر گیا؟" لیکن کسی نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا تھا اور اب ایک اجنبی ایک انکشاف لے کر وارد ہوا تھا لیکن قتل کے متعلق تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

"مجھے اسی وقت پتا چل گیا تھا کہ آپ کے شوہر کو قتل کیا گیا ہے لیکن میں یہاں آنے یا نہ آنے کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کرسکا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے انکشاف سے بہت سے لوگ مشکل میں گرفتار ہوجائیں گے۔ سب کچھ الٹ پلٹ ہو کر رہ جائے گا کیونکہ سچ کسی بھونچال کی طرح ہوتا ہے جو جھوٹ پر استوار کی گئی بنیادیں اکھاڑ کر رکھ دیتا ہے لیکن وقت کے ساتھ میرے ضمیر کی آواز بلند ہوتی گئی اور مجھے یہاں آنے پر مجبور کرتی رہی۔" وہ اٹھا اور ٹیبل لیمپ کے قریب جا کھڑا ہوا اس کی پشت میری جانب تھی۔

"آخر میں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ مجھے سچ کا گلا نہیں گھونٹنا چاہیے۔" اس نے دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا۔ "میں اب بھی یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وان کو قتل کیا گیا تھا ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت آپ کا شوہر میرا بہت اچھا دوست تھا۔ میں اس کے مزاج سے اچھی طرح آگاہ تھا بلاشبہ وہ شریف النفس اور بے ضرر انسان تھا جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اس نے کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس واردات کو انتقامی کارروائی نہیں سمجھتا، میں انتقام کا قائل نہیں ہوں بلکہ صرف یہ چاہتا ہوں کہ جس کسی نے اسے قتل کیا ہے، اسے اپنے کیے کی سزا ضرور ملنی چاہیے۔"

"آخر آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ وان کو عمداً قتل کیا گیا ہے، اس واردات کا کوئی محرک تو ہونا چاہیے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "مجھے بتایا گیا تھا کہ میرے شوہر کی لاش بھی نہیں ملی تھی۔"

"یہ تو آپ بھی جانتی ہوں گی کہ اپنے باپ مسٹر کورٹ کی طرح وان کو بھی اٹراسکن تہذیب و تمدن سے گہری دلچسپی تھی۔" مائیکل نے کہا۔ "جب ہم اٹلی میں کھدائی کررہے تھے تو وان کے ہاتھ ایک جڑاؤ پن لگی جو اٹراسکن قوم کی ہنر مندی کا بے نظیر نمونہ تھی۔ وان اسے ہر وقت اپنی دسترس میں رکھتا تھا، اس کی موت کے بعد یہ جڑاؤ پن اس کے کمرے سے غائب پائی گئی اور یہیں سے میرے دل میں یہ شک پیدا ہوا کہ وان کو محض اس جڑاؤ پن کے لیے قتل کیا گیا ہے۔"

"مجھے افسوس ہے میں نے اپنا بیان ٹھیک جگہ سے شروع نہیں کیا۔" وہ مسکراتا ہوا میرے قریب آگیا۔ "اس طرح سب کچھ گڈمڈ ہوجائے گا۔ کہانی دراصل وہاں سے شروع ہوتی ہے جب آپ کے شوہر نے مجھے بلوایا تھا، یہ آج سے دو برس پہلے کی بات ہے۔ میں ان دنوں میلان تھا، اٹراسکن کلچر میرا محبوب موضوع رہا ہے۔ ان دنوں میں اسی موضوع پر لیکچر دے رہا تھا، ہر کورٹ کا نام پڑھتے ہی میں فرط مسرت سے جھوم اٹھا تھا۔

میں دراصل یہ سمجھا تھا کہ مجھے مسٹر ڈی جے ہر کورٹ نے بلوایا ہے اسی لیے میں بہت خوش تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں مسٹر ڈی جے ہر کورٹ کا بہت مداح تھا۔ اٹرا سکن کلچر پر ان کی رائے استناد کا درجہ رکھتی تھی علاوہ ازیں میں نے ان کی متعدد کتابیں بھی پڑھ رکھی ہیں لیکن جب میں وان سے ملا تو پتا چلا ڈی جے ہر کورٹ تو اس کے ڈیڈی کا نام ہے بہر حال وان بھی کم دلچسپ شخصیت نہ تھی۔ اس نے جب مجھے یہ بتایا کہ وہ نئے سرے سے کھدائی شروع کرنا چاہتا ہے تا کہ اٹرا سکن قوم کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلوم جمع کر سکے تو یقین جانیے کہ میں بہت خوش ہوا۔ وہ مجھے بطور مشیر اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا لیکن اصل مسئلہ سرمائے کی فراہمی تھا۔"

مائیکل کی بات درست تھی مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ ابتدا میں تو وان کے ڈیڈی نے سرمائے کی فراہمی کا وعدہ کیا تھا لیکن جب انہیں یہ پتا چلا کہ وان ان کے نظریات کا مخالف ہے اور اٹرا سکن تہذیب و تمدن کے متعلق ان کے نظریات کو باطل ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے تو انہوں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ دراصل وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ ان کا اپنا ہی بیٹا ان کی برسوں کی محنت اور شہرت کو خاک میں ملا دے۔ بعد ازاں وان نے مختلف عجائب گھروں سے اعانت طلب کی لیکن اس کے ڈیڈی نے یہ بھی راہ مسدود کر دی تھی۔

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ کچھ عرصے کے لیے ہم نے اپنا پروگرام ملتوی کر دیا اس لیے کہ فوری طور پر سرمائے کی فراہمی کا دشوار مرحلہ درپیش تھا۔ ان دنوں ہم اس مسلمہ نظریے کے تحت کام کر رہے تھے کہ اٹرا سکن قوم نے بھی بہت کچھ یونان سے سیکھا تھا۔ ان کے تمام علوم و فنون یونانی علوم و فنون کا پرتو تھے۔ یہاں تک کہ چھٹی صدی تک وہ بھی محض مقلد اور نقال ہی سمجھے جاتے رہے اور پھر یوں ہوا کہ جب ہم نے کھدائی کا ارادہ ملتوی کر دیا تو اسی وقت گرین نمودار ہوا۔" مائیکل نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"گرین..... کون گرین؟"

"وان نے آپ سے گرین کا ذکر نہیں کیا تھا؟"

"جہاں تک مجھے یاد ہے وان نے کبھی ذکر نہیں کیا تھا۔"

"اس شخص کا پورا نام گرین وٹن ہے۔" مائیکل نے کہنا شروع کیا۔ "وہ اس طرح اچانک نمودار ہوا تھا جیسے صاف شفاف آسمان پر یک لخت بادل گھر آئیں۔ اس کا تعلق امریکا سے ہے اور بہت دولت مند ہے۔ وہ وان سے پیرس میں ملا۔ ان دنوں وان اٹلی جا چکا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اسے ہمارے پروگرام کی کیسے خبر ہو گئی تھی۔ اس نے سرمائے کی فراہمی کا وعدہ کر لیا اور وان کے بقول تمام تمام شرائط پر آمادگی کا اظہار کر دیا لیکن وہ کسی شرط کو تحریری شکل دینے سے گریزاں تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ کھدائی کے ہر مرحلے کو اخفا میں رکھنا چاہتا تھا۔ اس کی یہ شرط ہماری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ معاہدے کو تحریری شکل دینے سے گریز کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ اس کی نیت صاف نہیں ہے۔ میں نے وان کو سمجھانے کی کوشش کی مجھے اس شخص کی نیت میں فتور دکھائی دیتا ہے لیکن اس کا موقف یہ تھا کہ وہ گرین کو سنبھال لے گا اور یہی ہماری غلطی تھی۔"

وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گیا تھا جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"اگر آپ برا نہ منائیں تو میں آپ سے چند سوالات پوچھنا چاہتا ہوں۔" اس نے جھجکتے ہوئے بات شروع کی۔ "مسٹر ڈی جے ہر کورٹ سے ملاقات کرنے سے پہلے میں چند ایک باتوں کی وضاحت چاہتا

ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کس قسم کے انسان ہیں' اس کے ساتھ ساتھ مجھے یہ معلوم ہے کہ وہ ایک اجنبی شخص کا اعتبار نہیں کریں گے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرلیں کہ ان کے بیٹے کو عمداً قتل کیا گیا تھا۔"

"آپ کیا جاننا چاہتے ہیں؟" میں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"جب ہم نے اٹلی میں کھدائی کا آغاز کیا تو وان کا بھائی انتھونی بھی وہاں آپہنچا تھا۔" مائیکل نے کہنا شروع کیا۔ "مجھے یقین ہے کہ اس سے پہلے وہ گرین سے کبھی نہیں ملا تھا لیکن حیرت انگیز بات یہ بھی کہ وہ دونوں اتنی جلدی گھل مل گئے جیسے دونوں کے درمیان برسوں کا یارانہ ہو۔ میں آپ سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ انتھونی وہاں کس مقصد سے گیا تھا؟"

"میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔" میں نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ "نہ تو انتھونی نے مجھے اس بارے میں کچھ بتایا ہے اور نہ ہی اس کے باپ نے اس سلسلے میں کبھی کوئی بات کی ہے۔ ممکن ہے وان نے اسے خود وہاں آنے کی دعوت دی ہو؟ اس مقصد کے تحت کہ شاید وہ وان کا ہاتھ بٹا سکے۔"

"مجھے یقین ہے کہ انتھونی نے بھی آپ سے کبھی گرین کا ذکر نہیں کیا ہوگا میرا مطلب ہے کھدائی کے آغاز سے پہلے۔"

"میں انتھونی کے بہت سے دوستوں سے اب تک واقف نہیں ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "واقفیت تو بعد کی بات ہے' میں نے ان کے نام بھی نہیں سنے۔"

"ایک بات اور......" مائیکل نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا یہ ممکن نہیں کہ انتھونی کو اس کے ڈیڈی یعنی مسٹر وی۔ جے ہرکورٹ نے اٹلی بھیجا ہو کہ وہ کھدائی کے متعلق انہیں معلومات فراہم کرتا رہے؟"

"ہوسکتا ہے۔" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔" مائیکل بولا۔ "اگر یہ ثابت ہوجائے کہ انتھونی کو مسٹر کورٹ نے اٹلی بھیجا تھا تو میرا کام بہت آسان ہوسکتا ہے۔ یاد آیا میں ایک بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ مجھے مسٹر کورٹ کی نیت پر شبہ نہیں اور نہ ہی میں یہ تسلیم کرسکتا ہوں کہ انہوں نے خود ہی اپنے بیٹے کو قتل کرایا ہے' ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ کھدائی کے دوران' ہمیں ایسی بہت سی اشیا ملیں جن سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ اٹراسکن محض مقلد ہی نہ تھے بلکہ ان کے فن میں انفرادیت بھی تھی' ان کی صناعی میں یونانی اثرات کا شائبہ بھی شامل تھا' کیا آپ جانتی ہیں کہ یہ جڑاؤ پن کس قسم کی تھی؟ وان نے آپ کو خط میں بتایا تو ہوگا؟"

"ہاں' وان نے اس کا ذکر بڑے فخر سے کیا تھا۔"

"یہ جڑاؤ پن خالص سونے کی تھی اور اس کا ڈیزائن بھی منفرد تھا' اہل یونان کے ہاں ایسی جڑاؤ پن کا ثبوت نہیں ملتا۔"

"لیکن وان نے تو اپنے خط میں یہ نہیں بتایا تھا کہ یہ جڑاؤ پن خالص سونے سے بنائی گئی تھی اور نہ ہی اس نے اس کے ڈیزائن کا ذکر کیا تھا۔ اس نے تو صرف اتنا ہی لکھا تھا کہ کھدائی کے دوران اس کے ہاتھ ایک ایسی نادر شے لگی ہے جو تاریخی نظریات کا دھارا موڑ کے رکھ دے گی۔" مائیکل سر جھکائے میری باتیں سنتا رہا مگر بولا کچھ نہیں۔

"کیا وہ جڑاؤ پن اب آپ کے قبضے میں ہے؟"

"جی نہیں۔" مائیکل نے میری طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ نے جو کچھ کہا ہے اس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ آپ کو میری باتوں پر یقین نہیں آیا۔ یہ کوئی غیر متوقع بات نہیں ہے' اسی لیے میں یہاں نہیں

آنا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ مجھ سے ثبوت طلب کیا جائے گا اور میرے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے۔"
"ممکن ہے وان کے آفس میں کوئی ایسی دستاویز موجود ہو جس سے آپ کو کچھ مدد مل سکے۔" میں نے کہا۔ "آپ کو آفس کی تلاشی ضرور لینی چاہیے تھی۔"
"ہم نے کوئی آفس وغیرہ نہیں بنایا تھا۔" مائیکل بولا۔ "وہ اپنی تمام اشیا اپنے کمرے ہی میں رکھتا تھا مگر آگ میں ہر شے راکھ بن کے رہ گئی تھی۔"
"وان نے چند ایک دستاویزات مجھے بھیجی تھیں لیکن خالص ٹیکنیکل نوعیت کی تھیں اس لیے میں نے وہ وان کے ڈیڈی کو دے دی تھیں۔" میں نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔
"یہ دستاویزات انہوں نے خود طلب کی تھیں یا تم نے اپنی مرضی سے دی تھیں؟"
"انہوں نے خود مانگی تھیں۔"
"وان کے ڈیڈی نے جڑاؤ پن کا کبھی ذکر کیا؟"
"نہیں۔" میں نے قدرے حیرت سے جواب دیا۔
"اور انتھونی نے بھی کچھ نہیں بتایا؟" مائیکل نے سوالیہ انداز سے پوچھا۔
"اس نے بھی کچھ نہیں بتایا۔"
"حقیقت یہ ہے کہ انتھونی کو سب کچھ معلوم ہے۔" مائیکل نے کہنا شروع کیا۔ "جس روز جڑاؤ پن برآمد ہوئی تھی انتھونی وہاں موجود تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ کوئی ماہر آثار قدیمہ نہیں ہے لیکن اس کے باوجود وہ اس جڑاؤ پن کی قدر و قیمت اور تہذیبی اہمیت سے اچھی طرح آگاہ ہے لہٰذا اس حقیقت کو ایک اور پہلو سے دیکھیے' جس روز ہمیں جڑاؤ پن ملی ہے اس سے اگلے ہی روز ایک شخص آپ کے شوہر سے ملتا ہے اور اس جڑاؤ پن کو خریدنے کا ارادہ ظاہر کرتا ہے۔ علاوہ ازیں اس امر پر بھی بضد رہا کہ وہ اپنا نام پتا بھی نہیں بتانا چاہتا۔ میں اور وان حیران رہ جاتے ہیں کہ اس شخص کو جڑاؤ پن کا علم کیسے ہوا کیونکہ اس کا علم صرف مجھے' وان' گرین اور انتھونی ہی کو تھا۔"
"آپ غالباً یہ کہنا چاہتے ہیں جڑاؤ پن کی خبر گرین یا انتھونی کی زبانی باہر تک پہنچی تھی۔"
"بالکل ٹھیک سمجھا آپ نے۔" مائیکل نے تیزی سے جواب دیا۔
"اور اس شخص نے جڑاؤ پن کی کیا قیمت لگائی تھی؟"
"ڈھائی لاکھ پاؤنڈ۔" مائیکل نے جواب دیا۔
"ڈھائی لاکھ پاؤنڈ؟" میں نے حیرت زدہ آواز میں کہا۔ "وہ کسی عجائب گھر کا نمائندہ تو نہیں تھا؟"
"وہ کسی عجائب گھر کی طرف سے نہیں آیا تھا۔" مائیکل نے جواب دیا۔ "جب ہم نے اس سے پوچھا کہ وہ جڑاؤ پن کیوں خریدنا چاہتا ہے تو اس نے جواب دیا کہ اسے نوادرات جمع کرنے کا شوق ہے۔ جب ہم نے اس سے اس کا نام پوچھا تو کہنے لگا کہ "میں معذرت چاہتا ہوں میں اپنا نام نہیں بتا سکتا۔" لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اسے جڑاؤ پن کا علم کیسے ہوا؟ مجھے گرین پر شبہ تھا کیونکہ میں نے شروع ہی میں وان سے کہہ دیا تھا' کوئی قابل اعتبار شخص نہیں ہے۔ میرے خیال میں گرین ایک ایسا شخص ہے جو نوادرات کا ناجائز بیوپار کرتا ہے کیوں کہ جو لوگ کسی لکھت پڑھت کے بغیر نوادرات خریدتے ہیں ان کی نیت میں فتور ہوتا ہے۔ القصہ مختصر جڑاؤ پن کا خریدار ہمارے سامنے موجود تھا مگر وان اسے کسی قیمت پر فروخت کرنے پر رضامند نہیں تھا۔ دوسری طرف گرین کا اصرار تھا کہ اسے فروخت کر دیا جائے اور انتھونی اس کی حمایت کر رہا تھا۔"

"میرے خیال میں وان کو یہ حق پہنچتا تھا کہ وہ جڑاؤ پن کو فروخت کرے یا نہ کرے۔" میں نے مائیکل کی رائے یہ معلوم کرنا چاہی۔

"جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں ہمارے اور گرین کے درمیان ایسا کوئی تحریری معاہدہ نہیں ہوا تھا۔" مائیکل نے جواب دیا۔ "لیکن گرین اپنا حق اس لیے جتا رہا تھا کہ سرمایہ اس نے فراہم کیا تھا۔ وان نے ضد میں آ کر یہ کہہ دیا تھا کہ وہ کھدائی بند کر دے گا۔ اسے اپنے نظریے کے لیے ثبوت مل گیا تھا اور یہی اس کا مقصود بھی تھا، اس پر گرین نے قانونی کارروائی کی دھمکی دے ڈالی۔"

"اور یہ جڑاؤ پن کس کے قبضے میں تھی؟" میں نے پوچھا۔

"آپ کے شوہر کے قبضے میں۔" مائیکل نے سگریٹ سلگاتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ جڑاؤ پن ہمیں منگل کی صبح کو ملی تھی، اسی روز دوپہر کو ہمیں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اس چھوٹے سے زیور کی تاریخی اہمیت کیا ہے اور یہ ایک گم شدہ تہذیب کا کتنا بڑا ورثہ ہے۔ رات کو یہ جڑاؤ پن وان کے پاس تھی، اگلے روز جب وہی خریدار دوبارہ آیا تو سب کچھ جل کر راکھ ہو چکا تھا۔"

میں کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی کیونکہ بیٹھے بیٹھے میرا جسم درد کرنے لگا تھا۔

"مجھے یاد نہیں رہا یہ جڑاؤ پن کس دھات سے بنائی گئی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"خالص سونے سے۔" مائیکل نے جواب دیا۔

"اور آپ نے ابھی یہ کہا ہے کہ سب کچھ جل کر راکھ ہو چکا تھا۔"

"میں سمجھتا ہوں آپ کیا کہنا چاہتی ہیں۔" مائیکل میرے قریب آتے ہوئے بولا۔ "یاد رکھیے سونا اتنی جلدی نہیں پگھلا کرتا جیسا کہ آپ سمجھ رہی ہیں لیکن اس کے باوجود میں نے اپنے اطمینان کی خاطر آتش زدہ مکان میں راکھ میں بھی جڑاؤ پن تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جڑاؤ پن کسی دوسرے شخص کے قبضے میں چلی گئی تھی۔ یہ دوسرا شخص کون تھا؟ یہ سوال میرے ذہن کو شب و روز پریشان کرتا رہا اور آخر گزشتہ ماہ یہ معمہ بھی حل ہو گیا۔"

"آپ کا مطلب ہے جڑاؤ پن کا سراغ مل گیا؟"

"ہاں گزشتہ ماہ میں روم میں تھا کہ ایک وکیل سے ملاقات ہوئی وہ ایک امیر ترین شخص کا قانونی مشیر تھا اور اس کی جائیداد کی قانونی دستاویزات تیار کرنے میں مصروف تھا۔ اس امیر ترین شخص کا نام پدیالو ہے اور اسے نوادرات جمع کرنے کا بے حد شوق ہے وکیل نے مجھے اس شخص سے ملوایا تو پتا چلا کہ وہ مجھ سے ایک نادر شے کی قدر و قیمت کا تخمینہ چاہتا ہے پہلے تو میں نے انکار کر دیا لیکن جب اس نے یہ بتایا کہ اس چیز کا تعلق انرا سکن کلچر سے ہے تو میرا ماتھا ٹھنکا۔"

"اور وہ چیز جڑاؤ پن تھی؟" میں نے استفہامیہ لہجے میں کہا۔

"ہاں یہ وہی جڑاؤ پن تھی جو ہم نے برآمد کی تھی۔" مائیکل نے جواب دیا۔ "میں نے اسے آخری بار وان کے ہاتھوں میں دیکھا تھا۔ اس وقت شام ہو رہی تھی اور وہ اسے اپنے ساتھ اپنی قیام گاہ پر لے جا رہا تھا یہ جگہ کھدائی کے مقام سے قریب ہی تھی ہم نے ایک دوسرے کو شب بخیر کہا اور وہ اپنے مکان کی طرف چل دیا۔ چار گھنٹے بعد مکان میں آگ بھڑک اٹھی، آگ بجھی تو وان کی لاش بھی غائب تھی اور جڑاؤ پن بھی...... اور پھر آج دو ہفتے پیشتر وہی جڑاؤ پن روم کے ایک صاحب نوادرات کے پاس تھی۔ میرے استفسار پر پدیالو کے وکیل نے بتایا کہ جڑاؤ پن ٹھیک

ڈھائی لاکھ پاؤنڈ میں خرید گئی تھی۔"

❁......❁......❁

صبح آنکھ کھلی تو نو بج رہے تھے' مائیکل سے ملاقات اور اس سے باتیں ایک خوشگوار خواب جیسی لگ رہی تھیں۔ وہ رات کے ایک بجے تک مجھ سے باتیں کرتا رہا تھا اور اگلے روز شام کا وعدہ کر کے چلا گیا تھا۔

میں بستر سے اٹھ کر کھڑکی کے سامنے جا کھڑی ہوئی' مدھم مدھم سی روشنی ہر سو پھیل گئی تھی۔ بارش کے پانی میں نہائے ہوئے پیڑ پودے نکھر نکھرے سے گئے تھے۔

میں کپڑوں کی الماری کے قریب پہنچی ہی تھی کہ مجھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی یہ آواز ڈان کے ڈیڈی کے آفس والے کمرے کے قریب سنائی دی تھی مگر وہ تو اس وقت گھر پر نہیں تھے۔ انتھونی بھی گھر میں نہیں تھا تو پھر یہ کون تھا جو ان کے آفس کی طرف جا رہا تھا؟ گھر کی کوئی خادمہ بھی اُدھر نہیں جا سکتی خود مجھے بھی ان کے آفس میں جانے کی اجازت نہ تھی۔ اچانک میرا ذہن مائیکل کی طرف پلٹا' ممکن ہے وہ کسی ضروری دستاویز کی تلاش میں مسٹر ہرکورٹ کے آفس میں جا گھسا ہو' میں وقت ضائع کیے بغیر آفس کی طرف لپکی۔

میں نے آفس کا دروازہ آہستہ سے کھولا' میرا دل دھک دھک کرنے لگا اور عجیب عجیب وسوسے سے سر اٹھا رہے تھے۔ یہ کمرا اگرچہ خاصا بڑا تھا لیکن میز کرسیوں اور دیگر سامان سے پٹا پڑا تھا' دیواروں پر اٹراسکن لوگوں کے نقاب آویزاں تھے اور ایک کونے میں کسی اٹراسکن جنگ جو کا برہنہ مجسمہ تھا۔

"اندر کون ہے؟" میں نے بلند آواز میں کہا اور اپنے بائیں طرف بڑھ گئی' اسی وقت میری نظر برنیس پر پڑی جو ایک دراز کو تیزی سے میز کے اندر دھکیل رہی تھی۔ یہ وہی میز تھی جس میں میرے سسر یعنی مسٹر ہر کورٹ کی بہت سی اہم دستاویزات رکھی رہتی تھیں۔

ایک لمحے کے لیے ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف تکتی رہیں' اس کا چہرہ ایک دم سفید پڑ گیا تھا اور وہ کسی ایسے چور کی طرح کھڑی تھی جسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا جائے۔

"آپ نے تو ڈرا ہی دیا تھا۔" وہ بمشکل بولی۔ "آپ نے شاید یہ سمجھا ہو کہ کمرے میں کوئی چور گھس آیا ہے' ممکن ہے آپ مجھے بھی چور ہی سمجھ رہی ہوں۔"

برنیس وڈرنگ تقریباً دس برس سے مسٹر ہرکورٹ کی سیکرٹری تھیں' میں اسے بہت اچھی عورت سمجھتی تھی لیکن گزشتہ چند دنوں سے وہ مجھے زہر لگنے لگی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ پچھلے کئی دنوں سے انتھونی مجھ میں غیر معمولی دلچسپی لینے لگا تھا اور اسے انتھونی کی یہ روش بُری طرح کھٹکتی تھی۔

"میں یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اپنے باس کی عدم موجودگی میں ان کے آفس کی یوں تلاشی لیتی پھرو گی؟" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"میں جب چاہوں مسٹر ہرکورٹ کے آفس میں آ سکتی ہوں' میں ان کی سیکرٹری ہوں۔" اس نے اپنی بدحواسی پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔

"تم کیا تلاش کر رہی تھیں؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"ایک ضروری خط تھا مجھے اس کا جواب لکھنا ہے۔" برنیس نے بات بناتے ہوئے جواب دیا۔ "نہ جانے یہ خط انہوں نے کہاں رکھ چھوڑا ہے۔"

"میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ ان کی غیر حاضری میں کسی کو یہاں آنے کی اجازت نہیں ہے۔" میں نے سختی سے کہا۔

"کیا آپ مجھے چور سمجھتی ہیں؟" وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"یہ بات نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "میں صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا جب وہ آئیں گے تو میں انہیں اس بات سے مطلع کردوں گی۔"

"بتا دیجیے گا' اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" وہ بے نیازی سے بولی اور پھر بات کا رخ بدلنے کی غرض سے بولی۔

"ایک خادمہ کہہ رہی تھی کہ رات کو مسٹر ہرکورٹ کا کوئی ملاقاتی آیا تھا' کیا یہ سچ ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" میں واپس مڑتے ہوئے بولی۔

"خیر چھوڑیے اس بات کو۔" وہ میرے پیچھے پیچھے آتے ہوئے بولی۔ "آپ تو سارا سارا دن اپنے کمرے میں اداس پڑی رہتی ہیں حالانکہ آپ کو زیادہ سے زیادہ لوگوں سے ملنا چاہیے اس طرح آپ کا غم ہلکا ہوجائے گا اور دل بہلتا رہے گا۔"

"تمہیں کیوں اتنی فکر ہے؟" میں نے بے رخی برتی۔

"میں آپ سے ایک ضروری بات کہنا چاہتی ہوں۔" وہ میرے قریب آتے ہوئے بولی۔ "میرا خیال ہے آپ اپنے شوہر کے خطوط کو یوں سینے سے لگائے رہتی ہیں جیسے وہ کوئی سماوی صحیفہ ہوں۔ معاف کیجیے گا میں دراصل یہ کہنا چاہتی تھی کہ آپ انہیں ہر وقت پڑھتی رہتی ہیں خاص طور پر وہ خطوط جو انہوں نے آپ کو اٹلی سے بھیجے تھے شاید ان میں کوئی خاص بات پوشیدہ ہے۔"

میں اس کے انداز تکلم سے ہی پہچان گئی تھی کہ وہ کیا چاہتی ہے؟ یا تو وہ یہ جاننے کی خواہش مند تھی کہ ان خطوط میں کیا لکھا ہے یا پھر وہ یہ چاہتی تھی کہ میں انہیں تلف کردوں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ ایسا کیوں چاہتی تھی۔

"آپ یقیناً یہ سوچ رہی ہوں گی کہ میں آپ کے نجی معاملے میں اتنی دلچسپی کس لیے لے رہی ہوں۔" وہ پینترا بدلتے ہوئے بولی۔ "یقین کیجیے مجھے تو آپ کی بہتری مقصود ہے' ہم سبھی آپ کی بھلائی چاہتے ہیں۔" اس کی آواز میں لرزش نمایاں تھی۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے ناگواری سے جواب دیا۔ "تمہیں اپنی فکر کرنی چاہیے۔"

"چند روز پہلے کی بات ہے میری ملاقات ایک بڑے ہی زندہ دل شخص سے ہوئی تھی وہ شخص آپ کے شوہر سے اٹلی میں ملا تھا۔" برنیس میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ "وہ شخص آپ سے ملنے کا متمنی ہے بہت ہی خوب صورت آدمی ہے اس نے اپنا نام ونٹن گرین بتایا تھا' میں نے اس کو آپ سے متعارف کرانے کا وعدہ کرلیا تھا۔ کیا آپ اس شخص سے ملنا پسند فرمائیں گی؟"

❁ ❁ ❁

مائیکل اور برنیس کی باتوں نے مجھے چکرا کے رکھ دیا تھا' میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں؟ کسے دوست سمجھوں اور کسے دشمن جانوں؟ مائیکل اپنی آمد کا مقصد بیان کرچکا ہے' اپنے مفروضے کے مطابق وہ وان کے قاتل کی تلاش میں ہے اور اب گرین بھی مجھ سے ملنا چاہتا ہے آخر کیوں؟ ممکن ہے وہ یہ سمجھتا ہو کہ جزاؤ پن میری تحویل میں ہے اور وہ اسے خریدنے کی نیت سے آیا ہو؟ یا پھر ممکن ہے اسے بھی وان کے قاتل کی تلاش ہو؟ برنیس کو یہ حق کیسے پہنچتا ہے کہ وہ میری مرضی کے خلاف مجھے دوسروں سے متعارف کرانے کا وعدہ کرتی پھرے۔

میں ان خیالات کی کشمکش سے تنگ آ کر گھر سے نکل گئی باہر آئی تو آسمان پر بادل گھر آئے تھے اور خنک

ہوا دھیرے دھیرے بہہ رہی تھی۔ کھلی فضا میں پہنچتے ہی میں اپنے آپ کو سبک سر محسوس کرنے لگی اور بہت دیر بعد جب میں گھر گئی تو وان کے ڈیڈی کو اپنا منتظر پایا۔ مجھے ان کے آج کے رویے پر خاصی حیرت ہوئی کیونکہ میرے ساتھ ان کا رویہ شروع ہی سے غیر مشفقانہ رہا تھا۔ شادی کے فوراً بعد انہیں وان سے نفرت سی ہوگئی تھی اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ انہیں وان کی خودمختاری گوارا نہ تھی۔

"آؤ آؤ میری بیٹی......" وہ میری طرف بڑھتے ہوئے بولے۔

"میں تو بہت فکر مند تھا تمہارے لیے آخر تم کہاں چلی گئیں؟ میں اور انتھونی جب یہاں پہنچے تو پتا چلا کہ تم دوپہر سے غائب ہو۔ سچ پوچھو تو میں انتھونی کو تمہاری تلاش میں بھیجنے ہی والا تھا۔ تمہاری حالت پہلے سے خاصی اچھی ہوگئی ہے۔" انہوں نے قدرے توقف کے بعد کہا اور میرا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ مجھے ان کا یہ منافقانہ رویہ کچھ اچھا نہیں لگا۔ جی چاہا کہ ان کا ہاتھ زور سے جھٹک دوں' مجھے ان کی سرد' کھردری اور مردہ انگلیوں سے ہمیشہ نفرت رہی تھی۔

"اب تو تمہارے چہرے پر خاصی رونق آچلی ہے۔"

"میں کھلی ہوا میں گھومتی رہتی ہوں۔" میں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"برنیس بتا رہی تھی کہ گزشتہ شب کوئی مہمان آیا تھا۔" انہوں نے اپنے ہاتھ ہٹاتے ہوئے پوچھا' ان کی آواز میں عجیب سا تجسس تھا۔

"آپ نے ٹھیک سنا ہے۔" میں نے عجلت سے جواب دیا۔

"سنا ہے وہ رات کے ایک بجے تک تمہارے کمرے ہی میں رہا؟" ان کے لہجے میں سختی آتی جا رہی تھی۔

"یہ بھی درست ہے؟" میں نے دلیری سے جواب دیا۔ "وہ شخص دراصل آپ سے ملنے آیا تھا' وہ خود کو وان کا شناسا بتا رہا ہے' اٹلی میں ان کے ساتھ رہا ہے۔"

"وہ وان کا شناسا ہے اور اٹلی میں اس کے ساتھ رہا ہے؟" وہ استعجاب آمیز مسرت سے بولے۔ "اس نے اپنا نام نہیں بتایا تھا؟"

"اس کا نام مائیکل کیڈ ہے۔" میں نے سرد مہری سے جواب دیا۔

"مائیکل کیڈ...... اور کیا بتایا تھا اس نے؟"

"اس کے بقول وہ اٹراسکن آرٹ کا ماہر ہے۔" میں نے راست گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے آپ اس سے واقف ہیں' کھدائی کے دوران وہ وان کے ساتھ تھا۔ وان نے اسے خود بلوایا تھا' میلان یونیورسٹی میں لیکچرار ہے۔"

"اس نے اپنی آمد کا مقصد نہیں بتایا تھا؟"

"بتایا تھا...... مگر مجھے یقین نہیں آیا؟"

"رات ایک بجے تک وہ تم سے باتیں کرتا رہا اور اس کے باوجود تم یہ کہہ رہی ہو کہ تمہیں یقین نہیں ہے۔" مسٹر ہرکورٹ نے حیرت بھری آواز میں کہا۔

"سارا وقت ہم وان ہی کے متعلق باتیں کرتے رہے۔" میں نے جواب دیا۔ "وہ کہہ رہا تھا کہ وان اور وہ بہت اچھے دوست تھے۔"

"اچھا تو وہ میرے بیٹے کا دوست ہے۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میرے بیٹے میں یہ صلاحیت موجود تھی کہ جسے چاہتا اپنا دوست بنا لیتا تھا' تمہارا کیا خیال ہے؟" میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"وان کے متعلق وہ کیا کہہ رہا تھا؟" بوڑھے ہرکورٹ نے کریدتے ہوئے کہا۔

"یہی کہ وہ بہت اچھے دوست تھے دونوں کو ایک

دوسرے پر بڑا اعتماد تھا۔" میں نے جواب دیا۔ "اور یہ کہ کھدائی کے آخری ایام انہوں نے کیسے گزارے تھے۔"

"کیسے گزارے تھے؟"

"مائیکل آپ کو سب کچھ بتا دے گا۔" میں نے بےزاری سے کہا۔

"میری بات غور سے سنو مائی ڈیئر!" بوڑھے نے کرخت لہجے میں کہا۔ "میں تمہیں خبردار کردینا چاہتا ہوں کہ تم..." اور اسی وقت برنیس کی آواز ابھری۔

"آپ کا فون ہے مسٹر ہرکورٹ۔" اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔

"کس کا فون ہے؟ تم نے پوچھا نہیں؟" ہرکورٹ نے غصے سے کہا۔

"پوچھا ہے۔" برنیس گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "انہوں نے اپنا نام مائیکل کیڈ بتایا ہے وہ آپ سے آج رات ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔"

❁......❁......❁

میں ایک بار پھر اس زنداں سے نکل بھاگی تھی میرا جی چاہتا تھا یہاں سے کہیں بہت دور نکل جاؤں۔ کسی ایسی جگہ جہاں میرے سوا کوئی نہ ہو۔ وان کی بےوقت اور اچانک موت نے مجھے چڑچڑا اور خلوت پسند بنا دیا تھا۔

گھر سے باہر آتے ہی میں نے سکون کا سانس لیا' موسم بے حد خوشگوار تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا میرے تعاقب میں تو کوئی نہیں آرہا؟ دور تک کوئی نہیں تھا۔ گھر سے نکلتے وقت میرے ذہن میں کوئی واضح پروگرام نہیں تھا کہ مجھے کہاں جانا ہے؟ چلتے چلتے اچانک جی میں آئی کہ کسی آرٹ گیلری کی سیر کرنی چاہیے۔ قریب ترین آرٹ گیلری' ٹیٹ گیلری تھی چنانچہ میں اسی طرف چل دی۔

آرٹ گیلری میں پہنچ کر میں ایک قدیم پینٹنگ سے محظوظ ہو رہی تھی کہ اچانک مجھے یوں لگا جیسے کوئی میرے ساتھ کھڑا ہو۔ میں نے چونک کر دیکھا تو وہ انتھونی تھا۔ میں اسے دیکھتے ہی یہ بھانپ گئی کہ وہ میرا تعاقب کرتے یہاں تک آیا ہے۔

میں نے اس کی طرف غصیلی نظروں سے دیکھا تو اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا اور میری ناراضی کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

"سینٹ جارج اور شہزادی سبرا کی شادی کی یہ پینٹنگ اس آرٹ گیلری کی سب سے گھٹیا پینٹنگ ہے۔"

"اگر تمہیں یہ پینٹنگ پسند نہیں ہے تو تم اس جگہ سے ٹل کیوں نہیں جاتے؟" میں نے اسے قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے' آج بہت غصے میں ہو؟" وہ کھسیانے انداز میں مسکرایا۔ "برنیس کہہ رہی تھی کہ تم خاصی بدل چکی ہو لیکن مجھے تو ایسی کوئی بات دکھائی نہیں دیتی۔ کہیں یہ رات والے مہمان کی صحبت کا اثر تو نہیں ہے؟"

"تمہارا مطلب مائیکل کیڈ سے ہے؟" میں نے غصے سے کہا۔

"اچھا تو وہ مہمان عزیز مائیکل کیڈ تھا؟" وہ طنزیہ انداز میں مسکرایا۔

"تم اس سے اچھی طرح واقف ہو میں غلط تو نہیں کہہ رہی؟"

"میں نے کب کہا ہے کہ میں اس سے واقف نہیں ہوں۔" وہ شانے اچکاتے ہوئے بولا۔ "اسے بھلا کون بھلا سکتا ہے' وہ وان کا قابل اعتماد دوست رہ چکا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ وان کا دست راست تھا اس نے تمہیں بتایا تو ہوگا؟"

"ہاں اس نے مجھے اور بھی بہت کچھ بتایا ہے۔" میری آواز غیر ارادی طور پر بلند ہو گئی تھی جس کے نتیجے

میں قریب کھڑے لوگ ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ انتھونی نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مجھے یوں لگا جیسے اس کی انگلیاں دہکتی ہوئی سلاخوں کی طرح میرے ہاتھ میں دھنستی چلی جارہی ہیں۔

"مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔" میں نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ میں غصے سے کانپنے لگی تھی۔

"کیا میں اس گریز کی وجہ جان سکتا ہوں؟" وہ غصے سے بولا۔

"میں اسے اچھا نہیں سمجھتی۔"

"مائیکل نے تمہیں میرے متعلق کیا بتایا تھا؟" وہ کرخت آواز میں بولا۔

"تم اس سے خود کیوں نہیں پوچھ لیتے؟" میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "اس نے کہا تھا کہ وہ تمہارے ڈیڈی سے ملاقات کرے گا۔"

"آج شب؟ وہ آج شب ہمارے یہاں آرہا ہے؟ ٹھیک ہے میں اس سے خود ہی پوچھ لوں گا لیکن ایک بات یاد رکھنا وہ تمہیں پریشان کرنے پر تُلا ہوا ہے۔"

"تم میری فکر مت کرو۔" میں نے کہا۔

"تم اسے نہیں جانتی ہو۔" انتھونی نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ وہ اب چولا بدل رہا تھا۔ "اس شخص کی اوٹ پٹانگ باتیں تمہارا ذہنی سکون برباد کردیں گی۔ وہ بہت مکار شخص ہے۔"

"مجھے کوئی پریشان نہیں کرسکتا' تم اپنی فکر کرو۔" میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"رک جاؤ مینڈی!" وہ میرا راستہ روکتے ہوئے بولا۔ "تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں تمہیں پریشان نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے ہر اس شخص سے نفرت ہے جو تمہارے ذہنی سکون کو برباد کرنا چاہتا ہو۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ تم مجھے کس درجہ عزیز ہو؟ کیا یہ جھوٹ ہے؟ سنو مینڈی! میں اس شخص کو اچھی طرح جانتا ہوں اس کی شخصیت بڑی پُرکشش ہے وہ ہر کسی کو اپنا گرویدہ بنا سکتا ہے۔ وان کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا تھا وہ اس پر اندھا اعتماد کرنے لگا تھا۔ اس کا قرب وان کی کمزوری بن کر رہ گیا تھا لیکن اس کا قرب سراسر فریب ہے' سراسر ہلاکت ہے۔ یقین جانو مینڈی! یہ شخص تمہیں برباد کردے گا۔"

"نہیں اس میں مجھے برباد کرنے کی طاقت نہیں ہے۔" میں نے بے نیازی سے کہا اور تیزی سے آگے چل دی۔

"سنو تو مینڈی!" وہ ملتجیانہ لہجے میں بولا۔ "تمہیں نہیں معلوم کہ مائیکل کو مجھ سے نفرت ہے' شدید نفرت۔"

"لیکن اس نفرت کی وجہ؟" میں نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

"کیوں کہ وہ وان کا دوست نہیں تھا' دوستی کی آڑ میں اپنا الو سیدھا کرنے میں مصروف تھا۔" انتھونی نے جواب دیا۔

"اور مجھے اس کی یہ منافقانہ روش پسند نہ تھی۔"

"مجھے تمہاری کسی بات کا یقین نہیں ہے' مجھے جانے دو۔ تم مجھے قائل نہیں کرسکتے۔"

"مجھے سمجھنے کی کوشش کرو مینڈی!" وہ میرا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔ "میں جانتا ہوں مائیکل نے تمہیں مجھ سے بدظن کردیا ہے لیکن یاد رکھو مینڈی! وہ مخلص نہیں ہے اس نے محض خلوص کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے' وان کو تباہ و برباد کرنے کے بعد اس نے تمہیں منتخب کیا ہے۔ وان کی موت کا ذمے دار یہی شخص ہے' سب کچھ اسی کا کیا دھرا ہے؟"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" میں نے غصے سے کہا۔ "یہ نظریہ وان کا اپنا نظریہ تھا۔ اسے اسی نظریے کے ثبوت کی

خاطر اس نے اٹلی میں کھدائی کی تھی اور جڑاؤ پن کی دستیابی نے اس کے نظریے کی تصدیق کردی تھی۔"

"تو جڑاؤ پن کی کہانی تم تک بھی پہنچ گئی ہے۔" وہ طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ "مجھے یقین تھا مائیکل یہ چال ضرور چلے گا۔"

"کیسی کہانی اور کیسی چال؟" میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

"جڑاؤ پن کی کہانی۔" وہ غرور سے بولا۔ "اس کی انفرادیت اور اہمیت کی فرضی داستان جسے وہ ہر جگہ دہراتا پھرتا ہے۔ اس نے تمہیں بتایا ہوگا کہ جڑاؤ پن نے وان کے نظریے کی تصدیق کردی تھی لیکن اس نے تمہیں یہ نہیں بتایا ہوگا کہ وہ جڑاؤ پن ہے کہاں؟ وہ کبھی نہیں بتائے گا کیونکہ یہ اس کے مفاد کے خلاف ہے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں وہ جڑاؤ پن آگ میں جل کر راکھ بن گئی تھی۔"

"مجھے انتھونی کی بے خبری اور غفلت پر ہنسی آتے آتے رہ گئی۔ اس بے چارے کو کیا معلوم کہ مائیکل مجھے سب کچھ بتا چکا ہے۔

"تمہاری یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ جڑاؤ پن سے مائیکل کا کون سا مفاد وابستہ ہے؟" میں نے انتھونی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"مجھے تمہارے بھولپن پر ترس آتا ہے ڈارلنگ!" انتھونی بولا۔ "میں حیران ہوں کہ اتنی ذہین ہوتے ہوئے بھی تم بعض اوقات ایک سطحی سی بات کو بھی نہیں سمجھ پاتی ہو۔ میں تمہیں بتاتا ہوں مائیکل ہی کے کہنے پر وان نے کھدائی شروع کی تھی جب انہیں وہ جڑاؤ پن ملی جس کا ذکر وہ بڑے فخر سے کرتا پھرتا ہے تو اسی شخص نے وان کو یہ غلط نظریہ قائم کرنے پر مجبور کیا کہ یہ جڑاؤ پن اٹراسکن کلچر کا منفرد اور بے نظیر نمونہ ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اس طرح نوادرات جمع کرنے والا کوئی نہ کوئی شخص جڑاؤ پن کی بہت بڑی قیمت لگائے گا جس کے نتیجے میں اسے بھی اس میں سے کثیر رقم ہاتھ آئے گی لیکن وان کو یقین نہیں تھا۔ جانتی ہو کہ وان اگلے روز کیا کرنے والا تھا؟ وہ روم جاکر جڑاؤ پن کی اصلیت معلوم کرنا چاہتا تھا' اسے یقین تھا کہ مائیکل نے اسے محض بہکایا ہے اسی لیے وہ روم جاکر مائیکل کی قابلیت اور مہارت کا پردہ چاک کرنے کی فکر میں تھا لیکن تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ رات کو وان کے کمرے میں آگ بھڑک اٹھی اور سب کچھ جل کر راکھ بن گیا۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ وہ آتشزدگی محض اتفاقی حادثہ تھا؟ نہیں...... ایسا نہیں تھا اسی لیے میں تمہیں خبردار کررہا ہوں کہ اس شخص سے دور رہو ورنہ یہ تمہیں بھی ڈس لے گا۔ میرا بھائی تو مر چکا ہے لیکن تم کیوں موت کے منہ میں جارہی ہو؟"

❁ ❁ ❁

رات کو جب مائیکل کیڈ ہمارے گھر آیا تو ہم سب لوگ ڈرائنگ روم میں اس کے منتظر تھے۔ سب سے پہلے وان کے ڈیڈی اس کے استقبال کو بڑھے۔

"میرے بیٹے انتھونی سے تو آپ مل ہی چکے ہیں۔" مسٹر ہرکورٹ اسے ڈرائنگ روم کی طرف لاتے ہوئے بولے۔ "اور ہاں یہ تو مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ کل شب آپ کی ملاقات میری بہو ایمنڈا سے ہو چکی ہے البتہ برنیس سے آپ کی ملاقات نہیں ہوئی' ٹیلی فون پر اسی نے آپ کا پیغام سنا تھا' یہ میری سیکریٹری ہے۔"

برنیس سے ہاتھ ملانے کے بعد جب وہ میری طرف بڑھا تو میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کے لبوں پر ہلکا سا تبسم تھا' میں نے ہاتھ آگے بڑھایا تو اس نے میرے ہاتھ کو کچھ اس انداز سے دبایا کہ مجھے اپنا توازن بگڑتا ہوا محسوس ہونے لگا' میرے وجود میں بھونچال سا آ گیا تھا۔

"انتھونی نے بتایا تھا کہ آپ وان کے مشیر خاص تھے۔"

"آپ نے ٹھیک سنا ہے مسٹر ہرکورٹ۔" مائیکل نے دھیمے پن سے جواب دیا۔ "اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ میں اپنے فن میں ایکسپرٹ ہوں لیکن جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ میں نے وان کو کوئی نیا نظریہ قائم کرنے کا مشورہ دیا تھا یا اس قسم کی کوئی ترغیب دی تھی تو اس ضمن میں عرض یہ ہے کہ مسٹر وان اپنے نظریات میں قطعی آزاد تھے خاص طور پر ازاسکن کلچر کے بارے میں ان کی تھیوری انقلاب آفریں کہی جاسکتی ہے۔"

"اور کیا یہ بھی درست ہے کہ وان نے آپ کو بھاری معاوضے کی پیش کش کی تھی؟"

"یہ کون سی نئی بات ہے۔" مائیکل بولا۔ "آپ تو مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ ایکسپرٹ لوگ معاوضے کے بغیر تو کام نہیں کیا کرتے۔"

"مجھے آپ سے اتفاق ہے مسٹر مائیکل۔" بوڑھے ہرکورٹ نے کہا۔

"میں آپ لوگوں کا زیادہ وقت نہیں لینا چاہتا۔" مائیکل بولا۔ "اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ادھر ادھر کی باتوں کی بجائے اصل موضوع پر بات کروں۔"

"شوق سے۔" مسٹر ہرکورٹ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ مسٹر ونٹن گرین کو جانتے ہیں؟ ونٹن گرین وہ شخص ہے جس نے کھدائی کے لیے وان کو سرمایہ فراہم کیا تھا۔"

"ہاں انتھونی نے بتایا تھا کہ اس کا تعلق امریکا سے ہے اور بہت ہی دولت مند شخص ہے۔" مسٹر ہرکورٹ نے جواب دیا۔

"گرین کے متعلق برنیس نے مجھے بتایا تھا کہ

اھل حق اپنی تعریف پسند نھیں کرتے

☆

اھل مجلس میں کچھ لوگ ایک بزرگ کی تعریف کر رھے تھے اور اس کے اچھے اوصاف کو بڑھا چڑھا کر بیان کر رھے تھے اس بزرگ نے سر اٹھایا اور کھا۔ میں جو کچھ ھوں میں ھی جلتا ھوں۔

اہل حق مصیبت کو گناہ پر ترجیح دیتے ہیں

میں نے ایک پارسا کو دریا کے کنارے پر دیکھا جس کو چیتے نے زخمی کر دیا تھا اور اس کا زخم کسی دوا سے اچھا نہ ھوتا تھا عرصہ دراز سے اس تکلیف میں مبتلا تھا اور ھر وقت خداوند عزوجل کا شکر ادا کرتا تھا۔ لوگوں نے اس سے پوچھا کہ شکر کس بات کا ادا کرتے ھو، اس نے کھا کہ اس نے کہ مصیبت میں مبتلا ھوں نا کہ گناہ میں۔

مرسلہ: ھمایوں ظفر......کراچی

وہ ان دنوں لندن ہی میں ہے اور مجھ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔" میں نے بحث میں شامل ہوتے ہوئے کہا۔

میرے اس انکشاف پر مائیکل حیرت زدہ رہ گیا اور برنیس پر ایک گھبراہٹ سی طاری ہوگئی۔ انتھونی بھی اس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ اور کہتی برنیس تیزی سے اٹھی اور کمرے سے نکل گئی۔

"میرا خیال ہے مس برنیس کچھ پریشان ہوگئی ہیں۔" مسٹر ہرکورٹ نے اپنے بیٹے انتھونی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "تم

معلوم تو کرو بیٹی! مسز برنیس اس قدر پریشان کیوں ہوگئی ہیں؟"

میں بادل نخواستہ اٹھ گئی' کمرے میں اب مائیکل' انتھونی اور مسٹر ہرکورٹ رہ گئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ ابھی مزید بحث کریں گے کہ اچانک ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا اور سب سے پہلے مائیکل برآمد ہوا' میں عجلت سے ایک طرف ہٹ گئی اور دونوں باپ بیٹے کے کمرے سے نکل جانے کے بعد برآمدے میں آ گئی۔ مائیکل پلٹ کر دیکھے بغیر ٹیکسی کے قریب پہنچا اور دھیرے سے کچھ کہا' مجھے صرف ایک ہی لفظ ہلٹن سنائی دیا تھا اور ٹیکسی روانہ ہوگئی تھی۔

میں تیزی سے اپنے کمرے میں پہنچی اور لباس وغیرہ درست کرنے کے بعد باہر آ گئی۔ میں بہرصورت مائیکل سے آج ہی شب ملاقات کرنا چاہتی تھی' وہ میری زندگی میں پہلا شخص تھا جس کے تعاقب میں' میں دوسری بار جارہی تھی۔ پہلی بار میں نے وان کے دھوکے میں اس کا تعاقب کیا تھا اور آج مائیکل سمجھ کر اس کے تعاقب میں جارہی تھی۔

میں ابھی کمرے سے باہر ہی آئی تھی کہ انتھونی آ پہنچا۔

"اس وقت کہاں جارہی ہو؟" اس نے تجسس بھرے لہجے میں پوچھا۔

"یوں ہی گھومنے پھرنے' اندر بیٹھے بیٹھے میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔" میں نے بیزاری سے جواب دیا۔

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔" انتھونی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

میں نے اس کی آواز پر کوئی توجہ نہیں دی اور برآمدے سے نکل آئی۔ وہ تیزی سے میری طرف لپکا اور اپنے بازو میری گردن میں حمائل کردیئے لیکن میں نے اس کا بازو نفرت سے جھٹک دیا۔

"مجھے تنہا چھوڑ دو' مجھے تمہاری رفاقت کی ضرورت نہیں ہے۔" میں درشت لہجے میں کہا۔

میرے رویے پر وہ بھونچکا رہ گیا تھا اور میں تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی۔ چار پانچ قدم دور جانے کے بعد میں نے ایک بار پھر بلند آواز میں کہا۔

"میرے پیچھے مت آنا انتھونی!" میں نے پلٹ کر دیکھنا گوارا نہیں کیا اور مین اسٹریٹ کی طرف دوڑنے لگی۔

مین اسٹریٹ پر آتے ہی میری نظر ایک ٹیکسی پر پڑی' میں نے اسے اشارے سے اپنی طرف بلایا' ڈرائیور نے پوچھا کہ کہاں جائیے گا تو میں سوچ میں پڑ گئی میں نے ہلٹن کا لفظ ضرور سنا تھا لیکن یقین نہیں تھا کہ ہلٹن سے مراد ہلٹن ہوٹل ہی تھا۔ بہرحال میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہہ دیا کہ مجھے ہلٹن ہوٹل پہنچا دے۔ ہلٹن ہوٹل پہنچ کر جب میں ڈیسک کلرک سے مائیکل کے متعلق پوچھا تو پتا چلا کہ مائیکل نام کا کوئی شخص اس ہوٹل میں مقیم نہیں ہے۔ مجھے بڑا تعجب ہوا کہ اگر وہ اس ہوٹل میں مقیم نہیں تھا تو اس نے ہلٹن کا نام کیوں لیا تھا؟ ہلٹن نام کی اور کوئی جگہ لندن میں نہیں تھی۔ اچانک ایک خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں کوند گیا۔ ممکن ہے' وٹلن گرین اسی ہوٹل میں رہائش پذیر ہو اور مائیکل اس سے ملنے یہاں آیا ہو چنانچہ میں نے ڈیسک کلرک سے دوبارہ پوچھا کہ کیا وٹلن گرین نام کا کوئی شخص یہاں مقیم ہے؟ تو اس کے جواب نے میرے اندازے کی تصدیق کردی۔ میں نے کلرک سے کمرے کا نمبر پوچھا تو اس نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ یہ ہوٹل کے ضابطۂ اخلاق کے خلاف ہے۔ میرے اصرار پر اس نے کہا کہ آپ مسٹر گرین سے فون پر بات کرسکتی ہیں' کلرک نے کمرے کا نمبر ڈائل کیا اور ریسیور میرے ہاتھ میں دے دیا۔

"فرمائیے' کس سے بات کریں گی؟" کسی نے

سوالیہ انداز میں پوچھا تھا۔

"مجھے مسٹر مائیکل کیڈ سے ملنا ہے۔" میں نے بے تابی سے کہا۔

"مائیکل کیڈ؟ ہولڈ کیجیے میں پوچھ کے بتاتا ہوں۔" پھر دس پندرہ سیکنڈ بعد اسی شخص کی آواز سنائی دی۔ "معاف کیجیے گا مسٹر مائیکل کیڈ اس وقت یہاں نہیں ہیں ویسے ہیں وہ یہیں کہیں ہوں گے' آپ اپنا نام پتا بتادیں' میں انہیں مطلع کردوں گا۔"

"میں ہوٹل کی لابی سے بات کررہی ہوں۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"تو اوپر تشریف لے آئیے۔" ادھر سے آواز آئی۔

"کیسے چلی آؤں؟ مجھے آپ کے کمرے کا نمبر نہیں معلوم۔" اس نے کمرے کا نمبر بتایا تو پتا چلا کہ مجھے اٹھائیسویں منزل پر جانا ہوگا۔ جب میں اٹھائیسویں منزل پر پہنچی تو لفٹ میں میرے سوا کوئی نہیں تھا' ڈنٹن گرین کا کمرہ قریب ہی تھا۔

"مجھے مسٹر مائیکل کیڈ سے ملنا ہے؟" میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"مسٹر گرین...... مسٹر گرین!" میرے مخاطب شخص نے بلند آواز میں کہا۔ "یہ گڑیا مسٹر مائیکل کی تلاش میں ہے۔"

کمرے میں اور بھی لوگ تھے' مائیکل کا نام سنتے ہی سبھی میری طرف متوجہ ہوگئے پھر چند ہی سیکنڈ بعد ایک دبلا پتلا مگر دراز قد شخص نمودار ہوا' وہ سفید جیکٹ پہنے ہوئے تھا' اس کے بال گھنگریالے اور نقش و نگار خاصے دلکش اور تیکھے تھے۔

"آپ کو مائیکل سے ملنا ہے؟" وہ میرے قریب آتے ہوئے بولا۔ "مجھے ڈنٹن گرین کہتے ہیں۔" اس نے اپنا ہاتھ بڑھادیا اور میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اپنی وضع قطع اور لب و لہجے کے اعتبار سے بھی وہ بے حد مہذب دکھائی دیتا تھا۔

"معافی چاہتی ہوں کہ میں بن بلائے مہمان کی طرف چلی آئی۔" میں نے دھیرے سے کہا۔

"کوئی بات نہیں' زندگی میں ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔" وہ متبسم ہوکر بولا۔ "مائیکل کچھ دیر پہلے تو یہیں تھا' اسے یہاں آئے ہوئے زیادہ وقت نہیں گزرا' آپ نے اپنا تعارف تو کرایا ہی نہیں۔"

"مجھے ایمنڈا ہرکورٹ کہتے ہیں۔"

میرا نام سنتے ہی وہ چونک کر رہ گیا۔ "ایمنڈا ہرکورٹ! یہ تو بہت ہی اچھا ہوا کہ آپ خود ہی تشریف لے آئیں' میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ سے یوں اچانک ملاقات ہوجائے گی۔ آپ کے شوہر بہت مخلص اور عظیم انسان تھے' میرے دل میں ان کی بہت قدر تھی۔ ان کی موت ہمارے لیے نقصان عظیم سے کم نہیں ہے' میرا خیال ہے میں نے آپ کو تعزیتی خط بھی بھیجا تھا۔"

مجھے یاد آیا کہ ڈنٹن گرین نامی کسی شخص کا ایک تعزیتی خط آیا تو تھا لیکن میں نے اس کا جواب نہیں دیا تھا۔

"برنیس نے مجھے بتایا تھا کہ آپ مجھ سے ملنا چاہتے تھے؟"

"ہاں۔" گرین نے مدھم سی آواز میں کہا پھر بات کا رخ بدلتے ہوئے بولا۔ "کچھ دیر پہلے مائیکل میرے کمرے ہی میں تھا' ہم کسی ضروری مسئلے پر بات چیت کررہے تھے۔ میں اسے بتادوں گا کہ آپ تشریف لائی تھیں' آپ کیا پینا پسند فرمائیں گی' کافی یا شیمپئن؟" اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتی' اس نے مجھے بازو سے پکڑا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

"آئیے' آپ کو ایک مشہور شخصیت سے متعارف کراؤں۔" میں حیران تھی کہ ایسی کون سی مشہور شخصیت ہے جس سے وہ مجھے متعارف کروانا چاہتا ہے۔

"ان سے ملئے مسز ہرکورٹ!" وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "انہیں مسز آئرس کیڈ کہتے ہیں' میرا مطلب ہے مسز مائیکل کیڈ۔" اور میری آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔

❁......❁......❁
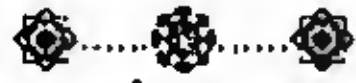
مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا' میں تحیر زدہ سی اس حسین و جمیل عورت پر نظریں مرکوز کیے کھڑی تھی' اس کے سنہرے لانبے بال کمر سے نیچے تک لہراتے چلے گئے تھے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ مائیکل شادی شدہ ہوگا لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی خاصی حیران کن تھی کہ مائیکل کیڈ نے یہ حقیقت مجھ سے کیوں چھپائے رکھی؟ اس نے تو مجھ سے یہی کہا تھا کہ وہ یہاں بالکل تنہا آیا ہے۔

"لگتا ہے آپ مسز آئرس کو دیکھ کر کچھ پریشان سی ہوگئی ہیں۔" وٹمن گرین مجھ سے مخاطب ہوا۔

"جی نہیں' ایسی تو کوئی بات نہیں۔" میں نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔

"مسٹر گرین! آپ نے ان محترمہ کا تعارف تو کرایا ہی نہیں؟" آئرس بولی۔

"یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔" گرین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ میرے ایک آنجہانی دوست دان ہر کورٹ کی بیوہ ہیں' مائیکل ان کے شوہر کا مشیر خصوصی رہ چکا ہے۔" اس پر وہ معنی خیز انداز سے مسکرائی۔

"بڑی مسرت ہوئی آپ سے مل کر۔"

"آپ میرے شوہر سے واقف نہیں ہیں؟" میں نے اس کی طنزیہ مسکراہٹ نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "مائیکل نے بھی آپ سے کبھی ذکر نہیں کیا؟"

"اس وقت ہماری شادی نہیں ہوئی تھی۔" وہ میرے گلاس میں شیمپین انڈیلتے ہوئے بولی۔ "میرا مطلب ہے ہماری شادی حال ہی میں ہوئی ہے' یہی کوئی تین ماہ پہلے۔"

"مائیکل سے آپ کی ملاقات کہاں ہوئی تھی؟" میں نے تجسسانہ انداز میں پوچھا۔

"مائیکل......؟" وہ تذبذب آمیز لہجہ میں بولی۔ لگتا تھا وہ اس نام سے مانوس نہیں ہے۔ "ہاں' ہماری پہلی ملاقات اٹلی میں ہوئی تھی۔"

"میلان میں؟"

"آپ نے ٹھیک کہا۔" وہ قدرے گھبراہٹ سے بولی۔

"وہاں آپ کی کیا مصروفیات تھیں؟" میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"مصروفیات......؟ وہ حیرت سے بولی۔ "میں وہاں اپنے فلم یونٹ کے ہمراہ گئی تھی۔ اس فلم میں میرا کردار بہت ہی مختصر سا تھا' فلم بندی کے بعد میں اٹلی ہی میں رکی رہی اور پھر مائیکل سے ملاقات ہوگئی۔"

"پھر تو آپ بہت خوش ہوئی ہوں گی۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"کس بات پر؟" وہ گھبراہٹ بھری آواز میں بولی۔

"مائیکل سے شادی پر؟"

"شادی تو نام ہی خوشی کا ہے۔"

"خصوصاً جب وہ محبت کی شادی ہو۔" میں نے شیمپین کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"یہی بات ہے۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"آپ وٹمن گرین کو کب سے جانتی ہیں؟" میں نے گلاس ٹیبل پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"آپ خود کو بہت چالاک سمجھتی ہیں؟" وہ تن کر بولی۔ "آپ مجھے بے وقوف بنانا چاہتی ہیں؟"

وہ ایک دم غصے میں آگئی تھی' لگتا تھا وہ میرا ارادہ بھانپ گئی تھی اور اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ

کہتی کسی نے قریب سے کہا۔
"تم دونوں اس اندھیرے میں کیا کر رہی ہو؟"
میں نے چونک کر دیکھا' ڈشن گرین میرے سامنے کھڑا تھا اور اس سے چند قدم پیچھے مائیکل موجود تھا۔ اس کی نظریں مجھ پر مرکوز تھیں' یوں لگتا تھا جیسے مجھے یہاں دیکھ کر اسے بہت حیرت ہوئی ہو۔
"میں اور مائیکل کسی اہم مسئلے پر گفتگو کر رہے تھے۔" گرین مسکراتے ہوئے بولا۔ "ہم دونوں معذرت خواہ ہیں کہ آپ کو انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی۔"
اسی دم مائیکل آہستہ سے آگے بڑھا اور حیرت زدہ لہجے میں بولا۔ "تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں یہاں ہوں؟"
"مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔" میں نے دھیرے سے کہا۔ "مجھے تم سے چند ضروری باتیں کرنا تھیں لیکن اب اس کی ضرورت نہیں رہی لہٰذا میں واپس جا رہی ہوں۔" میں آگے بڑھی ہی تھی کہ ڈشن گرین میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔
"اس وقت تو میں آپ کو نہیں جانے دوں گا' اتنے سارے دوستوں کی موجودگی میں آپ کا یوں چلے جانا کچھ عجیب سا لگتا ہے۔"
"مجھے مسز وان سے ایک اہم مشورہ کرنا ہے۔" مائیکل نے گرین سے کہا۔ "اس لیے ہمیں معذور سمجھئے امید ہے تم برا نہیں مناؤ گے۔"
"میں جانتا ہوں۔" گرین معنی خیز انداز سے مسکرایا۔ "وان کے ڈیڈی اور...... کیا نام ہے اس نوجوان کا؟ ہاں انتھونی...... ان دونوں سے تمہاری ملاقات نے بہت سے نئے سوالات کو جنم دیا ہے لیکن میرے خیال میں تمہاری بیوی یہ چاہتی ہے کہ تم ان سوالات کو کسی دوسرے وقت کے لیے اٹھا رکھو۔ مجھے بھی تم سے جزاؤپن کے بارے میں کچھ کہنا ہے لہٰذا کل کسی وقت مل لینا مسز ہرکورٹ سے۔"
گرین کی بات ختم ہوتے ہی آئرس اچانک اٹھ کھڑی ہوئی اور مائیکل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔
اس پر مائیکل نے حیرت زدہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور خاموش رہ گیا۔ یہ نظارا میرے لیے ناقابل برداشت تھا' میں اب وہاں نہیں ٹھہر سکتی تھی۔ مائیکل کے چہرے سے نقاب ہٹ گئی تھی۔
"میں یہاں نہیں ٹھہر سکتی۔" میں نے غصے سے کہا۔ "مجھے مسٹر مائیکل سے کچھ نہیں کہنا' آپ کی مہمان نوازی کا شکریہ' شب بخیر۔" میں نے دروازہ کھولا اور باہر آ گئی۔ میں غصے میں بھری تیز تیز قدموں سے لفٹ کی طرف جا رہی تھی اور لفٹ کے قریب پہنچی ہی تھی کہ مائیکل نے مجھے بازو سے آ پکڑا۔
"چھوڑ دو مجھے۔" میں نے اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اگر تم نے میرا بازو نہ چھوڑا' تو میں چیخ چیخ کر لوگوں کو اکٹھا کر لوں گی۔"
"مجھے سمجھنے کی کوشش کرو ایمنڈا!" اس نے میرے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "آج رات میں تم سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"
"تمہیں اپنی بیوی کو تنہا نہیں چھوڑنا چاہیے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔
"میری بیوی؟" وہ تحیر زدہ آواز میں بولا۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"
"تو کیا آئرس تمہاری بیوی نہیں ہے؟" میں نے استفہامیہ انداز میں کہا۔
"یقین کرو مینڈی!" اس کا چہرہ میری پیشانی سے چھونے لگا تھا۔ "اس عورت کو میں نے آج سے پہلے صرف ایک بار دیکھا تھا۔"
"تو پھر وہ کون ہے؟" میں نے حیرت بھری آواز میں پوچھا۔
"امریکا کی کوئی ایکٹرس۔" مائیکل بولا۔ "گرین

کی دوست ہے اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتا' آؤ کہیں اور چلتے ہیں۔" اور ہم دونوں لفٹ میں داخل ہو گئے۔

❁......❁......❁
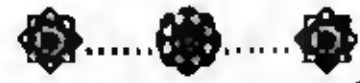
ہوٹل سے نکل کر ہم مے فیئر کے وسط میں واقع ایک بار میں پہنچے اور نیم روشن کونے میں جا بیٹھے۔ میرے ذہن میں ابھی تک وہی منظر گھوم رہا تھا جب آئرس' مائیکل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے کھڑی تھی۔

"تم نے کہا ہے کہ آئرس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔" میں نے پرتگالی شراب کا گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے کہا۔ "میرے خیال میں تم غالباً یہ کہنا چاہتے ہو کہ جب تم گرین کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے تھے تو یہ بات تمہارے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ گرین آئرس کو مجھ سے تمہاری بیوی کی حیثیت سے متعارف کرا چکا ہے؟"

"تم نے ٹھیک سمجھا ہے۔" مائیکل بولا۔ "یقین جانو کہ میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ گرین اتنی خطرناک چال چلے گا۔ گفتگو کے دوران اس نے مجھے دبے دبے لفظوں میں دھمکی تو ضرور دی تھی لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ یوں بلیک میل کرنے کی کوشش کرے گا۔"

"آخر وہ اس قسم کے اوچھے ہتھیار کیوں استعمال کر رہا ہے؟ وہ تم سے چاہتا کیا ہے؟" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"میرا خیال ہے وہ مجھے بدنام کرنا چاہتا ہے۔" مائیکل بولا۔ "سنو مینڈی! میں تم سے کوئی بات بھی پوشیدہ نہیں رکھوں گا' پھر یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے کہ تم کیا فیصلہ کرتی ہو۔"

"میں سن رہی ہوں۔"

"میں گرین سے پہلی بار اٹلی میں ملا تھا۔" مائیکل نے کہنا شروع کیا۔ "ہم دونوں کا تعارف وان نے کرایا تھا' میں نے وان سے اسی وقت کہہ دیا تھا کہ اس شخص نے مجھے قطعی متاثر نہیں کیا۔ میں اس کی نیت کو اسی روز بھانپ گیا تھا اسے معلوم تھا کہ وان کو سرمائے کی اشد ضرورت ہے اور کوئی دوسرا شخص سرمایہ فراہم کرنے پر رضامند نہیں ہے۔ یہ وان کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتا تھا' آثار قدیمہ کے متعلق اس کی معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں اور نہ ہی اسے آثار قدیمہ سے کوئی رغبت تھی' اس شخص کی ذہنیت خالص تاجرانہ ہے۔ آئرس بھی ان دنوں میلان ہی میں تھی اور میں نے اسے پہلی بار وہیں دیکھا تھا' میرے خیال میں وہ گرین ہی کے ساتھ رہتی تھی۔ اس دن کے بعد میں نے اسے آج رات دیکھا ہے' جیسا کہ میں تمہیں گزشتہ رات بھی بتا چکا ہوں کہ میری یہاں آمد کا مقصد محض یہ تھا کہ تمہیں اس حقیقت سے آگاہ کر سکوں کہ وان کی موت کسی اتفاقی حادثے کا نتیجہ نہ تھی۔ تمہارے بعد میں وان کے ڈیڈی سے ملنا چاہتا تھا کہ انہیں بھی قائل کر سکوں کہ ان کے بیٹے کو قتل کیا گیا ہے چنانچہ جب میں نے وان کے ڈیڈی کو فون کیا کہ میں ان سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں تو اس کے فوراً بعد مجھے ڈیمن گرین کا پیغام ملا کہ وہ لندن آیا ہوا ہے اور مجھ سے جلد از جلد ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اسے اپنے ہوٹل کا پتا دے دیا۔"

"کس ہوٹل کا؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"میں ہمیشہ براؤنز ہوٹل ہی میں قیام کیا کرتا ہوں۔" مائیکل نے جواب دیا۔ "میں نے اسے اپنے ہوٹل کا پتا تو بتا دیا لیکن اس کے باوجود میں اس سے نہیں ملنا چاہتا تھا اس کا یوں میرے تعاقب میں چلے آنا بلاوجہ نہیں تھا۔ اسی دوران وان کے ڈیڈی سے ملنے تمہارے یہاں پہنچا' وان کے ڈیڈی کا ردعمل نہایت

مایوس کن تھا' مجھے ان سے ایسی سرد مہری کی توقع نہ
تھی۔"

"اس سرد مہری سے تمہاری کیا مراد ہے؟" میں
نے وضاحتی لہجے میں کہا۔

"میرا خیال تھا کہ اپنے بیٹے کے قتل کا سن کر وہ
چونک اٹھیں گے اور قاتل کی تلاش کے لیے میرے
ساتھ بھرپور تعاون کریں گے لیکن انہیں میری باتوں پر
اعتبار نہ آیا۔" مائیکل نے جواب دیا۔ "ہاں تو میں کہہ رہا
تھا کہ جب میں تمہارے گھر سے نکلا تو میری حالت
کسی شکست خوردہ کھلاڑی جیسی تھی' میں نے اسی وقت
یہ فیصلہ کرلیا کہ مجھے خود گرین سے ملنے اس کے ہوٹل
جانا چاہیے لیکن تم میرے پیچھے کیوں آئی تھیں؟"

"بس یوں ہی۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔
"گھر میں جی نہیں لگ رہا تھا۔"

"لگتا ہے کچھ چھپا رہی ہو؟"

"تم مجھے بھی اپنے جیسا سمجھتے ہو؟ آئرس سے
شادی کرکے مجھ سے جھوٹ بولتے رہے؟" میں نے
اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"بہت خوب۔" اس کے ساتھ ہی وہ کھلکھلا کر ہنس
پڑا۔

"تم شاید ڈیمن گرین کے متعلق کچھ کہہ رہے
تھے؟"

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ وان کے ڈیڈی کا ردعمل
میری توقعات کے بالکل برعکس تھا۔ ان کے اس
خلاف توقع برتاؤ نے مجھے بے حد مایوس کیا تھا۔ مایوسی
کے انہی لمحوں میں میں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ مجھے اپنی
اس مہم سے دست بردار ہوجانا چاہیے۔ یہی سوچ کر
میں گرین کے پاس پہنچا تھا' علاوہ ازیں میں اس سے
یہ بھی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اسے یہ کس نے بتایا تھا کہ
میں ان دنوں لندن میں مقیم ہوں۔" مائیکل دھیرے

دھیرے کہہ رہا تھا۔" گرین مجھے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا' اسے قطعی امید نہ تھی کہ میں یوں اچانک اس کے سامنے آ کھڑا ہوں گا۔ میں نے اس سے سب سے پہلا سوال یہ کیا کہ اسے میری آمد کا پتا کیسے چلا؟ لیکن اس نے یہ کہہ کر بات کو ٹال دیا کہ وہ کسی بُری نیت سے نہیں آیا۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ کھدائی کے اس کام پر اس کا بہت سرمایہ ضائع ہوا ہے۔"

"کیا تم نے اسے جڑاؤ پن کے متعلق بھی بتا دیا ہے؟"

"ہاں' میں اس سے یہ بات پوشیدہ نہیں رکھ سکتا تھا کہ جڑاؤ پن اٹلی کے ایک مال دار شخص کے نوادرات میں شامل ہو چکی ہے۔" مائیکل نے جواب دیا۔ "مجھے معلوم تھا کہ خود اسے بھی یہ بات جلد یا بدیر معلوم ہو جائے گی کہ جڑاؤ پن کہاں ہے؟ اور کس کی ملکیت ہے؟ پھر ایسی بات کو اخفا میں رکھنے سے کیا فائدہ؟"

"جڑاؤ پن کا سن کر اسے غصہ تو آیا ہوگا؟"

"ہاں لیکن اس کے باوجود وہ آپے سے باہر نہیں ہوا۔" مائیکل بولا۔ "تاجرانہ ذہنیت کے مالک عام طور پر غصے میں کم ہی آیا کرتے ہیں پھر وہ چند قانونی نوعیت کے کاغذات لے آیا۔ وہ یہ کاغذات مجھے دکھانا چاہتا تھا اس کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مجھے بلیک میل کرنے پر تلا ہوا ہے' مجھے یقین ہے کہ وہ مسلسل میرا تعاقب کرتا رہا ہے بصورت دیگر اسے یہ کیسے پتا چلا کہ میں لندن میں ہوں اور تم سے ملاقات بھی کر چکا ہوں۔"

"کہتے رہو۔" میں نے کہا۔

"اور پھر تم یہاں آ پہنچیں۔" مائیکل نے کہا۔ "میں تم سے ملنے کے لیے کمرے سے نکلا ہی تھا کہ وہ میرے راستے میں حائل ہو گیا۔ اس کا یہ رویہ ناقابل فہم تھا' میرے استفسار پر اس نے کہا کہ میں اس کی مرضی کے بغیر کمرے سے باہر قدم نہیں رکھوں گا۔ میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ وہ مجھے کسی جال میں پھانسنا چاہتا ہے پھر اس نے مجھے ایک لفافہ دکھایا جس میں میری اور آئرس کی شادی کے کاغذات بند تھے۔"

"شادی کے کاغذات؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اور یہ کاغذات جعلی تھے۔" مائیکل نے جواب دیا۔ "یہ بھی گرین ہی کی ایک چال تھی اس طرح وہ مجھے تمہاری نظروں سے گرانا چاہتا تھا۔"

"اور اس کی یہ مذموم کوشش کارگر نہیں ہو سکی۔" میں نے کہا۔ "یقین رکھو مائیکل وہ ذلیل شخص ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا' آؤ اب چلیں۔" اور اس کے ساتھ ہم ہی بار سے باہر آ گئے۔

❁ ...... ❁ ...... ❁

جب میں گھر پہنچی تو صبح کے ڈھائی بج رہے تھے' جوتے ہاتھ میں لیے میں چپکے سے گھر میں داخل ہو گئی۔ ابھی میں نے زینے پر پاؤں رکھا ہی تھا کہ مجھے اپنی دائیں طرف کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی' میں نے چونک کر دیکھا تو میرے سامنے انتھونی اور اس کے ڈیڈی کھڑے تھے ان کے قریب ایک اور آدمی بھی تھا۔ اسے پہچاننے میں مجھے کچھ زیادہ وقت نہیں لگا' یہ ڈنٹن گرین تھا انہیں اپنے قریب پا کر میں ساکت و صامت ہی تو رہ گئی۔

"کہاں سے آ رہی ہو ایمنڈا؟" مسٹر ہرکورٹ نے قدرے حیرت سے پوچھا۔ "اتنی دیر کہاں رہ گئی تھیں؟"

"ہم رات بھر تمہارا انتظار کرتے رہے ہیں۔" انتھونی غصے سے بولا۔ "کہاں تھیں تم؟"

"میں جہاں کہیں بھی تھی تمہیں اس سے کیا؟" میں نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "مجھے

نیند آ رہی ہے' میں اپنے کمرے میں جارہی ہوں۔"

"ہم بہت فکر مند تھے بیٹی!" مسٹر ہر کورٹ نے کہا۔ "میں نے انتھونی کو تمہاری تلاش میں بھیجا تھا لیکن تم نہ جانے کہاں تھیں؟"

"آپ کو میری فکر نہیں کرنی چاہیے میں کوئی ننھی بچی نہیں ہوں۔" میں نے تیز تیز لہجے میں کہا۔ "میں خود مختار ہوں' جہاں جی چاہے جاسکتی ہوں۔"

"یہ آج تمہیں کیا ہو گیا ہے ایمنڈا! تمہارا لہجہ اس قدر تلخ کیوں ہے؟" انتھونی تعجب سے بولا۔

"آپ لوگوں کو میری نجی معاملات میں مداخلت نہیں کرنی چاہیئے میں اسے برداشت نہیں کرسکتی۔" میں نے رکھائی سے جواب دیا۔

"تم بھول رہی ہو ایمنڈا! وان کی موت کا مطلب یہ نہیں کہ تم بالکل آزاد ہوگئی ہو۔" مسٹر ہر کورٹ نے کہا۔ "اگر وہ زندہ ہوتا تو بھی میں تم سے اس بات کا جواب طلب کرسکتا تھا کہ تم رات بھر کہاں رہی ہو؟"

"اگر وہ زندہ ہوتا تو اس شخص کو یہاں گھسنے کی اجازت کبھی نہ دیتا۔" میں نے ڈٹن گرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بے شک۔" ڈٹن گرین نے سر کو مودبانہ انداز میں خم دیتے ہوئے جواب دیا۔ "معافی چاہتا ہوں کہ میری آمد آپ کی ناگواری کا سبب بنی۔ اس کے ساتھ ساتھ میں اپنے اس رویے کی بھی معافی چاہتا ہوں کہ میں نے مسٹر مائیکل کو خوامخواہ روکے رکھا اور آپ اس سے جلد ملاقات نہ کرسکیں۔ واقعی مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" پھر وہ انتھونی اور اس کے ڈیڈی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ "میں آپ کو بتا چکا ہوں نا کہ ایمنڈا اور مائیکل تنہائی میں کوئی اہم بات کرنا چاہتے تھے اور میں نے انہیں اپنے کمرے کی پیش کش بھی کی تھی۔"

"سنئے مسٹر گرین!" میں نے غصے سے کہا۔ "میں آپ سے ملنے ہوٹل نہیں گئی تھی' مجھے واقعی مائیکل سے ملنا تھا' آپ کو ہمارے معاملے میں مداخلت کا حق نہیں پہنچتا' براہِ کرم یہاں سے فوراً تشریف لے جائیے' آئندہ کبھی مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کیجیے گا' مجھے آپ سے نفرت ہے۔"

"آپ کو مجھ سے نفرت کا حق پہنچتا ہے اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ میں نے آپ کو یہ بتا کر جرم کیا ہے کہ مائیکل شادی شدہ ہے اور آپ کو اس کا پیچھا چھوڑ دینا چاہیے۔" ڈٹن گرین شاطرانہ مسکراہٹ سے بولا۔ "میں جانتا ہوں کہ آپ یہ جذباتی دھچکا برداشت نہیں کرسکی ہیں' مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔"

"یہ محض بکواس ہے' سراسر جھوٹ ہے۔" میں نے چیختے ہوئے کہا۔ "مائیکل مجھے سب کچھ بتا چکا ہے۔"

"مگر میرے پاس اس کی شادی کے کاغذات بھی ہیں۔" گرین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ محض فراڈ ہے' مائیکل ان کاغذات کی حقیقت خوب جانتا ہے' تم اسے بلیک میل کرنا چاہتے ہو مگر یہ محض تمہاری خوش فہمی ہے۔" میں نے غصے سے کہا۔

"تم ہمارے مہمان کی توہین کررہی ہو ایمنڈا!" مسٹر ہر کورٹ نے غصے سے کہا۔

"حیرت ہے مسٹر گرین نے آپ لوگوں کو اتنی جلدی اپنا گرویدہ بنالیا ہے۔" میں نے اپنے سسر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ مسٹر گرین نے میرے شوہر کو سرمایہ فراہم کیا تھا۔"

"مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ کس نے سرمایہ فراہم کیا تھا یا نہیں؟" مسٹر ہر کورٹ نے کہا۔ "میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ مسٹر گرین ہمارے مہمان ہیں۔"

"بہت خوب۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''آپ نے تو اپنے بیٹے کو سرمایہ فراہم کرنے سے انکار کردیا تھا نا؟ پھر آپ کو مسٹر گرین سے اتنی ہمدردی کیوں ہے؟ آپ کو تو اس شخص سے بات تک نہیں کرنی چاہیے تھی کیونکہ اس نے وان کی مدد کی تھی۔''

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا؟''

''آپ کے اپنے بیٹے کو محض اس لیے سرمایہ فراہم کرنے سے انکار کردیا تھا کہ وہ آپ کے تاریخی مفروضات کو درست نہیں سمجھتا تھا اور آپ یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ جلد یا بدیر وہ آپ کے مفروضات کو باطل ثابت کردے گا۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

''یہ جھوٹ ہے۔'' مسٹر ہرکورٹ نے چیخ کر کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے مائیکل کے بچے نے تمہارے خوب کان بھرے ہیں۔''

''آپ نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔'' گرین نے میرے سسر سے کہا۔ ''مائیکل دراصل آپ کو بلیک میل کرنا چاہتا ہے۔''

''بکواس بند کرو۔'' میں نے چیخ کر کہا۔ ''تم ہمارے خیر خواہ بن کر آئے ہو؟''

گرین کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی، انتھونی تیزی سے کمرے میں پہنچا اور پھر فوراً ہی واپس آتے ہوئے بولا۔

''مسٹر گرین! آپ کا فون ہے۔''

''معاف کیجیے گا میں ابھی آیا۔'' گرین نے دھیرے سے کہا اور کمرے کی طرف چل دیا اور جب وہ واپس آیا تو خاصا گھبرایا ہوا تھا۔

''معاف کیجیے گا میں بہت جلدی میں ہوں۔'' وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''مائیکل کی بیوی کا فون تھا اس نے بتایا کہ مائیکل اسے قتل کرنے پر تلا ہوا ہے، وہ کمرے میں بند ہے مجھے جلد از جلد وہاں پہنچنا ہوگا۔''

یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

''میرا خیال ہے مجھے مسٹر گرین کو اپنی گاڑی میں لے جانا چاہیے اس وقت انہیں ٹیکسی وغیرہ مشکل ہی سے ملے گی۔'' انتھونی نے اپنے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' مسٹر ہرکورٹ نے کہا۔ ''جلدی کرو۔'' انتھونی کے جانے کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''سنو بیٹی! تمہیں مائیکل سے دور رہنا چاہیے وہ کوئی اچھا آدمی معلوم نہیں ہوتا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی طرف چل دیے۔

ان کے جانے کے بعد میں سیدھی بڑے کمرے میں پہنچی اور براؤنز ہوٹل کا نمبر ڈائل کیا۔ ڈیسک کلرک نے مہذبانہ لہجے میں پوچھا۔

''فرمایئے کس سے ملنا ہے آپ کو؟''

''کیا مسٹر مائیکل اپنے کمرے میں ہیں؟'' میں نے بے چینی سے پوچھا۔

''جی ہاں، وہ اس وقت آرام فرمارہے ہیں۔'' کلرک نے جواب دیا۔

''مجھے ان سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔

''مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکتا مسٹر مائیکل نے کہہ رکھا ہے کہ انہیں پریشان نہ کیا جائے۔''

''مگر مجھے ان سے ضروری بات کرنی ہے۔''

''آپ وہ بات مجھے بتادیجیے میں انہیں مطلع کردوں گا مجھ پر بھروسہ رکھیے۔''

''نہیں میں ان سے خود بات کرنا چاہتی ہوں۔''

''معاف کیجیے گا میں انہیں جگانے کی جرأت نہیں کرسکتا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے سلسلہ منقطع کردیا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ گرین نے جھوٹ بولا تھا' مائیکل تو اپنے ہوٹل میں آرام کر رہا ہے اور آئرس ہلٹن ہوٹل میں ہے۔ وہاں اسے کون قتل کرنے چلا تھا؟ صاف ظاہر تھا کہ مائیکل کو پھانسنے کے لیے کوئی نئی چال چلی جا رہی تھی مگر میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ میں مائیکل کا ساتھ دوں گی' اسے میری ضرورت ہے مجھے جلد از جلد ہلٹن پہنچنا چاہیے۔

میں نے اپنے کمرے میں پہنچتے ہی جلدی جلدی لباس تبدیل کیا اور پھر دبے پاؤں گھر سے نکل آئی' خوش قسمتی سے فوراً ہی ٹیکسی مل گئی اور تھوڑی ہی دیر بعد میں ہلٹن کے سامنے جا اتری۔

جب میں گرین کے کمرے کے سامنے پہنچی تو دروازہ بند تھا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا اور ایک طرف ہٹ گئی' چند سیکنڈ بعد دروازہ کھلا تو گرین اور انتھونی میرے سامنے کھڑے تھے۔

"کیا ہوا؟ آئرس خیریت سے ہے نا؟" میں نے گرین سے پوچھا۔

"میں پولیس کو مطلع کرنے جا رہا ہوں۔" انتھونی نے دانت بھینچتے ہوئے کہا۔ "تم یہاں کیوں آئی ہو؟ فوراً یہاں سے چلی جاؤ ورنہ پولیس تمہیں بھی ملوث کر لے گی۔"

"تو کیا آئرس......؟" میں نے خوف زدہ آواز میں کہا۔

"ہاں وہ قتل ہو چکی ہے۔" انتھونی غصے سے بولا۔ "کیا مسٹر گرین نے ہمیں نہیں بتایا تھا کہ آئرس کی زندگی خطرے میں ہے؟"

"مگر مائیکل تو......" میں اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی' میری قوت گویائی مسلوب ہوتی جا رہی تھی۔

"کچھ دیر پہلے وہ یہیں تھا۔" انتھونی بولا اور ریسیور اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

"رک جاؤ' انتھونی...... رک جاؤ۔" میں ملتجیانہ لہجے میں بولی۔ "مائیکل بے گناہ ہے وہ تو اس وقت بھی اپنے ہوٹل میں موجود ہے۔"

"مگر کچھ دیر پہلے وہ یہیں تھا' آئرس کو قتل کرنے کے بعد یہاں سے فرار ہو گیا ہے۔" انتھونی نے جواب دیا۔ "کیا تم آئرس کی لاش دیکھنا چاہتی ہو؟"

"ہاں' مجھے یقین نہیں آتا کہ مقتولہ آئرس ہی ہے۔" میں لرزیدہ آواز میں کہا۔

"اسے جانے دو گرین!" انتھونی گرین سے مخاطب ہوا۔ "اسے بھی دیکھ لینے دو کہ مائیکل نے آئرس کو کس بے دردی سے قتل کیا ہے۔"

میں نے دہلیز پار کر کے کمرے میں نگاہ ڈالی تو فرط خوف سے میری چیخ حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ سبز قالین پر آئرس کی خون آلود لاش پڑی تھی' میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا اور دوسرے ہی لمحے میں بے ہوش ہو چکی تھی۔

❁......❁......❁

مجھے ہوش آیا تو میں اپنے کمرے میں بستر پر دراز تھی' برنیس میرے قریب بیٹھی تھی۔

"میں کہاں ہوں؟" میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ اپنے گھر میں ہیں۔" برنیس مسکرا کر بولی۔ "آپ بالکل ٹھیک ہیں۔"

"مگر وہ آئرس کی لاش...... وہ سب کیا تھا؟"

"وہ محض ایک خواب تھا۔" برنیس بولی۔

"جھوٹ مت بولو۔" میں نے غصے سے کہا۔ "نکل جاؤ میرے کمرے سے' میں تنہائی چاہتی ہوں۔"

"آپ کی حالت ٹھیک نہیں ہے' گزشتہ شب کے حادثے نے آپ کے اعصاب کو بری طرح متاثر کیا

ہے۔" برنیس نے کہا۔" آپ کی رنگت برف جیسی سفید ہوچکی ہے ایسی حالت میں آپ کو نہیں چھوڑا جاسکتا۔"

"گزشتہ شب والا حادثہ؟ کیا تم بھی جانتی ہو اس حادثے کے متعلق؟" میں نے حیرت بھری آواز میں کہا۔

"ہاں' مگر صرف اتنا ہی کہ آئرس کو مائیکل نے قتل کردیا ہے۔" برنیس نے جواب دیا۔

"تمہیں یہ کس نے بتایا ہے؟" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"مسٹر ہرکورٹ کہہ رہے تھے کہ مسٹر مائیکل کیڈ نے اپنی بیوی کو قتل کردیا ہے۔" برنیس نے جواب دیا۔ "ان کا حکم ہے کہ میں آپ کو کمرے سے باہر نہ جانے دوں۔"

"مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔" میں نے غصے سے کہا۔

"آپ کہیں نہیں جاسکتیں۔" برنیس نے میرے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔" آپ ناشتا کیجیے اور آرام سے دوبارہ اپنے بستر لیٹ جایئے۔"

"میں صرف چائے پیوں گی' باقی سامان اٹھا لے جاؤ۔" میں نے بےزاری سے کہا۔

"جیسے آپ کی مرضی۔" وہ ناشتے کے برتن اٹھاتے ہوئے بولی۔" ویسے اگر آپ ناشتا کرلیتیں تو بہتر تھا کیونکہ بھوک سے آپ اور بھی نڈھال ہوجائیں گی۔"

"مجھے تمہاری نصیحت کی ضرورت نہیں۔" میں نے غصے سے کہا۔

"اگر آپ مسٹر مائیکل سے ملنے کی سوچ رہی ہیں تو اب یہ بے سود ہے۔" برنیس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"میرا خیال ہے مسٹر مائیکل کو پولیس اپنی حراست میں لے چکی ہے۔" وہ فاتحانہ تبسم سے بولی۔" آج صبح ریڈیو پر بھی اعلان کیا جاچکا ہے کہ مائیکل نامی ایک شخص نے اپنی بیوی کو قتل کردیا ہے اور پولیس اسے تلاش کررہی ہے۔ علاوہ ازیں پولیس ہر اس شخص سے رابطہ قائم کررہی ہے جو قاتل اور مقتولہ سے واقف ہے۔ اسی لیے مسٹر ہرکورٹ نے آپ کے باہر جانے پر پابندی لگادی ہے۔"

"تو کیا پولیس بھی یہ سمجھتی ہے کہ آئرس' مائیکل کی بیوی تھی؟" میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔" پولیس کو یہ کس نے بتایا ہے کہ آئرس کا قاتل مائیکل ہے؟"

"مسٹر ونٹن گرین کے سوا اور کون بتا سکتا ہے؟" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔" مسٹر گرین نے تو ہمیں بھی بتایا تھا کہ مائیکل آئرس کو قتل کرنے کی کوشش کررہا ہے۔"

"گرین کو یہ کس نے بتایا تھا کہ ٹیلی فون پر کون بول رہا ہے؟" میں نے معصومیت سے پوچھا۔

"انتھونی نے۔" وہ جلدی سے بولی۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ انتھونی بھی آئرس سے واقف تھا' بصورت دیگر اس نے یہ کیونکر جان لیا کہ فون پر بات کرنے والی عورت آئرس ہی ہے۔"

"مگر انتھونی نے تو کبھی یہ نہیں بتایا کہ وہ اس نام کی کسی عورت سے واقف ہے؟"

"پولیس اس سے ضرور معلوم کرلے گی۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔" میں خود پولیس کو بتادوں گی کہ مسٹر انتھونی مقتولہ کے پرانے شناسا ہیں۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" وہ چونک کر بولی۔

"پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ ریڈیو پر کیا اعلان ہوا ہے؟ کیا خبر میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ قتل ہونیوالی عورت کا نام آئرس ہی تھا اور وہ مسٹر مائیکل کی بیوی تھی؟"

"نہیں۔" برنیس نے گھبراہٹ سے کہا۔" خبروں

میں ابھی تو صرف اتنا ہی کہا گیا ہے کہ کسی شخص نے ایک عورت کو قتل کر دیا ہے۔"

"پھر تمہیں کس نے بتایا ہے کہ مائیکل اور آئرس میاں بیوی تھے؟"

"مجھے مسز انتھونی نے بتایا تھا کہ مائیکل کی بیوی کا نام آئرس ہے اور وہ اس سے واقف ہے۔" برنیس نے جواب دیا۔

"پھر تو انتھونی کا بچنا مشکل ہے۔" میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی؟" وہ تحیر زدہ آواز میں بولی۔

"مطلب صاف ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "پولیس کو انتھونی کو اپنی حراست میں لینا پڑے گا۔"

"مگر انتھونی نے آئرس کو قتل نہیں کیا؟" وہ حیرت سے بولی۔

"میں کب کہہ رہی ہوں کہ اسے انتھونی نے قتل کیا ہے، میں تو صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ پولیس انتھونی سے بھی ضرور پوچھ گچھ کرے گی۔"

"اگر آپ پولیس کو یہ بات نہ بتائیں تو؟" وہ ملتجیانہ لہجے میں بولی۔

"نہیں بتاؤں گی مگر تم اس قدر فکر مند کیوں ہو؟ تمہیں انتھونی سے اتنی ہمدردی کیوں ہے؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"وہ میرے باس کے بیٹے ہیں۔" برنیس نے دھیرے سے جواب دیا۔ "ان سے ہمدردی کرنا میرا فرض ہے۔"

"اچھا یہ بتاؤ تم مسز گرین کو کب سے جانتی ہو؟" میں نے اس کا جواب نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں انہیں زیادہ عرصے سے نہیں جانتی۔" وہ بولی۔ "لندن میں ایک پارٹی تھی اس میں وہ بھی شریک تھے بس وہیں میرا اور ان کا تعارف ہوا۔"

"میرا خیال ہے تم گرین کو بہت پہلے سے جانتی ہو میرا مطلب ہے لندن والی پارٹی سے بہت پہلے۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"نہیں تو....." وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"انتھونی جب اٹلی میں تھا تو اس نے اپنے خطوں میں گرین کا ذکر ضرور کیا ہوگا۔" میں نے اس کی گھبراہٹ بھانپتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تمہیں اس سے انکار ہے کہ تم نے گرین کا نام پہلے کبھی نہیں سنا تھا؟"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں۔" وہ ہار مانتے ہوئے بولی۔ "مسز انتھونی اکثر اپنے خطوط میں مسٹر گرین کا ذکر کرتے رہتے تھے مگر یہ خط میرے نام تو نہیں ہوتے تھے۔"

"مجھے معلوم ہے کہ وہ خط مسٹر برکورٹ کے نام آتے تھے۔" میں نے کہا۔

"مگر آپ یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہی ہیں؟" وہ زچ ہوتے ہوئے بولی۔

"آئرس کو تم کب سے جانتی تھیں؟" میں نے اسے مزید الجھاتے ہوئے کہا۔

"آئرس کو؟ میں اسے بالکل نہیں جانتی۔" وہ گھبراہٹ بھری آواز میں بولی۔

"تم جھوٹ بولتی ہو برنیس!" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "تمہیں یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ آئرس گرین کی پرانی دوست تھی۔"

"ہاں مگر میں اس سے کبھی نہیں ملی؟" وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔

"تم اسے کیسے جانتی ہو؟"

"انتھونی نے اپنے خطوط میں اس کا ذکر بھی کیا تھا۔" وہ خوف زدہ آواز میں بولی۔

"اس سے ثابت ہوا کہ انقونی، آئرس سے خوب اچھی طرح واقف تھا، ٹھیک ہے نا؟ کیا تمہیں اس سے اختلاف ہے؟"

"جی ہاں آپ درست فرماتی ہیں۔" وہ منہ لٹکاتے ہوئے بولی۔

"اب نکل جاؤ یہاں سے۔" میں نے پلنگ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اگر تم نے میری اور اپنی اس گفتگو کا ذکر کسی سے کیا تو یاد رکھو میں پولیس کو سب کچھ بتادوں گی۔"

"میں کسی سے ذکر نہیں کروں گی۔" یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے نکل گئی۔

❀......❀......❀
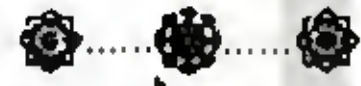
میں جلد از جلد براؤنز ہوٹل پہنچنا چاہتی تھی تاکہ مائیکل کے متعلق کچھ معلوم کرسکوں۔ میں نے برنیس کو اسی لیے اپنے کمرے سے بھگایا تھا کہ وہ یہاں سے فرار ہوسکوں۔

میں نے جلدی جلدی غسل کیا اور کپڑے تبدیل کرنے کے بعد کمرے سے نکل آئی۔ باہر ہلکی ہلکی بارش ہورہی تھی، میں نے برساتی اوڑھ رکھی تھی برآمدے میں پہنچ کر میں نے اِدھر اُدھر دیکھا آس پاس کوئی نہیں تھا لیکن جونہی میں آگے بڑھی نہ جانے انقونی کہاں سے برآمد ہوا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا میرے سامنے آرکا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر گھسیٹا اور اپنے کمرے میں لے آیا۔

"مجھے جانے دو۔" میں نے غصے سے کہا۔

"تم کہاں جانا چاہتی ہو؟" وہ دھیرے بولا۔

"مجھے بے وقوف مت بناؤ مینڈی!"

"میں نے کسی کو بے وقوف نہیں بنایا، میں اس گھر میں نہیں رہنا چاہتی۔" میں نے غصے سے کہا۔ "میں اس گھر سے تنگ آ گئی ہوں۔"

"ڈیڈی اس وقت گھر پر نہیں ہیں ان کی واپسی تک تو تمہیں یہاں رکنا ہی پڑے گا، یہ ان کا حکم ہے۔" انقونی نے میرے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"انہیں تم سے کوئی ضروری بات کرنی ہے۔"

"جب تک میں بھی لوٹ آؤں گی۔"

"اگر تم مائیکل سے ملنے جارہی ہو تو یہ تمہاری حماقت ہے۔" انقونی بولا۔ "ڈیڈی کا حکم ہے تم ان کی اجازت کے بغیر کسی سے نہیں مل سکتیں۔"

"میں اس سے ضرور ملوں گی۔"

"مجھے یقین ہے کہ مسٹر مائیکل اس وقت پولیس کی حراست میں ہوں گے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے، جھوٹے بیانات اسے زیادہ عرصے تک پولیس کی حراست میں نہیں رکھ سکتے۔ آج نہیں تو کل حقائق سے پردہ اٹھ جائے گا۔" میں نے دلیری سے جواب دیا۔ "اگر وہ واقعی پولیس کی حراست میں ہے تو مجھے جلدی کرنی چاہیے۔"

"کیا کہہ رہی ہو؟" وہ حیران ہوکر بولا۔

"میں خود بھی پولیس کے پاس جانا چاہتی ہوں، میں انہیں بہت کچھ بتانا چاہتی ہوں تمہارے متعلق، تمہارے ڈیڈی کے متعلق اور تمہارے دوست مسٹر گرین کے متعلق۔"

"اسی لیے تو ہم تمہیں یہاں بند رکھنا چاہتے ہیں۔" انقونی بولا۔ "ہمیں معلوم ہے تم مائیکل کی ہمدردی میں ہم سب کو بدنام کرسکتی ہو۔"

"میں کسی کو بدنام نہیں کرنا چاہتی، میں صرف حقائق سے پردہ اٹھانا چاہتی ہوں۔ جھوٹ اور سچ کو الگ الگ کرنا چاہتی ہوں، مجھے تم پر ترس آرہا ہے انقونی!"

"سنو مینڈی!" انقونی نے مجھے اپنے بازوؤں میں لینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"مجھ سے دور رہو نہیں تو میں چیخ پڑوں گی۔" میں نے اس سے الگ ہوتے ہوئے کہا۔ "یقین نہ آئے تو مجھے ہاتھ لگا کر دیکھ لو۔"

"خدا کے لیے مجھے سمجھنے کی کوشش کرو مینڈی!" وہ عاجزی سے بولا۔ "میں تمہارا دشمن نہیں ہوں' اس گھر میں کوئی بھی تم سے عداوت نہیں رکھتا۔ جمی کو تم سے ہمدردی ہے' سچ مانو میں رات بھر سو نہیں سکا۔ یقین جانو مجھے مائیکل سے بھی کوئی عداوت نہیں ہے' اگر اس نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا ہے تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ ہمیں اس قصے سے الگ ہی رہنا چاہیے۔"

"مائیکل نے آئرس کو قتل نہیں کیا۔" میں نے بلند آواز میں کہا۔ "اور نہ ہی مائیکل کا اس سے کوئی رشتہ تھا' وہ اس کی بیوی نہیں تھی۔"

"ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ آئرس کس کی بیوی تھی۔" انتھونی بولا۔ "ہمیں اس مسئلے سے بہر طور الگ رہنا ہے۔"

"ہم اس سے الگ نہیں رہ سکتے۔" میں نے جواب دیا۔ "قتل کی شب گرین ہمارے یہاں موجود تھا اور بقول تمہارے آئرس نے اسے فون پر اطلاع دی تھی کہ مائیکل اسے قتل کرنے کی کوشش کر رہا ہے' ایسی صورت میں ہم لاتعلق کیونکر رہ سکتے ہیں؟"

"اگر پولیس نے ہم سے پوچھا تو ہمارا ایک ہی جواب ہوگا کہ ہم اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتے۔" انتھونی نے کہا۔ "زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ گرین کا فون آیا تھا۔"

"لیکن میں پولیس سے کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتی۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "میں پولیس سے یہ بھی کہوں گی کہ وہ مائیکل اور آئرس کی شادی کے کاغذات کی جانچ پڑتال کرے۔"

"ایسی حماقت مت کرنا مینڈی! اس سے ہمارے خاندان کی بڑی بدنامی ہوگی۔" انتھونی بولا۔

"ہوا کرے بدنامی' مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ مائیکل کو بچانے کی خاطر مجھے سچائی کا سہارا لینا ہی ہوگا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"تمہیں ہمارے خاندان سے کوئی ہمدردی نہیں ہے؟ تم ہمارے احسانات کا بدلہ اس طرح چکانا چاہتی ہو؟" انتھونی کی آواز میں بے بسی کی جھلک نمایاں تھی۔

"کون سے احسانات اور کیسے احسانات؟ میں نے بے رخی سے کہا۔

"جب سے وان کا انتقال ہوا ہم نے تمہیں خوش رکھنے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا؟"

"لیکن میں یہ نہیں سمجھ سکی کہ آئرس کے قتل کا ان احسانات سے کیا تعلق ہے۔ جو تم نے مجھ پر کیے ہیں؟ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ کوئی بے گناہ سزا بھگتتا رہے اور ہم خاموش کھڑے تماشا دیکھتے رہیں؟"

"اگر مائیکل بے گناہ ہے تو پولیس خود ہی اسے چھوڑ دے گی' ہمیں کیا پڑی ہے پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑانے کی؟"

"میں تمہاری طرح خود غرض نہیں ہوں' مسٹر انتھونی!" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "میں کسی بے گناہ پر ظلم ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔"

"مجھے سمجھنے کی کوشش کرو مینڈی!" انتھونی عاجزی سے بولا۔ "تم بے شک چلی جانا لیکن جانے سے پہلے میری آخری بات سنتی جاؤ۔"

"اچھا تو کہو۔" میں نے اس کی کمزوری کو بھانپتے ہوئے کہا۔

"جب سے میرے بھائی کا انتقال ہوا ہے میں نے تمہیں خوش رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔ میں نے تمہارے لیے جو کچھ بھی کیا ہے محض اس لیے کہ مجھے تم سے محبت ہے مینڈی! میں تم سے دور نہیں رہ

سکتا' خدا شاہد ہے کہ مجھے تم سے والہانہ محبت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں تمہیں روک رہا ہوں' مجھے تمہارا تحفظ مقصود ہے مینڈی! میں تمہارے بغیر نہیں رک سکتا۔"

"ایسا مت کہو'تم زندہ رہو گے اور میرے بغیر' میں جا رہی ہوں..... میں جا رہی ہوں....." میں نے فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

وہ مجھے دروازے کی طرف بڑھتے دیکھ کر کچھ نہیں بولا'اس کے ترکش کا آخری تیر بھی ضائع ہو گیا تھا۔ ابھی میں باہر پہنچی ہی تھی کہ اچانک فون کی گھنٹی بج اٹھی' میں تیزی سے پلٹی اور اس سے پہلے انتھونی ریسیور تک پہنچتا۔ میں ریسیور اٹھا چکی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اس وقت مائیکل ہی نے فون کیا ہوگا۔

"ہیلو' ایمنڈا بول رہی ہوں۔" میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا' خون کنپٹیوں میں جمع ہونے لگا تھا۔

"سنو ایمنڈا....." یہ مائیکل ہی کی آواز تھی' وہی آواز جس کی سماعت کا انتظار صدیوں پر محیط ہو گیا تھا۔ "میرے پاس زیادہ وقت نہیں ڈیئر!" وہ کہہ رہا تھا اور میں وفور جذبات سے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ "کیا تم مجھ سے ملنے آ سکتی ہو؟ میں برٹش میوزیم کے مصری سیکشن میں تمہارا انتظار کروں گا' جلدی پہنچو..... میں....." اور اس کے ساتھ ہی سلسلہ کلام منقطع ہو گیا۔

"کس کا فون تھا؟" انتھونی نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ مت پوچھو' خدا حافظ۔" میں نے تیزی سے کہا اور دوڑتی ہوئی برآمدے میں پہنچی پھر بارش کی پروا کیے بغیر آگے بڑھ گئی۔

❁.....❁.....❁

"میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ تم اتنی جلدی پہنچ جاؤ گی۔" مائیکل نے مسکراتے ہوئے میرا استقبال کیا۔ اس کا چہرہ زرد ہو چکا تھا۔ "مجھے اندیشہ تھا کہ وہ لوگ تمہیں نہیں آنے دیں گے' تم نے کسی کو بتایا تو نہیں کہ کس سے ملنے جا رہی ہو؟"

"نہیں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"مجھے یقین تھا تم ضرور آؤ گی۔" مائیکل بولا۔ "وہ لوگ مجھے ہی قاتل سمجھ رہے ہوں گے؟ یہی بات ہے نا؟"

"ان کے سوچنے اور نہ سوچنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"میں پولیس کی بات کر رہا ہوں۔"

"پولیس کے متعلق تو مجھے کچھ نہیں معلوم۔" میں نے اس کے زرد چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے مینڈی کہ تمہیں اصل حالات سے آگاہ کر سکوں۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔ "ممکن ہے ہوٹل پہنچتے ہی پولیس مجھے گرفتار کر لے آج صبح جب انہوں نے مجھ سے پوچھ گچھ کی تھی تو میں نے انہیں مطمئن کر دیا تھا لیکن مجھے یقین ہے کہ وٹنی گرین کے بعد وہ مجھے ضرور حراست میں لے لیں گے۔"

"تم واپس مت جاؤ مائیکل!" میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "خدا کے لیے واپس مت جاؤ۔"

"ایمنڈا....." اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ "کیا تمہیں یقین ہے کہ میں نے آئرس کو قتل نہیں کیا؟ بولو ایمنڈا.....؟"

"مجھے معلوم ہے کہ تم بے گناہ ہو۔" میں نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ "مجھے تو اسی وقت شک پڑ گیا تھا جب اس عورت نے گرین کو فون کیا تھا۔"

"کس عورت نے؟"

"آئرس نے۔" میں نے جواب دیا۔ "گزشتہ شب جب میں گھر پہنچی تو گرین پہلے سے وہاں موجود تھا۔ اس نے مجھے بار بار یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ تم قابل اعتماد شخص نہیں ہو۔"

"لیکن تم نے کس عورت کا ذکر کیا تھا ابھی۔"

"کیا پولیس نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟"

"پولیس پوچھا کرتی ہے' بتایا نہیں کرتی۔" مائیکل نے جواب دیا۔ "مجھے تو اتنا ہی معلوم ہوا ہے کہ آئرس قتل کر دی گئی ہے' وہ بھی ریڈیو سن کر۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اسے اس جگہ قتل کیا گیا ہے' اخبارات کے مطابق یہ واردات ہوٹل ہلٹن میں ہوئی ہے گزشتہ شب جب میں تم سے جدا ہوا تو سیدھا اپنے ہوٹل چلا آیا تھا' میرا خیال ہے وہ کسی دوسرے ہوٹل میں منتقل ہو گئی تھی۔"

"تو تم ہلٹن نہیں گئے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں' پولیس میرے ہوٹل میں آئی تھی' واردات کے وقت میں اپنے ہوٹل میں موجود تھا۔" مائیکل نے جواب دیا۔ "ہاں تو تم نے بتایا نہیں کہ کس عورت نے گرین کو فون کیا تھا؟"

"ہم سب بڑے کمرے میں جمع تھے کہ فون کی گھنٹی بجی انتھونی نے کال سن کر اطلاع دی کہ مسٹر گرین کا فون ہے۔ گرین فوراً فون پر پہنچا اور جب واپس آیا تو کہنے لگا کہ آئرس کا فون تھا' اس نے بتایا کہ مائیکل اسے قتل کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور وہ کمرے میں بند ہے۔"

"تو گرین اپنی چال چل چکا ہے۔" مائیکل نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ "گرین کو معلوم ہے کہ جڑاؤ پن کا سراغ لگ چکا ہے' اب کوئی وقت جاتا ہے کہ اسے قانون کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ تمہارے سسر سے رقم ہتھیانا چاہتا ہے لیکن میں اس کی یہ چال کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔"

"آؤ کسی دوسری جگہ چلتے ہیں' یہاں میرا دم گھٹ رہا ہے۔" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" مائیکل نے دھیرے سے بولا اور ہم دونوں میوزیم سے باہر چلے آئے۔ قریب ہی ایک انڈین ریسٹوران تھا' ہم دونوں اس کے اندر چلے گئے۔

"اب کیا ارادہ ہے؟" میں نے مائیکل سے کہا۔ "واپس جاؤ گے؟"

"اگر میں واپس نہ گیا تو پولیس کا شک یقین میں بدل جائے گا۔" مائیکل بولا۔ "واپس جانے ہی میں عافیت ہے' ہوٹل کا ڈیسک کلرک اس بات کا شاہد ہے کہ میں سارا دن اپنے ہوٹل سے باہر نہیں نکلا۔"

"یہ تم نے بہت اچھا کیا۔" میں نے مائیکل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "شاید یہی وجہ تھی کہ تم نے میرا فون بھی نہیں سنا تھا۔"

"ہاں میں نے ڈیسک کلرک کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ مجھے قطعی پریشان نہ کیا جائے۔" مائیکل نے کہا۔

"تمہارے خیال میں آئرس کا قاتل کون ہو سکتا ہے؟" میں نے استفسار کیا۔

"مجھے یقین ہے کہ گرین ایسی بہیمانہ واردات کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔" مائیکل نے جواب دیا۔ "وہ مجھے پھانسنے کے لیے سب کچھ کر سکتا ہے مگر قتل کا ارتکاب نہیں کر سکتا۔"

"تو پھر؟"

"انتھونی بھی ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ آئرس سے اس کی عداوت نہیں یوں بھی قتل کے وقت وہ گرین کے

گفتگو ایک آرٹ ہے

جو کچھ کہنے کا ارادہ ہو ضرور کہیے۔ دوران گفتگو خاموش رہنے کی صرف ایک وجہ ہونی چاہیے وہ یہ کہ آپ کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہے ورنہ جتنی چاہے باتیں کیجیے۔ اگر کسی اور نے بولنا شروع کر دیا تو موقع ہاتھ سے نکل جائے گا اور کوئی دوسرا آپ کو بور کرنے لگا۔ (بور وہ شخص ہے جو اس وقت بولتا چلا جائے جب آپ بولنا چاہتے ہوں)

چنانچہ جب بولتے بولتے سانس لینے کے لیے رکیں تو ہاتھ کے اشارے سے واضح کر دیں کہ ابھی بات ختم نہیں ہوئی یا قطع کلامی معاف کہہ کر پھر سے شروع کر دیجیے اگر کوئی دوسرا اپنی طویل گفتگو ختم نہیں کر رہا تو بے شک جمائیاں لیجیے، کھانسیے، بار بار گھڑی دیکھیے...... ''ابھی آیا'' کہہ کر باہر چلے جائیے۔ یا وہیں سو جایئے یہ بالکل غلط ہے کہ اپنی ذہانت پر شبہ کرائیں البتہ لڑیے مت کیونکہ اس سے بحث میں خلل آ سکتا ہے۔

کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو اسے کبھی مت مانیے۔ لوگ ٹوکیں تو الٹے سیدھے دلائل بلند آواز میں پیش کر کے انہیں خاموش کرا دیجیے۔ ورنہ خوانخواہ سر پر چڑھ جائیں گے۔ دوران گفتگو لفظ ''آپ'' کا استعمال دو یا تین مرتبہ سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے اصل چیز میں ہے۔ اگر آپ نے اپنے متعلق نہ کہا تو دوسرے اپنے متعلق کہنے لگیں گے۔ تعریفی جملوں کے استعمال سے پرہیز کیجیے کبھی کسی کی تعریف مت کیجیے۔ ورنہ سننے والے کو شبہ ہو جائے گا کہ آپ اسے کام کے لیے کہنا چاہتے ہیں۔ اگر کسی شخص سے کچھ پوچھنا مطلوب ہو جسے وہ چھپا رہا ہو تو بار بار اس کی بات کاٹ کر اسے چڑا دیجیے وکیل اس طرح مقدمے جیتتے ہیں۔

مرسلہ: عرفان احمد ...... پتوکی

ساتھ اپنے گھر میں موجود تھا۔'' مائیکل نے کہا۔

''اور تم اس وقت اپنے ہوٹل میں بند تھے؟'' میں نے کہا۔

''تمہیں یقین نہیں ہے؟'' مائیکل نے عجیب سے انداز میں پوچھا۔

''یقین نہ ہوتا تو تم سے ملنے کیوں آتی۔'' میں نے دھیرے سے کہا۔

''اچھا تو آؤ اب واپس چلیں۔'' مائیکل نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''ہوٹل جاؤ گے؟'' میں نے تشویش آمیز لہجے میں کہا۔

''ہاں۔'' وہ بولا۔ ''میں پولیس کی نظروں سے زیادہ دیر تک اوجھل نہیں رہنا چاہتا۔''

''اگر انہوں نے تمہیں گرفتار کر لیا تو؟''

''تو بھی میں چھوٹ جاؤں گا۔'' وہ پُر اعتماد لہجے میں بولا۔ ''آؤ چلیں۔''

میں نے اس کے بازو میں اپنا بازو ڈالا اور ریستوران سے باہر آ گئی۔

❁......❁......❁

جب میں گھر پہنچی تو میرے سسر مسٹر ہرکورٹ بے چینی سے منتظر تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ تیزی سے میری طرف لپکے۔

''کہاں گئی تھیں تم؟''

''آپ کو اس سے مطلب؟'' میں نے بے نیازی سے کہا۔

''میں پوچھتا ہوں تم کہاں چلی گئی تھیں؟ کیا برنیس نے تمہیں منع نہیں کیا تھا؟'' مسٹر ہرکورٹ کا لہجہ خاصا درشت تھا۔

"وہ کون ہوتی ہے مجھے روکنے والی؟" میں نے بھی ترشی سے جواب دیا۔

"اسے میں نے کہا تھا کہ تمہیں گھر سے نہ نکلنے دے؟"

"آپ مجھے نہیں روک سکتے۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اس قبر نما گھر میں دفن ہو کر رہ جاؤں؟"

"آئندہ تم اس گھر سے باہر نہیں جاسکو گی۔" وہ غصے سے بولے۔

"میں اس گھر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دوں گی' کیا سمجھے آپ؟" میں نے ترش روئی سے جواب دیا۔ "یہ میوزیم آپ کو مبارک ہو' مجھے نہیں رہنا ہے اس میں۔"

"دیکھا جائے گا۔" وہ غصے سے بولے۔ "تو یہ درست ہے کہ تم اس ذلیل شخص سے مل کر آرہی ہو جس کا نام مائیکل کیڈ ہے۔" بوڑھے ہرکورٹ نے نفرت بھری آواز میں کہا۔ "پولیس اس کی تلاش میں ہے اور تم اس سے ملاقاتیں کرتی پھرتی ہو۔"

"کسی شریف آدمی کے متعلق یہ ریمارکس آپ کو زیب نہیں دیتے۔" میں نے دھیرے سے کہا۔

"وہ اپنی بیوی کا قاتل ہے' تمہیں اس سے دور رہنا چاہیے۔"

"تو آپ بھی اسے ہی قاتل سمجھتے ہیں؟"

"میں نے تو یہی سنا ہے۔" بوڑھے ہرکورٹ نے کہا۔

"سنی سنائی باتیں جھوٹ بھی تو ثابت ہو سکتی ہیں۔"

"بہرحال کچھ بھی ہو' تمہیں اس سے نہیں ملنا چاہیے اس طرح ہمارے خاندان کی رسوائی ہوتی ہے۔"

میں ابھی کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ ایک ملازمہ دوڑتی ہوئی اندر آئی وہ خاصی پریشان دکھائی دیتی تھی۔

"کیا بات ہے؟" بوڑھے ہرکورٹ نے حیرت سے پوچھا۔

"پولیس......" وہ بمشکل کہہ پائی۔

"پولیس؟" بوڑھے ہرکورٹ نے تحیر زدہ لہجے میں کہا۔ "کہاں ہیں وہ لوگ؟"

"صحن میں کھڑے ہیں' دو آدمی ہیں۔" ملازمہ نے گھبراہٹ سے جواب دیا۔

"انہیں یہیں بلوالو۔" مسٹر ہرکورٹ نے کہا۔

"ٹھہرو میں ان سے خود بات کرتا ہوں۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "تم دوسرے کمرے میں چلی جاؤ ایمنڈا! میں ان سے کہہ دوں گا کہ تمہاری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"

"نہیں' میں یہیں رہوں گی۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "مجھے ان سے بہت کچھ کہنا ہے۔"

"لیکن......؟"

"چلیے میں بھی آپ کے ساتھ باہر چلتی ہوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں...... تم یہیں ٹھہرو' میں انہیں خود لے کے آتا ہوں۔" بوڑھے ہرکورٹ نے بے بسی کے سے انداز میں کہا اور کمرے سے باہر چلے گئے۔

انسپکٹر اپنے ساتھی کے ہمراہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو میں کھڑی ہوگئی۔ وہ درمیانے قد کا ایک صحت مند اور وجیہہ شخص تھا۔ وہ سیاہ برساتی اوڑھے ہوئے تھا' آنکھوں سے ذہانت اور مستعدی کی چمک نمایاں تھی۔

"تو آپ ہی ہیں مسز وان ہرکورٹ!" وہ براہ راست مجھ سے مخاطب ہوا۔

"جی۔" میں نے دھیرے سے کہا۔

"تشریف رکھیے۔" وہ اپنے سامنے بچھی ہوئی

کرسی کی طرف رخ کرتے ہوئے بولا میں شکریہ ادا کرتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئی۔

"معاف کیجیے گا میں نے آپ لوگوں کو بے وقت زحمت دی۔" انسپکٹر بولا۔ "لیکن کیا کیا جائے آپ لوگوں سے ملنا ناگزیر تھا امید ہے آپ میری بات سمجھ گئے ہوں گے؟"

"آپ آئرس نامی عورت کے قتل کی تفتیش کے سلسلے میں تشریف لائے ہیں؟" مسٹر ہرکورٹ نے کہا۔

"جی ہاں۔" انسپکٹر ہماری طرف دیکھے بغیر بولا۔ "مجھے امید ہے کہ آپ لوگ قانون کے ساتھ پورا پورا تعاون کریں گے۔"

"مگر ہمارا اس قتل سے کیا تعلق ہے؟" مسٹر ہرکورٹ بولے۔

"بہت گہرا تعلق ہے۔" انسپکٹر نے جواب دیا پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "ہاں تو مسز وان ہرکورٹ! آپ اس مکان میں کتنے عرصے سے رہائش پذیر ہیں؟"

"تقریباً دو سال سے جب سے میری شادی ہوئی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ مقتولہ آئرس کو جانتی ہیں؟" انسپکٹر نے استفہامیہ لہجے میں کہا۔

"میں اس سے صرف ایک ہی بار ملی تھی۔"

"کہاں؟"

"ہلٹن میں۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ مسٹر مائیکل کو کب سے جانتی ہیں؟"

"صرف تین چار دن سے۔"

"آپ مسٹر گرین سے بھی واقف ہیں؟"

"جی ہاں۔ میرے آنجہانی شوہر کے شریک کار تھے کھدائی کے لیے سرمایہ مسٹر گرین ہی نے فراہم کیا تھا۔"

"کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ آپ ہلٹن ہوٹل کیوں تشریف لے گئی تھیں؟"

"مگر یہ تو میرا نجی معاملہ ہے۔" میں نے احتجاجاً کہا۔

"اسی لیے تو میں آپ سے اجازت مانگ رہا ہوں۔" انسپکٹر نے کہا۔ "بات دراصل یہ ہے مسز وان! قتل کی وارداتوں میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ قاتل ایک قتل پر اکتفا نہیں کرتا ایک کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا قتل......اور ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ قاتل کو دوسری یا تیسری واردات کی مہلت نہ دیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں تفتیش کا دائرہ وسیع رکھنا پڑتا ہے مجرموں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنے پہلے جرم کی پردہ پوشی کے لیے اکثر اوقات دوسرے جرم کا ارتکاب کرتے ہیں ہاں تو آپ وہاں کس لیے تشریف لے گئی تھیں؟"

"مجھے مسٹر مائیکل سے ملنا تھا۔" میں نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

"اس رات آپ کس وقت گھر لوٹی تھیں؟"

"تقریباً ڈھائی بجے میرا مطلب ہے صبح کے ڈھائی بجے۔"

"آپ ہوٹل سے یہاں تک اکیلی ہی آئی تھیں؟"

"جی نہیں۔ مسٹر مائیکل مجھے گیٹ کے قریب چھوڑ کر گئے تھے۔"

"مسٹر مائیکل نے آپ کو بتایا تو ضرور ہوگا کہ وہ آپ کو ڈراپ کرنے کے بعد کہاں جائیں گے؟"

"جی ہاں۔" میں نے محتاط لہجے میں جواب دیا۔ "انہوں نے کہا تھا کہ وہ اپنے ہوٹل جائیں گے وہ براؤنز ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

"کیا آپ یہ بتانا پسند کریں گی کہ مسٹر مائیکل اس وقت کہاں ہوں گے؟" انسپکٹر نے مودبانہ لہجے میں پوچھا۔

"کچھ دیر پہلے وہ برٹش میوزیم میں موجود تھے میں ان سے مل کر آ رہی ہوں۔" میں نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

"شکریہ مسز وان!" انسپکٹر بولا۔ "بات دراصل یہ ہے کہ مسٹر مائیکل بھی اس خونی ڈرامے کے ایک اہم کردار ہیں ہم انہیں ڈراپ کرنا نہیں چاہتے۔" پھر وہ اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا۔

"آپ مسٹر مائیکل کی نگرانی ذرا سخت کر دیجیے ایسا نہ ہو کہ وہ..... آپ میرا مطلب سمجھ ہی گئے ہوں گے۔"

"جی ہاں آپ فکر نہ کیجیے میں ابھی جا رہا ہوں۔" انسپکٹر کے ساتھی نے پولیس والوں کے مخصوص لہجے میں جواب دیا اور تیزی سے باہر چلا گیا۔

اس کے بعد انسپکٹر نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا اور اٹھ کر مسٹر ہرکورٹ کے کمرے میں چلا گیا اس کے جاتے ہی انتھونی آ دھمکا' بہت غصے میں دکھائی دیتا تھا۔ اسے انسپکٹر کے ساتھ میری گفتگو پر خاصی تشویش تھی اس کے خیال میں مجھے اپنی زبان بند رکھنا چاہیے تھی لیکن جب میں نے اسے یہ بتایا کہ ابھی تو میں نے پولیس کو اصل حالات سے آگاہ ہی نہیں کیا تو وہ اس تلخ نوائی کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنے ڈیڈی کے کمرے میں چلا گیا۔

❁.....❁.....❁

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ونٹن گرین بھی ہمارے گھر آ پہنچا' وہ قدرے مسرور دکھائی دیتا تھا۔ لگتا تھا اسے اپنی سازش کی کامیابی کا یقین ہو چلا ہے اس نے مجھے ایک بار پھر یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ آرس کو مائیکل ہی نے قتل کیا ہے لیکن نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں اس کی بے ہودہ گوئی برداشت نہیں کر سکتی۔ میرے درشت لہجے کے جواب میں وہ نہایت ڈھٹائی سے مسکراتا رہا۔

بریٹس' مسٹر ہرکورٹ اور انتھونی کے بعد انسپکٹر نے ونٹن گرین سے پوچھ گچھ شروع کی۔

"آپ مسٹر مائیکل کو کب سے جانتے ہیں؟" انسپکٹر نے پہلا سوال کیا۔

"ہماری پہلی ملاقات اٹلی میں ہوئی تھی۔" گرین نے جواب دیا۔ "وہ آنجہانی وان ہرکورٹ کے ساتھ بحیثیت ایکسپرٹ کام کر رہے تھے۔"

"سنا ہے مرحوم وان ہرکورٹ کو ان پر بڑا اعتماد تھا؟"

"آپ نے ٹھیک سنا ہے۔"

"آپ نے کھدائی پر خاصی خطیر رقم ضائع کی ہے مسٹر گرین! کیا یہ سچ ہے؟"

"بالکل سچ ہے۔"

"آپ کو اس سے کیا ملا؟ میرا مطلب ہے آپ کو کوئی فائدہ ہوا؟"

"جی نہیں' مجھے بہت نقصان اٹھانا پڑا تھا۔"

"کیا یہ بھی سچ ہے کہ کھدائی کے دوران ایک بڑی ہی نادر شے دستیاب ہوئی تھی؟ میرا مطلب جڑاؤ پن سے ہے۔"

"یہ بھی درست ہے۔"

"آپ نے وہ جڑاؤ پن وان ہی کے پاس کیوں رہنے دی؟"

"وہ اسے اپنے ہی پاس رکھنا چاہتے تھے۔"

"اس وقت وہ جڑاؤ پن کہاں ہے؟"

"گم ہو چکی ہے۔"

اس جواب پر انسپکٹر دھیرے سے مسکرا دیا۔

"آپ کا مطلب ہے آتشزدگی کے دوران؟"

"جی ہاں۔" گرین پر گھبراہٹ سی طاری ہونے لگی تھی۔

"آپ کے خیال میں وان ہرکورٹ کی موت بھی

آتشزدگی کا نتیجہ تھی؟"

"میں تو یہی سمجھتا ہوں۔"

"آپ غلط سمجھتے ہیں' وان کو قتل کیا گیا تھا۔" انسپکٹر نے بلند آواز میں کہا۔

"آپ کو یہ بات مائیکل نے بتائی ہوگی؟" گرین گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔

"آپ کو اس سے غرض نہیں ہونی چاہیے کہ ہمیں مائیکل نے بتایا ہے یا کسی اور نے۔" انسپکٹر بولا۔ "آپ سے جو کچھ پوچھا جارہا ہے صرف اسی کا جواب دیجیے۔"

"ٹھیک ہے میں اس جسارت کی معافی چاہتا ہوں۔" گرین گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"آپ مقتولہ آئرس کو کب سے جانتے ہیں؟" انسپکٹر نے پوچھا۔ "کیا یہ سچ ہے کہ آپ اسے اس وقت سے جانتے ہیں جب وہ اٹلی میں مقیم تھی؟"

"مجھے تسلیم ہے۔"

"مقتولہ کا پورا نام کیا تھا؟"

"آئرس میڈوک۔" گرین بولا۔ "مگر شادی کے بعد اس نے اپنا نام آئرس مائیکل رکھ لیا تھا۔" اس جواب پر انسپکٹر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

"شادی کے بعد؟" وہ قدرے حیرت سے بولا۔

"جی ہاں' شادی کے بعد۔"

"مائیکل سے اس کی ملاقات کہاں ہوئی تھی؟"

"وہ میرے ساتھ کھدائی کی جگہ پر گئی تو مائیکل سے اس کی دوستی ہوگئی جو بعدازاں شادی پر منتج ہوئی۔"

"مقتولہ کو کھدائی وغیرہ سے بہت دلچسپی تھی کیا؟"

"جی نہیں' میں اسے خود اپنے ساتھ لے گیا تھا۔"

"تو آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مسٹر مائیکل سے شادی سے پہلے آپ کی دوستی تھی؟" انسپکٹر بولا۔ "یہ ایک خالص ذاتی قسم کا سوال ہے مسٹر گرین! لیکن ناگزیر ہے لہٰذا امید ہے آپ برا نہیں منائیں گے۔"

"دوستی ہی سمجھ لیجیے۔"

"کیا یہ بھی درست ہے کہ مقتولہ ایک پیشہ ور ایکٹریس تھی؟"

"درست ہے۔" گرین نے جواب دیا۔ "مگر میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ آئرس کے قتل کا کھدائی کے کام سے اور پھر وان کی موت سے کیا تعلق ہے؟"

"بہت گہرا تعلق ہے مسٹر گرین!" انسپکٹر بولا۔

"آئرس کا قتل وان ہی کے قتل کی ایک کڑی ہے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" گرین متحیر آواز میں بولا۔

"آپ کے خیال میں آئرس کو مائیکل نے قتل کیا ہے؟" انسپکٹر نے گرین کی حیرت نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ مائیکل ہی نے اپنی بیوی کو قتل کیا ہے۔"

"قتل کا محرک کیا ہے؟"

"وہ آئرس سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔"

"آخر کیوں' آئرس میں کیا خرابی تھی؟"

"وہ مسز وان ہرکورٹ سے شادی کا فیصلہ کرچکا تھا۔"

"یہ جھوٹ ہے' محض بکواس ہے۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "یہ محض الزام تراشی ہے۔"

"صبر سے کام لیجیے خاتون!" انسپکٹر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "کسی کے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔" پھر وہ گرین کی طرف متوجہ ہوا۔

"آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مسٹر مائیکل' مسز وان ہرکورٹ سے پہلے کبھی نہیں ملے تھے؟"

"مجھے تسلیم ہے۔"

"تو یہ کیسے ممکن ہے کہ پہلی ہی ملاقات میں مسٹر

مائیکل، مسز وان ہرکورٹ پر فریفتہ ہو گئے ہوں کہ انہوں نے انجام سے بے خبر ہوتے ہوئے اپنی حسین و جمیل بیوی کو قتل کر دیا اور وہ بھی اس بہیمانہ طور پر میں اس مفروضے کو تسلیم نہیں کر سکتا مسٹر گرین!"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ میرے بیان کو مضحکہ خیز سمجھتے ہیں؟" گرین نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"کوئی بھی ذی ہوش آپ کے مفروضے پر یقین نہیں کر سکتا۔" انسپکٹر بولا۔ "میرے نزدیک قتل کا محرک شادی یا کسی عورت کی محبت نہیں بلکہ دولت اور صرف دولت ہے۔"

"دولت...... کیسی دولت؟ آئرس کے پاس دولت کہاں سے آ گئی؟" گرین تحیر زدہ آواز میں بولا۔

"فی الوقت یہ نہیں بتایا جا سکتا۔" انسپکٹر بولا۔ "اچھا یہ بتایئے کیا آپ نے وان ہرکورٹ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ جڑاؤ پن فروخت کر دیں۔"

"جی ہاں۔"

"کیا یہ بھی درست ہے کہ اس جڑاؤ پن کی قیمت ڈھائی لاکھ پونڈ لگائی گئی تھی؟"

"یہ بھی درست ہے۔"

"شکریہ مجھے آپ سے اور کچھ نہیں پوچھنا۔" انسپکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا اسی وقت انسپکٹر کا دوسرا ساتھی کمرے میں داخل ہوا اور انسپکٹر کے کان میں کوئی بات کی۔

"آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے مسز وان کورٹ!" انسپکٹر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ مسٹر مائیکل کو ائیر پورٹ پر روک لیا گیا ہے وہ ملک سے فرار ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔"

مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا میں انسپکٹر کی بات سنتے ہی دم بخود رہ گئی تھی۔

"مجھے یقین نہیں آتا انسپکٹر!" میں نے لرزیدہ آواز میں کہا۔ "یہ جھوٹ ہے۔"

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں مسز وان! یہ جھوٹ نہیں ہے، مسٹر مائیکل نے میلان کا ٹکٹ خریدا تھا آپ یہ سن کر اور بھی حیران ہوں گی کہ مائیکل کے پاس دوسرا ٹکٹ آپ کے نام کا تھا اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ آپ کو بھی اپنے ہمراہ بھگا لے جانا چاہتا تھا۔"

"اگر آپ کی بات صحیح ہے تو مجھے بھی ائیر پورٹ پر ہونا چاہیے تھا۔" میں نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "اس وقت مائیکل کہاں ہے؟"

"یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" انسپکٹر بولا۔ "ویسے مجھے مسٹر مائیکل کے اس اقدام پر خاصی حیرت ہوئی ہے انہیں فرار ہونے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے تھی۔"

"اب تو آپ کو میرا مفروضہ سچ مان لینا چاہیے انسپکٹر!" گرین مسکراتے ہوئے بولا۔ مجھے اس کے اس انداز پر بہت غصہ آیا مگر مصلحت کے تحت خاموش رہی۔

"نہیں مسٹر گرین!" انسپکٹر بولا۔ "ہم پولیس والے اتنی جلدی نتائج اخذ نہیں کیا کرتے محض فرار ہونے کی کوشش کو قتل کا ثبوت نہیں تسلیم کیا جا سکتا۔"

"حیرت ہے آپ کو ابھی تک یقین نہیں آیا۔" گرین کے انداز میں فاتحانہ تفاخر شامل تھا۔ "آپ اسے گرفتار کیوں نہیں کر لیتے؟"

"معلوم ہوتا ہے آپ پولیس کے ضابطوں سے آگاہ نہیں ہیں، ہم ٹھوس ثبوت کے بغیر کسی کو گرفتار کرنے کے مجاز نہیں ہیں، محض شک کی بنیاد پر کسی شخص کو گرفتار نہیں کیا جا سکتا۔"

"تو اس وقت وہ کہاں ہوگا؟"

"اس کا جواب میں مسز وان کو دے چکا ہوں۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "آپ اس قدر بے چین کیوں ہیں؟"
"جی نہیں ایسی تو کوئی خاص بات نہیں۔" گرین خفت سے بولا۔
اسی وقت بزنس کمرے میں داخل ہوئی۔
"مسٹر ہرکورٹ نے آپ کو بلوایا ہے۔" وہ انسپکٹر سے مخاطب تھی۔
"چلیے" انسپکٹر بولا اور اس کے ساتھ اس کا ساتھی بھی اٹھ گیا' کمرے میں میرے اور گرین کے سوا کوئی نہیں تھا۔
"مجھے آپ سے ہمدردی ہے مسز ڈان ہرکورٹ!" گرین کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔
"مجھے کسی کی ہمدردی نہیں چاہیے۔" میں نے ترشی سے جواب دیا۔ "آپ یہیں تشریف رکھیے' میں کچھ دیر کے لیے اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔"
"مگر سنیے تو....." گرین نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔
"میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔" میں نے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا اور تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بھاگی' میں اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مائیکل کے پاس پہنچ جانا چاہتی تھی۔ انسپکٹر کی باتوں نے میرے دل میں ہیجان سا برپا کر دیا تھا' مائیکل کو خطرے میں محصور دیکھ کر میری محبت کا آتش فشاں پوری شدت سے بھڑک اٹھا تھا۔
میں پوری رفتار سے بھاگ رہی تھی' بارش اب بھی جاری تھی لیکن مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ مجھے ہر حال میں مائیکل تک پہنچنا تھا' مجھے یقین تھا کہ اگر وہ واقعی بے گناہ ہے تو اس ہوٹل میں واپس آ گیا ہوگا جس کا پتا اس نے مجھے چلتے وقت دیا تھا۔ دوسری صورت میں وہ روپوش ہو چکا ہوگا' میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ کہیں نہیں گیا ہوگا ہوٹل ہی میں موجود ہوگا۔ کاش میرے دل کی آواز سچی ہو' میں بار بار یہی فقرہ دہرا رہی تھی اور بارش میں بھاگتی چلی جا رہی تھی۔
جب میں ہوٹل میں داخل ہوئی تو میرا سانس بری طرح پھول گیا تھا اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ استقبالیہ میز پر بیٹھی ہوئی بوڑھی خاتون میری اس حالت پر حیرت زدہ سی رہ گئی۔ میرے استفسار پر اس نے مائیکل کے کمرے کا نمبر بتایا اور میں تیزی سے زینے کی طرف لپکی۔ کمرے کا دروازہ بند تھا لیکن میں نے دستک نہیں دی بلکہ دروازے کو پوری قوت سے دھکا دیا اور دوسرے ہی پل دروازہ کھل گیا' مائیکل سامنے بیٹھا تھا۔
"مائیکل۔" فرط جذبات سے میرا گلا رندھ کر رہ گیا اور میں دیوانہ وار مائیکل کے بازوؤں میں سماتی چلی گئی۔
"کیا بات ہے مینڈی ڈیئر! تم اس قدر پریشان کیوں ہو؟" اس نے میری اشک بار آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ میرا سر اس کی آغوش میں تھا اور وہ مجھ پر کسی شفیق ہستی کی طرح جھکا ہوا تھا' میرے ہونٹ کپکپا رہے تھے اور آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔
"یہ تم نے کیا کیا مائیکل؟" میں نے آب دیدہ ہو کر کہا۔ "تم نے ایسا کیوں کیا؟"
"مجھے دروازہ بند کر لینے دو۔" وہ میرے سر کو زانو سے ہٹاتے ہوئے بولا۔ دروازہ بند کر دینے کے بعد وہ ایک بار پھر میرے قریب آ بیٹھا اور محبت بھرے لہجے میں بولا۔ "اب کہو کیا کہہ رہی تھیں تم؟"
"کیا تمہیں سمجھ نہیں آئی؟" میں نے لرزیدہ آواز میں کہا۔ میں چاہتی تھی وہ خود ہی سچ سچ بتا دے کہ وہ کہاں جا رہا تھا' کیوں فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔
"سمجھ گیا۔" وہ مطمئن لہجے میں بولا۔ "تم یہ جاننا

چاہتی ہو کہ میں ایئر پورٹ پر کیا لینے گیا تھا؟" اس کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم پھیلنے لگا تھا۔ "لیکن تمہیں کیسے پتا چلا؟ ممکن ہے پولیس نے بتایا ہو، بہر حال مجھے تمہارے سوال کا جواب ضرور دینا چاہیے۔ مجھے اعتراف ہے مینڈی کہ مجھ سے حماقت سرزد ہوئی ہے لیکن کیا کرتا؟ یقین جانو میں بہت مایوس ہو چکا تھا۔"

"کیوں مایوس ہو چکے تھے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا آئرس کے قتل نے مسائل کو اور بھی بُری طرح الجھا دیا ہے۔" مائیکل نے جواب دیا۔ "میں دراصل اٹلی واپس جا کر پدیالو کے قانونی مشیر سے یہ دریافت کرنا چاہتا تھا کہ اس کے آنجہانی موکل نے جڑاؤ پن کس شخص سے خریدی تھی کیونکہ مجھے یقین ہے کہ جڑاؤ پن فروخت کرنے والا یا بہ الفاظ دیگر ڈھائی لاکھ پونڈ وصول کرنے والا شخص ہی وان کا قاتل ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ آئرس کو بھی اسی شخص نے قتل کیا ہے۔"

"آج مجھے رہ رہ کر اپنی اس حماقت کا احساس ہو رہا ہے کہ میں نے اس ایجنٹ کا نام و پتا کیوں دریافت نہ کیا جو وان کے پاس جڑاؤ پن خریدنے آیا تھا یا جوں ہی مجھے جڑاؤ پن کے متعلق معلوم ہوا تھا کہ وہ پدیالو کے پاس ہے تو مجھے اسی وقت تفتیش مکمل کر لینی چاہیے تھی، کاش میں نے غفلت شعاری سے کام نہ لیا ہوتا۔"

"تو اب کیا کیا جا سکتا ہے؟" میں نے بے چینی سے پوچھا اور اٹھ کر کھڑکی کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ بارش ابھی تک نہیں تھمی تھی اور روشنی خاصی مدھم ہو گئی تھی۔

"مجھے افسوس ہے مینڈی کہ میری وجہ سے تمہیں اس قدر پریشانی اٹھانا پڑی۔" مائیکل تاسف آمیز لہجے میں بولا۔ "میری خواہش ہے کہ تم مجھے تنہا چھوڑ دو، میں اس مصیبت سے اکیلا ہی نمٹ لوں گا۔ قاتل اپنے تحفظ کی خاطر کسی کو بھی قتل کر سکتا ہے لہٰذا میں نہیں چاہتا کہ میرے ساتھ تمہاری زندگی بھی خطرے میں گھری رہے۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو، میں تم سے التجا کرتا ہوں مینڈی!"

"میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"میری بات مان لو مینڈی!"

"ایسا نہیں ہو سکتا مائیکل! میں سب کچھ چھوڑ سکتی ہوں، ہر کسی سے کنارہ کش ہو سکتی ہوں لیکن تمہیں ہرگز نہیں چھوڑوں گی۔" میں نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "تو پھر تمہاری مرضی ہے اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دوں یا کہیں روپوش ہو جاؤں؟"

"اب تم کہیں نہیں جا سکتے، پولیس پوری مستعدی سے تمہاری نگرانی کر رہی ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا پھر میں نے اسے پولیس کی تمام کارروائی سے آگاہ کر دیا۔

"تم نے کچھ اندازہ لگایا کہ پولیس کے نزدیک اصل مجرم کون ہے؟" مائیکل نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "ویسے میں یہ بات مکمل وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ پولیس اب تک یہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکتی کہ قاتل کون ہے، انسپکٹر کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں۔"

"میرا خیال ہے پولیس کو ابھی تک کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملا ورنہ کوئی نہ کوئی گرفتاری عمل میں آ چکی ہوتی۔" مائیکل نے میری باتوں سے نتیجہ اخذ کرتے

ہوئے کہا۔

"تم نے صحیح اندازہ لگایا ہے۔"

"اگر اس وقت میں خود کو پولیس کے حوالے کردوں تو یہ ایک طرح کا جواہی ہوگا۔" مائیکل نے جواب دیا۔ "میرے خلاف ایسی شہادتیں موجود ہیں جو عدالت کو کافی حد تک مطمئن کرسکتی ہیں' کیا خیال ہے؟"

"میں نے تم سے یہ نہیں کہا کہ اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کردو۔ میں نے کہا...... فیصلہ تمہیں کرنا ہے نہ کہ مجھے' ویسے میرا خیال ہے کہ ابھی تمہیں پولیس سے گریزاں ہی رہنا چاہیے۔"

"مجھے تم سے اتفاق ہے۔" مائیکل بولا۔

"انسپکٹر کا خیال ہے کہ آئرس' جڑاؤ پن فروخت کرنے والے کو جانتی تھی۔" میں نے کھڑکی سے ہٹتے ہوئے کہا۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" مائیکل حیرت سے بولا۔

"ہاں' پولیس کا خیال ہے کہ جڑاؤ پن کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم ہی آئرس کے قتل کا محرک بنی ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ آئرس بہت کچھ جانتی تھی۔" مائیکل کے لہجے میں ایک بار پھر امید کی کرن چمک اٹھی۔

"اور ونٹن گرین ہی وہ واحد شخص ہے جس سے اس کی دوستی تھی۔" میں نے مائیکل کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ بھی درست ہے۔" مائیکل بولا۔ "لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ونٹن گرین جیسا کائیاں شخص آئرس کو رازدار نہیں بنا سکتا تو پھر تیسرا شخص کون ہوسکتا ہے؟ انتھونی...... نہیں آئرس کا انتھونی سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ وہ ہر وقت گرین کے ساتھ رہتی تھی' میں نے اسے انتھونی یا کسی اور شخص سے کبھی ملتے نہیں دیکھا۔"

"اس طرح صرف دو ہی شخص باقی رہ جاتے ہیں' ایک گرین دوسرے تم۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"اور گرین نے کمال ہوشیاری سے مجھے آگے کردیا اور خود صاف بچ کر نکل گیا ہے۔" مائیکل نے کہا۔

"تم میں ایک بڑی خامی ہے مائیکل!" میں نے کہا۔ "تم نتائج اخذ کرنے میں بہت جلد بازی سے کام لیتے ہو۔"

"مجھے اپنی اس خامی کا اعتراف ہے۔"

"پہلے تم اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ گرین بے گناہ ہے اور اب اسے مجرم گردان رہے ہو۔"

"دراصل میں بری طرح الجھ کے رہ گیا ہوں۔" وہ بولا۔ "آئرس کی موت نے مجھے خوف زدہ کردیا ہے۔"

باتیں کرتے کرتے میں ایک بار پھر کھڑکی میں آن کھڑی ہوئی اور پلٹ کر کچھ کہنے ہی والی تھی کہ میری نظر برنیس پر جا ٹھہری۔ وہ شاہ بلوط کے پیڑ تلے کھڑی بار بار اوپر دیکھ رہی تھی۔

"کسے دیکھ رہی ہو؟" مائیکل نے میرے قریب آتے ہوئے پوچھا۔

"برنیس کو۔" میں نے دھیرے سے جواب دیا۔

"میرا خیال ہے وہ میری تلاش میں ہے۔"

"ممکن ہے اس نے ہمیں دیکھ لیا ہو۔" مائیکل بولا۔

"نہیں اسے اتنی دور سے صاف دکھائی نہیں دیتا۔" میں نے جواب دیا۔ "اس کی دور کی نظر بہت کمزور ہے' حتیٰ کہ چشمہ لگانے پر بھی اسے دور کی چیزیں صاف دکھائی نہیں دیتیں۔"

"اب کیا کیا جائے؟"

"تم اپنے کمرے میں ہی رہو' میں نیچے جاتی ہوں اگر وہ میری تلاش میں آئی ہے تو تمہارا ذکر تک نہیں

کرے گی۔ پہلے تو میں اسے ٹالنے کی کوشش کروں گی' بصورت دیگر میں اس کے ساتھ چل دوں گی۔"

"تم ٹھہرو میں جاتا ہوں۔"

"نہیں نہیں' میں خود جاؤں گی۔ میں نے اسے راستے سے ہٹاتے ہوئے کہا اور کمرے سے نکل آئی' نیچے پہنچتے ہی میں سیدھی برنیس کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ "کیا تم مجھے تلاش کر رہی ہو؟" میں نے اسے متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں' میں تمہیں ہی تلاش کر رہی تھی۔"

"کیوں؟" میں نے متجسسانہ لہجے میں کہا۔

"کس نے بھیجا ہے تمہیں؟"

"میرے ساتھ آؤ۔" وہ دھیرے سے بولی۔ "انتھونی تمہارے لیے بے چین ہے' اسی نے مجھے تمہاری تلاش میں بھیجا ہے' جلدی چلو۔"

"مگر میں انتھونی سے نہیں ملنا چاہتی۔" میں نے بے رخی سے کہا۔

"اسے آپ سے بڑی ہی اہم بات کرنی ہے۔" برنیس میری طرف دیکھے بغیر بولی۔

"پھر تو اسے خود آنا چاہیے تھا' اس نے تمہیں کیوں بھیجا؟" میں نے قدرے حیرت سے کہا۔

"مسٹر ہرکورٹ کی طبیعت چونکہ ٹھیک نہیں ہے' اس لیے انتھونی گھر سے باہر نہیں آ سکتا۔ وہ بہت پریشان ہے۔" برنیس دھیرے سے بولی۔ "اس کی خواہش ہے کہ آپ کو بھی گھر ہی میں رہنا چاہیے۔"

"لیکن مجھے اس گھر اور اس گھر کے مکینوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔" میں نے بے رخی سے کہا۔ "اگر اسے مجھ سے کوئی اہم بات کرنی ہے تو کسی ریستوران وغیرہ میں چلا آئے۔"

"انتھونی کو معلوم تھا کہ آپ اس گھر میں نہیں آئیں گی اسی لیے اس نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے ڈیڈی کے میوزیم ہال میں ہمارا منتظر ہو گا۔"

مسٹر ہرکورٹ کا میوزم ہال ان کی ذاتی اقامت گاہ سے خاصا دور تھا' اس میں جگہ جگہ سے اکٹھے کیے گئے مختلف مجسمے اور مورتیاں رکھی رہتی تھیں۔

❀......❀......❀

جب ہم میوزم ہال کے باہر پہنچے تو دروازے کا قفل کھلا ہوا تھا جس کا مطلب تھا کہ انتھونی ہم سے پہلے وہاں پہنچ چکا ہے۔

"میرا خیال ہے انتھونی آ چکا ہے جبھی تو دروازے کا قفل کھلا ہوا ہے۔" برنیس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا پھر اس نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا اور ہم دونوں ہال کے اندر داخل ہو گئیں۔

ہال میں ایک چھوٹا سا بلب روشن تھا جس کی زرد روشنی گہری تاریکی میں دب کر رہ گئی تھی۔ تمام کھڑکیاں بند تھیں اور ہال کی فضا خاصی بوجھل بوجھل اور ناگوار سی تھی۔ ہال میں کم سے کم پچاس مجسمے قطار در قطار استادہ تھے۔ مجھے ان کے بے جان چہروں اور بے نور آنکھوں سے عجیب سا خوف محسوس ہوتا تھا میرا جی چاہتا تھا کہ پوری رفتار سے دوڑتی ہوئی ان میں گھس جاؤں اور دونوں ہاتھوں سے انہیں فرش پر ڈھیر کرتی جاؤں' انہیں ریزہ ریزہ کر دوں تاکہ ان کی مضحکہ خیز اور ڈراؤنی صورتیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میری آنکھوں سے اوجھل ہو جائیں۔

"انتھونی کہاں ہے؟" میں نے بلند آواز میں کہا اور میری آواز کی بازگشت پورے ہال میں گونجنے لگی۔ اچانک مجھے یوں لگا جیسے بے شمار حشرات الارض میرے بدن پر رینگنے لگے ہوں۔

"یہیں ہونا چاہیے تھا اسے۔" برنیس نے کپکپاتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "دروازے پر تو ہمیشہ قفل پڑا رہتا ہے اور چابیاں عام طور پر انتھونی ہی کے پاس ہوتی

ہیں اس نے کہا تھا کہ تمہاری واپسی پر دروازے پر قفل نہیں ہوگا اگر وہ یہاں نہیں ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر دروازہ کس نے کھولا ہے؟" پھر وہ انتھونی انتھونی پکارنے لگی لیکن اس کی آواز ہال کی دیواروں اور مجسموں سے ٹکرا کر واپس آ گئی۔

برنیس کی آوازوں کی بازگشت ابھی محو بھی نہیں ہوئی تھی کہ مجھے ایسا لگا جیسے میرے جسم پر بے شمار کیڑے رینگنے لگے ہوں اور ان کی ننھی ننھی تیز ٹانگیں میرے گوشت میں دھنستی چلی جا رہی ہوں۔ خوف کے ان دیکھے پنجے لحظہ بہ لحظہ میرے قریب آتے جا رہے ہوں' میں خوف سے کانپنے لگی تھی اور مجھے یقین ہو چلا تھا کہ برنیس مجھے دھوکے سے یہاں لے آئی ہے۔ اب کوئی وقت جاتا ہے کہ موت کا خونی پنجہ میرے حلق تک آ پہنچے گا اور میں تار عنکبوت میں الجھی ہوئی مکھی کی طرح بے بس ہو کر رہ جاؤں گی۔ اگر انتھونی یہاں ہوتا تو کب کا سامنے آ چکا ہوتا۔ اچانک مجھے گرین کا خیال آیا اور مجھے برنیس کی عیارانہ چال کا یقین ہو گیا' وہ مجھے دھوکے سے یہاں لے آئی تھی کہ گرین کے خونی ہاتھ آسانی سے میرا گلا گھونٹ سکیں۔

"انتھونی یہاں نہیں ہے۔" میں نے غصے سے کہا۔ "تم نے مجھے دھوکا دیا ہے برنیس! میرا دل کہتا ہے کہ یہاں انتھونی نہیں بلکہ گرین چھپا ہوا ہے تاکہ آج رات کے بعد مجھے بھی ٹھکانے لگا سکے۔"

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے مسز وائن!" وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں قسم کھاتی ہوں کہ میں آپ کو انتھونی کے کہنے پر یہاں لائی ہوں' اس نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ ہمیں اسی جگہ ملے گا۔ آپ مجھ پر بھروسہ کیجیے میں نے آپ کو کوئی دھوکا نہیں دیا میں خود ایک عجیب سا خوف محسوس کر رہی ہوں۔"

"تم یقین سے کہہ سکتی ہو کہ دروازہ مقفل تھا؟"

"ہاں۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"میرا خیال ہے ہمیں لوٹ جانا چاہیے۔" میں نے ایک مجسمے کی کھوپڑی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"تم یہیں ٹھہرو میں دوسرے کمرے میں جاتی ہوں۔" وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ "ممکن ہے انتھونی کہیں چھپا بیٹھا ہو اور ہماری بے بسی پر محظوظ ہو رہا ہو' میں اسے جانتی ہوں بہت ستم ظریف نوجوان ہے۔"

"مگر مجھے یقین نہیں ہے۔" میں نے اپنے خوف پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "کہو تو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں؟"

"نہیں نہیں' تم یہیں ٹھہرو۔" اس نے بلند آواز میں کہا اور ایک دیو قامت مجسمے کے عقب میں روپوش ہو گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں ایک بار پھر متوقع خطرے کے متعلق سوچنے لگی لیکن ابھی ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ کمرے میں کوئی تیزی سے دوڑا اور پھر یک لخت خاموشی چھا گئی۔ اس کے ساتھ ہی میں فرط خوف سے کانپ گئی۔ اب کسی شک کی گنجائش نہ رہی تھی' میری حماقت ہی مجھے زیر دام لے آئی تھی مگر اب پچھتاوے کا وقت نہیں تھا' موت کا دائرہ لحظہ بہ لحظہ تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ برنیس مجھے جل دے کر نکل گئی تھی۔

میں نے ایک بت کو زور سے دھکا دیا اور لرزیدہ قدموں سے آگے چل دی۔ میں جلد از جلد بیرونی دروازے تک پہنچ جانا چاہتی تھی' میں بتوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی چلی جا رہی تھی کہ ہال میں ایک دلدوز چیخ گونجی اور میرے پاؤں فرش پر جم کر رہ گئے اور دل اتنی زور سے دھڑکا کہ جیسے سینہ توڑ کر باہر ابل پڑے گا۔

"برنیس...... برنیس......" میں نے لرزیدہ آواز میں پکارا۔ "برنیس تم کہاں ہو؟" میں مجسموں سے

ٹکراتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی کہ بے خیالی میں بند دروازے جا ٹکرائی' میں نے ٹٹول کر دیکھا تو دروازہ مقفل تھا۔

"برنیس......" میں حلق پھاڑ کر چیخی مگر میری آواز ہال کی چھت اور دیواروں سے ٹکرا کر رہ گئی۔ اسی دم مجھے یوں لگا جیسے کوئی دھیرے دھیرے حرکت کررہا ہو فرط دہشت سے میرا رونگٹا رونگٹا کھڑا ہوگیا۔

میں نے اندھیرے میں ادھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کی مگر کچھ دکھائی نہیں دیا پھر یوں محسوس ہوا' جیسے کوئی میرے دائیں طرف دھیمے دھیمے سانس لے رہا ہو اچانک کوئی ایک بار پھر دھیرے دھیرے حرکت کرنے لگا۔

"کون ہے؟" میں خوف سے لرزیدہ آواز میں چیخی۔ "برنیس...... برنیس......؟" مگر کوئی جواب نہیں ملا۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ جواب کیوں نہیں دیتی' وہ میرے ساتھ ایسا کھیل کیوں کھیل رہی ہے' کیا وہ مجھے خوف زدہ کرنا چاہتی ہے یا میرے اعصاب کا امتحان لے رہی ہے پھر مجھے اس چیخ کا خیال آیا جو کچھ دیر پہلے ہال میں گونجی تھی۔ کیا وہ برنیس ہی کی چیخ تھی؟ نہیں نہیں' وہ چیخ برنیس کی نہیں تھی تو پھر کس کی تھی؟ کہیں وہ پاگل تو نہیں ہوگئی ہے؟ مجھے تنہا چھوڑ کر وہ کہاں چلی گئی ہے؟

میں کسی بخار زدہ انسان کی طرح تھر تھر کانپ رہی تھی اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھا مگر باہر جانے کا کوئی راستہ نہ تھا' تمام کھڑکیاں مضبوطی سے بند تھیں پھر میں تیزی سے ایک کھڑکی کی طرف لپکی اور اسے کھولنے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ کھڑکی کے دونوں پٹ زنگ آلود ہونے کی وجہ سے اور بھی سخت ہوگئے تھے۔ میں نے ایک بار پھر پورا زور لگایا اور اس بار کھڑکی تو نہیں کھل سکی البتہ میں لڑکھڑاتی ہوئی ایک مجسمے پر جا گری۔ مجسمہ دھڑام سے فرش پر آرہا اور اس کے ساتھ میں بھی کمر کے بل زمین پر آرہی۔ خوش قسمتی سے میرا سر مجسمے سے نہیں ٹکرایا تھا ورنہ بھیجا پاش پاش ہوگیا ہوتا۔

چوٹ کا احساس کم ہوا تو میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن پاؤں دوبارہ پھسل گیا اور جونہی میری داہنی ہتھیلی فرش سے ٹکرائی تو مجھے یوں لگا جیسے فرش پر کوئی سیال شئے بکھری ہوئی ہو' فرط خوف سے میری چیخ حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ میں نے اپنا ہاتھ تیزی سے کھینچا اور ایک مجسمے کا سہارا لیتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔ میں نے ہاتھ کو سونگھا تو دل اور بھی زور زور سے دھڑکنے لگا اور جسم پر کیڑے سے رینگنے لگے۔

یہ خون کی بو تھی' تازہ اور گاڑھا خون اور پھر یک لخت میری آنکھوں کے سامنے ایک شعلہ سا بھڑک اٹھا اور میں دہشت زدہ سی ہوکر ایک قدم پیچھے گئی۔ یہ شعلہ دیا سلائی کا تھا' میں نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا' مجھ سے تین چار فٹ کے فاصلے پر مائیکل کھڑا تھا پھر اس نے دوسری دیا سلائی جلائی اور میں ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ پیچھے ہٹ گئی۔

"نہیں نہیں نہیں...... تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا مائیکل......" میں گھٹی گھٹی آواز میں چلا رہی تھی۔

اس نے تیسری دیا سلائی جلائی تو میری نظر دائیں طرف اٹھ گئی۔

"اُف میرا خدا۔" میری چیخ گلے میں اٹک کر رہ گئی' مجھے اپنی بصارت پر یقین نہیں آرہا تھا۔

میرے سامنے فرش پر برنیس کی لاش پڑی تھی اس کا سر پاش پاش تھا اور سرخ سرخ خون دور تک بہتا چلا گیا تھا' میں فرط خوف سے گنگ کھڑی تھی کہ دیا سلائی

بجھ گئی اور کمرے میں ایک بار پھر اندھیرا چھا گیا۔ مجھ سے ضبط نہیں ہو سکا اور مجسموں کو اِدھر اُدھر گراتی ہوئی بھاگ نکلی لیکن لرزیدہ ٹانگوں نے میرا ساتھ نہ دیا اور میں ایک دم فرش پر آ رہی۔ میرے گرتے ہی مائیکل نے ایک بار پھر ماچس جلائی اور بلند آواز میں پکارا۔

"ایمنڈا..... تم کہاں ہو؟"

میں نے جواب دینا چاہا لیکن الفاظ حلق میں گھٹ کر رہ گئے۔ برنیس کو خون میں لت پت دیکھ کر مجھے مائیکل سے نفرت ہو چکی تھی۔

"ایمنڈا..... کہاں ہو تم؟ کیا تم یہ سمجھ بیٹھی ہو کہ برنیس کو میں نے قتل کیا ہے؟" مائیکل کہہ رہا تھا۔ دیا سلائی ایک بار پھر بجھ گئی تھی اور ہال میں تاریکی پھیل گئی تھی' میں نے ایک مجسمے کا سہارا لیا اور اس سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی پھر مجھے مائیکل کے قدموں کی آہٹ سنائی دی' وہ دھیرے دھیرے میری طرف بڑھ رہا تھا۔

"میری بات غور سے سنو ایمنڈا!" وہ میرے قریب کھڑا تھا مگر میں خاموش رہی۔ "تم جواب کیوں نہیں دیتیں؟ یقین جانو ایمنڈا میں نے برنیس کو قتل نہیں کیا' میں تم دونوں کا تعاقب کرتا ہوا یہاں پہنچا ہوں۔ تمہارے چلے آنے کے بعد اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے تمہاری زندگی خطرے میں ہو' پھر میں تمہارے تعاقب میں چل دیا۔ تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے نا کہ یہ اخدشہ بے بنیاد نہیں تھا؟"

میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں دبا لیا' میرے تمام حواس پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ اس کا اعتبار کر لو' اس سے مت روٹھو ہاں..... مجھے اس کا اعتبار کر لینا چاہیے تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا نا کہ وہ مجھے بھی موت کے گھاٹ اتار دے گا' ہاں مجھے اس کا یقین کر لینا چاہیے اگر وہ قاتل ہے تو اس کے ہاتھوں قتل ہو جانا سب سے بڑی سعادت ہے۔

"کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے ایمنڈا!" اس نے قدرے بلند میں آواز میں کہا۔

"مجھے تم پر اعتبار ہے مائیکل!" میں نے بیٹھے بیٹھے جواب دیا اور میری آواز سنتے ہی اس کے ہاتھ اندھیرے کو چیرتے ہوئے میرے سر تک آ پہنچے پھر وہ نیچے جھکا اور مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیا اور اسی دم ہال میں ٹارچ کی تیز روشنی پھیل گئی' میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ میں نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی مگر روشنی کی چکا چوند کی تاب نہ لا سکی اور میں مائیکل کے بازوؤں میں کسمساتی ہوئی فرش پر بیٹھ گئی۔

"مجھ سے چھپنے کی کوشش بے سود ہے مینڈی!" یہ انتھونی کی آواز تھی۔ "تم بڑی ہی احمق عورت ہو مینڈی! مجھے افسوس ہے کہ میرا منصوبہ ناکام رہا اور تم نے مائیکل کا اعتبار کر لیا ورنہ آئرس اور برنیس کے قتل کے جرم میں یہ ہمیشہ کے لیے زنداں میں پڑا رہتا اور اس طرح تم بھی ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتیں لیکن اب مجھے تم دونوں کو ایک ساتھ ٹھکانے لگانا ہوگا۔"

مائیکل نے مجھے اور بھی مضبوطی سے تھام لیا اور میں غیر ارادی طور پر قہقہے لگانے لگی پھر میں بیک وقت رونے اور قہقہے لگانے لگی اور اس کے بعد نہ جانے کیا ہوا کہ میں حلق پھاڑ کر چیخنے لگی۔

"اسے چپ کراؤ۔" انتھونی نے مائیکل سے کہا۔ "اگر تم نے اسے خاموش نہ کیا تو میں اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کر دوں گا۔" اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا دایاں ہاتھ بلند کیا تو میرے قہقہے یک لخت تھم گئے اور آنسو دیدوں ہی میں خشک ہو کر رہ گئے اس کے دائیں ہاتھ میں ایک وزنی ہتھوڑا لہرا رہا تھا جس کا سرا برنیس کے خون سے سرخ ہو رہا تھا۔

"تم نے برنیس کو کیوں قتل کیا انتھونی؟" مائیکل نے بے خوف لہجے میں پوچھا۔ "میرے وہم و گمان

میں بھی نہ تھا کہ تم کسی کو قتل بھی کر سکتے ہو اور وہ بھی برنیس جیسی بے گناہ لڑکی کو۔"

"وہ بے گناہ ہی نہیں احمق بھی تھی۔" انتھونی فاتحانہ انداز میں بولا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں اور مائیکل کے بازوؤں میں سمٹ گئی تھی۔

"اکثر عورتیں بے وقوف ہوتی ہیں۔" انتھونی کی آواز ایک بار پھر گونجی۔ "آئرس بھی بے وقوف تھی' برنیس سے بھی زیادہ بے وقوف اور برنیس کا قصور یہ تھا کہ وہ کچھ زیادہ بولنے لگی تھی۔"

"یہ جھوٹ ہے۔" مائیکل نے جواب دیا۔ "آئرس کسی کو بلیک میل نہیں کر سکتی تھی۔ وہ بہت صاف ستھرے ذہن کی مالک تھی' اسے اداکاری کے سوا کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔"

"شٹ اپ۔" انتھونی نے درشت لہجے میں کہا' میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا' ہتھوڑا اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا' وہ ایک قدم اور آگے آ گیا تھا۔

"تم آئرس کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔" انتھونی حقارت سے بولا۔ "میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اس نے مجھے کس طرح بلیک میل کرنا چاہا تھا؟ پیڈیالو کے ہاتھ جڑاؤ پن کس نے فروخت کی تھی' نہیں جانتے؟ تو سنو یہ کام آئرس نے سرانجام دیا تھا' کیا سمجھے؟"

"غالباً تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ یہ ساری اسکیم آئرس ہی کی تھی؟"

"نہیں یہ میری اسکیم تھی۔" انتھونی غرور سے بولا۔ "وہ اتنی ذہین نہیں تھی کہ اس نے وہی کچھ کیا جو میں نے اسے سمجھایا تھا' اب تم پوچھو گے کہ وہ اس کام پر آمادہ کیسے ہو گئی؟ وہ جانتی تھی کہ ڈھائی لاکھ پونڈ بہت بڑی رقم ہے وہ اس میں سے اپنا حصہ بٹانا چاہتی تھی۔"

"کیا تم مجھے یہ باور کرانا چاہتے ہو کہ وہ تمہارے اور گرین کے درمیان......" مائیکل نے اپنی بات پوری بھی نہیں کی تھی کہ انتھونی بول اٹھا۔

"گرین......" اس نے استہزائیہ انداز میں کہا' اس کی آنکھیں درندوں کی طرح دہک رہی تھیں اور چہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ "گرین کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں' میں نے کہا ہے نا کہ یہ ساری اسکیم میری تھی۔ ڈیڈی نے مجھے اس مقصد کے لیے وان کے پاس اٹلی بھیجا تھا کہ میں انہیں وان کی کارکردگی سے مطلع کرتا رہوں' انہوں نے مجھے پیغام رساں لڑکے کی حیثیت سے اٹلی بھیجا تھا لیکن تقدیر نے اس پیغام رساں لڑکے کو قاتل بنا دیا۔" پھر اس نے ایک فاتحانہ قہقہہ لگایا۔ "وان میرا بڑا بھائی تھا' بہت ذہین اور دور اندیش لیکن فطرتاً بہت ہی سادہ لوح اور بے ضرر انسان تھا۔"

"میں اب سمجھا۔" مائیکل نے سر کو ہلکی سی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ "وان کے کمرے میں آگ تمہی نے لگائی تھی؟"

"مجھے اپنے جرم کا اعتراف ہے مسٹر مائیکل!" انتھونی کے لبوں پر ایک مکروہ تبسم کھیل رہا تھا۔ "آگ میں نے ہی لگائی تھی لیکن اس کا مقصد وان کو قتل کرنا نہیں تھا' مجھے صرف جڑاؤ پن ہتھیانا تھی اور یہ محض اتفاق تھا کہ میرا بھائی اس آگ میں جل کر راکھ ہو گیا' میں اپنے بھائی کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ میں نے کچن میں آگ بھڑکائی اور اس کے بیڈ روم میں چلا آیا جب دھواں پھیلنے لگا تو میں نے اپنے بھائی کو بتایا کہ مکان میں آگ لگ گئی ہے۔ وہ گھبراہٹ کے عالم میں بستر سے اٹھا اور کچن کی طرف بھاگا' جڑاؤ پن میز پر رکھی تھی کیونکہ وہ اسے ہر وقت اپنے پاس رکھتا تھا۔ اس کے جاتے ہی میں نے جڑاؤ پن اچک لی اور تیزی سے باہر آ گیا' میرا خیال تھا وہ بھی کمرے سے نکل آئے گا مگر افسوس کہ آگ نے بچ نکلنے کی مہلت نہ دی۔"

وہ ہمارے ساتھ کھڑا تھا' ہتھوڑے والا ہاتھ اب بھی اوپر اٹھا ہوا تھا اور کسی بھی وقت ہم پر حملہ آور ہو سکتا تھا' مائیکل مجھے اپنے بازوؤں میں سمیٹے کھڑا تھا۔

''میں نے وہ جڑاؤ پن ڈھائی لاکھ پونڈ میں فروخت کردی تھی۔'' انتھونی نے کہنا شروع کیا۔''اور تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ میں نے اس رقم میں سے اپنی ذات پر ایک پائی بھی خرچ نہیں کی' البتہ آئرس کو اس کا جائز حصہ ادا کردیا تھا اور وہ اس پر مطمئن ہوگئی تھی' سارا منصوبہ میری توقعات کے عین مطابق پورا ہوگیا تھا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا' ہم بھی مطمئن تھے کہ پدیالو کی موت نے سب کچھ الٹ پلٹ کردیا۔ پدیالو کے انتقال کی خبر مجھے آئرس ہی نے پہنچائی تھی۔''

''کیا وہ جانتی تھی کہ پیدالو کی موت کے بعد اس کے قانونی مشیر نے مجھے بلوایا تھا تاکہ میں جڑاؤ پن کی قدروقیمت کا صحیح تخمینہ بتاسکوں۔''

''نہیں' اسے اس بات کا قطعی علم نہیں تھا۔'' انتھونی نے کہا۔''اس کا اصل قصور یہ تھا کہ وہ اپنے معاہدے سے پھر گئی تھی اور مجھ سے مزید رقم ہتھیانا چاہتی تھی۔ اس نے مجھے لکھا تھا کہ وہ گرین کو ساتھ لے کر لندن آرہی ہے اور اگر میں نے اسے مزید پانچ ہزار پونڈ ادا نہ کیے تو وہ میرے ڈیڈی کو سب کچھ بتادے گی۔ پانچ ہزار پونڈ کوئی بڑی رقم نہیں' میں اسے یہ بھی دے دیتا بشرطیکہ وہ مجھے دھمکی نہ دیتی' وہ مجھے بلیک میل کرنا چاہتی تھی۔''

''گرین کو وہ اپنے ساتھ کیوں لائی تھی؟'' مائیکل نے تیز لہجے میں کہا۔ وہ انتھونی کو باتوں میں الجھائے رکھنا چاہتا تھا' تاوقتیکہ اسے جوابی حملے کی مہلت مل جائے' میں نے اس دوران کئی بار سوچا تھا کہ انتھونی پر کود جاؤں کیونکہ جب تک وہ مجھ سے نمٹتا' مائیکل اسے دبوچ لیتا لیکن میں یہ خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی ناکامی کی صورت میں وہ ہم دونوں کو موت کے گھاٹ اتار سکتا تھا۔

''گرین بھی خاصا احمق ثابت ہوا ہے۔'' انتھونی نے حقارت سے جواب دیا۔ آئرس نے اسے یہ باور کرادیا تھا کہ وہ جڑاؤ پن کی آڑ میں میرے ڈیڈی سے خاصی رقم ہتھیا سکتا ہے' اس کا پلان یہ تھا کہ میرے ڈیڈی کو اس بات پر قائل کرلے کہ جڑاؤ پن کی موجودگی ان کے تاریخی مفروضات اور ان کی عالمانہ عظمت کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے لہٰذا اسے خرید کر تلف کردینا چاہیے۔ اس طرح گرین کو بطور کمیشن خاصی رقم ہاتھ لگ سکتی تھی۔ دوسری طرف آئرس مجھ سے رقم بٹورنا چاہتی تھی۔ علاوہ ازیں گرین کو یہ بھی معلوم ہوچکا تھا کہ تم لندن پہنچ چکے ہو اور تمہاری موجودگی کو وہ اپنے لیے بہت بڑا خطرہ سمجھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے آئرس سے مل کر تمہاری اور آئرس کی شادی کے جعلی کاغذات تیار کروائے' اسے تمہارے خلاف دیکھ کر مجھے یہ موقع مل گیا کہ آئرس کو ٹھکانے لگادوں۔ مجھے یقین تھا کہ گرین تمہی کو قاتل ٹھہرائے گا اور وہی ہوا۔''

''کیا آئرس نے گرین کو یہ بات بتادی تھی کہ جڑاؤ پن تم نے چرائی تھی اور اس کی فروخت کا کام آئرس نے خود سرانجام دیا تھا؟'' مائیکل نے پوچھا۔

''نہیں۔'' انتھونی نے جواب دیا۔''میرے خیال میں وہ ایسا نہیں کرسکتی تھی' وہ صرف سوچ کر آئی تھی کہ مجھے آسانی سے بے وقوف بنالے گی لیکن میں نے اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کردیا اور اب میں تم دونوں کو اسی طرح ٹھکانے لگادوں گا جس طرح میں نے برنیس اور آئرس کو ٹھکانے لگایا ہے۔''

اور اس کے ساتھ ہی اس نے ہتھوڑے والے ہاتھ کو حرکت دی' مائیکل ہتھوڑے کی زد میں تھا لیکن اس سے پہلے کہ انتھونی مائیکل پر وار کرتا میں بجلی کی سی

تیزی سے مائیکل کی گرفت سے نکلی اور دونوں کے درمیان دیوار کی طرح حائل ہوگئی۔ میں چاہتی تھی انقونی پہلے مجھ پر وار کرے اور مائیکل اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو جائے۔

"یہ تم نے کیا کیا مینڈی!" مائیکل تڑپ کر بولا۔

"تم اپنی فکر کرو مائیکل!" میں نے ایک مجسمے کی اوٹ سے جواب دیا۔ انقونی میری اس جسارت پر چڑا سا گیا' اس نے ٹارچ کی روشنی کا رخ میری طرف پھیر دیا اور دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگا۔

"رک جاؤ انقونی' رک جاؤ......" میں نے چیخ چیخ کر کہا۔ "میں تمہاری ہر بات ماننے کو تیار ہوں' مجھ پر بھروسہ رکھو انقونی! میں پولیس کو کچھ بھی نہیں بتاؤں گی۔ میں پولیس کو یہ بھی نہیں بتاؤں گی کہ تمہارے ہی کہنے پر برنیس نے آئرس بن کر گرین کو فون کیا تھا کہ اسے مائیکل سے جان کا خطرہ ہے حالانکہ آئرس اس وقت قتل ہو چکی تھی۔ تم گھر سے میری تلاش میں جانے کا بہانہ کر کے نکلے تھے اور آئرس کو قتل کرنے کے بعد الٹے پاؤں گھر لوٹ آئے تھے۔ برنیس تمہاری راز دار تھی اور تم نے اسے محض اس لیے قتل کر دیا کہ وہ اس راز کو مجھ پر ظاہر کر دینا چاہتی تھی۔ ٹھیک ہے نا؟ لیکن میں برنیس نہیں ہوں' تمہارے۔ ہر راز کو مرتے دم تک اپنے سینے میں پوشیدہ رکھوں گی۔ میرا اعتبار کرو انقونی! مجھے تم سے محبت ہے' کیا تمہیں یقین نہیں آتا؟ کیا تم اتنا بھی نہیں سوچ سکتے کہ اگر مجھے تم سے محبت نہیں ہوتی تو میں تمہیں گرفتار کروا چکی ہوتی۔ تم نے اعتراف کر لیا کہ تم دان کو قتل نہیں کرنا چاہتے تھے اور میں نے تمہاری اس بات کا یقین کر لیا ہے۔ مجھے اپنی اس حماقت کا اعتراف ہے کہ میں نے تمہاری محبت کا کبھی اقرار نہیں کیا لیکن آج میں خلوص دل سے اس بات کا اعتراف کرتی ہوں کہ مجھے آج بھی تم سے والہانہ محبت ہے۔ میں تمہارے ساتھ جانے کو تیار ہوں' یقین کرو انقونی!" اس پر تذبذب کی کیفیت طاری تھی' ہتھوڑا اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ کسی بھی وقت مجھ پر حملہ آور ہو سکتا تھا۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں انقونی!" میں نے دھیمی آواز میں کہا' فرط خوف سے میرا گلا بند ہونے لگا تھا۔

"نہیں' تم جھوٹ بول رہی ہو۔" اس نے نفرت سے کہا اور اس کے ساتھ ہی اس نے ہتھوڑے کو پوری قوت سے لہرایا اور میرا سر کو نشانہ بنایا لیکن میں بجلی کی تیزی سے پیچھے ہٹ چکی تھی۔

"تم میرے ہاتھ سے نہ بچ سکو گی۔" اس نے ہتھوڑا بلند کرتے ہوئے کہا اور آگے بڑھتے ہوئے میرے سر کو نشانہ بنایا لیکن اس بار بھی میں اس کی زد میں نہ آ سکی۔

"رک جاؤ انقونی! تمہیں میری باتوں کا یقین کر لینا چاہیے مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا' وہ فرط غیظ سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔

"میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا مینڈی!" یہ کہتے ہوئے وہ دیوانہ وار میری طرف لپکا اور ہتھوڑے کو پوری قوت سے لہراتے ہوئے میرے سر پر لے آیا پھر ہتھوڑا تیزی سے نیچے آیا اور اس کے ساتھ ہی میں حلق پھاڑ کر چیخی۔ دوسرے ہی لمحے ہتھوڑا ایک مجسمے کے سر سے جا ٹکرایا اور انقونی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا' اسی دم مائیکل چیتے کی طرح اچھلا اور انقونی کو فرش پر گرا دیا۔ گرتے ہی انقونی کا سر کسی پتھریلی شے سے ٹکرایا اور وہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ میں تیزی سے مائیکل کی طرف لپکی اور اس ایک بار پھر اس کے محبت بھرے بازوؤں میں سمائی چلی گئی۔

پراسرار قتل

خلیل جبار

ہمارا دین مبین ہمیں توکل کی ہدایت کرتا ہے' یعنی ہمیں ہر حالت میں اللہ رب العزت پر بھروسہ کرنا چاہیے' جس نے ہمیں پیدا کیا اور روزی دی وہی حالات کے مطابق ہمیں سہارا دیتا ہے لیکن ان سب باتوں پر ایمان رکھنے کے باوجود ہم مسلسل دولت جمع کرنے اور خوب سے خوب تر کی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں اور ایسے میں خونی رشتوں کی پامالی سے بھی گریز نہیں کرتے۔

دولت کی بھینٹ چڑھ جانے والے ایک شخص کا قصۂ عبرت۔

کورٹ رپورٹر کی ڈائری کا ایک ورق' حیدر آباد کا ایک سچا واقعہ۔

شمائلہ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئی اسے ایک انسانی ہیولا نظر آیا' وہ انسانی ہیولے کو دیکھ کر ایک لمحے کو خوف زدہ ہوگئی تھی۔ اس کے منہ سے زوردار چیخ نکل گئی پھر اس نے خود پر قابو پالیا اور اس نے جیسے ہی ہیولے کو پکڑنے کی کوشش کی وہ ہیولا فضا میں تحلیل ہوگیا اس نے اسے اپنا وہم جانا اور مطمئن ہوکر بیڈ پر لیٹ گئی۔

شمائلہ کے شوہر سہیل کی پُراسرار ہلاکت کو ابھی چند دن ہی ہوئے تھے' پولیس سہیل کے ملزمان کو پکڑنے کی غرض سے تفتیش کررہی تھی ان چند دنوں میں جب بھی شمائلہ کو تنہائی ملتی تھی اسے عجیب قسم کا خوف اور ڈر محسوس ہونے لگتا تھا حالانکہ جب تک شوہر سہیل زندہ رہا اسے کبھی بھی تنہائی میں خوف و ڈر محسوس نہیں ہوا تھا۔ ابھی اسے بیڈ پر لیٹے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ اس نے چھت پر کسی کو چلتے ہوئے دیکھا اس کے پاؤں چھت پر جبکہ دھڑ نیچے کی طرف تھا۔ چھت پر وہ ایسے چل رہا تھا کہ جیسے زمین پر چل رہا ہو۔ شمائلہ کو اپنی طرف متوجہ پاکر اس نے زوردار قہقہہ لگایا اور اپنی بتیسی ایسے بجائی جیسے سخت سردی سے دانت بج اٹھے ہیں۔ شمائلہ چیخنا نہیں چاہتی تھی مگر پھر اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ گھر میں کوئی نہیں تھا جو اس کی چیخ سن کر آتا' شمائلہ کے چیخنے پر چلنے والے شخص نے اسے گھور کر دیکھا اور پھر غائب ہوگیا۔

اس کے غائب ہوجانے پر بھی شمائلہ خاصی دیر تک گم صم بیڈ پر پڑی رہی' یہ ابتدا تھی اب وہ ہیولا روزانہ مختلف صورت میں آکر شمائلہ کو ڈرانے لگا تھا۔ ایسا وہ دن میں اس وقت کرتا تھا جب گھر میں اس کے علاوہ کوئی اور نہیں ہوتا تھا۔ ڈر و خوف کے مارے شمائلہ کسی کو بتا بھی نہیں پارہی تھی کیونکہ اس نے سن رکھا تھا کہ آسیب کے بارے میں ظاہر کردینے سے وہ زیادہ غصے میں آجاتا ہے اور پہلے سے زیادہ تنگ کرنے لگتے ہیں۔ وہ عدت میں بیٹھی ہوئی تھی اور اپنے روحانی علاج کے لیے کہیں جا بھی نہیں سکتی تھی اس لیے بہتری اسی میں تھی کہ وہ خاموشی اختیار رکھے اور عدت پوری ہونے کا انتظار کرے۔

گرمیوں کے دنوں میں کمرے میں رات گزارنا مشکل ہوجاتی تھی' گرمیاں آچکی تھیں اس لیے شمائلہ رات میں صحن میں اپنی چھوٹی بیٹی ملالہ کے ساتھ سونے کی غرض سے لیٹ گئی تھی۔ رات ابھی زیادہ نہیں گزری تھی' شمائلہ جتنا سونا چاہ رہی تھی نیند اتنا ہی دور ہوتی جارہی تھی۔ وہ کئی دن سے گہری نیند نہیں لے سکتی تھی آسیب کی وجہ سے اس کے ذہن پر دباؤ تھا جو اسے سکون نہیں لینے دے رہا تھا۔ اچانک شمائلہ کو ایسا

محسوس ہوا کہ جیسے کوئی سایہ ہے جو دروازے کی دیوار پر چل رہا ہے۔ سائے کو دیکھ کر شمائلہ کے چہرے پر خوف طاری ہو گیا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس سائے کو غور سے دیکھنے لگی پھر خود بخود اس سائے کا چہرہ واضح ہونے لگا۔ جوں جوں سائے کا چہرہ واضح ہو رہا تھا شمائلہ کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ سایہ وہی تھا جو اسے کئی دن سے ہیولے کی صورت میں تنگ کر رہا تھا' بے اختیار شمائلہ کی چیخ نکل گئی' اس کے چیخنے پر وہ سایہ قہقہہ لگاتے ہوئے غائب ہو گیا تھا۔

''کیا ہوا امی جان!'' عباس دوڑتے ہوئے اس کے پاس آیا۔

''عباس بیٹے وہ سایہ...... مم...... مجھے پھر نظر آیا تھا۔'' پسینے میں بھیگی شمائلہ نے کہا۔

''کیا بات ہے امی! وہ سایہ آپ کو روز ہی نظر آنے لگا ہے' آخر وہ کیا چاہتا ہے؟'' عباس نے پوچھا۔

''مجھے کیا پتا وہ کیا چاہتا ہے' اسے دیکھتے ہی میری چیخ نکل جاتی ہے اور وہ قہقہہ لگاتے ہوئے غائب ہو جاتا ہے۔''

''امی ایسا کریں گاؤں چلی جائیں' نانا جان کے گھر کچھ عرصہ رہنے پر ہو سکتا ہے' طبیعت بہتر ہو جائے اور وہ سایہ تنگ کرنا چھوڑ دے۔'' طارق نے کہا۔

''تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو' میرے زیادہ دن یہاں رہنے سے وہ سایہ مجھے ڈرا ڈرا کر ہلاک کر ڈالے گا۔''

''ہاں یہ ٹھیک ہے' نانا جان کے گھر آپ کی طبیعت اچھی رہتی ہے۔ وہ ویسے بھی پہاڑی علاقہ ہے' وہاں کی آب و ہوا بھی اچھی ہے وہاں رہنے سے طبیعت اچھی ہی رہے گی۔'' عباس نے کہا۔

''امی صحن کو چھوڑ دیں' کمرے میں آ کر لیٹ جائیں' ہماری موجودگی میں اس سائے کی اتنی ہمت نہیں ہو گی کہ آپ کو تنگ کرے۔'' طارق نے کہا۔ بیٹوں کے

کہنے پر شمائلہ صحن سے اٹھ کر کمرے میں چلی گئی۔
شمائلہ کمرے میں بچھی چارپائی پر لیٹ گئی' وہاں بھی اسے نیند آنے کی بجائے سوچیں آنے لگی تھیں۔ شادی ہر لڑکی کا خواب ہوتا ہے اور وہ سمجھتی ہے کہ شادی کے بعد اس کی لاٹری کھل جائے گی۔ شوہر اس پر کھلا خرچ کرے گا ہر فرمائش منہ سے نکلتے ہی پوری ہو جائے گی۔ اس کے ساتھ کی سہیلیاں شادی ہونے پر بہت خوش تھیں اور ان کے منہ سے شوہر کی تعریفیں سن کر شمائلہ کے کان پک گئے تھے۔ اب اس کا من بھی یہی چاہنے لگا تھا کہ اس کی بھی شادی ہو جائے تا کہ وہ بھی چسکے لے لے کر اپنے شوہر کی باتیں اور تعریفیں بڑھا چڑھا کر بیان کرے۔ اس نے بھی دوسری لڑکیوں کی طرح خواب دیکھنا شروع کر دیئے تھے۔ وہ اپنے شوہر میں ایسی خوبیاں دیکھنے لگی تھی جو ہر لڑکی شادی سے قبل سوچتی ہے۔ ایک آئیڈیل شوہر جس میں خوبیاں ہی خوبیاں ہوں مگر قسمت میں ایسا کہاں ہوتا ہے۔ خواب خواب ہی ہوتے ہیں' ان میں حقیقت کہاں ہوتی ہے' جب شمائلہ کی سہیل سے شادی ہوئی وہ ارمانوں سے اس کے گھر آئی تھی۔ چند دن گزرنے پر اس پر سہیل کی حقیقت کھل گئی' سہیل کی آمدنی بہت اچھی تھی مگر وہ انتہا کا کنجوس تھا۔ ایک ایک پیسہ بہت ہی سوچ سمجھ کر خرچ کرتا تھا' اس کے لیے مشہور تھا کہ پیسے کو دانتوں سے پکڑ لیتا ہے کہ کہیں خرچ نہ ہو جائے۔ شمائلہ نے اپنی سہیلیوں سے سن رکھا تھا کہ شوہر شادی کے ابتدائی دنوں میں بیوی کو اچھے اچھے ہوٹلوں پر کھانا کھلانے کو لے کر جاتے ہیں' اس کے دل میں بھی یہ خواہش تھی کہ اس کا شوہر اسے ہوٹل لے کر جائے' جب اس نے اپنی اس خواہش کا اظہار سہیل سے کیا وہ مسکراتے ہوئے بولا۔
''بیگم کیا تم اب ہوٹل میں کھانا کھاؤ گی' ہوٹل میں اچھے کھانے کہاں پکتے ہیں۔''
''میری سہیلیاں ہوٹل کے کھانوں کی بڑی تعریفیں کرتی ہیں۔''
''میں تمہیں کیسے سمجھاؤں ہوٹل کے کھانوں میں صرف ذائقہ ہی ہوتا ہے لیکن وہ کھانے صحت کے لیے نقصان دہ ہوتے ہیں۔ کبھی ہوٹل کا کچن دیکھا ہے' وہاں کس قدر گندگی ہوتی ہے۔ کیڑے مکوڑے' لال بیگ ایسے کھانے پینے کی اشیا پر گھوم رہے ہوتے ہیں جیسے پکنک منانے آئے ہوں۔''
''کیا واقعی ایسا ہوتا ہے؟'' وہ بُری طرح چونکی۔
''میں کیا تم سے جھوٹ بولوں گا' میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میرے کئی دوستوں نے بتایا ہے کہ ان کے کھانوں میں لال بیگ نکل آئے تھے اس لیے انہوں نے باہر کھانا کھانا چھوڑ دیا۔''
''بب...... بس کرو...... ورنہ مجھے الٹی ہو جائے گی۔'' شمائلہ نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔
''بس...... میں چاہ رہا تھا کہ اپنے دوستوں کے ساتھ ہوٹل میں ہونے والے واقعات ذرا تفصیل سے سناؤں۔'' سہیل نے کہا۔
''ہوٹل نہیں لے جانا تو ایسے ہی منع کر دو اس طرح کے واقعات سنا کر میری طبیعت خراب نہ کرو۔''
''ہاں' میں اسی لیے ہوٹل کے کھانے نہیں کھاتا' گھر کی چٹنی بھی اچھی ہوتی ہے کیونکہ وہ صاف ستھری بنی ہوتی ہے۔''
''گھر میں چٹنی کے علاوہ بھی بہت کچھ بنتا ہے۔''
''ہاں ہاں میں کب انکار کر رہا ہوں' میں نے مثال کے طور پر بتایا ہے۔'' سہیل مسکرایا۔ اسے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ بیگم ہوٹل کا کھانا کھانے سے پہلے ہی اکتا گئی تھی۔
سہیل نے گھر میں بچپن سے غربت دیکھی تھی' گھر میں کھانے کے لالے پڑے رہتے تھے' اس کے والد نور محمد ایک مزدور تھا' کبھی مزدوری مل گئی' کبھی نہیں ملی۔ سہیل کے دو بڑے بھائی ایاز اور نیاز جیسے تیسے پڑھ لکھ گئے تھے' نصیب بھی ان کا اچھا تھا کہ انہیں

سرکاری نوکریاں بھی مل گئیں۔ ان کے نوکری مل جانے سے گھر میں خوشحالی آ گئی تھی مگر یہ خوشحالی چند روزہ ہی ثابت ہوئی تھی۔ وہ شادی کرکے گھر سے الگ رہنے لگے تھے' والدین کو بھی ان کے گھر سے الگ ہوجانے کا دکھ تھا' دو لاکھ سمجھانے پر بھی نہیں آئے۔ سہیل اس وقت میٹرک میں تھا اس نے میٹرک کرکے اپنے تعلیم کے اخراجات پورے کرنے کے لیے پارٹ ٹائم کام کرنا شروع کردیا۔ اس کے پارٹ ٹائم کام کرنے سے نا صرف تعلیمی اخراجات پورے ہونے لگے تھے بلکہ وہ کچھ رقم والدین کو گھر کے خرچ کے لیے دے دیا کرتا تھا۔ نور محمد کی بڑی خواہش تھی کہ سہیل صرف تعلیم پر توجہ دے مگر مالی مجبوری کے سبب وہ سہیل کو پارٹ ٹائم کام کرنے سے روک نہیں سکتا تھا۔ اگر وہ زبردستی پارٹ ٹائم روک دیتا تو سہیل کے تعلیمی اخراجات کہاں سے پورے ہوتے۔

نور محمد کو اپنے بیٹوں کی بے حسی کا بھی بہت دکھ تھا جب اس کے بیٹے گھر میں خوشحالی لانے کے قابل ہوئے تو گھر ہی چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ سراسر خودغرضی نہیں تو کیا تھی۔ نور محمد سے زیادہ غصہ سہیل کو اپنے بھائیوں پر تھا' وہ اندر ہی اندر کڑتا رہتا تھا۔ اس کے دوست احباب' عزیز' رشتے دار بھی اس سے کتراتے تھے کہ کہیں وہ ان سے مالی مدد نہ مانگ لے جیسے تیسے کرکے سہیل نے ماسٹر کرلیا تھا۔ ماسٹر کرتے ہی وہ مقابلے کے امتحان میں بیٹھ گیا۔ امتحان میں کامیابی ملنے پر اسے سرکاری محکمے میں اچھی نوکری مل گئی۔ نوکری کیا ملی جو عزیز رشتے داران سے ملنے سے کتراتے تھے وہ ان کے قریب آنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ سہیل کو ان سب کی اوقات کا پتا چل چکا تھا اس لیے وہ ان سے ایک خاص حد تک ہی ملنا پسند کرتا تھا۔

شمائلہ کے والدین سہیل کے دور پرے کے رشتے دار تھے' ایک تقریب میں جب سہیل نے شمائلہ کو دیکھا وہ اس پر مر مٹا۔ وہ ہر صورت میں شمائلہ سے شادی کرنا چاہتا تھا' جب سے سہیل کے پاس دولت آئی تھی وہ کنجوس ضرور ہوگیا تھا لیکن خوب صورت دوشیزائیں اس کی کمزوری ہوگئی تھیں وہ اپنی عیاشی کی خاطر ان پر کچھ رقم خرچ کرنے میں کنجوسی نہیں کرتا تھا۔ وہ دوسرے عیاش لوگوں کی طرح نہیں تھا کہ اپنی تمام دولت ان پر خرچ کرڈالتے ہیں۔ وہ یہ بات جانتا تھا کہ یہ خوب صورت دوشیزائیں جب تک آدمی کے پاس دولت ہو ساتھ رہتی ہیں پھر دولت ختم ہوجانے پر کسی اور کی بانہوں میں چلی جاتی ہیں۔ وہ شمائلہ کو ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا اور یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ وہ اس سے شادی کرلے۔ نور

گناہ گاروں پر سخاوت!

آپ ﷺ کے پاس ایک بدو آیا اور کہا۔ ''حضور ﷺ ایک بہت بڑا گناہ ہوگیا۔''

فرمایا ''کیا؟''

بدو بولا۔ ''حضور ﷺ میں روزہ کی حالت میں بیوی کے پاس چلا گیا۔'' فرمایا۔ ''تم ساٹھ روزے رکھو کفارہ ہوجائے گا۔'' اس نے کہا۔ ''ایک روزہ میں یہ حالت ہوگئی ساٹھ کیسے رکھوں۔''

فرمایا۔ ''ساٹھ غریبوں کو کھانا کھلاؤ۔'' فرمایا۔ ''خود مشکل سے کھاتا ہوں ساٹھ کو کیسے کھلاؤں۔''

آپ ﷺ نے فرمایا۔ ''اچھا تم بیٹھو میں کچھ کرتا ہوں۔'' اتنے میں ایک صحابیؓ کھجوروں کا ٹوکرا لائے آپ ﷺ نے وہ ٹوکرا بدو کو دیا اور کہا۔ ''غریبوں میں بانٹ دو کفارہ ہوجائے گا۔''

بدو بولا۔ ''آپ ﷺ تیری قسم پورے مدینے میں مجھ سے زیادہ غریب ہے ہی کوئی نہیں۔''

آپ ﷺ بے ساختہ مسکرائے اور فرمایا۔ ''جا یہ ٹوکرا تو ہی لے جا۔''

مدیحہ کمال' لاہور

محمد اور اس کی بیوی کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ شمائلہ کے والدین کو اچھی طرح سے جانتے تھے۔ وہ ان کے دیکھے بھالے رشتے دار تھے اس لیے بات بن گئی تھی۔ شمائلہ سہیل کی بیوی بن کر ان کے گھر میں آ گئی۔ سہیل کی شادی کے چند سال تک ہی وہ دونوں میاں بیوی جی سکے تھے اس دوران شمائلہ نے دو بیٹوں طارق اور عباس کو جنم دیا تھا۔ سہیل خرچہ کرنے کے معاملے میں بہت محتاط تھا اور ایک ایک پیسہ بہت سوچ سمجھ کر خرچ کیا کرتا تھا۔ شمائلہ کو اپنے شوہر کی یہ عادت بہت زہر لگتی تھی' کیونکہ وہ بھی عام عورتوں کی طرح سوچتی تھی کہ شوہر کا ہاتھ کھلا ہونا چاہیے۔ وہ اپنے بیوی اور بچوں پر دل کھول کر خرچ کرے' شمائلہ اپنے شوہر کی کنجوسی پر دل ہی دل میں کڑھتی رہتی تھی۔

دن ایسے ہی گزر رہے تھے' طارق اور عباس تعلیمی مدارج طے کرتے ہوئے انٹر میں پہنچ گئے تھے۔ انہیں بھی اپنے والد کی کنجوسی کی عادت اچھی نہیں لگتی تھی' جب وہ کالج میں اپنے دوستوں کو موٹر سائیکل پر آتا دیکھتے ان کے دل میں بھی یہ خواہش جنم لیتی تھی کہ کاش ان کے پاس بھی موٹر سائیکل ہوتی وہ بھی اپنے دوستوں کے ساتھ گاڑی میں کالج آتے۔

ایک دن جب طارق سے برداشت نہ ہوسکا تو اس نے اپنی اس خواہش کا اظہار ابو سے کر دیا حالانکہ اسے معلوم تھا سہیل موٹر سائیکل دلا کر نہیں دے گا پھر بھی یہ سوچ کر شاید ابو ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے گاڑی دلا دیں' سہیل بیٹے کی خواہش کو سن کر بے اختیار مسکرا دیا۔

''تمہیں گاڑی کی کیا ضرورت پڑ گئی' چند قدم کے فاصلے پر کالج ہے۔''

''ابو چند قدم کے فاصلے پر کہاں' پیدل جانے پر پورے بیس منٹ خرچ ہوتے ہیں۔'' طارق نے کہا۔

''تم جوان ہو' پندرہ بیس منٹ روزانہ چلنے سے تمہاری صحت پر کون سا فرق پڑ جائے گا۔ میں بوڑھا آدمی اپنے آفس آدھے گھنٹے پیدل چل کر جاتا ہوں اس طرح آفس جانے سے دو فائدے ہوتے ہیں کہ فضول خرچی سے بچ جاتا ہوں' دوسرا فائدہ یہ کہ صبح صبح واک ہوجاتی ہے۔ تم خوش نصیب ہو کہ تمہارے کالج اتنے فاصلے پر ہے کہ صبح ہی صبح تمہاری واک ہوجاتی ہے۔'' سہیل نے کہا۔

ابو کی بات سن کر طارق جل بھن کر رہ گیا' اس نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح ابو کو گاڑی کے لیے قائل کرلے مگر وہ قائل ہونے والے نہیں لوگوں کو قائل کرنے والوں میں سے تھے جب وہ ابو کو قائل کرنے میں ناکام رہا تو اس نے امی کا سہارا لیا وہ اس کی بات سن کر چہرے پر پھیکی مسکراہٹ لا کر رہ گئیں۔

''طارق تم سے کس نے کہا تھا کہ اپنے ابو سے گاڑی کی فرمائش کرو؟''

''مجھے بھلا کون کہے گا' میرے سب دوست گاڑی پر کالج آتے ہیں میں کیا ان سے کم ہوں۔ میرے ابو بھی اچھے عہدے پر فائز ہیں وہ موٹر سائیکل کیا کار بھی دلا سکتے ہیں۔'' طارق نے کہا۔

''وہ تمہیں دلائیں گے نہیں' اس لیے ان سے فرمائش مت کرو۔'' وہ بولیں۔

''کیوں؟ وہ کیوں نہیں مجھے گاڑی دلائیں گے' کیا میں ان کا بیٹا نہیں ہوں؟'' طارق بھڑک اٹھا۔

''طارق بیٹے میں جب سے اس گھر میں آئی ہوں' تمہارے ابو کو ایسا ہی پایا ہے۔ وہ ٹکے ٹکے پر جان دیتے ہیں' میرے شادی سے پہلے بہت ارمان تھے مگر افسوس کے انہوں نے ایک بھی ارمان پورا نہیں کیا۔ انہیں ہم سے زیادہ دولت سے پیار ہے۔ وہ دولت پر سانپ بن کر بیٹھے ہوئے ہیں۔'' شمائلہ کے منہ سے دل میں جو بات تھی وہ نکل گئی۔

''وہ ایسے کیوں ہیں؟''

''جن لوگوں نے بچپن میں دولت نہیں دیکھی ہوتی اور پھر اچانک انہیں دولت حاصل ہوجائے پھر وہ

دولت کو بہت سنبھال کر رکھتے ہیں اور ان کے مرنے کے بعد دوسرا ہی کوئی اس دولت کو کھاتا ہے۔"

"امی تم یہ بات ٹھیک کہہ رہی ہو میں نے یہ دیکھا ہے میرے کئی دوستوں کے والد بھی ابو کی طرح تھے ان کے انتقال پر میرے دوستوں کے بڑے بھائیوں کے مزے آ گئے۔ وہ اپنے والدین کی دولت کو دونوں ہاتھوں سے خوب لٹا کر اپنے باپ سے انتقام لے رہے ہیں۔"

"دولت بہت مشکل سے حاصل ہوتی ہے اسے بے دریغ بھی خرچ نہیں کرنا چاہیے' سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔"

"جیسے ابو کر رہے ہیں۔" طارق بولا۔

"اپنے ابو کی بات مت کرو' انسان سوچ سمجھ کر ضرور خرچ کرے مگر اپنا اور اپنے بیوی بچوں کی خواہشات کا گلہ بھی نہ گھونٹے۔ انسان پیسہ اس لیے نہیں کماتا کہ اسے چھپا کر رکھے بلکہ اپنی ضروریات پوری کرنے کی خاطر کماتا ہے۔" امی نے کہا۔

"امی تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو ابو دولت پر سانپ بن کر بیٹھ گئے ہیں اور یہ دولت ہمیں ان کے مرنے پر ہی حاصل ہوگی۔" یہ کہتے ہوئے طارق کی آنکھوں میں پُراسرار چمک آ گئی تھی۔

❁......❁......❁
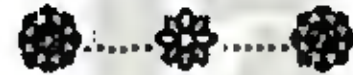
"سہیل تم کب تک ہمارے صبر کا امتحان لیتے رہو گے۔" شائلہ نے کہا۔ سہیل کے رات گئے لوٹنے پر وہ اس سے مخاطب ہوئی۔

"کیوں کیا ہوا؟"

"میری جب سے شادی ہوئی ہے' میری تم نے ایک بھی خواہش پوری نہیں کی۔ میں صبر کے گھونٹ بھرتی رہی ہوں کم از کم اپنے بچوں کے ساتھ ایسا نہ کرو' وہ تمہارا خون ہیں۔ وہ اپنی خواہشات پوری کرنے کے لیے کہاں جائیں گے؟"

"بیگم ذرا کھل کر بات کرو تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟" سہیل سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

"طارق نے تم سے ایک موٹر سائیکل کا مطالبہ کیا ہے' تم نے وہ بھی پورا نہیں کیا۔"

"بیگم میں اپنے بچوں کی عادتیں خراب کرنا نہیں چاہتا' ان کی یہ عمر یں موٹر سائیکل چلانے کی نہیں پڑھنے کی ہے۔ میرے موٹر سائیکل دلا دینے پر وہ جارحانہ انداز میں موٹر سائیکل چلائیں گے' جس سے وہ نا صرف اپنا بلکہ دوسروں کو بھی نقصان پہنچائیں گے۔" سہیل نے کہا۔

"یہ تم کس طرح کہہ رہے ہو؟" وہ تنک کر بولی۔

"میں اندھا نہیں ہوں' میں اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں۔ میں اپنی آنکھوں سے طارق اور عباس کی عمر کے لڑکوں کو جارحانہ انداز میں موٹر سائیکل چلاتے دیکھتا ہوں' اخبارات میں بھی ایسے لڑکوں کے لوگوں کو زخمی کر دینے کے واقعات پڑھتا رہتا ہوں اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ انہیں موٹر سائیکل نہیں دلاؤں گا۔" سہیل نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"اپنی عیاشیوں کے لیے تمہارے پاس بہت پیسہ ہے' ہم لوگوں کے لیے نہیں ہے۔" شائلہ رودی۔

"کیا عیاشی کرتا ہوں بولو۔" سہیل نے اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے سب خبر ہے تمہاری رنگین شامیں کہاں گزرتی ہیں۔ میں اگر کہتی نہیں ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مجھے کچھ خبر نہیں ہے۔"

"کس نے تم سے یہ کہا؟" وہ غصے سے چیخا۔

"ایسی باتیں زیادہ دن ڈھکی چھپی نہیں رہتیں' سب کو یہ باتیں معلوم ہیں۔"

"کمینی میرے سامنے زبان چلاتی ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ غصے سے بھرا ہوا سے مارنے کو لپکا۔

جیسے ہی اس نے شائلہ کو مارنے کو ہاتھ اٹھایا' طارق نے ابو کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ سہیل نے جیسے ہی جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا وہ چھڑا نہ سکے۔

''ابو جس کے لیے امی کو مارنا چاہتے ہو وہ بات میرے دوستوں کو بھی پتا ہے۔ ہم دونوں بھائی احتراماً اگر تمہارے سامنے وہ بات نہیں کہتے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہمیں کچھ خبر نہیں ہے۔'' طارق نے سہیل آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔

''میں تم سب کو اپنی جائیداد سے عاق کردوں گا' تم سڑکوں پر بھیک مانگتے پھرو گے پھر بھی اپنا پیٹ نہیں بھر سکو گے۔'' سہیل نے غصے سے آگ بگولہ ہوتے ہوئے کہا۔

اسے طارق کا اس طرح سے ہاتھ پکڑنا بہت بُرا لگا تھا اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ اپنے بیٹے کو اس گستاخی پر گلا گھونٹ کر ہلاک کردیتا۔ آج تک اسے کسی کو بھی اس طرح گستاخی کرنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔

''ابو لوگوں کو کیا کہو گے کہ ہمیں کس بات پر عاق کیا ہے ایسا کرکے اپنا مذاق مت بنوانا۔'' طارق نے سہیل کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا۔

سہیل کو بیٹے پر شدید غصہ تھا' اس لیے وہ گھر سے نکل گئے۔ رات گئے جب ان کی واپسی ہوئی طارق اور عباس سو چکے تھے' شائلہ جاگ رہی تھی۔

''تم کیوں جاگ رہی ہو' کس کا تمہیں انتظار ہے۔'' سہیل نے غصے سے شائلہ کو دیکھا۔

''میرا کون ہے میرے سب کچھ تم ہی ہو۔''

''مجھے بھول جانے کی کوشش کرو' کیونکہ میں تمہیں اس گھر سے بے دخل کرنے والا ہوں۔''

''میں تمہاری بیوی ہوں کیسی بات کررہے ہو؟''

''مجھ سے میرے بیٹوں کو باغی کرکے بھی سمجھ رہی ہو کہ میں تمہیں اپنے گھر میں پناہ دوں گا ناممکن ایسا کبھی نہیں ہوگا۔''

''یہ آج تمہیں کیا ہوگیا ہے؟''

''آج اس گھر میں جو ہوا ہے اس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے اور میں سوچنے پر مجبور ہوگیا ہوں۔ میں جنہیں پال پوس کر جوان کررہا ہوں حقیقت میں وہ آستین کے سانپ بن کر ظاہر ہوئے ہیں اور انہیں سانپ بنانے میں تمہارا اہم کردار ہے۔''

''تم ہوش میں نہیں ہو اس لیے ایسی بہکی بہکی باتیں کررہے ہو۔'' شائلہ بولی۔

''میں ہوش میں آج ہی آیا ہوں اس لیے پہلے مجھے ہوش ہی نہیں تھا' میں نے وکیل صاحب کو فون کردیا ہے کل صبح وہ میرے پاس آرہے ہیں ان سے تمہارے طلاق نامہ اور بیٹوں کے لیے عاق نامہ تیار کرارہا ہوں یہ دونوں چیزیں تیار ہونے پر بھی تم اگر یہاں سے نہیں گئے تو پھر میں تم لوگوں کو پولیس کے ہاتھوں دھکے دے کر گھر سے نکال دوں گا۔'' وہ غصے سے کہتا ہوا چلا گیا۔

شائلہ نے سہیل کو اتنا غصے میں کبھی نہیں دیکھا تھا اس لیے وہ ڈر کے مارے سہم گئی تھی اور اس کے منہ سے کچھ بھی لفظ ادا نہیں ہورہے تھے کیونکہ وہ جانتی تھی جب سہیل دل سے جو ٹھان لے اسے کرکے رہتا ہے۔ اس کے سامنے مزید بولنا ایسا ہی تھا کہ جو کام اسے صبح کرنا تھا وہ وکیل کو بلا کر ابھی کردیتا۔ صبح ہونے پر ہوسکتا تھا کہ وہ اپنے فیصلے میں کچھ ترمیم کرلے لیکن فیصلہ بدل نہیں سکتا تھا۔

صبح سہیل وقت سے پہلے ہی بیدار ہوگیا تھا' ناشتے کی ٹیبل پر وہ تیزی سے ناشتا کرنے پر مصروف تھا۔ ٹیبل پر موجود سب کی ہی نظریں سہیل کے چہرے پر تھیں مگر وہ ناشتا کرنے میں ایسا مصروف تھا کہ کسی کی موجودگی کا اسے احساس ہی نہیں تھا اور نہ ان میں اس کی کسی قسم کی دلچسپی رہی تھی۔ ناشتے سے فارغ ہوکر اس نے حسب عادت دودھ کا گلاس پیا اور آفس جانے کو ٹیبل سے اٹھ گیا۔ سہیل کو اپنے ارادے کی تکمیل کی نوبت ہی نہیں آسکی' پہلے اس کی پُراسرار طور پر گمشدگی ہوئی اور پھر دو دن گزرنے پر نشاط بینگل مارکیٹ پر واقع گندے نالے کے پاس سہیل کی لاش

پولیس کو مل گئی تھی کسی نے سہیل کی شہ رگ اور آدھی گردن کو کاٹ کر ہلاک کر دیا تھا۔

سر پر وار کرنے سے بال خون آلود ہو رہے تھے' پولیس نے اپنی ابتدائی تفتیشی رپورٹ میں محلے والوں' دفتر کے ساتھیوں اور گھر والوں کے بیانات لیے لیکن ایسی کوئی بات نہیں مل سکی تھی جس سے سہیل کے قاتل کا سراغ مل سکے۔ شمائلہ اور اس کے بیٹوں نے اپنے بیان میں یہی بتایا تھا کہ سہیل کے گمشدگی سے پہلے کچھ پریشان تھے لیکن اپنے پریشان ہونے کی وجہ انہیں نہیں بتائی تھی۔

آج گرمی کی شدت بہت تھی' اس پر ستم گرم گرم لوؤں کی لپٹیں جب چہرے پر پڑنے سے گرمیاں آ جانے کا احساس ہو رہا تھا۔ گرمی سے بچنے کے لیے میں اور ایس ایم رضوی کینٹین میں بیٹھے تھے۔ ایس ایم رضوی سگریٹ پیتے ہوئے اس کا دھواں فضا میں چھوڑ رہا تھا۔

"نعیم بھائی کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی ہے۔" ایم ایس رضوی نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے' کل سول اسپتال ہو کر آئے ہو۔" میں نے کہا۔

"ہاں! خلیل جبار میرا جانا ضروری تھا' نعیم بھائی سے میری دوستی بہت پرانی ہے۔ اسے کورٹ میں نہ پا کر میرا دل نہیں لگتا' کیا تم اسپتال گئے تھے؟"

'ہاں میں سول اسپتال گیا تھا محمد علی لغاری نے مجھے بتایا تھا کہ ان کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے اور وہ ملاقات کے لیے آنے والوں کو پہچان بھی نہیں پا رہے ہیں۔ خون کی کئی بوتلیں بھی انہیں لگ چکی ہیں' میں کل صابر فیاض کے ساتھ اسپتال گیا تو شکر ہے کہ ان کی طبیعت بہتر ہو چکی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا جب میں نے پوچھا کہ انہوں نے محمد علی لغاری کو کیوں نہیں پہچانا تو وہ مسکرائے اور بولے۔

"بھئی اس وقت میری ذہنی کیفیت ایسی تھی کہ جو بھی عزیز رشتے دار یا دوست آ رہا تھا اس کا چہرہ ضرور شناسا سا لگ رہا تھا مگر یہ یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس کا نام کیا ہے۔ وہ دوست ہے یا رشتے دار ہے؟"

"نعیم بھائی ہر سال گرمیوں میں بیمار ضرور ہوتے ہیں مگر اتنا شدید بیمار کبھی نہیں ہوئے۔" ایس ایم رضوی نے کہا۔

"بڑھتی عمر کے ساتھ ہیپا ٹائٹس ہی بہت زور پکڑ گیا ہے اس لیے خون کی الٹیاں بھی بہت ہو چکی ہیں۔ پاؤں پر بہت ورم ہے۔"

"میں نعیم بھائی کو بہت عرصے سے سمجھا رہا تھا کہ سنجیدگی سے اپنا علاج کراؤ مگر وہ میری سنتے ہی نہیں ہیں۔" ایس ایم رضوی نے کہا۔

"چار ہزار تنخواہ میں ڈھائی ہزار گھر کرائے کی مد میں چلے جاتے ہیں جو باقی بچتے ہیں اس میں ان کے گھر کا گزارا چلنا مشکل ہے وہ اپنا علاج کیسے کرائیں گے۔ وہ تو شکر ہے کہ ان کے بیٹے کچھ کمانے کے قابل ہو گئے ہیں تو اچھی گزر بسر ہو جاتی ہے۔" میں نے کہا۔

"مجھے اندازہ ہے نعیم بھائی کی مالی پوزیشن بہت کمزور ہے مگر انہیں زندہ رہنے کے لیے مکمل علاج کرانا پڑے گا ورنہ وہ نوکری سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔" ایس ایم رضوی نے اداسی سے کہا۔

پولیس ایک نوجوان کو ہتھکڑی پہنائے ہمارے سامنے سے گزری اس نوجوان کی عمر کچھ زیادہ نہیں تھی۔ وہ سول کورٹ کی طرف جا رہے تھے۔ میرے اٹھنے پر ایس ایم رضوی بھی اٹھ گئے اس کی آنکھوں میں خاصی چمک آ گئی تھی۔ پولیس ملزم کو ریمانڈ حاصل کرنے کے لیے لائی تھی' سب انسپکٹر کاشف ہمیں دیکھ کر مسکرایا' اس نے ہمیں پہلے بھی بہت اچھی خبریں دی تھیں۔

"آج صحافی برادری کے لیے بڑی اچھی خبر ہے۔" اس نے کہا۔

"تمہارے کورٹ میں داخل ہونے پر میں سمجھ گیا تھا کہ کاشف بھائی کے پاس بڑی اچھی خبر ہوگی۔"
ایس ایم رضوی نے مسکا لگایا۔
"ہاں واقعی بہت اچھی خبر ہے میں عدالت سے ملزم کا ریمانڈ حاصل کرلوں پھر تمہیں خبر بتاتا ہوں۔" سب انسپکٹر کاشف نے کہا۔
"آج گرمی سے بُرا حال تھا اوپر سے ہمارے پاس کوئی خبر نہیں تھی جس کی وجہ سے بے زاری ہورہی تھی۔" ایس ایم رضوی نے کہا۔
"چلیں تمہاری بے زاری ختم ہوگئی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ عدالت سے ملزم کے ریمانڈ حاصل کرلینے پر سب انسپکٹر کاشف ہمارے پاس آیا اور بولا۔
"دو ہفتے قبل ایک سہیل نامی سرکاری افسر کا پُراسرار قتل ہوگیا تھا' جس کی خبر سارے اخبارات نے ہی شائع کی تھی۔ سہیل کا قاتل ہم نے گرفتار کرلیا ہے' اسے قتل کرنے والا کوئی غیر نہیں اس کی بیوی اور دونوں بیٹے ملوث ہیں۔ ایک بیٹے کو ہم نے گرفتار کرلیا ہے جبکہ دوسرے بیٹے اور اس کی بیوی کو گرفتار کرنے کے لیے پولیس ملزمان کے آبائی گاؤں روانہ ہوچکی ہے اور اب تک ان کی گرفتاری عمل میں آچکی ہوگی۔"
"اس نوجوان کو شک کی بنیاد پر گرفتار کیا ہے یا اس نوجوان نے خود اقرار کیا ہے۔" میں نے پوچھا۔
"ملزم اتنی آسانی سے جرم کہاں قبول کرتا ہے' میں کئی بار سہیل کے قتل کے سلسلے میں تفتیش کی غرض سے سہیل کے بڑے بیٹے طارق سے ملا اور ہر بار یہ بات کرتے ہوئے اکھڑ جاتا تھا مجھے اس پر شک ہوا اور تھانے بلاکر تفتیش کی' محلے والوں کو بھی طارق کے تھانے لانے کی خبر ہوگئی چند بزرگ تھانے پہنچے اور طارق کی حمایت کرتے ہوئے بولے کہ باپ کی موت نے اسے پاگل کر رکھا ہے اس وجہ سے درست بیان نہیں دے پارہا ہے۔ وہ طارق کو اپنے ساتھ لے جا کر کسی ڈاکٹر سے علاج کرانے کا سوچ رہے تھے۔ میں نے انہیں سمجھا بجھا کر بھیج دیا کہ وہ کسی قسم کی فکر نہ کریں میں خود طارق کو اس کے گھر چھوڑ کر جاؤں گا۔ اگر اسے ڈاکٹر کو دکھانے کی نوبت آئی تو میرے بہت اچھے ڈاکٹر دوست ہیں ان سے طارق کا علاج کراؤں گا۔ بزرگوں کے جانے پر میں نے اپنی صلاحیتوں کو آزماتے ہوئے طارق سے بات چیت کرتے ہوئے یہ راز اگلوالیا کہ یہ قتل اس نے اور اس کے بھائی عباس نے مل کر کیا اور انہیں اس قتل پر ان کی والدہ شمائلہ نے اکسایا تھا۔ سہیل کے وکیل کو تمام حقائق کا علم ہے مگر وہ انہیں بچا کر مالی فائدہ اٹھانا چاہ رہا ہے اس لیے وہ خاموش ہے۔ قتل کے متعلق مزید معلومات ملزم طارق سے پوچھ لو۔" سب انسپکٹر کاشف کی طرف اشارہ کیا۔
ہمیں اس نوجوان کو دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی اور اس نے خود اپنے باپ کا قتل کر ڈالا تھا۔
"ہاں بھئی بالکل سچ سچ بتانا ویسے بھی کاشف بھائی نے عدالت سے قتل کے مقدمے میں تمہارا جسمانی ریمانڈ حاصل کرلیا ہے۔" ایس ایم رضوی نے تھانے دار کے انداز میں کہا۔
"میں نے قتل کا اقرار کرلیا ہے۔" نوجوان طارق بوکھلاتے ہوئے بولا۔
"یہ بات ہمیں بھی معلوم ہے تم یہ بتاؤ کہ اس قتل کی وجہ کیا تھی اور تم نے انہیں کس طرح سے قتل کیا؟" میں نے پوچھا۔
"میرے والد کے پاس دولت بہت تھی مگر وہ اپنی دولت کو اپنی عیاشی تک محدود رکھے ہوئے تھے۔ میری امی اور ہم مفلوک الحال زندگی گزارنے پر مجبور تھے جب ہم مختلف لوگوں سے اپنے باپ کے بارے میں عیاشیوں میں رقم لٹانے کے واقعات سنتے ہمارا خون کھول اٹھتا کہ ہم اس کی اولاد ہیں اور ہماری جائز خواہشوں کے لیے ان کے پاس رقم نہیں ہے۔ لوگ

ہمیں طعنے دیتے تھے اس سے ہمارے غم میں بتدریج اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ موٹر سائیکل کی فرمائش مسترد کیے جانے اور امی کے بتانے پر کہ وہ صبح وکیل کی مدد سے امی جان کو طلاق اور ہمیں اپنی جائیداد سے عاق کردینا چاہتے ہیں۔ ہمارے غصے میں شدت آگئی اور اس رات ہم سوئے نہیں اور پوری رات منصوبہ بندی کرتے رہے کہ انہیں کس طرح سے اس اقدام سے روکا جائے اور ہمارے ذہن میں یہی منصوبہ آیا کہ انہیں اس ارادے سے باز رکھنے کے لیے راستے سے ہی ہٹادیا جائے اس صورت میں ان کی ساری دولت بھی ہمیں مل جائے گی اور اس گھر کی چھت تلے اپنی جائز خواہشوں کی تکمیل بھی کرسکیں گے۔ ابو کی وکیل سے ملاقات کو روکنے کی غرض سے ہم نے دودھ میں نشہ آور دوا ملادی پھر انہیں رسیوں سے باندھا اینٹوں کے وار کیے لیکن اطمینان نہ ہونے پر شہ رگ اور آدھی گردن نوکے سے کاٹی اور انہیں شاپر میں پیک کردیا اس عمل میں امی بھی شامل تھیں۔ ہم نے ابو کی لاش کو گھر میں ہی چھپادیا اور تھانے پر ان کی پُراسرار گمشدگی کی رپورٹ لکھوادی۔ ابو کی لاش کو ہم زیادہ دن گھر میں نہیں رکھ سکتے تھے لاش خراب ہونے کی صورت میں گھر میں بدبو پھیل جاتی اور محلے والوں کو اس واقعے کی خبر ہوجاتی۔ اس لیے ایک رات تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم ابو کی لاش کو نشاط بینگل مارکیٹ کے پاس گندے نالے کے برابر پھینک آئے۔ ہم خوش تھے کہ تمام مراحل آسانی سے حل ہوگئے تھے ابو کے وکیل نے ہمیں بلیک میل کرنے کی کوشش کی مگر ہم نے انہیں خاموش رہنے اور وقت آنے پر بھاری رقم دینے کی یقین دہانی کرادی تھی اس لیے وہ خاموش ہوگئے اور انہوں نے ہمیں بلیک میل کرنے کی بجائے ابو کے واجبات اور ان کی جائیداد ہمارے نام منتقل کرانے کی کوشش شروع کردی مگر بدقسمتی کہ ابھی اس واقعے کو چند دن بھی نہیں گزرے تھے کہ امی کو ایک ہیولا مختلف شکل میں آکر تنگ کرنے لگا۔ وہ اسے دیکھ کر ڈرجاتی تھیں میں نے امی کو عباس کے ساتھ نانا جان کے گھر بھیج دیا۔ گھر میں اب میں اکیلا رہ گیا تھا اس ہیولے نے امی جان کے چلے جانے پر مجھے ڈرانا شروع کردیا تھا۔ ایک طرف وہ ہیولا مجھے تنگ کررہا تھا دوسری طرف سب انسپکٹر کاشف کے سوالات تھے۔ ڈرو خوف کے باعث میں درست جوابات نہیں دے پارہا تھا اس بات نے ان کا یہ خیال مضبوط کردیا کہ قتل میں میرا ہاتھ ہے اور انہوں نے اپنے روایتی طریقہ کار سے قتل کا راز اگلوالیا۔ راز اگلنے پر مجھے پتا چلا کہ میں کس قدر بڑی غلطی کرگیا ہوں۔" طارق نے شرمندگی کے باعث اپنا سر نیچے جھکالیا تھا۔

"کیا تمہیں اپنے باپ کو قتل کرکے کسی قسم کی شرمندگی ہوئی ہے۔" ایس ایم رضوی نے پوچھا۔

"قتل اور وہ بھی اپنے باپ کا کوئی خوشی سے نہیں کرتا یہ جذباتی فیصلہ ہوتا ہے اس وقت سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفلوج ہوچکی ہوتی ہے اور انسان کو صرف اپنا مفاد نظر آتا ہے کہ ایسا کرنے سے وہ کچھ حاصل کرلوں گا جس سے محروم کیا جانے والا ہوں۔ میں نے محض اپنے باپ کو قتل ناانصافیوں کی وجہ سے کیا ہے بس میں اس کے علاوہ کچھ نہیں کرسکتا۔" طارق یہ کہتے ہوئے خاموش ہوگیا۔

خبر مکمل ہوگئی تھی اس لیے ہم دونوں نے اپنی اپنی نوٹ بک بند کردیں۔

تہذ

حناسید

ایک مختصر سی مگر بہت بڑی کہانی۔ اس آگ کا قصہ جو بڑھتی ہوئی ہر دوسرے گھر کی دہلیز پر پہنچ رہی ہے مگر اس کے باوجود ہم اسے سمجھنے اور سنبھالنے کے لیے تیار نہیں۔
نئی نسل کے لیے بطور خاص' اس تہذ کا قصہ جس کی گونج اور جلن ہم سمجھنے کے لیے تیار نہیں۔

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔احساس ندامت سے وہ زمین میں گڑھا جا رہا تھا۔اس کا ماتھا پسینے سے تر تھا۔آج اسے اپنے آپ سے بھی شرم آرہی تھی۔اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ابھی پتھر کا ہو ہو جائے یا ساری دینا سے اوجھل...... کسی ایسی جگہ چلا جائے جہاں کوئی بھی نہ ہو۔اس کی حسیں ساتھ چھوڑ رہی تھیں۔اگر اس کا ساتھ دے رہے تھے تو صرف دماغ میں آنے والے نت نئے خیالات تھے جو اسے احساس دلا رہے تھے کہ وہ ابھی زندہ ہے شرمندگی کا بوجھ اُسے کسی ایسی دلدل کا حصہ بنا رہا تھا جو آنے والی ہر چیز کو اپنے اندر ضم کر لیتی ہے۔یہ کہانی صرف ثوبان کی نہ تھی بلکہ ہر اس نوجوان کی تھی جو موبائل کا استحقاق رکھتا ہے اور اخلاق کی سرحدوں کو موبائل سے پار کرنا فرض عین سمجھتا ہے۔یہ کہانی اس معاشرے کے منہ پر تھپڑ ہے جس کی تشکیل کے لیے بزرگوں نے ہندوؤں کی معاشرت کو چھوڑا تھا الگ وطن حاصل کیا تھا جس کے بزرگ ایک پاکیزہ فضا کے حصول کے لیے جانیں لٹا آئے' مال چھوڑ دیا اور پرکھوں کو بھلا آئے تھے۔

ثوبان کی عمر اس وقت چودہ برس تھی جب اس کے ماموں بیس سال بعد آسٹریلیا سے لوٹے۔ اکلوتی بہن کے صرف دو ہی بچے تھے جن کے لیے وہ تحائف کے ڈھیر لائے ان تحائف میں ثوبان کے لیے موبائل بھی تھا۔موبائل ہاتھ آیا تو جلدی ہی صحیح غلط کی تمیز مٹ گئی۔یہی تو پہچان ہوتی ہے اپر کلاس کی کہ جلد ہی معاشرتی اصولوں کو اپنے اپنے اصولوں میں ڈھال لیتے ہیں۔خیر بات ثوبان کی تھی۔نامعلوم نمبرز آنے کی دیر تھی اس کے ہاتھ ایک دلچسپ مشغلہ آگیا۔دوسروں کو تنگ کرنا بطور خاص لڑکیوں کو اس کا پسندیدہ کھیل بن گیا۔لڑکپن کی حدوں کو چھوڑ کر جوانی میں آگیا یہ عادت

چھوٹنے کی بجائے مزید پختہ ہوتی گئی۔ کالج سے آ کر سارا دن اس کا لڑکیوں کو پٹانے اور ان سے ملنے ملانے میں گزر جاتا۔ لاہور جیسے شہر میں اس کو کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ ملتان میں تو پھر بھی اسے اپنے باپ کا تھوڑا ڈر تھا۔

ایک دن اس نے نئی سم خریدی اور مختلف نمبرز پر خود سے ڈائل کر کے گڈ نائٹ کے میسج کر دیئے۔ چند ہی لمحوں میں ایک نمبر سے جوابی میسج آ گیا اس نے مسکراتے ہوئے وہ نمبر محفوظ کر لیا۔ اگلی صبح چونکہ اتوار تھی اس لیے وہ سو کر لیٹ اٹھا مگر اٹھتے ہی رات والے نمبر پر میسج کر دیا گڈ مارننگ کا۔ دوسری طرف سے بھی فوراً جوابی گڈ مارننگ کا میسج آ گیا۔

تین چار روز اسی میں گزر گئے پھر ایک دن ثوبان نے ایک فضول سا میسج بھیجا اُدھر سے بھی فضول سا میسج موصول ہو گیا یوں سلسلہ چل نکلا۔ انہی دنوں ثوبان کے بابا لاہور آ گئے اور وہ چاہنے کے باوجود اس لڑکی سے بات نہ کر سکا۔ ایک ہفتہ اس کے بعد بابا آئے اور اس کی چھوٹی بہن ثمن کا لاہور کالج میں داخلہ کروا کر چلے گئے۔ ثمن کو متعلقہ

ہوسٹل میں جگہ مل گئی تو وہ بھی چلی گئی۔

پندرہ، بیس دن کے وقفے کے بعد اس نے میسج کیا تو آگے سے جوابی میسج آنے میں دیر نہ لگی جو گھٹیا سی شاعری پر مشتمل تھا۔ اسی رات ثوبان نے کال کرنے کی ٹھان لی۔ چند بیل جانے کے بعد ریسیو کر لی گئی۔ دھیما دھیما لہجہ تھا، مترنم آواز اور الفاظ کا خوب صورت چناؤ۔ یہ لڑکی اس کے شب روز میں کیا داخل ہوئی اس کے معمول ہی بدل کے رہ گئے۔ ساری پرانی دوستوں کو اس نے "بائے" کہہ دیا۔ اسے اس آواز کا نشہ ہو گیا جس کے بغیر اس کا گزارا مشکل ہوتا اب وہ یونیورسٹی میں آ چکا تھا، خوب صورت آواز کی مالک لڑکی جسے وہ ساحرہ کہتا تھا کا عمل دخل اس کی زندگی میں بڑھنے لگا ہر کام اس کی مرضی کا کرتا، کپڑے اس کی پسند کے پہنتا، معمول کے مطابق ان کی باتیں جاری تھیں کہ ساحرہ نے بتایا کہ وہ لاہور آ رہی ہے کسی کام سے صرف چند روز کے لیے۔ ثوبان ملنے کو مچل گیا مگر اس نے یہ کہہ کر ٹال دیا وہ کوشش کرے گی وعدہ نہیں کر سکتی۔ اس کے لیے اتنا ہی بہت تھا وہ کوشش کرے گی۔ پر امید ہوگئی کہ ملنے کی کوئی راہ نکل ہی آئے گی۔ یہ سوچتے ہوئے اس نے ڈھیروں تحائف خرید ڈالے۔

دو ہفتے بعد ساحرہ لاہور میں تھی اور ثوبان کی خوشیاں دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔

"میں تم سے ہفتہ کی دوپہر ایک بجے مل سکتی ہوں مگر کسی ہوٹل میں نہیں۔"

ساحرہ کا میسج پڑھتے ہی ثوبان نے فٹ سے پلان تیار کر لیا۔ اس کا ایک دوست گھر چلا جائے گا اور اس کا فلیٹ استعمال کر سکتا ہے۔ اپنے فلیٹ میں اس نے ساحرہ کو بلانا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ وہ اپنا فلیٹ کسی کے ساتھ شیئر کر رہا تھا۔ ثوبان کو اس کی عزت بڑی عزیز تھی۔

جمعہ کی رات جب اس کا دوست چلا گیا اس نے چابی لے لی اور تیاریاں شروع کر دیں۔ وہ سرپرائز دینا چاہتا تھا کیونکہ ان کے اس "بے نام" رشتے کو دو سال ہو جانے تھے۔ سارا فلیٹ سجایا، اگلے روز کیک اور دیگر اشیا کا اس نے آرڈر کر دیا۔ ایک بجے سے پہلے وہ اپنی تیاری مکمل کر چکا تھا۔ دروازہ وہ پہلے ہی کھول چکا تھا جیسے ہی باہر قدموں کی چاپ سنائی دی اس نے لائٹس آف کر دیں۔ لائٹس آف ہونے کے اور ونڈوز پر بلائنڈ کی وجہ سے گھپ اندھیرا ہو گیا۔ ثوبان اندازے سے چاپ کی جانب بڑھا وہ ساحرہ کا ہاتھ پکڑ کر ٹیبل کی طرف لے جانا چاہتا تھا مگر اندھیرے کی وجہ سے

ساحرہ لڑکھڑا کر ثوبان پر گر گئی۔ ایک لمحہ تھا جس میں اس پر شیطان حاوی ہو گیا۔ ساحرہ کے بچنے سے ثوبان کے حاوی ہونے کی کوشش میں ساحرہ کا ڈوپٹہ اتر گیا مگر وہ اس کی گرفت سے دور ہوتی سوئچ پینل سے جا ٹکرائی ایک لمحے میں دنیا روشن ہو گئی۔ کمرہ روشن کیا ہوا ساحرہ اور ثوبان کے اعصاب منجمد ہو گیے۔

ثوبان ساجرہ کے پسندیدہ رائل بلو رنگ کی شرٹ میں تھا اور وہ سیاہ ڈریس میں تھی۔ گلابی رنگت' صبیح رخسار گلاب کی پنکھڑیوں سے ہونٹ' براؤن بال' بڑی بڑی سیاہ آنکھیں' بھرا بھرا جسم ......وہ واقعی ساحرہ تھی مگر...... ثوبان...... ثوبان کے اوپر تو قیامت کی گھڑی تھی۔

وہ ساحرہ اس کی بہن تھی تو کیا...... تو کیا اپنی بہن کی آبرو......نہیں......نہیں......

اس کے اندر سے کوئی چیخا۔ وہ پچھلے دو سال سے اپنی ہی بہن سے......نہیں نہیں......اندر کی چیخ نے پھر سے اس کی نفی کی۔ وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا مگر حقیقت اٹل تھی۔ وہ رو نہیں رہا تھا مگر اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ احساس ندامت سے وہ زمین میں گڑھا جا رہا تھا۔ اس کی پیشانی پسینے سے تر ہو چکی تھی اسے اپنے آپ سے بھی شرم آ رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ پتھر کا ہو جائے یا ساری دنیا سے اوجھل کسی ایسی جگہ پر چلا جائے جہاں کوئی بھی نہ ہو۔ اس کی حسیں اس کا ساتھ چھوڑ رہی تھیں اگر اس کا ساتھ دے رہے تھے تو صرف دماغ میں آنے والے نت نئے خیالات تھے جو اسے احساس دلا رہے تھے کہ وہ ابھی زندہ ہے۔

یہ کہانی صرف ثوبان کی نہ تھی بلکہ ہر اس نوجوان کی تھی جو موبائل کا استحقاق رکھتا ہے اور اخلاق کی سرحدوں کو پار کرنا فرض عین کفایہ سمجھتا ہے۔ یہ کہانی معاشرے کے منہ پر تھپڑ ہے جس کی تشکیل کے لیے پرکھوں نے ہندوؤں کی معاشرت کو چھوڑا تھا' الگ وطن حاصل کیا جس کے بزرگ ایک پاکیزہ فضا کے لیے جانیں لٹا آئے' مال چھوڑ دیا اور پرکھوں کو بھلا آئے۔

ملاپ

ریاض بٹ

یہ دنیا بہت رنگی ہے اس کا ہر رنگ انسان کو حیران کر دینے والا ہے' کوئی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ وہ دنیا کو سو فیصد جان گیا ہے' چاہے وہ عاشق صادق ہو یا سماج کا نام نہاد ٹھیکیدار' دانش ور ہو یا شاعر سب ہی دنیا کے کسی نہ کسی رنگ میں رنگے ہوئے ہوتے ہیں۔

ایک عاشق کی روداد' وہ اچانک دنیا کی نظروں سے اوجھل ہوگیا تھا۔

ماضی کے ایک تھانے دار کی یادداشتوں کا ایک ورق۔

ایسی تحریر جس کا انتظار قاری ہر ماہ کرتے ہیں۔

یہ بحث بہت پرانی ہو چکی ہے کہ مرد بے وفا ہے یا عورت' کسی مرد سے پوچھا جائے تو وہ یہی کہے گا کہ عورت بے وفا ہے اور مرد حضرات کے متعلق عورت کا بھی یہی کہنا ہے کہ مرد ہرجائی ہے۔ میں یہاں اس بحث میں نہیں پڑوں گا کہانی پڑھ کر آپ خود اندازہ لگائیں کہ اس کہانی کے کرداروں میں کون بے وفا اور کون وفادار ہے۔

تھانیدار کا کام اس وقت شروع ہوتا ہے جب کسی واردات کی رپورٹ تھانے میں آئے۔ وہ ایک روشن اور گرم صبح تھی' میں چند لمحے پہلے ہی تھانے میں آیا تھا کہ مجھے سپاہی نواز نے آکر سیلوٹ کیا اور بولا۔

"سر دو بندے آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"بھیج دو بھئی' سنیں تو سہی انہیں کون سی مصیبت یا کام نے اس گرم صبح تھانے میں آنے پر مجبور کیا ہے۔" سپاہی ٹھیک ہے سر کہہ کر چلا گیا۔

کچھ دیر بعد دو بندے میرے کمرے میں آئے اور جب وہ میرے کہنے پر میرے سامنے بچھی کرسیوں پر بیٹھ چکے تو میں نے بغور ان کا جائزہ لیا' سپاہی کو میں نے واپس بھیج دیا تھا۔

ایک چھریرے بدن کا جوان تھا' گندمی رنگ' تیکھے نین نقش اور ہلکی ہلکی مونچھیں اس کی مردانہ وجاہت میں اضافہ کررہی تھیں۔ دوسرا اس کا چچا تھا' فربہ اندام تھا عمر چالیس سے تجاوز کرگئی تھی شاید اس کی دائیں آنکھ میں کوئی نقص تھا۔ جوان کا نام شفیع اور چچا کا نام مبارک علی تھا۔ چچا نے کھنکھار کر گلا صاف کیا پھر بولا۔

"تھانیدار صاحب! میرا بھتیجا رفیع شاداب دو دن سے لاپتہ ہے۔"

"لاپتہ ہے......" میں نے زیر لب دہرایا پھر اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کے بھتیجے کی عمر کیا ہوگی؟"

"تھانیدار صاحب! وہ کوئی بچہ نہیں ہے' ماشاءاللہ بائیس سال کا گھبرو جوان ہے۔"

"دیکھیں جناب! بائیس سال کا گھبرو جوان خود بھی کہیں جاسکتا ہے۔"

"وہ اس طرح بغیر بتائے کہیں نہیں جاتا تھانیدار صاحب!" چچا نے جوان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ ابھی تک خاموش تھا' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جوان تم بھی کچھ بولو۔"

"جی...... بزرگ بول رہے ہوں تو......"

"خوب۔" میں نے مسکرا کر کہا پھر دوبارہ مبارک علی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ "ہاں تو بزرگو! آپ کچھ وضاحت کریں' آپ کو کون سا شک یا وجہ تھانے تک لے آئی ہے؟ کسی کے ساتھ دشمنی وغیرہ کا چکر تو نہیں ہے؟"

"بالکل نہیں جناب! رفیع تو بڑا بیبا پتر ہے۔"

"پھر...... بات کچھ پلے نہیں پڑ رہی' وہ بچہ بھی نہیں ہے جسے کوئی ورغلا کر یا زبردستی لے گیا ہو۔ دشمنی بھی نہیں ہے۔" چند لمحے ہچکچانے کے بعد مبارک علی نے کچھ باتیں ایسی بتائیں کہ میں رفیع کی گمشدگی کی رپورٹ لکھنے پر مجبور ہو گیا' کچھ دشمنی تھی۔ میں نے انہیں محرر کے پاس بھیجنے کے بعد سپاہی نواز کو دوبارہ بلا لیا جیسا کہ پچھلی کسی کہانی میں ذکر آ چکا ہے کہ سپاہی نواز نیا آیا تھا اس کے متعلق یہ پتا چلا تھا کہ کھاتے پیتے گھرانے سے اس کا تعلق ہے۔ شوق اسے پولیس میں لے آیا تھا' پیچیدہ معاملات کو حل کرنے کی جستجو اور لگن اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ سپاہی نواز کو میں نے رفیع شاداب کے متعلق بتایا تو وہ بولا۔

"سر! یہ تو کوئی شاعر لگتا ہے۔"

"اچھا۔" میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے چند لمحے توقف کیا پھر بولا۔ "تمہارا اندازہ بالکل صحیح ہے لیکن ساتھ ایک بات اور بھی ہے۔"

"وہ کیا سر!"

"کسی وقت وہ پہلوانی بھی کرتا تھا۔"

"پھر اس نے پہلوانی چھوڑ کر شاعری شروع کر دی۔"

"سر بات تو عجیب ہے لیکن......"

"لیکن ویکن کو چھوڑو' تم نے اس کے متعلق معلومات حاصل کرنی ہیں اور ساتھ ہی اس کا سراغ بھی لگانا ہے۔"

"او کے سر! میں آج ہی یہ کام شروع کر دیتا ہوں۔" پھر وہ سیلوٹ کر کے چلا گیا اور میں تھانے کے دوسرے کاموں میں لگ گیا۔

کچھ باتیں گم ہونے والے جوان کا چچا مجھے بتا گیا تھا' جس کی بنیاد پر میں نے انہیں رپورٹ درج کروانے محرر کے پاس بھیج دیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد رپورٹ میرے سامنے پڑی تھی۔ رپورٹ کے مطابق تین دن پہلے رفیع شاداب گھر میں کچھ بتائے بغیر کہیں گیا تھا پھر واپس نہیں آیا اور یہ بات تو آپ کے علم میں کئی بار آ چکی ہے کہ گمشدہ کو پہلے خود ڈھونڈا جاتا ہے مایوس ہونے کے بعد تھانے میں رپورٹ کروائی جاتی ہے۔

ایسے کیسوں میں دریا میں سے سوئی ڈھونڈنے والا معاملہ ہوتا ہے اور کبھی کبھی اشارے کے پیچھے بھاگنا کسی سڑک کی سرخ بتی کے پیچھے بھاگنے کے مترادف ہوتا ہے۔

بہرحال دو دن بعد سپاہی نواز نے مجھے جو معلومات نما رپورٹ دی۔ اس پر مجھے بہت غصہ آیا قارئین غصہ سپاہی نواز پر نہیں تھا بلکہ شاداب یعنی رفیع شاداب کے چچا پر آیا' جو مجھے ادھوری باتیں بتا کر گیا تھا۔

قارئین سب سے پہلے جو باتیں رفیع کا چچا بتا کر گیا تھا اس پر بات ہو جائے اس نے بتایا تھا کہ رفیع نزدیکی گاؤں کے اکھاڑے میں جاتا تھا وہاں وہ چوہدری برکت کے زیر سایہ کشتیاں لڑتا تھا یعنی وہ چوہدری برکت کا پہلوان تھا۔ ایک دوسرے گاؤں کا چوہدری بھی ایک پہلوان رکھتا تھا' چوہدری کا نام شہباز تھا' دونوں ایک دوسرے کے حریف تھے۔ زیادہ کشتیاں چوہدری برکت کا پہلوان یعنی رفیع جیتتا تھا جس پر چوہدری شہباز اپنی ہی بوٹیاں نوچتا تھا اس نے کئی بار رفیع کو لالچ دیا کہ وہ اس کی طرف سے کشتی لڑا کرے تو وہ اپنی زرعی زمین میں سے پانچ کنال اس کے نام کر دے گا۔

لیکن رفیع نے انکار کر دیا چوہدری شہباز کو اپنی دولت اور زمین پر بڑا ناز تھا اس کا قول تھا کہ دولت سے ہر چیز خریدی جا سکتی ہے لیکن رفیع نے اس کی پیشکش ٹھکرا کر اس کی انا کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ وہ زخمی سانپ کی طرح رفیع کو ڈسنے کے لیے بے تاب رہنے لگا۔

بات چوہدری برکت تک بھی پہنچ چکی تھی' اس نے چوہدری شہباز کو پیغام بھجوایا کہ اگر رفیع کو کچھ ہوا تو یہ اس کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ دونوں طرف ایک تناؤ کی صورت حال پیدا ہو گئی بقول رفیع کے چچا کے ایسی فضا سے بددل ہو کر یا گھبرا کر رفیع نے کشتی لڑنا چھوڑ دیا کچھ عرصہ بعد پتا چلا کہ وہ شاعری کرنے لگا ہے۔

اب سپاہی نواز کی رپورٹ سن لیں (اس میں کچھ باتیں مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھیں) جیسا کہ ذکر آ چکا ہے رفیع کشتی لڑنے قریبی گاؤں میں جاتا تھا وہاں چوہدری برکت کی بیٹی مہتاب رفیع سے محبت کرنے لگی۔ پہلے پہل رفیع اس سے کنی کتراتا رہا بعد میں وہ بھی اس کی زلف کا اسیر ہو گیا۔

ایک دن چوہدری برکت کے کسی نوکر نے دونوں کو اکٹھا دیکھ لیا' بات چوہدری برکت تک پہنچیں اس نے رفیع سے کہا۔

"تم تو آستین کے سانپ نکلے' تم اتنا عرصہ میری

عزت بڑھاتے رہے، ہو اس لیے میں تمہیں چھوڑ رہا ہوں ورنہ تمہیں قتل کروا کے تمہاری لاش غائب کروا دیتا۔ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ تم میری نظروں سے دور ہو جاؤ اور پھر مجھے کبھی اپنی شکل نہ دکھانا۔"

رفیع شکستہ قدموں سے کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح واپس آ گیا پھر وہ رفیع سے رفیع شاداب بن گیا یعنی شاداب کے تخلص سے شاعری شروع کر دی اور کشتی کو ہمیشہ کے لیے خیر آباد کہہ دیا۔

یہ تقریباً دو مہینے پہلے کی بات تھی' تازہ صورت حال یہ تھی کہ چوہدری برکت نے اپنی بیٹی کی شادی اپنے بھائی کے بیٹے افضل سے کر دی تھی۔ چھوٹا چوہدری (افضل) اسی شہر میں رہتا تھا اس کی کوٹھی جس علاقے میں واقع تھی وہ میرے تھانے کی حدود میں آتا تھا۔

رفیع آستین کا سانپ تھا یا نہیں وہ بے وفا تھا یا......؟ اس سے قطع نظر یہ بات بالکل صحیح تھی کہ اس نے چوہدری شہباز کی پیشکش ٹھکرا کر وفادار ہونے کا ثبوت دیا تھا لیکن دل کے ہاتھوں مجبور ہو گیا تھا اور آخر میں چوہدری برکت کی عزت کا خیال کرتے ہوئے اپنے ارمانوں کی لاش اٹھائے ہوئے واپس آ گیا تھا۔

قارئین یہ میرے خیالات ہیں' ہو سکتا ہے آپ ان سے مطمئن یعنی متفق نہ ہوں بہرکیف آگے بڑھتے ہیں۔

رفیع شاداب غائب ہو گیا تھا اس سارے گورکھ دھندے میں اسے ڈھونڈنا تھا' سپاہی کب کا جا چکا تھا۔

ان دنوں دونوں اے ایس آئی (ابرار اور شاہد) مختلف عدالتوں میں مصروف تھے' کچھ کیسوں کا معاملہ تھا۔

شام کا وقت تھا سورج دن بھر کی مسافت کے بعد ڈوب گیا تھا میں ابھی دفتر سے نکلنے کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ سپاہی انور کی شکل نظر آئی۔

"سر! گمشدہ جوان کا چچا آیا ہے وہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

"بھیج دو۔" میں نے اپنے کوارٹر میں جانے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے کہا۔ دراصل اگلے دن میرا پروگرام رفیع شاداب کے گھر جانے کا تھا اچھا ہوا رفیق کا چچا خود ہی آ گیا تھا۔

میں نے مبارک علی (چچا) کو بیٹھنے کے لیے کہا اور سوالیہ نگاہیں اس کے چہرے پر گاڑھ دیں۔ وہ جز بز ہوتے ہوئے گویا ہوا۔

"تھانیدار صاحب! رفیع کا کچھ پتا چلا؟"

"دیکھیں جناب! جب ڈاکٹر سے مرض اور تھانیدار سے اصل باتیں چھپائیں گے تو......" میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑتے ہوئے اسے تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"جناب! کیا مطلب......؟"

"آپ نے ادھوری معلومات مجھ تک پہنچائیں۔" پھر اس کے دماغ کی کھڑکیاں کھولنے کے لیے میں نے سپاہی نواز کی حاصل کردہ معلومات اس کے کانوں میں انڈیل دیں۔ وہ خجل اور شرمندہ سا نظر آنے لگا پھر چند لمحوں کے بعد مریل سی آواز میں بولا۔

"تھانیدار صاحب! معاملہ نازک تھا' ہم چوہدری برکت کا مقابلہ نہیں کر سکتے اس لیے میں نے پہلو بچاتے ہوئے......" میں نے لہجے کو سخت بناتے ہوئے اسے فقرہ پورا نہیں کرنے دیا اور بولا۔

"آپ کی اس بزدلی اور کوتاہی کی وجہ سے کافی وقت ضائع ہوا' جب اس قسم کے حالات ہوں تو کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرنے کی بجائے دلیری کی ضرورت ہوتی ہے۔" میں نے دیکھا کہ وہ چپ سا

ہوگیا ہے۔

"خیر اب مجھے سارے حالات کا علم ہو چکا ہے' میری تفتیش کے گھوڑے صحیح سمت میں دوڑیں گے۔" میں نے بات ختم کرتے ہوئے کہا وہ رخصت ہو گیا اور کچھ دیر کے بعد میں بھی تھانے سے اٹھ گیا۔

سونے سے پہلے میں اگلے دن کا سارا پروگرام ترتیب دے چکا تھا۔ اگلے دن جب میں تیار ہو کر تھانے پہنچا تو ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی' گرمیوں میں جب بارش کے قطرے موتی بن کر زمین تک آتے ہیں تو موسم خوشگوار ہو جاتا ہے' وہ ماہ جون کے آخری ایام تھے' پچھلے دنوں سخت گرمی نے بے حال کر دیا تھا۔

بہر حال تھانیدار کا اور تھانے کے باقی عملے کا حال جیسا بھی ہو کام تو کرنا پڑتا ہے۔ وہ میں نے شروع کر دیا کانسٹیبل وزیر کو بلا کر میں نے اسے مخبری کا نظام متحرک کرنے کے متعلق ہدایات دیں۔ انہیں چوہدری برکت کے گاؤں جانا تھا اور سن گن لینی تھی حالانکہ حالات کے مطابق چوہدری برکت کی طرف سے کسی گڑ بڑ کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا لیکن تھانیدار کو ہر پہلو پر نظر رکھنی ہوتی ہے۔

مجھے زیادہ شک چوہدری شہباز پر تھا' رفیع نے اس کی پر کشش پیشکش کو ٹھکرا دیا تھا لیکن میں ابھی اسے چھیڑنا نہیں چاہتا تھا۔

یہ کیس ایسا تھا کہ میں کھل کر تفتیش نہیں کر سکتا تھا۔ چوہدری برکت کے سامنے رفیع کے گھر والوں کی حیثیت سورج کے سامنے چراغ دالی تھی۔ اس کی بیٹی کا معاملہ تھا وہ طیش میں آ کر رفیع کے گھر والوں کو نقصان پہنچا سکتا تھا لیکن میں نے سوچ لیا تھا۔ کہ اگر وہ واقعی رفیع والے معاملے میں ملوث ثابت ہو جاتا ہے تو میں اسے قانون کے شکنجے میں کسنے میں ذرا تاخیر نہیں کروں گا اور اس کی چوہدراہٹ کو کوئی اہمیت نہیں دوں گا۔ کانسٹیبل وزیر کے ذمہ میں نے ایک اور کام بھی لگایا تھا اس نے اپنی بیوی کے ذریعے چھوٹے چوہدری افضل کے گھر کے حالات معلوم کرنے تھے۔

شام سے ذرا پہلے کانسٹیبل وزیر میرے کمرے میں داخل ہوا اس کے چہرے کے تاثرات سے یہ پتا چلتا تھا کہ اسے کچھ کامیابی ہوئی ہے جب اس نے بات کی تو مجھ پر آشکارا ہوا کہ اس کی بیوی چوہدری افضل کے گھر سے ایک بندی کو لے آئی تھی۔ وہ بندی اس وقت کانسٹیبل کی بیوی کے ساتھ تھانے سے ذرا ہٹ کر کھڑی تھی۔ میں نے اپنے کوارٹر کی چابی اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"تم اپنی بیوی سے کہو اسے لے کر کوارٹر میں جائے میں آ رہا ہوں۔"

بعض قارئین سوچ رہے ہوں گے کہ یہ کیسا تھانیدار ہے اور یہ تفتیش کا کون سا طریقہ ہے تو اس بابت عرض ہے کہ بعض کیسوں میں عام ڈگر سے ہٹ کر کام کرنا پڑتا ہے مصلحت کے تحت ایسے بھی کرنا پڑتا ہے۔

بہر حال کچھ دیر کے بعد میں بندی کا جائزہ لے رہا تھا شکل سے سہمی ہوئی لگتی تھی۔ رنگ ذرا صاف' چہرہ گول اور قد ذرا لمبا تھا' عمر تیس سے کم ہی ہوگی۔

"بی بی! بالکل ڈرنے یا خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔

"تھانیدار صاحب! میں باجی کے کہنے پر آ گئی ہوں' اگر چوہدری صاحب کو پتا چل گیا تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

قارئین آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے' جی ہاں یہ چھوٹے چوہدری کے گھر کی نوکرانی تھی اور چوہدرانی کی رازدار بھی' نام بشریٰ تھا۔

"دیکھو بشریٰ!" میں نے اسے اس کے نام سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تم بالکل بے فکر ہو جاؤ' جو کچھ تم بتاؤ گی وہ تمہارے مالکوں تک نہیں پہنچے گا لیکن شرط یہ ہے کہ سب کچھ بتانا ہے اور سچ بتانا ہے۔"

"تھانیدار صاحب! میں جب یہاں تک آ گئی ہوں تو کچھ چھپانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"آپ بالکل بے فکر ہو جائیں' بشریٰ کچھ بھی نہیں چھپائے گی۔ یہ اپنی مالکن کے لیے بہت دکھی ہے۔" کانسٹیبل کی بیوی نے بشریٰ کا کاندھا تھپکتے ہوئے کہا۔

پھر اس سے جو معلومات حاصل ہوئیں میں اپنے الفاظ میں بیان کر دیتا ہوں ورنہ بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ چوہدری برکت نے اپنی بیٹی مہتاب کے سامنے دو باتیں رکھیں یا تم افضل سے شادی کر لو یا رفیع کی لاش دیکھنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کر لو۔

روتے دھوتے مہتاب نے افضل سے شادی کے لیے ہامی بھر لی کیونکہ اسے اپنے والد کی عادت اور ضد کا پتا تھا۔ اس نے رفیع کو بھی مروا دینا تھا اور شادی تو اسے پھر بھی کرنی پڑتی۔

کئی دفعہ اس کے دل میں آئی کہ اپنی زندگی کو ختم کر لے پھر اس نے سوچا اس طرح تو اس کے والد کی اور زیادہ بے عزتی ہو گی لیکن بعض اوقات والدین اپنی انا کی تسکین کے لیے غلط فیصلے کر بیٹھتے ہیں۔

افضل ایک بگڑا ہوا شہزادہ تھا' اس کا شہر میں گھر بنانے کا کارخانہ تھا۔ دولت کی فراوانی نے اسے عیاش بنا دیا تھا' بازار حسن کی ایک خوب صورت طوائف اس کی مستقل داشتہ تھی۔

جب مہتاب کو یہ سب باتیں پتا چلیں تو اسے اپنی قربانی رائیگاں جاتی محسوس ہوئی۔ اس نے افضل کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ اتنا آگے بڑھ چکا تھا کہ واپسی مشکل تھی۔ اس نے مہتاب سے کہہ دیا۔

"مجھے کسی معاملے میں ٹوکنا مت ورنہ......" اس سے آگے اس نے کچھ نہیں کہا تھا لیکن لہجے کی سنگینی نے مہتاب کو بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔

خیر جو کچھ بھی تھا مجھے تو رفیع شاداب کو ڈھونڈنا تھا' وہ کدھر تھا اور اس کے ساتھ کیا حالات پیش آئے تھے۔ البتہ بشریٰ (نوکرانی) نے ایک کام کی بات یہ بتائی کہ ایک دن بازار میں اسے رفیع شاداب مل گیا تھا'

اولیا صرف اللہ پر بھروسا کرتے ہیں

شیخ سعدیؒ بیان کرتے ہیں کہ ایک سفر میں ایک بوڑھا درویش میرا ساتھی تھا۔ ہم دونوں سفر کرتے کرتے ایک دریا پر پہنچے۔ ہمیں پار جانا تھا اور کشتی بان معاوضہ لیے بغیر کسی کو کشتی پر سوار نہ کرتے تھے۔ میرے پاس ایک درہم تھا چنانچہ مجھے تو انہوں نے بٹھا لیا لیکن بوڑھا درویش خالی ہاتھ تھا اسے کشتی میں بٹھانے سے انکار کر دیا اور کشتی کو تیزی سے چلا دیا۔ مجھے اپنے ساتھی کی بے کسی پر رونا آگیا۔ مجھے اس قدر ملول دیکھ کر بوڑھا درویش قہقہہ مار کر ہنسا اور کہا کہ: اے عقلمند میرے حال پر غم نہ کھا مجھے وہی ذات دریا پار کرائے گی جو کشتی لے جا رہی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے پانی کی سطح پر مصلیٰ بچھایا اور اس پر بیٹھ کر آناً فاناً دریا کے پار اتر گیا۔ میں ساری رات کروٹیں بدلتا رہا صبح کو ہوش آیا تو اس درویش نے آواز دی کہ "اے مبارک خیال دوست تو تعجب میں کیوں پڑ گیا تجھے کشتی نے کنارے پر پہنچایا اور مجھے خدا نے۔"

انتخاب: سید سجاد علی...... ملتان

یہ اس کے غائب ہونے سے تین دن پہلے کا واقعہ تھا۔
بشریٰ نے اسے افضل کے متعلق سب کچھ بتا دیا تھا' دراصل مہتاب نے ایک دن رو رو کر اسے کہا تھا کہ اگر رفیع شاداب اسے کہیں نظر آ جائے تو اسے میرے حالات سے آگاہ کر دینا اور ساتھ یہ بھی کہہ دینا مہتاب تم سے بہت شرمندہ ہے۔ اس نے بے وفائی کی تجھ سے صرف اپنے باپ کی عزت کی خاطر اور تمہاری زندگی کی خاطر لیکن سب کچھ رائیگاں گیا' وہ ایک ایسی سولی پر ٹنگی گئی ہے جہاں اس کا روز جینا اور روز مرنا ہوگا۔ ایک پتھر سے سر ٹکرانا ہوگا۔ بشریٰ نے یہ بھی بتایا کہ ساری کہانی سن کر شاداب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اس نے کہا تھا میں چوہدری سے خود بات کروں گا۔
میں نے بشریٰ کو کانسٹیبل کی بیوی کے ساتھ رخصت کر دیا اور ساتھ یہ تاکید بھی کر دی کہ اپنا منہ بند رکھے اور مہتاب کو بھی نہ بتائے یہ باتیں جو وہ مجھ کو بتا گئی ہے اور خود تھانے میں آ گیا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ آیا رفیع شاداب چوہدری سے ملا تھا یا نہیں۔ اب مجھے یہ خطرہ بھی لگ رہا تھا کہ کہیں چوہدری افضل نے رفیع شاداب کو غائب نہ کر دیا ہو اور ہو سکتا ہے ہمیشہ کے لیے غائب کر دیا ہو۔
ایسے بگڑے شہزادوں سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔
میں نے اب حفظ ماتقدم کے تمام تقاضوں کو طاق پر رکھ کر تفتیش کرنی تھی۔ ابھی میں آئندہ کے لائحہ عمل کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ کانسٹیبل وزیر میرے کمرے میں داخل ہوا۔
''آؤ بھئی' کیا خبریں ہیں؟'' میں نے بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''سر! چوہدری برکت اور چوہدری شہباز کے گاؤں میں کوئی گڑبڑ نہیں ہے نہ ہی کافی عرصے سے رفیع شاداب کو وہاں دیکھا گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے جو کچھ گڑبڑ ہے یہاں ہی ہے۔'' میں نے بشریٰ سے حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں کہا اور اسے بشریٰ کے ساتھ ہونے والی باتیں بتا دیں۔ میری بات سن کر چند لمحوں تک کانسٹیبل کے ماتھے پر سلوٹیں ابھری رہیں۔ پھر وہ بولا۔
''سر! میں چھوٹے چوہدری افضل کو ٹٹولوں؟''
''اس کی طرف ٹٹولنا ہی نہیں ہے بلکہ ٹھوکنا بجانا بھی ہے۔'' میں نے معنی خیز نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔
''سر! میں اسے پکڑ لاؤں؟''
''فی الحال تم صرف اتنا کرو کہ اس کی مصروفیات سے آگاہی حاصل کرو۔''
''ٹھیک ہے سر! کل دوپہر تک یہ کام ہو جائے گا۔'' کانسٹیبل نے مودبانہ لہجے میں کہا۔ جس سے کام کرنے کا عزم بھی جھلک رہا تھا۔ جب وہ مجھے سیلوٹ کر کے جانے لگا تو میں نے اسے آواز دی۔
''ٹھہرو' توفیق آیا کہ نہیں؟''
''سر! توفیق کل تھانے میں آئے گا۔''
''ٹھیک ہے۔'' میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے جانے کی اجازت دیتے ہوئے کہا۔
یہاں اس بات کی وضاحت کروں کہ توفیق رفیع کا جگری یار تھا' جو آزاد کشمیر میں ملازمت کرتا تھا۔ ابھی اسے وہاں ملازم ہوئے چار ماہ ہی ہوئے تھے' اس کا گھر رفیق کے گھر کے ساتھ تھا اور وہ مہینے میں گھر کا ایک چکر لگاتا تھا اب میرے پیغام کی وجہ سے پندرہ دن بعد آ رہا تھا۔ یہ سب حساب کتاب بتانے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ وہ آخری بار رفیع سے اس کے گم ہونے سے کچھ دن پہلے ہی ملا تھا۔
باقی دن تھانے کے دیگر جھمیلوں میں گزر گیا اور شام ہوتے ہی میں کوارٹر میں چلا گیا۔

جولائی 2015ء کے شمارے کی ایک جھلک
شب ہجر کی پہلی بارش — نازیہ کنول نازی کا نیا سلسلے وار ناول
موم کی محبت — راحت وفا کا سلسلے وار ناول
ٹوٹا ہوا تارا — سمیرا شریف طور کا سلسلے وار ناول
محبت دل کا سجدہ ہے — سباس گل کا منفرد ناولٹ
ڈاکٹر نگہت نسیم، فاخرہ گل، طلعت نظامی، نظیر فاطمہ، شمسہ فیصل
صدف آصف، نیلم شہزادی کی خوب صورت تحریریں
women.magazine
womenmagazine
aanchalpk.com
مستقل سلسلے بھی
آپ کی صحت، ڈش مقابلہ، بیوٹی گائیڈ، غزلیں
نظمیں، بیاض دل، دوست کے پیغام آئے و دیگر

اگلے دن حسبِ وعدہ کانسٹیبل وزیر نے چھوٹے چوہدری افضل کے متعلق دستیاب معلومات فراہم کردیں۔ اس کی روشنی میں ہم نے پروگرام ترتیب دے ڈالا۔

شام کو میں اور سپاہی نواز اس کی کوٹھی میں پہنچ گئے اس کی کوٹھی ایک کنال میں تھی۔ کوٹھی دیکھ کر اس کی امارت ہم پر ظاہر ہوگئی ہم اس وقت سادہ کپڑوں میں تھے۔ وہ ہمیں سجی سجائی بیٹھک میں لے گیا اور ہمارے منع کرنے کے باوجود ہماری خاطر تواضع کا کہنے چلا گیا جب وہ واپس آیا اور ہم نے باتوں کا سلسلہ شروع کیا تو ہمیں معلوم ہوگیا کہ وہ مجھ سے واقف ہے۔ یہ کوئی اچنبھے یا حیرانگی کی بات نہیں تھی اس قسم کے چوہدری ایسی معلومات رکھنے پر مجبور تھے جونہی ہم نے ٹھنڈے ٹھار دودھ کے گلاس خالی کیے وہ بولا۔

"تھانیدار صاحب! مجھے معلوم ہے کہ آپ کیوں آئے ہیں؟" اس نے یہ بات کہہ کر ہمیں حیران کردیا۔

"کیا مطلب......؟" میں نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"رفیع غائب ہوگیا ہے اور آپ کو شک ہے کہ اسے میں نے غائب کیا ہے؟"

"یہ خیال کیسے آپ کے دل میں آیا؟"

"بس ویسے ہی۔" اس نے خوامخواہ دلیر بننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھیں رفیع غائب ہوگیا ہے ہم صرف یہ جاننے کے لیے آئے ہیں کہ وہ پچھلے ہفتے آپ سے ملنے آیا تھا؟"

"مجھ سے ملنے؟" اس نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ "تھانے دار صاحب بھلا وہ مجھ سے ملنے کیوں آتا؟"

"اس لیے کہ......" میں نے چند لمحے توقف کیا پھر لہجے کو ڈرامائی بناتے ہوئے کہا۔ "کیونکہ آپ ایک طوائف کے عشق میں بری طرح گرفتار ہوچکے ہیں اور گھر میں بالکل توجہ نہیں دے رہے۔"

"رفیع کا ہمارے گھر سے کیا لینا دینا؟" اس نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا۔

"یہ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔" میں نے آخری پتہ پھینکتے ہوئے کہا۔ مجھے شک ہو چلا تھا کہ رفیع چوہدری افضل کے غصے کا شکار ہوچکا ہے۔

"دیکھیں تھانیدار صاحب! مجھے اپنے چچا پر بڑا غصہ ہے کہ انہوں نے اس احسان فراموش اور بے غیرت کو زندہ کیوں چھوڑ دیا تھا اور یقین کریں اگر رفیع مجھ سے ملنے آتا اور کوئی الٹی سیدھی بات کرتا تو میں اپنے ریوالور کی چھ کی چھ گولیاں اس کے سینے میں اتار دیتا۔"

"چوہدری صاحب! یہ بات آپ ایک تھانیدار کے سامنے کہہ رہے ہیں اور کچھ بعید نہیں کہ یہ کارنامہ آپ نے انجام دے ہی ڈالا ہو۔" میں نے تپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اوہ سوری تھانیدار صاحب! دیکھیں اس قسم کی باتیں دماغ کو خراب کر ہی دیتی ہیں آپ یقین کریں وہ مجھ سے ملنے نہیں آیا۔ ویسے ایک بات تو بتائیں آپ کو کیسے پتا چلا کہ رفیع مجھ سے ملنا چاہتا ہے؟"

"چوہدری صاحب! ہمارے اپنے ذرائع ہیں خیر اگر کوئی ایسی ویسی بات آپ کے علم میں آئے تو تھانے میں آ کر ہمیں ضرور مطلع کیجیے گا۔" اس دوران میں چوہدری کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا تھا وہاں مجھے ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی جس سے اندازہ ہوتا کہ چوہدری سے ملنے رفیع آیا تھا۔ جو شک شروع میں مجھے ہوا تھا وہ کافی حد تک کم ہوگیا تھا لیکن ابھی میں پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔

ہم جب تھانے میں واپس آئے تو عشاء کی

اذانیں ہو رہی تھیں۔ وقت کا کام تو گزرنا ہوتا ہے وہ گزر جاتا ہے۔ انسان کو اس کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہوتا لیکن تھانیداروں کو وقت کے ساتھ چلنا پڑتا ہے۔

اگلے دن یہ دوپہر کا وقت تھا جب توفیق (رفیع کا دوست) سپاہی نواز کے ساتھ میرے پاس آیا میں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا اور بغور اس کا جائزہ لیا وہ گھنگھریالے بالوں والا ایک خوبرو جوان تھا آنکھیں اخروٹ کی مانند تھیں عمر پچیس سال ہوگی۔ قد چھ فٹ کے قریب، کسرتی جسم کا مالک تھا آگے بڑھنے سے پہلے ایک بات کی وضاحت کردوں کہ یہ دریافت کانسٹیبل وزیر کی تھی۔

"توفیق میاں! ماشاءاللہ تمہاری صحت اچھی ہے قد بھی ٹھیک ہے۔ جسم بھی کسرتی ہے پھر تم نے پہلوانی کی طرف آنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟" میں نے اس کے دل سے تھانے کا خوف دور کرنے کے لیے ایک غیر ضروری سوال کرتے ہوئے کہا۔ اس نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے کہا۔

"بس تھانیدار صاحب! دل اس طرف مائل ہی نہیں ہوا۔" میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے سے پریشانی ہویدا ہے یہ تو ایک فطری بات تھی اس کا جگری یار گم ہو گیا تھا۔

"خیر اپنے دوست کے متعلق بتاؤ، وہ کہاں جا سکتا ہے؟"

"تھانیدار صاحب! رفیع بہت حساس بندہ ہے مہتاب اسے بھی اچھی لگی تھی لیکن اس کے استاد نے کہا تھا اگر کشتی لڑتے رہنا ہے تو عورت سے دور رہنا۔ اس لیے پہلے تو وہ مہتاب سے کنی کتراتا رہا لیکن ایک دن مہتاب نے اسے کہا۔

اگر اس نے اس کے پیار کا جواب پیار سے نہ دیا تو وہ زہر کھا لے گی مجبوراً رفیع اس کی طرف راغب ہو گیا لیکن تھانیدار صاحب! عورت ہوتی ہی بے وفا ہے۔ مہتاب نے زہر خود تو نہ کھایا لیکن بے وفائی کا زہر رفیع کی رگوں میں اتار دیا۔ اس نے کشتی لڑنا چھوڑ دی اگر میں اسے سہارا نہ دیتا تو وہ نشے پر لگ جاتا جو اسے دیمک کی طرح چاٹ جاتا۔ میں اسے ایک مشہور شاعر کے پاس لے گیا، اسے دل کا غبار نکالنا تھا ورنہ اس کا دل پھٹ جاتا اسے رونا تھا، میں نے اسے رُلایا

ایک مردِ حق اور بادشاہ وقت

ایک مرد باخدا جنگل کے ایک گوشہ میں بیٹھا اللہ اللہ کر رہا تھا اور اس نے بادشاہ کی طرف دھیان نہ کیا۔ بادشاہ اس کی بے نیازی پر بگڑ گیا اور کہنے لگا کہ یہ گدڑی پوش جانور ہوتے ہیں۔ ان کو انسانیت چھو کر بھی نہیں گئی۔ بادشاہ کے تیور دیکھ کر وزیر اس فقیر کے پاس گیا اور کہا کہ اے مرد خدا ایک جلیل القدر بادشاہ تیرے پاس سے گزرا لیکن تو نے کوئی خدمت نہ کی اور نہ آداب بجا لایا۔ اس نے کہا۔ بادشاہ سے کہہ دو کہ خدمت کی توقع اس سے رکھے جو اس سے انعام کی توقع رکھتا ہو اور یہ بھی سمجھ لے کہ بادشاہ رعیت کی نگہبانی کے لیے ہیں نہ کہ رعیت بادشاہوں کی اطاعت کے لیے۔

بھیڑ چرواہے کے لیے نہیں ہے بلکہ چرواہا اس کی خدمت کے لیے ہے۔

بادشاہ کو فقیر کی باتیں بھلی معلوم ہوئیں۔ اس نے فقیر سے کہا مجھ سے کچھ مانگ فقیر نے کہا میں یہ مانگتا ہوں کہ آپ یہاں دوبارہ تشریف لا کر مجھے تکلیف نہ پہنچائیں۔

بادشاہ نے کہا: تو پھر مجھے کوئی نصیحت کیجیے۔

فقیر: ابھی وقت ہے کہ کچھ کر لے کیونکہ نعمت اب تیرے ہاتھ میں ہے اچھی طرح جان لے یہ دولت اور ملک ہاتھوں ہاتھ جاتا ہے۔

مراسلہ: عبدالرحمان..... کراچی

اور شاعر نے اس کے ہاتھ میں قلم تھما دیا۔
اس طرح اس کا ذہن اس طرف لگ گیا وہ بہت دکھی ہو گیا تھا اس کا دکھ اشعار کی صورت میں اس کے قلم سے بہنے لگا اگر کوئی خطرناک پھوڑا بہے نہ تو کینسر بن جاتا ہے۔ میں نے اسے بولنے سے نہیں روکا' وہ بھی اپنے دکھی یار کی وجہ سے دکھی تھا۔ میں نے اسے دل کا غبار نکالنے دیا آخر میں' میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے ہیں۔ میں نے اسے رونے دیا جب اس کے دل کا غبار ڈھل گیا تو میں نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔

"جوان حوصلہ رکھو' ہمیں مل کر رفیع کو ڈھونڈنا ہے۔"

"تھانیدار صاحب! اگر میرے بس میں ہوتا یا مجھے پتا ہوتا تو اسے ڈھونڈتا پاتال میں بھی چلا جاتا۔" پھر جب میں نے اسے تازہ صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ کچھ سوچ کر بولا۔

"اوہ تھانیدار صاحب! کیا آپ کو یقین ہے کہ رفیع چوہدری افضل سے نہیں ملا؟"

"بظاہر تو یہی لگتا ہے لیکن میں اس کے اوپر حقیقت کی مہر ثبت نہیں کر سکتا۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ توفیق کسی گہری سوچ میں غرق ہو گیا' اس کے خوب صورت ماتھے کے اوپر لکیریں پڑ گئیں اور آنکھیں کسی ان دیکھے نقطے کے اوپر مرکوز ہو گئیں۔

دفتر میں ایک پُر اسرار سی خاموشی طاری ہو گئی تھی' ایسی خاموشی کہ اگر سوئی بھی گرتی تو شاید اس کی آواز سے خاموشی کا طلسم ٹوٹ جاتا لیکن آخر سکوت اور خاموشی میں ارتعاش توفیق کی آواز سے پیدا ہوا۔

"تھانیدار صاحب! ایک بات اور بھی ہو سکتی ہے۔"

> دشمن کو احسان کی تلوار سے مارنا چاہیے
>
> ☆☆☆☆
>
> شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے مشائخ کبار میں سے ایک کے پاس شکایت کی کہ فلاں شخص نے میرے خلاف شر انگیز (جھوٹی) گواہی دی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ تو اس کے ساتھ نیکی کر تاکہ وہ شرمندہ ہو۔
>
> زین الدین...... کراچی

"کون سی بات بھئی......" میں نے چونک کر کہا' یہ جوان مجھے ہوشیار بھی لگتا تھا اور عقل مند بھی۔ پھر اس نے وہ بات بتائی تھی اور میرا ذہن روشن ہو گیا تھا۔ ابھی وہ بات میں آپ کو نہیں بتاؤں گا' ذرا انتظار کریں۔ توفیق کو میں نے چائے وغیرہ پلا کر رخصت کر دیا۔

رات کو میں نے سپاہی انور' سپاہی نواز کو ضروری تیاری کا حکم دیا۔ ہماری ضروری تیاری میں اسلحہ کا انتظار' ہتھکڑی وغیرہ شامل ہوتے تھے۔ ہم نے وہاں جانا تھا جہاں دن سوئے اور راتیں جاگتی ہیں۔ ایک گھنٹے بعد میرے اور سپاہی انور کے قدموں تک اس کوٹھے کے زینے تھے جن پر قدم رکھ کر ہم چھوٹے چوہدری افضل کی داشتہ گلنار بائی تک پہنچ گئے۔

اس کے خدوخال ماضی کی اداکارہ مدھوبالا سے ملتے جلتے تھے۔ ہم سادہ کپڑوں میں تھے' یہ ہمارا ایک خفیہ انداز ہوتا ہے۔ میرے کپڑے کھلے کھلے تھے جن میں میرا سروس ریوالور اور دیگر چیزیں پوشیدہ تھیں یعنی ان کی بڑی بڑی جیبوں میں۔ ہلکی ہتھکڑی کا جوڑا سپاہی نواز کے پاس تھا' جس کو میں نیچے بازار میں ہی کھڑا کر آیا تھا۔

میں نے ایک تماش بین کی طرح گلنار بائی کا

جائزہ لیا اور بولا۔

"بائی جی! میں نے سنا ہے کہ آپ ایک مخصوص بندے کے علاوہ کسی کے سامنے نہیں ناچتیں؟"

"آپ نے ٹھیک سنا ہے لیکن ہمارے پاس ایک سے بڑھ کر ایک ہیرے ہیں یا آپ اور آپ کے ساتھی کے لیے پوری رات کے ساتھی کا بندوبست کیا جا سکتا ہے۔" گلنار بائی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ہم نے ایسے حلیے بنائے تھے کہ گلنار بائی ہمیں ایک تو پولیس والوں کی حیثیت سے پہچان نہیں سکتا تھا (اگر وہ ہمیں جانتی ہوتی) دوسری وہ ہمیں کوئی رئیس یا جاگیر دار سمجھ سکتی تھی۔ اس لیے جب اس نے ایسی بات کی تو ہمیں حیرانگی نہیں ہوئی' میں نے مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں تو تمہارے ساتھ رات بسر کرنا چاہتا ہوں۔"

"دیکھیں' ہم وعدہ خلافی نہیں کرتے۔ ایک تو میں صرف ناچتی ہوں' دوسرے میں نے اپنے آپ کو ایک بندے کے لیے مختص کر دیا ہے۔" اس نے ایک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ اب میں نے وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اصل بات کی طرف آتے ہوئے کہا۔

"لیکن چند دن پہلے ایک بندہ آیا تھا' تم نے اس کے ساتھ رات گزاری تھی اور میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ میں تمہارے مستقل تماش بین سے بھی واقف ہوں یہ بندہ جس کا میں نے ذکر کیا ہے یہ چوہدری افضل نہیں تھا۔"

"آپ کون ہیں؟" اچانک اس نے چونکی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا شاید اس کی چھٹی حس نے اسے کسی ان دیکھے خطرے سے آگاہ کر دیا تھا اور یہاں میں اس بات کی بھی وضاحت کر دوں کہ بندے کا ذکر ہوا میں تیر چلانے والی بات تھی۔ لیکن خوش قسمتی سے تیر ٹھیک نشانے پر جا لگا تھا اب میں ڈھیلا نہیں پڑ سکتا تھا۔

"اس بات کو تم چھوڑو کہ میں کون ہوں' تم یہ بات بتاؤ اس بندے نے کتنی رقم دی تھی؟"

"برائے مہربانی آپ تشریف لے جائیں' میں آپ سے مزید کوئی بات نہیں کروں گی۔" پھر اس نے بڑی نائیکہ کو آواز دی۔

چند لمحوں بعد ایک موٹی تازی عورت جس کی جوانی ڈھل چکی تھی اور منہ میں پان دبا ہوا تھا' اندر داخل ہوئی اس کے پیچھے ایک ہٹا کٹا جوان بھی تھا' جو شکل سے بدمعاش اور قاتل لگتا تھا۔

"کیا بات ہے گلنار!"

"یہ صاحب عجیب عجیب باتیں کر رہے ہیں۔" گلنار بائی نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں جناب! کیا بات ہے؟" جوان نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ اچانک غیر متوقع طور پر میں نے اس کے منہ پر الٹے ہاتھ کا تھپڑ رسید کر دیا۔ وہ اس غیر متوقع افتاد سے چکرا گیا لیکن کمال پھرتی سے گرتے گرتے سنبھل گیا اور اس کا ہاتھ جیب کی طرف چلا گیا لیکن میں نے اس سے بھی پھرتی دکھائی اور سروس ریوالور نکالتے ہوئے کہا۔

"جوان! ہاتھ سر سے اوپر کر لو ورنہ......" اس نے غیر ارادی طور پر ہاتھ اٹھا دیے لیکن مجھے خونخوار نظروں سے دیکھنے لگا۔

سپاہی بھی بائی الرٹ ہو گیا تھا اس نے اس کی جیب سے لمبے پھل والا چاقو نکال لیا۔ دونوں عورتیں سہم گئی تھیں پھر میں نے اپنا تعارف کروایا تھا۔ سب کے چہرے فق ہو گئے اور سب جھاگ کی طرح بیٹھ گئے' سپاہی انور نے سپاہی نواز کو بھی بلا لیا۔

"جوان تم خود چلو گے یا تمہیں ہتھکڑی لگا کر زبردستی

لے جانا پڑے گا۔" میں نے جوان کو گھورتے ہوئے کہا۔
"لیکن میرا جرم جناب!" اس نے دلیر بننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
"یہ زیادتی ہے جناب! کسی کو بغیر کسی جرم کے لے جانا کہاں کا انصاف ہے اور قانون بھی اس کی اجازت نہیں دیتا۔" گلنار بائی نے زبان کھولتے ہوئے کہا۔
"میرے کام میں کسی نے رخنہ ڈالنے کی کوشش کی تو سب کو گرفتار کر کے لے جاؤں گا۔" اس بات کا گلنار بائی اقرار کر چکی ہے کہ یہاں عصمت فروشی کا دھندا ہوتا ہے۔ دوسری طرف سپاہی انور اور سپاہی نواز میرے حکم کے منتظر کھڑے تھے بلکہ سپاہی نواز نے ہتھکڑی کا ہک جوڑا ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔
مختصراً ہم جوان جس کا نام جعفر عرف جگا تھا' گرفتار کر کے لے آئے' جب ہم تھانے میں پہنچے تو رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ میں نے جگے صاحب کو حوالات میں بند کروا دیا اور عملے کو یہ تاکید کر کے کوارٹر میں چلا گیا کہ اگر کوئی جگے سے ملاقات کرنے آئے تو اسے ملنے نہیں دینا اور کہہ دینا تھانیدار صاحب منع کر گئے ہیں تم صبح آ کر ان سے بات کرنا۔
دراصل مجھے خدشہ تھا کہ بات چوہدری افضل تک ضرور پہنچے گی' صبح تھانے جا کر مجھے معلوم ہوا کہ میرا خدشہ بالکل صحیح تھا۔ رات دو بجے چوہدری آیا تھا' عملے نے اسے وہی جواب دیا جو میں ان سے کہہ چکا تھا۔
میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اے ایس آئی ابرار (جو اس وقت تھانے میں آ چکا تھا) کو بلایا اور اسے حکم دیا کہ وہ جونہی کچہری کھلے جگے کو ساتھ لے جائے اور اس کا ریمانڈ لے آئے۔ اسے ویسے بھی جانا تھا پھر میں نے اسے ساری بات سمجھائی تھی کہ مجھے شک ہے رفیع کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے گلنار بائی کے کوٹھے پر ہوا ہے اور جگے کو سب کچھ پتا ہے کیونکہ میں نے گلنار بائی کے رویے سے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ رفیع اس کے پاس گیا تھا۔
رفیع کی گمشدگی کی رپورٹ ہمارے پاس درج تھی۔ اس کی کاپی بھی اے ایس آئی کو لے جانی تھی' خیر یہ تو قانونی تقاضے ہوتے ہیں۔ دس بجے کے قریب مجھے اطلاع دی گئی کہ چوہدری افضل مجھ سے ملنے آیا ہے میں نے اسے بلا لیا۔ جب وہ میرے کمرے میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا وہ غصے میں ہے۔ اسے اپنی دولت اور اثر و رسوخ پر ناز تھا' وہ بولا تو اظہار ہو گیا۔
"تھانیدار صاحب! یہ کیا اندھیر نگری ہے۔"
"کون سی اندھیر نگری چوہدری صاحب!" میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔
"ایک تو بلاوجہ آپ نے جعفر کو لا کر حوالات میں بند کر دیا دوسرے رات کو آپ کے عملے نے اس سے ملنے بھی نہیں دیا اور مجھے پتا چلا ہے کہ آپ نے اسے کچہری بھیج دیا ہے۔"
"چوہدری صاحب! دھیرج' ایک ہی سانس میں اتنے سوالات...... ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ......" میں نے چند لمحے توقف کیا پھر معنی خیز لہجے میں کہا۔
"ہم کوئی کام بلاوجہ نہیں کرتے۔" اچانک اس کا رویہ بدل گیا' وہ شیر سے بلی بن گیا اور وہ بھی بھیگی بلی اور منت سماجت پر اتر آیا جب اس سے بھی کام نہ چلا تو مجھے ایک بڑی رقم بطور رشوت پیشکش کی۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
"چوہدری صاحب! لگتا ہے جعفر عرف جگے نے کوئی بہت بڑا جرم کیا ہے جسے آپ نوٹوں کے ڈھیر کے نیچے چھپانا چاہتے ہیں۔" میری بات سے وہ سٹپٹا گیا اور بولا۔

"جرم تو اس نے کوئی نہیں کیا' میں تو ویسے ہی آپ کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔" میں نے اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا تو مجھے صاف نظر آ گیا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

بہرحال جاتے جاتے وہ یہ کہہ گیا میں عدالت میں سب کو دیکھ لوں گا۔ وہ جب چلا گیا تو میرے ہونٹوں پر ایک پُراسراری مسکراہٹ آ گئی۔ میں نے اس کے لیے جو سوچا تھا اگر اس کو پتا چل جاتا تو وہ اپنی ہی بوٹیاں نوچنے لگ جاتا۔

دوپہر تک اے ایس آئی کامیاب لوٹا' عدالت نے جعفر عرف جگے کا سات روز کا ریمانڈ دے دیا تھا لیکن ہم نے اسے صرف ایک رات اور ایک دن میں توڑ لیا۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں وہ بات بتا دیتا ہوں جو میں پہلے گول کر گیا تھا۔ رفیع کے جگری یار توفیق نے کہا تھا۔ "تھانیدار صاحب ہو سکتا ہے' رفیع نے چوہدری سے بات کرنے کی بجائے گلنار بائی سے بات کی ہو۔

بالکل یہی بات تھی اس نے پہلے تو منت سے بات کی کہ وہ چوہدری افضل کا داخلہ بند کر دے لیکن گلنار بائی نے نہ صرف اس کی بے عزتی کر دی بلکہ جگے کو بلا کر دو چار تھپڑ بھی لگوا دیئے جس پر وہ غصے میں بولا۔

"مجھے پتا ہے یہاں جسم فروشی کا دھندا ہوتا ہے میں کسی دن عین موقع پر چھاپہ ڈلوا دوں گا۔" بس پھر کیا تھا وہ کچھ ہو گیا جو وہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اچانک جگے نے آگے بڑھ کر اس کے گلے پر دونوں ہاتھ رکھ دیئے اور اس وقت تک دبا تا رہا جب تک وہ بے جان ہو کر نیچے نہیں گر گیا۔

وقتی پاگل پن کے لمحے سے جب وہ باہر آیا تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے بہرحال انہوں نے مل کر کوٹھے کے ایک سائیڈ والے کونے میں رفیع کی لاش کو رکھ کر اس کے اوپر ترپال ٹائپ کپڑا ڈلوا دیا۔ اس وقت شام ہونے والی تھی اسی رات تین بجے کے بعد جگے نے تین بندوں کے ساتھ مل کر لاش جا کر ایک ویران جگہ پر دبا دی۔ انہوں نے کافی گہرا گڑھا کھود کر لاش کو دبایا تھا جو بعد میں ظاہر ہے ہم نے برآمد کر لی تھی اور تینوں بندوں کو بھی گرفتار کر لیا تھا۔

اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی مجھے جعفر عرف جگے کے الفاظ یاد ہیں اس نے کہا تھا۔

"تھانیدار صاحب! میں نے کبھی قتل نہیں کیا تھا' رفیع کو میں مارنا نہیں چاہتا تھا پتا نہیں اس لمحے مجھے کیا ہو گیا تھا۔"

میں نے اس سے کہا "تمہاری سزا کم ہو سکتی ہے؟"

"وہ کس طرح تھانیدار صاحب!" اس نے حیران نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم عدالت میں یہ کہنا کہ تمہیں چوہدری نے رفیع کو مارنے کے لیے کہا تھا۔" وہ میری باتوں میں آ گیا' دراصل میں اسے وقتی اشتعال کا فائدہ نہیں دینا چاہتا تھا اور چوہدری کو بھی کچھ پریشان کرنا چاہتا تھا۔

مقدمہ عدالت میں چلا گیا یہاں یہ بات بھی بتا دوں کہ جب ہم جعفر عرف جگے کو گرفتار کر کے لے آئے تو گلنار بائی نے چوہدری کو بتایا کہ رفیع جگے کے ہاتھوں مارا جا چکا ہے۔ ہمارے جانے کے بعد چوہدری وہاں جا نکلا تھا' پہلے وہ لاعلم تھا۔

چند دن بعد مہتاب نے خودکشی کر لی اور اس کی قبر بھی اسی قبرستان میں بنی جہاں رفیع کو دفن کیا گیا تھا۔ اس طرح دو روحوں کا ملاپ ہو گیا۔

قلندر ذات

امجد جاوید

قلندر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو شکر گزاری کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچ کر قرب الٰہیٰ حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ رب تعالیٰ بھی ان کی خواہش کو رد نہیں کرتا۔ دوسرے وہ جو ذات کے قلندر ہوتے ہیں۔ ان کا پیشہ بندر' ریچھ اور کتے نچانا ہوتا ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے مرد آہن کی ہے جو ذات کا قلندر تھا۔ اس نے ان لوگوں کو اپنی انگلیوں پر نچایا جو اپنے تئیں دنیا تسخیر کرنے کی دھن میں انسانیت کے دشمن بن گئے تھے۔ انسانی صلاحیتوں کی ان رسائیوں کی داستان جہاں عقل دنگ رہ جاتی ہے اور فکر حیران، اس داستان کی انفرادیت کی گواہی آپ خود دیں گے۔ کیونکہ یہ محض خامہ فرسائی نہیں مقاصد کا تعین بھی کرتی ہے۔

وہ ہیری کو یوں دیکھ رہے تھے، جیسے وہ کوئی ماورائی مخلوق ہو۔ جبکہ ہیری یوں معصومانہ انداز میں کھڑا تھا جیسے اسے یہ سمجھ نہ آ رہی ہو کہ وہ سب اسے یوں کیوں دیکھ رہے ہیں؟

ایملی کی آنکھوں میں حیرت جم کر رہ گئی تھی۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے اتنے بندے مر جائیں گے۔ وہ سہمے ہوئے چھوٹے بچوں کو لے کر دوبارہ گھر میں آ گئی تھی۔ ہیری کا کچھ پتہ نہیں تھا۔

ڈرے ہوئے بچے اس سے کوئی سوال بھی نہیں کر رہے تھے۔ وہ مسلسل ہیری کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ ایسا کیسے ہو گیا ہے؟ وہ تو اب تک ایک نارمل بچہ تھا؟ کیا دوسرے بچے بھی ایسے ہی ہوں گے؟ کیا وہ کسی سازش کا شکار ہو گئی ہے؟ وہ انہیں واپس برطانیہ لے جانے کی بجائے ان کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کرنا چاہتے تھے؟ سوالوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا جو ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ دوپہر ہونے کو تھی۔ ولسن ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ ایملی کھڑکی میں سے دیکھ رہی تھی کہ وہ لیبارٹری کے اندر تھا۔ اسے یہ سوچ کر ہی جھرجھری آ گئی کہ اس کے گھر سے تھوڑا ہی دور کئی لاشیں بکھری پڑی ہیں۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ ہیری گھر میں آ گیا۔ ایک دم اسے ہیری سے خوف آیا لیکن اگلے ہی لمحے ممتا سب کچھ بھول گئی۔ وہ سکون سے آ کر بیٹھ گیا تو ایملی نے پیار سے پوچھا۔

"کھانا کھاؤ گے؟"

"ہاں، مجھے بھوک لگی ہے۔" اس نے ماں کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا تو ایملی کچن کی جانب مڑ گئی۔ اسے ہیری کے چہرے پر کچھ تبدیلی دکھائی دی تھی، وہ کیا تھی؟ کھانا لے کر جاتے ہوئے وہ کوئی فیصلہ نہ کر پائی۔ اس نے ہیری کے سامنے میز پر کھانا رکھ دیا۔ ہیری سکون سے کھانے لگا۔ تبھی ایملی نے غور سے اسے دیکھا۔ ہیری کے چہرے پر سکون تھا، لیکن اس کی آنکھیں تیز چمک رہی تھیں۔ اس کے علاوہ اسے کوئی تبدیلی دکھائی نہ دی تھی۔ اس نے سکون سے کھانا کھایا اور اپنی ماں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"ماما! کیا آپ پریشان ہو؟"

"ہاں، بہت زیادہ۔ یہ سب کیا ہے، انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ ہمارے لیے خطرہ بہت بڑھ گیا ہے، وہ ہمیں مار دیں گے اور میں تم لوگوں کو کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتی ہوں۔" ایملی نہ چاہتے ہوئے بھی جذباتی ہو گئی۔ اس کا لہجہ بھیگ گیا تھا۔ اس پر ہیری نے ماں کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"ماما! کوئی ہمیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پاپا کوشش کر رہے ہیں کہ کسی سے ہمیں مدد مل جائے۔ لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔"

"وہ کیسے؟" ایک دم سے اس نے پوچھا۔

"آپ کو پتہ ہے کہ ہم سب بہن بھائیوں نے مل کر ایک کشتی بنائی ہوئی ہے۔ وہی ہمارے کام آئے گی۔ ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔" اس نے سکون سے کہا۔

"ہم یہاں سے چاہیں بھی تو نہیں نکل سکتے ہیں۔" ولسن نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے کہا تو ہیری نے اپنے باپ کی جانب دیکھا۔ ایملی اور ہیری کی آنکھوں میں سوال تھا، جس کا اس نے ولسن نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"اصل میں اس جزیرے کے اردگرد ایک ناٹیکل میل دور تک اور گنبد کی صورت میں ایک ان دیکھا حفاظتی حصار ہے۔ جو الیکٹریک شاک دیتا ہے۔ اس کے ساتھ جو بھی ٹکراتا ہے، وہ یا تو جل جاتا ہے یا

شاک سے مرجاتا ہے۔اس کے اندر کوئی نہیں آ سکتا اور نہ باہر جا سکتا ہے۔“

”وہ بجلی کا پتر کیسے آ جاتے ہیں؟“ ایملی نے تیزی سے پوچھا۔

”اس لیے کہ وہ جس وقت یہاں آتے ہیں، وقتی طور پر وہ حصار بند یا ختم کر دیتے ہیں۔ جب فضا میں واپس جاتے ہیں تو پھر دوبارہ آن کر دیتے ہیں۔ یہ دو طرح کے مقصد کے لیے تھا، ایک یہ کہ ہم باہر نہ جا سکیں اور دوسرا باہر سے کوئی اندر نہ آ سکے۔“

”ہم نے یہاں سے جانے کی کوشش نہیں کی اور باہر سے یہاں کوئی نہیں آیا، مگر یہ سب کیوں؟“ ایملی نے لاشعوری طور پر کہا اور پھر ہیری کی طرف دیکھ کر ایک دم سے خاموش ہو گئی۔ پھر جلدی سے بات بناتے ہوئے بولی۔

”کیا وہ پھر آ ئیں گے؟“

”میں کچھ نہیں کہہ سکتا، سوائے اس کے کہ ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکلنا ہوگا۔ اب باہر سے کھانے پینے سے لے کر کسی بھی قسم کی کوئی مدد نہیں آئے گی۔ میں وہ الیکٹرک حصار توڑنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تم اندازہ لگاؤ کہ ہم کتنے دن تک یہاں رہ سکتے ہیں۔“ واٹسن نے کہا اور فریج کی جانب بڑھا۔ ہیری خاموشی سے یہ سب سن رہا تھا۔ وہ بھی اٹھ کر باہر کی طرف جانے لگا تو واٹسن نے اس سے کہا۔

”ہیری تمہارے بدن میں گولیاں لگی تھیں، کیا وہ ابھی تک......“

”وہ نکل گئی ہیں، انہوں نے مجھے نقصان نہیں پہنچایا۔“ یہ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ تبھی واٹسن نے بے یقینی کے سے انداز میں پوچھا۔

”مگر کیسے؟ تمہیں درد بھی نہیں ہوا؟“

”درد تو ہوا، جیسے کوئی بہت زور سے چیز لگتی ہے، لیکن وہ میری جلد ہی میں اٹک گئیں، یوں جس طرح کانٹا چبھتا ہے، میں نے وہ سب نکال دیں تو سکون ہو گیا۔“ اس نے یوں جواب دیا جیسے کچھ بھی نہیں ہوا ہو، جس پر وہ کچھ نہیں بولا تو ہیری باہر کی جانب چلا گیا۔ وہ دور ندی کنارے جا کھڑا ہوا۔ واٹسن اور ایملی اسے دیکھ رہے تھے۔ تبھی ایملی نے کہا۔

”تم نے اس کی آنکھیں دیکھی ہیں؟“

”ہاں! اور میں سمجھ رہا ہوں کہ ڈاکٹر ایلکس نے اس پر ہی کوئی تجربہ کرنے کی کوشش کی ہے۔“ واٹسن نے دکھ بھرے لہجے میں کہا اور باہر نکل گیا۔ اس کا رُخ اپنی لیبارٹری کی طرف تھا۔ اس کی چال میں ایک عجیب طرح کی تھکن کا احساس تھا۔ ایملی سوچوں میں گم ہو گئی۔ اسے ہیری کے بارے میں اب تک یقین نہیں ہو رہا تھا۔

☆......☆......☆

”تمہیں یہ سب باتیں کیسے معلوم ہیں؟“ میں نے اس لڑکی الماسیہ سے پوچھا، جب وہ اپنی بات ختم کر چکی۔

”ہمارا برطانیہ میں موجود شام کی لیبارٹری کے کچھ لوگوں سے رابطہ ہے۔ انہیں وہ سب پتہ ہے، جو وہاں جزیرے پر ہو رہا ہے یا ہو گیا ہے۔ یہ کل شام تک کی بات ہے، اس کے بعد کیا ہوا، میں نہیں جانتی ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”اب سوال یہ ہے کہ جب تم لوگوں کو جزیرے کے بارے میں پتہ ہے تو پھر تم لوگ یہاں کیوں چھپ رہے ہو، برطانیہ کی حکومت کو کیوں نہیں بتا دیتے ہو کہ ایسا سب کچھ ہو رہا ہے؟“

”پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمیں جزیرے کے بارے میں کچھ پتہ نہیں، وہ کہاں پر ہے، اگر پتہ ہوتا تو کچھ کرتے، دوسرا جب تک ہم حکومت کو بتاتے، وہ

ہماری بات پر یقین کرتی، تب تک وہ سب ہو جاتا جو، اَب ہو گیا ہوا ہے، ہمارے پاس نہ تو کوئی وسائل ہیں کہ وہاں تک پہنچ سکیں اور نہ طاقت کہ مافیا وغیرہ سے لڑ سکیں، اس کے پیچھے ایک بہت بڑی مافیا ہے۔ اس جزیرے کا پورا کنٹرول انہی کے ہاتھ میں ہے ان کی مرضی کے بغیر وہاں نہ کوئی آ سکتا ہے اور نہ جا سکتا ہے۔ سو ڈاکٹر حسن رضوی نے چھپ جانا ہی مناسب سمجھا۔" اس نے تیزی سے بتایا

"بات اب بھی عقل میں نہیں آ رہی ہے، چھپ جانا تھا تو پھر اغوا کا اتنا بڑا ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

"اس لیے کہ کوئی بھی ہم سے رابطہ نہ کر سکے، ہم اپنے پلان کے مطابق چھپ گئے تھے، لیکن یہ پولیس آفیسر ہم تک آ پہنچا، اس سے بھی جان چھڑا لی تو یہ پھر آن ٹکرایا۔ اب ہم منظر عام پر آ بھی جائیں تو کوئی فائدہ نہیں۔" الماانیہ مایوسانہ لہجے میں بولی۔

"کیوں فائدہ کیوں نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"دیکھیں جب یہ تجربہ شروع کیا گیا تھا تو اسے تین مختلف لوگوں میں بانٹ دیا گیا تھا، ہر بندہ اپنے حصے کا کام کرتا تھا۔ ڈاکٹر حسن رضوی کے پاس وہ کوڈ ہیں، جن سے اس لڑکے ہیری کو اپنی مرضی سے چلایا جا سکتا ہے۔ مافیا وہ کوڈ مانگ رہا ہے، جبکہ ڈاکٹر اسے ڈی کوڈ کرنا چاہتے ہیں، تاکہ وہ نارمل بچہ ہی رہے۔ یا کم از کم ایسا بچہ بن جائے جو انسانیت کے کام آئے، تباہی کا باعث نہ بنے۔"

"کیا اب بھی وقت ہے کہ اسے ڈی کوڈ کیا جا سکتا ہے، اسے اپنی......" میں نے پوچھنا چاہا تو وہ بولی۔

"وقت گزر گیا ہے یا نہیں یہ تو ڈاکٹر ہی بتا پائیں گے۔ لیکن تب تک باقی لوگ معصوم بچے، وہ سب بے گناہ مارے جائیں گے، ہیری کی وحشت کی بھینٹ چڑھ جائیں گے یا پھر باہر سے آنے والے لوگ انہیں مار دیں گے۔ ایک پوری رات گزر چکی ہے، اب تک پتہ نہیں کیا ہو گیا ہوگا۔ افسوس اسی بات کا ہے۔"

"اچھا تم ایسا کرو، ڈاکٹر کا نمبر دو، ہم اس سے بات کرتے ہیں، جزیرے کے بارے میں بھی جان لیتے ہیں۔ ہری اپ۔" میں نے کہا تو اس نے بتایا

"میرے اسی سیل فون میں ہے۔ نانو کے نام سے، لیکن آپ مجھے کانفرنس میں لے لیں گے تو وہ اعتماد کریں گے، ورنہ شاید وہ بات بھی نہ کریں۔"

اوکے۔" میں نے کہا اور کال ختم کر دی۔ میں نے سب کی طرف دیکھا اور وہ پوری طرح متوجہ تھے۔ میں نے نمبر دیکھا اور کال ملا دی۔ کال ملتے ہی چند لمحوں بعد ایک ٹھٹھرتی ہوئی آواز سنائی دی

"کہاں ہو میری بچی، کس نے......"

"الماانیہ محفوظ ہے ڈاکٹر اور بہت آرام سے ہے۔ میں ابھی ان سے آپ کی بات کراتا ہوں۔" میں نے کہا اور کانفرنس میں الماانیہ کو لے لیا۔"

"نانو میں ہر طرح سے ٹھیک ہوں، آپ ان پر اعتماد کر سکتے ہیں۔" اس لڑکی نے تیزی سے کہا۔

"اگر آپ تعاون کریں تو ہم اس جزیرے تک پہنچ سکتے ہیں، اب آپ پتہ نہیں ہم پر اعتماد کرتے ہیں یا نہیں؟" میں نے کہا تو وہ بولا۔

"میری بیٹی مجھے واپس کر دو، میں ہر طرح سے تعاون کروں گا۔" اس نے اسی ٹھٹھری ہوئی آواز میں کہا۔

"نانو میں کہہ رہی ہوں کہ آپ ان پر اعتماد کریں۔ میں کچھ دیر بعد آپ کے پاس ہوں گی۔" اس نے زور دیتے ہوئے کہا تو میں نے کہا۔

"ڈاکٹر اگر آپ ہم پر اعتماد کریں اور ہمیں معلومات دیں تو ممکن ہے ہم ان معصوم لوگوں کو بچا پائیں۔"

"غلطی میری ہے کہ میں برطانیہ سے بھاگ آیا، مجھے سب کچھ بتا دینا چاہئے تھا، لیکن تب تک مجھے بھی نہیں پتہ تھا کہ وہ جزیرہ کہاں ہے؟ اب وہاں کے حالات معلوم ہوئے ہیں تو مجھے نہیں لگتا کہ تم یا کوئی دوسرا، اُن معصوم جانوں کو بچا پائے گا، وہ ہیری درندہ بن چکا ہوگا اور اب تک ان کو مار چکا ہوگا۔" ڈاکٹر نے افسوس سے کہا۔

"ہیری کو مارا جا سکتا ہے اب یا وہ نارمل لڑکا بن سکتا ہے،؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے یہ فکر نہیں ہے کہ اسے مارا جا سکتا ہے یا نہیں، مجھے کچھ اور ڈر ہے؟" ڈاکٹر نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

"دراصل، یہ سارا کھیل ہی غلط تھا، ہم نے جنیٹک انجینئرنگ کا غلط استعمال کیا۔ کیا تم جنیٹک انجینئرنگ کے بارے میں تھوڑا بہت سمجھتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"آپ بتادو۔" میں نے کہا۔

"جنیٹک انجینئرنگ ایک جادو کی چھڑی ہے، جس سے جو چاہو، وہ ہو تو جاتا ہے، لیکن اگر اخلاقی حدوں میں رہے تو انسانیت کی بھلائی، ورنہ تباہی ہے۔ ہم نے تو بھلا ہی سوچا تھا لیکن ٹام اسے تباہی کی طرف لے جانے کا منصوبہ رکھتا ہے۔ جنیٹک انجینئرنگ عام ہو چکی ہے، اس سے بنیادی سیل میں تبدیلی لائی جاتی ہے اور جسم کے حالات، ساخت اور ہئیت کو بدلا جا سکتا ہے۔ جیسے کسی کی نسل میں نیلی آنکھیں ہوں اور جنیٹک انجینئرنگ کے بعد اگلی نسل میں کالی آنکھیں ممکن ہیں۔ پودوں پر، پھلوں پھولوں پر تو بے شمار تجربات ہو چکے ہیں۔ ہم نے ایک ایسا بچہ بنانے کی کوشش کی جو ذہنی اور جسمانی لحاظ سے غیر معمولی ہو۔ میں نے، ڈاکٹر ایلکس اور روبن اسمتھ نے یہ تجربہ کیا۔ پندرہ برس وقت تھا۔ وہ دونوں مر گئے، اب کوڈ میں جانتا ہوں، اسی سے ہیری کو ایسا غیر معمولی ذہن بنانا تھا کہ کمپیوٹر اس کے سامنے معمولی چیز رہ جاتی، لیکن ٹام نے اپنی احمقانہ حرکتوں سے اس کے اندر منفی ڈی کوڈنگ کر دی ہے۔ اب وہ ظالم، وحشی اور درندہ بن جائے گا۔ بن کیا جائے گا، بن گیا ہے۔"

"اگر کسی طرح سے ان لوگوں کو وہاں سے نکال لیا جائے اور ہیری کو وہیں رہنے دیا جائے تو؟" میں نے ایک خیال کے تحت پوچھا۔

"مجھے یہ ڈر نہیں ہے کہ وہ لوگ وہاں مر جائیں گے، لیکن ان کے مرنے سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوگا، ہیری اگر مر جاتا ہے تو ڈر کا امکان تب بھی ہے۔ اس کے ڈی این اے سے وہ کلوننگ کر لیں گے، اس سے تو وہ اگلے پندرہ برس میں ایک فوج کھڑی کر سکتے ہیں۔ اصل یہ ڈر ہے۔ وہ بھی یہی چاہتے ہیں، یہی ان کا منصوبہ ہے۔"

"اوہ۔! یہ تو بڑا خطرناک منصوبہ ہے۔" میں نے تشویش سے کہا کیونکہ یہ دنیا پر بہت بڑی آفت ٹوٹنے والی تھی۔ میں نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

"او کے، ڈاکٹر میں کچھ کرتا ہوں۔ کیا اسے زندہ لایا جائے تو ممکن ہے کہ وہ نارمل ہو جائے؟"

"مجھے نہیں لگتا کہ تم اسے لا سکو یا کوئی بھی اسے لا سکتا ہے، اس کے اندر جو اچانک حالات بدلنے سے ڈی کوڈنگ ہو گئی ہے، اس کا کوئی حل نہیں ہے۔" اس نے مایوسانہ جواب دیا۔

"او کے، میں دوبارہ رابطہ کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے فون بند کر کے ایک طرف رکھ دیا اور سب کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اپنی اپنی جگہ سوچ رہے تھے۔

"پہلے جزیرہ تو دیکھ لیں۔ وہ کہاں پر ہے۔" فہیم

نے تیزی سے کہا تو میں نے پوچھا۔

"کتنا وقت لگے گا؟"

"زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ۔" اس نے اعتماد سے کہا۔

"تم جاؤ اور تلاش کرو، جتنی جلدی ممکن ہو سکے۔" میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ اٹھ گیا۔ اس کے ساتھ رونیت اور اروند بھی چلے گئے۔

"پلان کیا ہے؟" سلمان سارہ بات کو سمجھتا ہوا بولا تو میں نے انسپکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تم کب تک کراچی پہنچ سکتے ہو جلد از جلد؟" اس نے رسٹ واچ دیکھ کر ایک لمحے کو سوچا اور بڑے اعتماد سے بولا۔

"اگر، میں یہاں سے ابھی چلوں اور مجھے ایک گھنٹے بعد جہاز مل جائے تو اگلے دو گھنٹے بعد میں وہاں ہوں گا۔"

"چلو ہم نکلتے ہیں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا تو سلمان تیزی سے بولا۔

"آپ رہیں ادھر، آپ لمحہ بہ لمحہ ہمارے ساتھ ہوں گے، ہم بات بھی کر سکیں گے۔ بہت زبردست نظام فٹ کر دیا ہے یہاں۔ گیت کو ادھر رکھیں، باقی ہم سب جاتے ہیں، تین گھنٹے بعد رابطہ ہوتا ہے۔"

"اوکے، وِش یو گڈ لک۔" میں نے کہا تو اٹھتے چلے گئے۔ میں انہیں پورچ تک چھوڑ کے آیا اور واپس آتے ہی نہیم کے پاس چلا گیا۔

☆......☆......☆

اس وقت جسپال سو کر اٹھا تھا۔ اسے تیار ہونے میں ذرا وقت لگ گیا۔ وہ لاؤنج میں آیا تو نوتن کور کے ساتھ سندیپ کور بڑے فریش موڈ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی دونوں سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔ وہ ان کے پاس دھرے ایک صوفے پر آن بیٹھا۔

"کوئی خیر خبر باہر کی؟" اس نے بیٹھ کر پوچھا۔

"وہی، پولیس اور ایجنسیاں تلاش کر رہی ہیں۔" نوتن کور نے بتایا

"باقی سب؟" اس نے پوچھا۔

"وہ چنن سنگھ کے پاس ہیں۔ ادھر وہ محفوظ ہیں۔ ادھر بھی کوئی خطرہ تو نہیں، محتاط تو ہونا ہی ہے۔" اس نے عام سے لہجے میں صورت حال بتائی۔

"اب پروگرام کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"پہلا تو یہی تھا کہ سندیپ کور کو وہاں سے نکال لیا جائے۔ دوسرا میرے ذمے یہ تھا کہ جہاں یہ سندیپ رہی ہے، اس ادارے کی پوری جانکاری لی جائے، وہ میں نے لے کر بھیج دی ہے۔ تیسرا یہ کہ احکام آنے تک ہم یہیں ہیں۔" اس نے تفصیل بتا دی۔

"اور بے کار رہنے سے بندے کو بھوک بھی لگتی ہے۔ اس کا کچھ بندوبست ہے؟" جسپال نے پوچھا۔

"بالکل ہے، ابھی ناشتہ آجاتا ہے۔" نوتن نے کہا اور اٹھ گئی۔ سندیپ چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر یاسیت بھرے لہجے میں بولی۔

"مجھے پتہ چلا ہے کہ تم اور جمال بہت گہرے اور جگری دوست ہو۔"

"ہاں یہ تو ہے، تم نے کیسا پایا؟" جسپال نے پوچھا۔

"بہت اچھا ہے، اس کے ساتھ رہنے میں مزہ آیا، اس میں اعتماد بلا کا ہے، شاید یہی چیز اسے نڈر بنائے ہوئے ہے۔" اس نے اپنے طور پر رائے دی

"اور بانیتا؟" جسپال نے یونہی پوچھا۔

"اس کے بارے میں سن کر بڑا افسوس ہوا، بہت جان دار لڑکی ہے، مجھے اس نے صرف جمال کی وجہ سے کچھ نہیں کہا۔ ورنہ اس کی فائٹ، کیا بات تھی۔" وہ تعریف کئے بنا نہیں رہ سکی۔

"ہاں، یہ ایک قرض ہے مجھ پر، جسے بہت جلد چکانا ہے۔" وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔

"تو دیر کس بات کی ہے، پتہ ہے کس نے کیا یہ سب؟" اس نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"یہی تو پتہ نہیں ہے، ورنہ اب تک اس کا کام نہ کر چکا ہوتا۔" جسپال نے بے بسی سے کہا۔ اس وقت تک نوتن کور بھی وہیں آ گئی۔ وہ بیٹھ گئی تو سندیپ کور نے کہا۔

"یہ کون سا بڑی بات ہے، میں تمہیں بتاتی ہوں۔"

"بولو۔" وہ پوری توجہ سے بولا۔

"یہاں امرتسر میں باقاعدہ ایک منصوبے کے ساتھ نرنکاری سکھوں کو پرموٹ کیا جاتا رہا ہے، اور انہیں ہر طرح کا تحفظ بھی دیا جاتا ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ وہ امرت دھاری سکھوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔"

"یہ تو مجھے معلوم ہے۔" جسپال نے کہا۔

"انہی نرنکاریوں میں سے سردار ہرنیت سنگھ ہے، وہی اس انسٹیٹیوٹ کا انچارج بھی ہے، جہاں میں رہتی ہوں۔ اگر تو "را" اور ایجنسیاں اس میں ملوث ہیں تو اس کی اجازت کے بغیر یہاں کارروائی نہیں ہوتی۔ اب یہ دیکھ لو، جس قدر وہ مہان بندہ ہے، اس کی سیکورٹی اور معاملات کیسے ہوں گے، یہ دیکھتے ہوئے تو پورا ایک مہینہ لگ جائے گا۔"

"یہ پکا ہے کہ وہی بانیتا کور پر حملے کا ذمہ دار ہے؟" جسپال نے پوچھا تو نوتن کور بولی۔

"وہ صرف بانیتا کور کو نشانہ بنانے نہیں آئے تھے، انہیں اس پورے جتھے پر شک تھا۔ شک کیا، یقین ہے انہیں۔ "را" کے تحت ہونے والے معاملات ایک بندہ ہی دیکھتا ہے اور یہ پکی بات ہے وہ نرنکاریوں میں سے ہی ہوتا ہے، باقی رہی پکا کرنے کی بات، وہ ابھی کچھ دیر میں ہو جائے گی۔"

"اسے پکا کرو، جلدی۔" جسپال نے کہا اور مضطرب ہو کر صوفے پر پہلو بدلنے لگا۔ اتنے میں

انمول موتی

✦ضد اور ہٹ دھرمی صحیح رائے کو دور کر دیتی ہے۔

✦دل زبان کی کھیتی ہے اس سے اچھی باتوں کی تخم ریزی کروا دیں سب نہ اگیں گے کچھ نہ کچھ تو ضرور اگیں گے۔

✦یہ زندگی ہماری خواہشات کے مطابق نہیں ہوتی جہاں ہماری پسند کی چیز ہمیں میسر نہ آئے یا کھو جائے صبر وہاں کام آتا ہے۔

✦کسی کی حوصلہ شکنی نہ کرو' کیا پتا وہ اپنی آخری امید لے کر آیا ہو۔

✦اگر آپ سب کچھ کھو چکے ہیں تو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ جو سب کچھ کھو دیتا ہے اس کے پاس پانے کے لیے پوری دنیا ہوتی ہے۔

بات

☆ جو شخص نا پسندیدہ بات کہے گا وہ نا پسندیدہ بات سنے گا۔ عربی کہاوت

☆ دشمن اچھی بات کہے تو اس کو قبول کرنے میں تامل نہ کرو۔ سوامی شیدھ نند

☆ بات کو دیر تک سوچو پھر منہ سے نکالو، تم کبھی شرمندہ نہ ہو گے۔ افلاطون

☆ بری بات پر تم بھلی بات کے ذریعے زیادہ آسانی کے ساتھ فتح پا سکتے ہو۔ گوتم بدھ

مرسلہ: زبیر اختر.....لاہور

وہاں کی ایک ملازمہ نے ناشتہ لگا دینے کی بابت بتایا تو وہ اٹھ گیا۔
ایک گھنٹہ گزر گیا۔ نوتن کور فون پر مصروف رہی۔ اس دوران سندیپ آنکھیں بند کیے لیٹی ہوئی تھی۔ ایسے میں نوتن کور پلٹ کے ان کے پاس آ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔
''وہی ہے، میرے ذرائع بے پر کی نہیں اُڑاتے۔''
''اب دیکھنا یہ ہے کہ اس تک کیسے پہنچا جا سکتا ہے۔'' جسپال نے سوچتے ہوئے کہا اور اپنا سیل فون نکال لیا، تبھی سندیپ اٹھتے ہوئے بولی۔
''میں گھاس ڈالتی ہوں۔''
''گھاس مطلب؟'' اس نے الجھتے ہوئے پوچھا۔
''انسٹیٹیوٹ میں شیتل ورما کی طرح ایک دوسرا بندہ بھی تھا، جو میرے بدن کا خواہشمند تھا اور اب بھی ہے۔۔۔ سندیا پٹیل نام ہے اس کا۔ ادھر گرونانک پورہ میں رہتا ہے۔ تم مجھے کور دینا، میں اس سے رابطہ کرتی ہوں۔''
''وہ کیا.....'' جسپال نے کہنا چاہا تو وہ بولی۔
''کہہ رہی ہوں نا، وہ اس بندے کے بہت قریب ہے، یہ انفارمیشن میں نکال دوں گی کہ ہرنیت سنگھ کب کہاں ہے۔''
''اوکے، جو کرنا ہے کرو۔'' جسپال نے فیصلہ کن انداز میں کہہ دیا تو سندیپ کور نے اپنی پتلون کی جیب سے سیل فون نکالا تو جسپال نے پوچھا۔
''یہ فون.....؟''
''میں نے منگوایا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ سوچ سوچ کر نمبر ملانے لگی تبھی نوتن کور نے تیزی سے کہا۔
''ٹھہرو ٹھہرو، یونہی اسے کال نہ کرو، پہلے پوری طرح سوچ لو، ہم سے ڈسکس کر لیں، پھر کوئی قدم اٹھاتا۔''
''ہاں، سندیپ، اس وقت تمہاری صورت حال بھی یہی ہے کہ تم اغوا ہو، پھر دوبارہ ان کے چنگل میں پھنس گئی تو۔'' جسپال نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔
''میں اسے پھنسانے کی کوشش کروں گی اور مجھے اُمید ہے کہ وہ میرے بدن کے لالچ میں پھنس جائے گا۔ میں اس سے معلومات نکلوا لوں گی۔''
''تمہیں اغوا کیا گیا ہے، کس نے کیا، ان کے چنگل سے کیسے نکلی وغیرہ وغیرہ......'' نوتن نے کہا۔
''سیدھی سی بات ہے کہ پتہ نہیں وہ کون تھے، وہ کیا چاہتے تھے، وہ مجھے ایک جگہ لے گئے، اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتے، میں وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئی۔ اتنی سی کہانی سنانی ہے۔''
''اور اگر اس نے......'' نوتن کور نے پوچھنا چاہا تو سندیپ کور اسے ٹوکتے ہوئے بولی۔
''تم بھی ایک عورت ہو، کیوں نہیں سمجھ رہی ہو کہ بھوکے کتے کے آگے اگر ہڈی ڈال دی جائے، یا گرم گرم گوشت رکھ دیا جائے تو اس کی ذہنی حالت کیا ہوتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا نا کہ وہ مجھے مار ڈالے گا۔ اس سے زیادہ تو کچھ نہیں کر سکتا نا۔'' اس کے لہجے میں نفرت کی انتہا تھی۔ جسپال کچھ نہیں بولا تو نوتن کور نے کہا۔
''اچھا ذرا ٹھہرو۔''
یہ کہہ کر وہ پلٹ کر کچھ دور پڑے ایک بیگ کے پاس گئی، اس میں سے ایک فون سیٹ نکالا اور واپس آ کر اسے دیتے ہوئے بولی۔
''وہ فون، عام سا ہے، تم یہ فون رکھو، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایسا مائیک بھی ہے، جو ہمارے ساتھ جڑا ہوا ہے، یہ قریب ہوگا تو ہر آواز ہم تک پہنچ جائے گی۔''
''ہاں یہ کام کی چیز ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اسے دیکھنے لگی، پھر اس کی آپریٹنگ سمجھ کر اپنے پاس والے فون سے سم نکال کر اس میں ڈالی اور اس سے رابطہ

کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ اس سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس نے اسپیکر آن کر دیا۔ اپنا تعارف کرا کے بولی۔

"بہت مصیبت میں ہوں اس وقت، میرا کوئی حال نہیں ہے، میرے پاس تو رہنے کا بھی ٹھکانہ نہیں، آپ کو تو پتہ ہے سر کہ تفتیش کے نام پر مجھے کس طرح ذلیل کیا جا رہا ہے۔ مجھے بس ٹھکانہ چاہئے۔"

"میری یاد تمہیں کیسے آئی، وہ بھی میری یاد ہے؟" اس نے طنزیہ لہجے میں پوچھا تو وہ ڈھیلے سے لہجے میں بولی۔

"سر میں اور کس کے پاس جاؤں، میرے ادارے ہی کے لوگ میری مدد کریں گے، سہیل ورما کے بعد ایک آپ ہی تو ہیں، جنہیں میں یاد کر سکتی ہوں۔"

"تم تو اغوا ہو گئی تھیں۔" اس نے پوچھا۔

"سر میں ساری تفصیل مل کر بتا دوں گی نا، اگر آپ مجھے چند دن تحفظ دے سکتے ہیں تو پلیز میری مدد کریں۔"

"کیوں نہیں، لیکن میرا جو مطالبہ پہلے تھا، اب بھی وہی ہوگا، تب تم ہاتھ نہیں آئیں، اب اگر......"

"میں آپ کی ہر بات ماننے کو تیار ہوں، ویسے بھی سہیل ورما کے بعد کوئی مرد ہیں تو آپ، میں خود بہت خواہش مند ہوں، کوئی دوسرا ملا ہی نہیں، اور میں خود......" وہ کہتے کہتے جان بوجھ کر رک گئی۔

"اوہو، تو اصل بات یہ ہے، بولو کہاں ہو، میں تمہیں پک کر لیتا ہوں۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"لیکن سر مجھے چند دن رہنا ہے، یوں ایک دن یا رات نہیں، مجھے کم از کم اتنے دن کہ میں کوئی اپنا ٹھکانہ ....." اس نے اپنی بات کہنا چاہی تو وہ بولا۔

"او کم آن، اس شہر میں میرے کئی فلیٹ ہیں، ایک میں تم رہ لینا، جب تک رہنا چاہو۔" اس نے کہا تو سندیپ نے اسے وہ لوکیشن بتا دی، جو وہ جسپال اور نوتن سے طے کر چکی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ نکل پڑے۔ نوتن کور اور جسپال اپنی کار میں تھے، جبکہ سندیپ کور نے آٹو رکشہ لے لیا۔ وہ آگے پیچھے چلتے ہوئے سندھو پارک میں آ گئے۔ وہ ایک دوسرے سے یوں لاتعلق تھے، جیسے ان میں شناسائی ہی نہ ہو۔ جسپال اور نوتن ٹہلتے ہوئے ایک بینچ پر جا بیٹھے اور سندیپ ان سے ذرا فاصلے پر ایک بینچ پر بیٹھ گئی۔ تقریباً دس منٹ گزرے ہوں گے، ایک لمبے قد اور پکی عمر کا شخص ادھر اُدھر دیکھتا ہوا، سندیپ کور کے پاس جا پہنچا۔ سندیپ کور کچھ زیادہ ہی والہانہ انداز سے ملی۔ وہ اس کے برابر بیٹھ گیا۔

وہ دونوں باتیں کرنے لگے۔ سندیپ کور نے ایک کہانی گھڑی کہ وہ کس طرح ان اغوا کاروں کے چنگل سے آزاد ہوئی اور صبح سے دھکے کھا رہی ہے۔ وہ اب کچھ دن چھپ کر رہنا چاہتی ہے۔ وہ کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ اس دوران جسپال اور نوتن ارد گرد کسی ایسے بندے یا بندوں کو پہچاننے کی کوشش کرتے رہے جن پر یہ شک ہو کہ وہ نند پاٹیل کے ساتھ آئے ہوں یا ان کی نگرانی کر رہے ہو۔ انہیں ایسا کوئی شخص دکھائی نہیں دیا اور نہ ہی کسی پر شک ہوا۔ وہ دونوں اٹھ گئے تو جسپال کے ساتھ نوتن بھی اٹھ گئی۔ اس نے احتیاطاً چنن سنگھ کو فون کر کے بتا دیا تھا کہ وہ کیا کرنے جا رہے ہیں اس لیے کسی بھی وقت ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اس نے یہ بات اچھی طرح سمجھ لی تھی۔

پارک کے باہر ایک نئے ماڈل کی کار میں بیٹھ رہے تھے، یہ دونوں بھی اپنی کار میں جا بیٹھے۔ اگلے لمحوں میں وہ ان کے پیچھے تھے۔ وہ گرونانک پورہ کے علاقے میں کھیم کرن روڈ کے اندر ایک گلی میں جا رکے۔ وہ ایک درمیانے درجے کا گھر تھا۔ وہ اپنی کار

پورچ میں لے گیا اور یہ آگے بڑھ گئے۔ سفر کے دوران نند پاٹیل اور سندیپ باتیں کرتے رہے۔ انہوں واضح طور پر محسوس کیا کہ سندیپ کی بات درست تھی۔ نند پاٹیل کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہوا، بلکہ وہ جلد از جلد اس جگہ پہنچ جانا چاہتا تھا کہ جو بڈی اس کے سامنے آگئی ہے اسے جھنجوڑ سکے۔

سندیپ اس کی بے چینی کا بھرپور فائدہ اٹھانا چاہ رہی تھی۔ وہ دونوں اس گھر کے قریب ہی کار میں بیٹھے ان کی آوازیں سن رہے تھے۔ وہ نند پاٹیل سے یہ منوانا چاہ رہی تھی کہ پاٹیل اس کی ملاقات ہرنیت سنگھ سے کروا دے تاکہ وہ اس سے مل کر اپنی بے گناہی ثابت کر سکے۔ یا کم از کم یہ اجازت لے سکے کہ اسے اپنی مرضی کی زندگی گزارنے دی جائے۔ یہ جو تفتیش کے نام پر اسے ذلیل کیا جا رہا ہے یہ بند ہونا چاہئے۔ یا پھر سیدھے جیل ہی میں ڈال دیں۔ کچھ تو ہو۔

"دیکھ میں جاتا ہوں اس کے پاس، بات کروں گا اس سے پہلے اسے تیری ساری اسٹوری سناؤں گا، اگر اس نے ملنے کو بولا تو میں تجھے لے جاؤں گا۔ اب یہ ایک دم کا معاملہ تو نہیں ہے نا۔" وہ شاطرانہ لہجے میں بولا۔

دو گھنٹے سے زیادہ وہ اس کے ساتھ مغز ماری کرتی رہی لیکن وہ اسی بات پر اڑا رہا، اس دوران انہوں نے شراب پی کھانا کھایا، وہ اسے فوراً بیڈ تک لے جانا چاہتا تھا۔ آخر سندیپ نے باتوں ہی باتوں میں پوچھ لیا کہ اس گھر میں کون کون ہیں۔ وہاں تین ملازم تھے۔ ایک چوکیدار، دو گھر کے اندر میاں بیوی تھے۔ سندیپ نے اشارہ دے دیا کہ انہیں اب مداخلت کر دینی چاہئے کیونکہ وہ ایسے نہیں ماننے والا۔

مگر وہ سندیپ سے زیادہ شاطر نکلا تھا۔ وہ جیسے ہی سندیپ کو اپنے گھر لایا، اس نے یہ خبر ہرنیت سنگھ کو دے دی کہ وہ اغوا ہونے والی لڑکی اس کے پاس ہے۔ اگرچہ اس بات کی خبر جسپال اور نوتن کو نہیں تھی لیکن انہوں نے گھر کے باہر کچھ ہی دیر بعد غیر معمولی ہلچل دیکھ لی تھی۔ تبھی اس نے دوبارہ چنن سنگھ سے رابطہ کیا تو اس نے یہی بتایا کہ وہ بالکل قریب ہیں۔ جیسے ہی وہ کہے گی پہنچ جائیں گے۔

وقت آہستہ آہستہ گزرتا چلا جا رہا تھا۔ ان لوگوں کے علاوہ کافی گاڑیاں بھی آگئی تھیں۔ اندر دونوں کی بحث جاری تھی۔ یہاں تک کہ پاٹیل نے سندیپ سے کہا کہ تم منہ ہاتھ دھو کر تیار ہو جاؤ، میں ہرنیت سے رابطہ کرتا ہوں۔ پھر اس کے پاس چلتے ہیں۔ سندیپ اپنا فون وہیں چھوڑ کر باتھ روم میں چلی گئی۔ تبھی جسپال اور نوتن حیران رہ گئے کہ ہرنیت کی وہاں آمد ہونے والی تھی۔ اسی لیے معمولی نقل و حرکت ہو رہی تھی۔ جسپال کے من میں سنسنی پھیل گئی۔ نوتن کور نے جلدی سے چنن سنگھ کو ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا۔

دوپہر ہونے کو تھی کہ ہرنیت سنگھ نوے ویل میں وہاں آ گیا۔ اس کے ساتھ چار گاڑیاں تھیں، جن میں اس کے گارڈ موجود تھے۔ اس کی گاڑی سیدھی اندر چلی گئی۔ نوتن کے فون سے آوازیں ابھر رہی تھیں۔

"اچھا تو یہ ہے وہ حسینہ، جس کے بڑے چرچے سنے تھے ہم نے، واقعی، جتنا خوبصورت سنا تھا، ارے یار یہ تو اس سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔ یار ایسے کچھ نہیں کہنا، بس اس سے یہ پوچھ لو کہ اس کے ساتھی کہاں ہیں، آرام سے بتا دے تو انعام کے طور پر میں اسے اپنی رکھیل رکھ لوں گا، عیش کرے گی ماں کی

……" اس نے اپنی بات ایک غلیظ گالی پر ختم کی تو سندیپ کور بھنا کر بولی۔

"اوئے دیکھ ہرنیت۔! میں نے جو تربیت لی ہے نا، وہ اپنے وطن پر قربان ہو جانے کے لیے لی ہے، بھارت ماتا پر مر مٹنے کے لیے لی ہے۔ میں ایک سپاہی ہوں، اب تم لوگ مجھے صرف ایک عورت سمجھ رہے ہو اور غلطی کر رہے ہو۔ اس لیے پاٹیل نے تم لوگوں کو جس مقصد کے لیے بھی بلایا ہے، میں مر تو جاؤں گی……"

"اوئے بھاشن نہ دے، تو غدار ہے، تیرے ساتھ تو یہ سلوک ہونا چاہئے کہ تجھے چوراہے میں کھڑا کر کے آگ لگا دینی چاہئے۔ لیکن میں تو پھر تجھے اپنی رکھیل رکھنے کو راضی ہوں۔ بس اتنا بتا دے کہ تیرے ساتھی کہاں ہیں، جنہوں نے اسپتال سے تیرے اغوا کا ڈرامہ کیا اور اب مجھ تک پہنچنے کو پاٹیل کے پاس بھیج دیا۔ بول۔" وہ انتہائی سرد لہجے میں بولا۔

"تم لوگ بہت غلط سمجھ رہے ہو، اب میں کچھ نہیں کہوں گی۔ جو کرنا ہے کرو۔" سندیپ نے کہا تو چٹاخ کی آواز اُبھری۔ جسپال انتہائی مضطرب ہو گیا۔ اس کے سامنے وہ گھر تھا۔ جس کے ایک طرف سڑک تھی، دائیں اور بائیں گھر تھے اور پچھلی طرف بھی گھر کی دیوار تھی۔ اس گھر کے سامنے گاڑیاں کھڑی تھیں۔ جن کے اندر اور باہر کئی لوگ تھے۔ کچھ گھر کے اندر تھے۔ انہوں نے یہ غلطی کر لی تھی کہ چھت پر کوئی نہیں چڑھا تھا۔ چمن سنگھ کی طرف سے جہاں بلدیو سنگھ وغیرہ آ گئے تھے، وہیں، کافی سارے مزید لوگ بھی تھے۔ جسپال نے نوتن سے کہا کہ وہ سب کو بتا دے اور کار چلا دی۔ وہ پچھلی گلی میں چلا گیا۔ جب تک نوتن سب کو صورت حال سے آگاہ کر چکی تھی۔ اندازے کے مطابق گھر کے سامنے جیسے ہی

اسلام یورپ کا سب سے بڑا مذہب

آئندہ 20 سالوں میں اسلام یورپ کا سب سے بڑا مذہب ہوگا اور مساجد کی تعداد گرجا گھروں سے تجاوز کر جائے گی۔ بین الاقوامی سروے کے مطابق یورپ میں 5.2 ملین مسلمان آباد ہیں جن کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اور یہ تعداد 104 ملین تک پہنچنے کا امکان ہے۔ پی ای ڈبلیو کے مطابق 2030ء تک مسلمانوں کی تعداد 2 ارب 20 کروڑ تک جا پہنچے گی۔ 2020ء تک برطانیہ کا نمایاں مذہب اسلام ہوگا جرمنی کی حکومت نے پہلی بار اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ جرمنی میں مقامی آبادی کی گرتی ہوئی شرح پیدائش اور مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی شرح پیدائش کو روکنا ممکن نہیں لیکن اگر صورت حال یہی رہی تو 2050ء تک جرمنی مسلم اکثریت کا ملک بن جائے گا۔ یورپ میں مقامی آبادی کا تناسب کم ہونے کی ایک وجہ وہاں کے لوگوں کا شادی نہ کرنا اور بچوں کی ذمہ داری نہ لینا ہے جبکہ یورپ میں مقیم مسلمانوں کی آبادی میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ رپورٹ کے مطابق 2050ء تک یورپ کے کئی ممالک میں 60 سال سے زائد عمر کے مقامی افراد مجموعی آبادی کا 75 فیصد تک ہو جائیں گے اور اس طرح بچوں اور نوجوان نسل کا تناسب کم رہ جائے گا جبکہ مسلمانوں کی آبادی میں کئی گناہ اضافہ ہو جائے گا جن میں اکثریت نوجوانوں کی ہوگی۔ رپورٹ کے مطابق کینیڈا میں اسلام تیزی سے پھیلنے والا مذہب ہے اعداد و شمار کے مطابق 2001ء سے 2006ء تک کینیڈا کی آبادی میں 6.1 ملین افراد کا اضافہ ہو چکا ہے۔ جن میں سے 2.1 ملین مسلمان ہیں امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد ایک کروڑ سے تجاوز کر چکی ہے اور آئندہ 30 سالوں میں 5 کروڑ مسلمان امریکی ہوں گے۔ پی ای ڈبلیو کے مطابق دیگر مذاہب کے پیروکاروں کے مقابلے میں مسلمانوں کی آبادی میں نوجوانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ مسلمان انڈونیشیا میں آباد ہیں مگر 20 سالوں میں یہ اعزاز پاکستان کو حاصل ہو جائے گا جبکہ بھارت مسلم آبادی کے اعتبار سے دنیا کا تیسرا بڑا ملک بن جائے گا۔

(عثمان عبداللہ……کراچی)

جسپال نے کار روکی، نوتن نے اسے اسلحہ تھما دیا۔ اس کے پاس دو پسٹل، ایک لانچر اور چند دستی بم تھے۔ وہ اب رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ جسپال نے گیٹ کو دھکیلا، وہ بند تھا، اس نے بیل دینا مناسب نہیں سمجھا، باؤنڈری وال سے اندر کود گیا۔ سامنے ہی لاؤنج تھا، اس میں ایک خاتون بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر چیخنے لگی تو جسپال نے پسٹل اس کی طرف کر کے کہا۔

"پولیس، مجھے صرف چھت پر جانا ہے، ورنہ باہر سے کوئی آدمی اندر آ کر تجھے مار دے، سمجھی۔" یہ کہہ کر وہ سیڑھیاں چڑھ گیا۔ وہ سرعت سے اوپر پہنچا، تو وہ گھر کی دائیں جانب والی چھت پر تھا۔ دوسری چھت پر جانے کے لیے ایک چھوٹی سے دیوار تھی۔ وہ لمحوں میں کود گیا۔ اوپر سے اس نے دیکھ لیا کہ ان سیکورٹی والوں کے گرد بھی گھیرا تنگ تھا۔ بلدیو سنگھ پہنچ چکا تھا۔ وہ دیوار کی اوٹ میں بیٹھ گیا اور فون پر بلدیو سے رابطہ کیا۔

"ہاں۔! مجھے نوتن نے بتا دیا ہے، کیا تم اوپر پہنچ چکے ہو؟" اس نے تیزی سے پوچھا تو وہ بولا۔

"ہاں، اور میں دیکھ رہا ہوں کہ....."

"وقت کم ہے، گو۔" یہ کہہ کر اس نے فون کاٹ دیا۔ تبھی اس نے دو ہینڈ گرنیڈ نکالے، یکے بعد دیگرے ان کی پنیں نکالیں اور ایک باہر کی جانب اچھال دیا اور ایک گھر کے اندر پھینک دیا۔ اس کے ساتھ ہی جسپال چھت پر لیٹ گیا۔ ایک ساتھ دو دھماکے ہوئے۔ جس کے ساتھ کئی چیخیں بلند ہوئیں۔ اور اس کے ساتھ ہی شدید فائرنگ ہونے لگی۔ جسپال نے لیٹے لیٹے لانچر سیدھا کیا، اس میں راکٹ ڈالا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس نے سامنے کھڑی گاڑیوں کا نشانہ لیا اور اس ترتیب سے فائر کر دیا کہ زیادہ سے زیادہ گاڑیاں تباہ ہوں۔ دھماکے کے ساتھ لانچر پھٹا اور اس کے ساتھ ہی وہاں آگ لگ گئی۔ جسپال وہاں کھڑا نہیں رہا۔ وہ انہیں پیروں پر پلٹ کر اس جگہ آ گیا، جہاں سے نیچے جانے کا راستہ تھا۔ وہیں سے سیڑھیاں نیچے اترتی تھیں۔

توقع کے مطابق اسے سیڑھیوں پر لوگوں کے اوپر آنے کی دھمک سنائی دی، وہ دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا، جیسے ہی اس نے ایک شخص کو باہر آتے ہوئے دیکھا، اس نے سر کا نشانہ لے کر فائر جھونک دیا۔ تب تک دوسرا پہنچ چکا تھا، جسپال نے اسے بھی نشانہ پر رکھ کر فائر کر دیا۔ سیڑھیاں صاف تھیں۔ وہ محتاط انداز میں نیچے کی طرف چلا گیا۔

وہ سیڑھیاں لاؤنج ہی میں کھلتی تھیں۔ سامنے سندیپ کور فرش پر پڑی ہوئی تھی اور اس پر پاٹیل کا پاؤں تھا، جبکہ ہرنیت سنگھ باہر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جسپال کی آہٹ پا کر جیسے ہی پاٹیل مڑا، جسپال نے اس پر فائر جھونک دیا۔ اسی لمحے ہرنیت سنگھ پلٹا تو جسپال نے کہا۔

"اب رک جاؤ، ہلنا مت۔"

تبھی ہرنیت سنگھ دونوں ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے تیزی سے بولا۔

"دیکھو، تم جو کوئی بھی ہو، ہم بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں، جو بھی تم چاہو، ہم اس پر سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔ تم فائر مت کرنا، آؤ۔"

"نہیں ہرنیت سنگھ، اب نہیں۔" جسپال نے غصے میں کہا۔ اس دوران سندیپ کور اٹھ کھڑی ہوئی، اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، آگے بڑھ کر ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارتے ہوئے بولی۔

"یہ سکھ قوم کی ہر بیٹی کی طرف سے ہے تمہارے منہ پر، جنہیں تو نے اس راہ پر لگایا۔ چل نکل باہر۔"

سندیپ کور نے اسے گردن سے پکڑا اور باہر

دھکیلنے لگی۔ باہر کا ماحول ہی بدلا ہوا تھا۔ چھوٹے سے صحن میں لاشیں پڑی ہوئیں تھیں۔

"سندیپ چھوڑ دو اسے، ہم نکلیں۔" جسپال نے کہا۔ تو وہ انتہائی نفرت سے بولی۔

"جب تک یہ ہے، ہم نکل سکیں گے، ورنہ......"

"کچھ نہیں ہوگا، نکل۔" جسپال نے ہرنیت سنگھ کو بازو پکڑتے ہوئے کہا، سندیپ نے اسے چھوڑا تو جسپال نے اس کے ماتھے پر پسٹل کی نال رکھتے ہوئے کہا۔

"بانیتا کور پر گولی چلانے والا، زندہ کیسے بچ جائے، یہ ممکن نہیں ہے میری جان۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے اس کے ماتھے میں سوراخ کر دیا۔ وہ ایک لمحے کو اس کے ہاتھوں میں تڑپا تو اس نے ہرنیت کو چھوڑ دیا۔ وہ زمین پر جا پڑا اور تڑپنے لگا۔ انہوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا، وہ باہر نکل گئے۔ سامنے بچن کور کی گاڑی کھڑی تھی۔ وہ دونوں اس میں سوار ہو گئے۔ وہ جس وقت وہاں سے نکلے، وہاں سے باہر ابھی کسی کو خبر نہیں ہوئی تھی کہ کیا ہو گیا ہے۔ وہ چند منٹوں میں کھیم کرن روڈ پر سیدھے جا رہے تھے۔

☆......☆......☆

انسپکٹر، سلمان، زویا، علی نواز کے ساتھ المانیہ اس چھوٹے جہاز کے عرشے پر کھڑے تھے، جو انہیں لمحہ بہ لمحہ ساحل سمندر سے بہت دور جزیرے کے پاس لے جا رہا تھا۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ گہرے نیلے پانی پر سورج کی کرنیں یوں چمک رہی تھیں، کہ ان کی آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ انہوں نے باقاعدہ چور پر فورسز کو مطلع کر دیا تھا۔ ڈاکٹر حسن رضوی خود انسپکٹر کے ساتھ پولیس کے پاس چلا گیا تھا۔ انہیں وزارت داخلہ سے اجازت لینے میں اتنی دشواری نہیں ہوئی۔ سو وہ فورسز کے لوگوں کے ساتھ جا رہے تھے۔

میں کنٹرول روم میں بیٹھا ان کی کارروائی دیکھ اور سن رہا تھا۔ ہر بندے کے پاس کیمرہ تھا، جس سے میں وہاں کے مناظر سمجھ سکتا تھا۔ وہ جزیرہ ساحل سے کوئی ایک ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ وہ اب بالکل قریب پہنچنے والے تھے اور بہت زیادہ محتاط ہو گئے ہوئے تھے۔ انہیں صرف یہی ڈر تھا کہ وہ کہیں انجانے میں اس حد تک نہ چلے جائیں، جہاں پر کشتی یا جو بھی اس کی رینج میں آتا تباہ ہو جاتا۔ اسی دوران ایک ہیلی کاپٹر فضا میں چکرانے لگا۔

فہیم اور اروند نے جو اندازہ لگایا تھا کہ یہ الیکٹرک ریز کی ایک نادیدہ دیوار ہے۔ جسے کہیں سے بھی کنٹرول کیا جا سکتا تھا۔ اس کی تصدیق حسن رضوی نے کر دی کہ ایسا ممکن ہے اور اس نے اس کا توڑ بھی دیا تھا۔ وہ ایک خاص فاصلے پر پہنچ چکے تھے۔ جہاں سے انہوں نے ہوا میں دور مار قسم کے راکٹ چلانا شروع کر دیئے تاکہ جہاں الیکٹرک دیوار ہو تو اس کے بارے میں معلوم ہو جائے۔ انہیں زیادہ وقت انتظار نہیں کرنا پڑا۔ جیسے ہی ایک راکٹ چلایا گیا، وہ کچھ فاصلے پر جا کر ہوا ہی میں یوں جل گیا، جیسے کسی نے اسے آگ لگا دی ہو۔ وہ ایک دم سے بھسم ہو گیا۔ وہ سارے ایک دم سے ٹھٹک گئے۔ جہاز کو فوری طور پر روک دیا گیا، جو پہلے ہی آہستہ چل رہا تھا۔ وہ رک چکے تھے۔ اب وقت آ گیا تھا کہ جب انہوں نے اس الیکٹرک وال کا توڑ کرنا تھا۔

ایک خیال یہ تھا کہ بغیر اس دیوار کو چھیڑے اس قدر گہرائی میں جایا جائے جہاں اس کے اثرات نہ ہوں اور نیچے سے دیوار پار کر لی جائے۔ اس طرح جہاں سے بھی اسے کنٹرول کیا جا رہا تھا، انہیں پتہ نہ چلتا۔ یہ ایک رسک تھا۔ انہیں پہلے یہ معلوم کرنا تھا کہ گہرائی میں اس دیوار کے اثرات ہیں بھی کہ نہیں؟

لیکن یہ بڑا وقت طلب تھا، واپسی پر نجانے کیا صورتِ حال ہوتی، اس لیے انہوں نے اس دیوار ہی کو ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ کیونکہ فورسز کے لوگ بھی یہی چاہتے تھے کہ اگر انہیں معلوم ہو جاتا ہے، اور وہ یہاں تک پہنچتے ہیں تو انہیں پکڑا جا سکتا ہے۔

ان سب کا فیصلہ یہی تھا کہ بعد میں جو ہوگا وہ دیکھا جائے گا، لیکن اس وقت جزیرے تک پہنچنا ضروری ہے اور اس سے پہلے اس الیکٹریکل دیوار کو ختم کر کے ہی پہنچا جا سکتا تھا۔ عرشہ پر ایک بڑی ساری بیم نما سرچ لائٹ لائی گئی، اسے آن کرنے کے لیے ایک طاقتور جنریٹر رکھا گیا تھا۔ اسے آن کیا گیا تو اس میں سے پیلی لیزر نکلیں۔ سامنے جہاں کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا، وہاں گلابی رنگ کی دیوار سی نظر آئی۔ اس بیم کا رخ جس طرف بھی کیا جاتا، وہاں ایسی ہی دیوار نظر آتی گئی۔ یہاں تک کہ ایک جگہ اس کی شعاعیں نکالی گئیں۔ کچھ ہی دیر بعد اسی بیم نما سرچ لائٹ سے گلابی شعاع نکلنے لگی۔ وہ شعاع جہاں پڑتی وہیں چنگاریں نکلتیں دھواں سا اٹھتا اور پھر ختم، اچانک دھواں فضا میں پھیل گیا۔ بیم نما سرچ لائٹ کی روشنی پیلی ہوگئی اور پھر کچھ دیر بعد وہ بجھ گئی۔

ماہرین نے یہ اعلان کردیا کہ وہ الیکٹرک دیوار ختم ہوگئی ہے۔ جس طرح پہلے راکٹ مار کر جانچا گیا تھا، انہوں نے دوبارہ جانچا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ جہاز آہستہ آہستہ چل پڑا۔ بھی لوگ کسی بھی متوقع صورت حال کے لیے تیار تھے۔ جہاز اس جگہ سے گزر گیا۔ دیوار ختم ہوگئی تھی۔ اس پہلی کامیابی نے ان کے حوصلے بڑھا دیئے تھے۔ وہ بھی خوش تھے۔ کافی دور انہیں ایک سرسبز جزیرہ دکھائی دینے لگا تھا۔

اس وقت سہ پہر ہو چلی تھی، جب وہ جزیرے سے کچھ دور آ رکے۔ وہ بھی اسلحہ سے لیس کشتیوں پر بیٹھ کر کنارے تک جا پہنچے۔ انسپکٹر، سلمان، زویا، علی نواز، اور المانیہ کے ساتھ فورسز کے لوگ تھے۔ ان کے سامنے سرسبز و شاداب درختوں، پودوں جھاڑیوں کا جنگل تھا۔ وہ اس میں سے راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ وہ جزیرے پر آئے اور جنگل میں گھستے ہی پھیلتے چلے گئے۔ وہ ایک قطار میں آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے جس طرح جنگل کی مخصوص آواز ہوتی ہے، وہ آواز اس لیے بھی ہیبت ناک لگ رہی تھی کہ وہاں ہوا بہت تیز تھی۔ پرندوں کے بولنے کی آوازوں کے علاوہ ایسے لگ رہا تھا جیسے گہرا سناٹا، روح تک میں اتر رہا ہو۔ وہ انتہائی محتاط انداز میں آگے بڑھتے گئے۔

تقریباً آدھا کلومیٹر جنگل عبور کر لینے کے بعد وہ کھلے میں آ گئے۔ وہاں سے آگے میدان تھا، کافی دور تک پھیلے ہوئے اس میدان کے ایک جانب انہیں پانی کی نہر بہتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ محتاط انداز میں آگے بڑھتے چلے گئے، یہاں تک کہ انہیں لکڑی کا ایک کاٹیج دکھائی دیا۔ اس کے باہر لان تھا۔ اس سے ذرا فاصلے پر شیڈ بنا ہوا تھا، جس کے نیچے ایک کمرہ تھا۔ اس کے اردگرد لکڑی ہی سے باڑ لگی ہوئی تھی۔ وہاں کوئی ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ آگے بڑھتے گئے۔

وہ لکڑی کے کاٹیج کے قریب پہنچے۔ وہاں بھی انہیں کوئی دکھائی نہیں دیا۔

''کیا انہیں یہاں سے اٹھا لیا گیا ہے؟'' ایک دم سے المانیہ نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''اس بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔'' اس کے قریب کھڑے انسپکٹر نے جواب دیا تو اسے اپنے سوال پر احساس ہوا کہ جس طرح اسے کچھ نہیں پتہ تو دوسروں کا کیا معلوم ہوگا۔ تب وہ بولی۔

''دیکھو! میں آواز لگاتی ہوں۔ تم سب لوگ ادھر ادھر خیال کرنا۔'' یہ کہہ کر کسی جواب کا انتظار کیے بنا وہ قریب ہی ایک ٹیلے پر چڑھ گئی اور زور زور سے پکارنے لگی۔ ''ایملی...... ہیری...... واٹسن...... کہاں ہو...... ہم تمہارے دوست ہیں۔ پلیز سامنے آؤ۔''

اس کی آواز کی بازگشت گونج کر رہ گئی۔ کوئی ان کے سامنے نہیں آیا۔ المانیہ نے پھر آواز لگائی اور خاموش ہو کر کسی ردعمل کا انتظار کرنے لگی۔ کتنے ہی منٹ یونہی گذر گئے۔ اچانک نہر اور شیڈ کے درمیان سے ایک لڑکا برآمد ہوا۔ وہ ان کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر یوں ان کی طرف بڑھنے لگا، جیسے وہ انہیں جانتا ہو۔ اس کے انداز سے یوں لگ رہا تھا، جیسے یہ گمان بھی نہ ہو کہ خوف نام کی کوئی شے بھی ہو سکتی ہے۔

''ضرور یہ ہیری ہے۔'' سلمان نے دھیرے سے کہا۔

''کم آن ہیری۔'' المانیہ نے اس کی طرف دیکھ کر زور سے کہا اور ہاتھ ہلانے لگی۔

وہ ہیری ہی تھا جو ان سے تقریباً سو قدم کے فاصلے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ان کی طرف یوں دیکھ رہا تھا، جیسے وہ کوئی دوسری مخلوق ہوں۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی، جس میں شک، بے اعتمادی اور غصہ چھلک رہا تھا۔ وہ یک ٹک ان کی طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ تبھی اس کی طرف دیکھتے ہوئے المانیہ ہی آگے بڑھی۔

''ہیری، میں المانیہ، میں تمہاری اور تمہاری فیملی کو بچانے آئی ہوں۔ واٹسن......''

''وہیں رک جاؤ۔'' ہیری نے تیزی سے کہا تو المانیہ یکدم وہیں رک گئی۔ تب سلمان آگے بڑھا اور بہت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''تم اپنی ماما یا پاپا کو بلاؤ، ہم تم سب کے لیے آئے ہیں، وہ ہماری بات سمجھیں گے۔''

''جو بات کرنی ہے مجھ سے کرو۔'' وہ سرد لہجے میں بولا۔

''دیکھو! ہم وہ نہیں ہیں، جنہوں نے تم لوگوں پر حملہ کیا تھا۔ وہ دوبارہ کسی وقت بھی حملہ کر سکتے ہیں۔ تم ہماری بات نہیں سمجھ پاؤ گے، وہ اگر یہاں نہیں آ سکتے تو مجھے ان کے پاس لے چلو، میں انہیں سمجھاتا ہوں۔'' سلمان نے اسے قائل کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے آؤ، باقی سب ادھر رہیں۔'' اس نے ایک دم سے کہا تو المانیہ کے ساتھ سلمان آگے بڑھ گئے۔

وہ تینوں کانیج اور نہر کے درمیان جگہ پر جا پہنچے، جہاں وہ سب یوں بیٹھے ہوئے تھے جیسے چھپ گئے ہوں۔ وہ انہیں دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ چند لمحے ان کے آپس میں تعارف میں گذر گئے۔ تب المانیہ نے اپنی جیب سے ایک پرانی تصویر نکالی اور واٹسن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''کیا لندن میں تجربے سے گزرنے کے دوران کبھی اس بندے کو آپ نے دیکھا۔''

واٹسن اس تصویر کو چند لمحے گھورتا رہا، پھر ایملی کی جانب بڑھا دی اس نے فوراً ہی پرجوش لہجے میں کہا۔

''ہاں، کیوں نہیں، یہ وہاں ڈاکٹر تھا، اور اکثر میرے ٹیسٹ کیا کرتا تھا۔''

''وہ تھا نہیں ہے۔'' المانیہ نے تیزی سے کہا۔

''وہ میرے نانا ہیں اور اس وقت پاکستان میں ہیں۔ یہ سب انہی کی وجہ سے ممکن ہو پایا ہے کہ ہم یہاں تک پہنچے ہیں۔ اگر آپ لوگ سکون سے ہماری بات سن لیں تو ہم ہی وہ لوگ ہیں جو سب کو محفوظ ٹھکانے تک لے جا سکتے ہیں۔''

''آپ بچوں سے کہیں کہ وہ کانیج میں چلے

جائیں، انہیں یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔'' سلمان نے کہا تو وانسن نے ہیری کو اشارہ کیا کہ وہ سب کو لے جائیں۔ وہ چلے گئے تو المانیہ نے انتہائی اختصار سے ساری بات ان دونوں کو بتادی۔

''کیا ہیری ٹھیک ہوجائے گا۔'' ایملی نے پوچھا۔

''نانا کہتے ہیں کہ اسے لندن لے جانا ہوگا، وہاں اس کی دوبارہ سے ٹریٹمنٹ ہوگی، سو فیصد امکان تو نہیں ہے، ممکن ہے۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔

''ایک سادہ سا سوال ہے کہ ہم تم پر کیسے یقین کر لیں کہ تم انہی کے ساتھ نہیں ہو جنہوں نے یہاں حملہ کیا تھا۔'' وانسن نے سکون سے کہا۔

''یہ تم بتادو۔ تم کیسے یقین کر سکتے ہو؟'' سلمان نے کہا تو وہ بے یقینی کے انداز میں بولا۔

''لندن میں میری بات ہوسکتی ہے؟''

''کس سے کرنی ہے بات؟'' المانیہ نے بڑے تحمل سے پوچھا تو اس نے کہا۔

''میرا دوست تھا، جارج پال، کیا اس سے بات ہوسکتی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکا، پھر اس نے بتایا کہ وہ کہاں رہتا تھا۔ المانیہ نے ہامی بھر لی اور سٹلائیٹ فون سے رابطہ کرنے کا کہا۔ اس دوران وانسن ان سے الیکٹرک دیوار کے بارے میں پوچھتا رہا کہ وہ کیسے ختم کر کے یہاں تک پہنچے ہیں۔ انہی باتوں کے دوران اس نے کہا۔

''جیسے ہی تم لوگوں نے وہ دیوار ختم کی ہوگی، اسی وقت انہیں پتہ چل گیا ہوگا جہاں سے بھی یہ آپریٹ کی جاتی تھی۔''

''وہی تو ہمارا خیال ہے کہ تم جلدی کرو، کہیں وہ دوبارہ یہاں نہ پہنچ جائیں۔''

''لیکن میں کیسے.....'' یہ کہتے ہوئے وانسن نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''نہیں، جب تک تمہیں یقین نہیں ہو جاتا۔'' سلمان نے حتمی لہجے میں کہا اور فون کو دیکھنے لگا۔ بلاشبہ اس کے دوست کو تلاش کیا جارہا ہوگا۔

سہ پہر سے شام ہورہی تھی، جب وانسن کی بات جارج پال سے کروادی۔ وہ بہت حد تک مطمئن ہو گیا تھا۔ ایملی پرجوش تھی کہ وہ اس ویران جزیرے سے جارہی ہے۔ وہ بچوں کو تیار کر رہی تھی۔ وانسن اپنی لیب سے چیزیں اٹھا کر ان کے پاس آگیا۔ وہ سارے ان کے ساتھ وہاں تک چل دیئے، جہاں دوسرے لوگ ایک صبر آزما وقت گزار رہے تھے۔ وہ سب انہیں دیکھ رہے تھے، لیکن کوئی بھی ان کے قریب نہیں گیا تھا کہ کہیں انہیں بدگمانی نہ ہوجائے۔ انہوں نے صبر تو کیا لیکن اس کا نتیجہ اچھا نکلا، ایملی اور وانسن اپنے بچوں کے ساتھ ان کے ساتھ ساحل کی طرف چل پڑے تھے۔

جزیرے سے نکلنے کی خبر سب کو ہو گئی تھی۔ حکومت اور اس کی خفیہ فورسز کے لوگ الرٹ ہو گئے تھے۔ درمیان میں جنگل کا ہی راستہ تھا۔ جو عبور کر کے انہوں نے ساحل پر پہنچ جانا تھا۔ سورج مغرب میں ڈوب رہا تھا۔ ایسے میں شمال کی جانب سے دو ہیلی کاپٹر نمودار ہوئے۔ انہوں نے فوراً اپنے لوگوں سے رابطہ کیا، جن سے یہ پتہ چلا کہ وہ ہیلی کاپٹر ان کے نہیں ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کہیں محفوظ مقام کی جانب بڑھتے، ان ہیلی کاپٹرز کی طرف سے ایک دم سے شیلنگ ہونے لگی۔ وہ سب درختوں کی سمت بھاگے۔ یہاں تک کہ وہ درختوں کے نیچے آچھپے۔

''سلمان، تم ان سب کو اپنے ساتھ لے کر نکل جاؤ، ہم انہیں دیکھتے ہیں۔'' فورسز کے ایک اعلیٰ آفیسر نے کہا۔

"میں بھی یہیں ہوں اور ہم سب یہاں سے نکلتے ہیں، فکر نہ کریں ہم ان پر قابو پالیں گے۔" سلمان نے کہا اور زویا کے ساتھ طے کیے ہوئے پلان کے بارے میں اُس سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے کہا اور ایملی کے ساتھ بچوں کو لے کر چل دی۔ واٹسن ان کے ساتھ تھا۔ اسی لمحے ایک جوان نے راکٹ لانچر سے فائر کیا۔ انہیں معلوم تھا کہ یہ بے کار کا فائر ہے۔ لیکن دشمن کو یہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ وہ بھی اسلحہ سے لیس ہیں۔ وہ فائر کافی دور جا کر ایک دھماکے سے پھٹ گیا۔ ایسے میں ہیری اپنے خاندان کے ساتھ جاتے ہوئے نجانے کیا سوچ کر پلٹ آیا۔ وہ آتے ہی اپنے باپ کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

"ہیری، تم جاؤ، اپنے بہن بھائیوں کا اور ماں کا خیال کرو، ہم آرہے ہیں۔" واٹسن نے کہا۔

"مجھے گن دیں، مجھے گن چلانا آتی ہے۔" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کیا تمہیں گن چلانا آتی ہے، تم نے تو کبھی نہیں چلائی۔" واٹسن نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"مجھے آتی ہے۔" اس نے اسی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا جس میں کافی حد تک اصرار تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے، دیتے ہیں۔" واٹسن نے اس سے کہا اور اسے لے کر ساحل کی طرف جانے لگا۔ ہیلی کاپٹر میدان میں اتر رہے تھے۔ وہ تیزی سے ساحل کی جانب بھاگنے لگے۔ اس وقت اندھیرا چھا گیا رہا تھا جب وہ ساحل پر آگئے۔ ان سب کو فوری طور پر کشتیوں میں بٹھا دیا گیا۔ جو انہیں لے کے جہاز کی طرف جانے لگیں۔

اس وقت ساحل پر واٹسن، ہیری، سلمان اور فورسز کے چند سپاہی کشتیوں کے انتظار میں کھڑے تھے۔ باقی سب کو جہاز پر چھوڑ کر واپس آرہی تھی۔ اسی وقت ان سے کچھ فاصلے پر ایک بم نما گولا پھٹا۔ پھر یکے بعد دیگرے کئی پھٹتے چلے گئے۔ وہ سب ساحل کی ریت پر لیٹ گئے۔ وہ اس سمت کا تعین کرنا چاہتے تھے کہ یہ فائر کس طرف سے ہوئے ہیں۔ وہ کچھ دیر اسی میں الجھے رہے۔ لیکن جونہی کشتیاں کنارے پر آئیں، وہ بھاگ کر اس میں بیٹھ گئے۔ ان کے ساتھ ہیری بھی تھا۔

وہ لمحہ بہ لمحہ جہاز کے نزدیک ہوتے چلے گئے۔ جس وقت وہ جہاز کے قریب پہنچے، اس وقت تک وہ ہیلی کاپٹر دوبارہ فضا میں اُڑ چکے تھے۔ چونکہ فورسز کو ان ہیلی کاپٹرز کے بارے میں اطلاع ہو چکی تھی، اس لیے کراچی سے فائٹر طیارے اُڑ پڑے تھے۔ ان کی آواز فضا میں گونج اٹھی تھی۔ انہوں نے سکون کا سانس لیا کہ اب محفوظ ہیں۔ مگر یہ ان کی خام خیالی تھی۔

فہیم اور اروند کو جب اس الیکٹرک دیوار کے بارے میں معلوم ہوا تھا، اسی وقت وہ اس تلاش میں لگ گئے تھے کہ یہ کہاں سے آپریٹ ہو رہی ہے۔ وہ دیوار کراچی سے ہی آپریٹ ہو رہی تھی۔ اس کا محل وقوع کلفٹن ہی کے پاس تھا۔ یہ ہیلی کاپٹر بظاہر ایک نجی کمپنی کے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ جس طرح بھی اسے آپریٹ کرتے رہے، لیکن اس وقت وہ انتہائی جدید انداز میں سب کر رہے تھے۔ یہاں نہ صرف وہ کاروبار کر رہے تھے، بلکہ یہاں سے انفارمیشن بھی لیتے تھے۔ انفارمیشن اکٹھی کرنے کا جو طریقہ تھا، وہ اسی میں پھنس گئے۔ اروند اور فہیم نے ان کے کمپیوٹرز تک رسائی لے لی۔ یہیں سے وہ خوف ناک انکشاف ہوا۔ جسے دیکھتے ہی اروند چیخ اٹھا۔

"سب کو جہاز سے اتار لو فوراً۔"

میں اس کے پاس ہی بیٹھا تھا، لیکن جس طرح وہ چیخا تھا اور جس طرح اس کے لہجے میں خوف بولا تھا، اس پر میں نے پوچھا۔

"بات کیا ہے۔"

"فوراً رابطہ کرو سلمان سے۔" اس نے کہا۔

"میں رابطے میں ہوں اروند، بولو کیا بات ہے۔" سلامن کی آواز ابھری۔ جبکہ مینا سے ویڈیو میں دیکھ رہا تھا کہ وہ جہاز میں سوار ہیں۔

"جس وقت تم لوگوں کو ہیلی کاپٹر میں الجھایا ہوا تھا، اسی وقت جہاز کے نیچے طاقتور بم لگا دیئے گئے ہیں۔ جس وقت جہاز چلا، اس کے ساتھ ہی وہ پھٹ جائیں گے، یا کچھ دیر بعد واپس ساحل پر آ جائیں۔" اروند نے تفصیل بتائی۔ یہ ساری بات وہیں پر موجود لوگوں نے سن لی تھی۔ وہ گھبرا گئے۔ تبھی سلمان نے کہا "جلدی نہیں کرنی اور نہ ہی کسی کو بتانا ہے گھبراہٹ میں غلطیاں ہو سکتی ہیں۔ اس لیے......"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو، ہم کشتیوں میں اترتے ہیں۔" واٹسن نے کہا اور پلٹنے لگا۔

اس سے پہلے کہ وہ جہاز کے کمرے میں موجود اپنے خاندان کے لوگوں کو واپس ساحل کی طرف لے جانے کے لیے بلاتا، ہیری پاس کھڑا تھا، اس نے واٹسن سے کہا۔

"کتنے بم ہیں، یہ پتہ ہے؟" اچانک ہیری نے پوچھا تو سلمان نے اروند سے پوچھا۔

"دو ہیں، ایک اگلی طرف اور ایک پچھلی جانب۔"

"او کے۔" ہیری نے کہا اور سوچنے لگا جیسے کوئی فیصلہ کر رہا ہو۔

"تم نے کیوں پوچھا، بات کیا ہے؟" واٹسن نے گھبراتے ہوئے کہا۔

دین کی بات سکھانا

جس طرح دین کی بات سیکھنا بڑے ثواب کا کام ہے اسی طرح کسی کو دین کی بات سکھانا اس سے بھی زیادہ فضیلت کا عمل ہے۔ بشرطیکہ اس کا مقصد اپنا علم جتانا اور بڑائی ظاہر کرنا نہ ہو بلکہ دوسرے کو فائدہ پہنچانا مقصود ہو لہٰذا جب کسی کو دین کی کوئی بات بتانے کا موقع ہو تو اس کو غنیمت سمجھ کر یہ فضیلت حاصل کر لینی چاہیے۔ خاص طور پر اپنے گھر والوں اور بیوی بچوں کو دین کی باتیں سکھاتے رہنا چاہیے کہ یہ انسان کے حق میں بہت بڑا صدقہ جاریہ ہے اور یہ کہ اگر تمہاری تعلیم و تربیت سے کسی ایک شخص کو بھی ہدایت ہو جائے تو یہ تمہارے لیے دنیا کی بڑی سے بڑی دولت سے بہتر ہے۔

نگاہ نفرت

ایک مولوی سب کو نیکی کی راہ کی طرف راغب کرتا تھا اور بُرے کاموں سے منع کرتا تھا اور لوگوں کو ٹیلی ویژن دیکھنے سے بھی منع کرتا تھا کہ یہ گناہ ہے۔

ایک مرتبہ مولوی خود ٹیلی ویژن دیکھ رہا تھا ایک شخص نے کہا "مولوی صاحب آپ تو سب کو ٹیلی ویژن دیکھنے سے منع کرتے ہو اور خود دیکھ رہے ہو۔" مولوی نے کہا "میں تو اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھ رہا ہوں۔"

مرسلہ: جاوید علی......اسلام آباد

"پاپا! سوری، سب میری وجہ سے ہو رہا ہے، میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں، اب میں ہی اسے ٹھیک کروں گا۔ میں بم نکالتا ہوں، اور میں نکالوں گا، مجھے تین منٹ دیں۔ ماما کو سنبھال لینا، گڈ بائے۔" اس نے کہا اور ایک دم سے سمندر میں چھلانگ مار دی۔ وہ کسی وہیل مچھلی کی مانند ہلکا سا ابھرا اور پھر دکھائی نہیں دیا۔

وہ سب عرشے پر جمع ہو گئے تھے۔ ان سب کی نگاہیں وہاں تھیں جہاں پر ہیری کودا تھا۔ ایملی کی آنکھوں میں آنسو تھے، وہ رو رہی تھی۔ باقی بچے سہمے ہوئے تھے۔ تین منٹ کا وقت گذر گیا تھا کہ اچانک کافی دور ہیری نے سر اٹھایا، سرچ لائٹ اس پر پڑ رہی تھی۔ اس نے ہاتھ ہلائے، ان میں جیسے کچھ تھا۔ وہ ڈبکی لگا گیا۔

"اوہ۔! کہیں....." سلمان نے سرسراتے ہوئے کہا۔

"ممکن ہے۔" واٹسن بڑبڑایا

اگلے دو منٹ میں جہاز سے کافی دور یکے بعد دیگرے دو زوردار دھماکے ہوئے۔ پانی میں زوردار ہلچل ہوئی، جس سے ایک بار تو جہاز ڈول گیا۔ اس کا ارتعاش ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ جہاز کا کپتان عرشے پر آ گیا۔

"سب سن لو، جہاز کلیئر ہے، میں نے اپنے آلات سے دیکھ لیا ہے، وہ دو بم ہی تھے۔"

"او کے۔" واٹسن نے افسردگی سے کہا۔

"اب ہم نکل رہے ہیں۔" کپتان نے کہا اور پلٹ گیا۔ ایملی وہیں عرشے پر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ واٹسن اس کے پاس چلا گیا۔ جہاز چل پڑا تھا۔ جبکہ رات اتر رہی تھی۔ انسپکٹر اپنے حکام کو اطلاع دے رہا تھا۔

☆......☆......☆

جسپال، سندیپ اور نوتن، گلاب سنگھ کالونی میں پہنچ کر ایک گھر میں سکون سے بیٹھے ہوئے تھے۔ رات ڈھل گئی تھی۔ ٹی وی کی رپورٹ میں ہرنیت سنگھ پر قاتلانہ حملہ اور اس کے قتل کی رپورٹ نجانے کتنی مرتبہ دکھائی جا چکی تھی۔ جبکہ پاٹیل کی موت کو چھپا لیا گیا تھا۔ اس کی کیا وجہ تھی۔ اس بارے میں یہی قیاس کیا جا سکتا تھا کہ وہ چونکہ خفیہ سے تھا، اس لیے اس کا قتل منظر عام پر نہیں لایا گیا۔ وہ بھی بکھر گئے تھے، کسی کو کسی کے بارے میں معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہیں۔ نوتن کور نے جان بوجھ کر چھنن سنگھ سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ وہ منتظر تھی کہ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تب وہ خود رابطہ کر لیں گے۔

جسپال سنگھ ٹی وی کے سامنے بیٹھا اُکتا گیا تھا۔ وہ اٹھا اور باہر کی جانب چل دیا۔ باہر چھوٹا سا لان تھا۔ وہ اس کی سیڑھیوں پر آن بیٹھا، ٹھنڈی اور ہلکی ہلکی چلنے والی ہوا نے اسے خاصا سکون دیا تھا۔ اسے یہ اچھی طرح احساس تھا کہ ہرنیت سنگھ کا قتل کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ یہ ایک طرح سے را کو چیلنج تھا کہ وہ مقامی سربراہ کو قتل کر کے انہیں یہ پیغام دینا چاہتے تھے کہ ان کے خلاف کوئی متحرک ہے۔ اگرچہ ان کا یہ کوئی بہت بڑا نقصان نہیں تھا۔ ایک مہرہ پٹ جانے سے وہاں نیا مہرہ رکھ دیا جاتا۔ لیکن ان کے لیے یہ بڑی چنوتی تھی کہ کوئی ان کی طاقت کو نہیں مان رہا۔ ان سے خوف زدہ نہیں ہے۔ یہی چنوتی، انہیں بڑے پیمانے پر تلاش کرنے کا سبب تھی۔ اب ان کے پاس دو ہی راستے تھے۔ ایک تو یہ وہ یہاں سے کہیں دور نکل جائیں اور ان کے ہاتھ نہ آئیں۔ دوسرا، ان پر اس قدر بھرپور وار کرتے چلے جائیں کہ را کو ان کی طاقت تسلیم کرنا پڑے۔ پہلا

راستہ جتنا آسان تھا۔ لیکن دوسرا راستہ اتنا ہی مشکل تھا۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ اندر سے نوتن کور باہر آ گئی، اسے یوں بیٹھا دیکھ کر بالکل اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور دھیرے سے بولی۔

"جسپال کیا سوچ رہے ہو؟"

اس پر جسپال نے اس کی طرف دیکھا اور ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی سوچوں کے بارے میں بتاتے ہوئے یوں بولا جیسے اسے بڑی حسرت ہو۔

"میں مانتا ہوں کہ ہماری جدوجہد ختم ہونے والی نہیں ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اب تک ہم کوئی ایسا کام نہیں کر پائے، جس سے ہماری قوم کو ایسا فائدہ ملے، جو کم از کم اتنی اہمیت رکھتا ہو، جس سے وہ کوئی اپنی بات منوا سکیں، کوئی تو ٹرن پوائنٹ ہو، قوم جاگ اٹھے۔"

یہ سن کر نوتن کتنے ہی لمحے خاموش رہی، پھر جب بولی تو اس کے لہجے میں دکھ اترا ہوا تھا۔

"جسپال، جب کوئی بھی قوم زوال کا شکار ہو، تو اس کی وجہ صرف اور صرف یہی ہوتی ہے کہ اس میں ایسی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں جن سے ان کا ضمیر مردہ ہو جاتا ہے۔ وہ قوم کئی حصوں میں بٹی ہوئی ہوتی ہے۔ ان میں صرف اور صرف اتحاد کی کمی ہوتی ہے۔ یہ مختلف حصے اپنی سوچ اور فکر کے باعث ہی الگ الگ ہوتے ہیں۔ جو صاحب فکر ہوتے ہیں، جن کے ضمیر زندہ ہوتے ہیں، وہ اپنی جان کی نہیں، قوم کے اعلیٰ مقصد پر نگاہ رکھتے۔ جو مردہ ضمیر ہوتے ہیں، وہ اپنی قوم سے غداری کرنا کوئی عیب خیال نہیں کرتے۔ ان مردہ ضمیروں میں ایک ٹولہ ایسا بھی ہوتا ہے، جنہیں صرف اپنے مفاد سے غرض ہوتی ہے۔ میں سکھوں میں ہی ایک ایسے ٹولے کو بھی جانتی ہوں، جو اپنی ہی قوم کی ہڈیاں بھنبھوڑ رہے ہیں۔"

"کون ہیں وہ لوگ؟" جسپال نے پوچھا۔

"شاید پہلے بھی یہ بات ہو چکی ہے کہ عالمی سطح پر ایک مفاد پرست بھی ہیں، جن کا نہ کوئی مذہب ہے اور نہ کوئی قوم، وہ صرف طاقت چاہتے ہیں۔ وہ اسلحہ فروخت کرنے کے لیے قوموں کو لڑواتے ہیں۔ منشیات بیچنے کے لیے انسانیت کا خیال تک نہیں آتا انہیں۔ اب یہی دیکھو، سکھ قوم کو ختم کرنے کے لیے ایک بڑا وار بڑی خاموشی سے کیا جا رہا ہے کہ ان میں منشیات اور خاص طور پر شراب کی رسائی اتنی آسان بنا دی گئی ہے کہ کوئی بچہ بھی اسے استعمال کر سکتا ہے، اس پر گیتوں میں، فلموں میں ایسا ماحول انہیں دکھایا جاتا ہے کہ وہ اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ مطلب جس طرح بھی ہو سکے، اپنا فائدہ سامنے رکھتے ہیں، انسان یا انسانیت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔" نوتن کور نے دکھے ہوئے دل سے کہا۔

"نوتن، جو باضمیر ہیں، وہ تو لڑ رہے ہیں، انہیں تو یکجا ہونا چاہئے نا؟" جسپال نے کہا۔

"رتن دیپ سنگھ کا یہی خیال تھا، اور ان سب کو اکٹھا بھی اسی لیے کیا گیا کہ ان سے ایسے کام لیے جائیں کہ سکھ قوم ان کی طرف ایسے دیکھے جیسے یہی ان کے نجات دہندہ ہیں۔ لیکن ہوا کیا۔ الیکشن، بانیتا کور کا زخمی ہونا اور خاص طور پر اب اس وقت سیاست میں عہدے کی بندر بانٹ نے سب کو الجھا کر رکھ دیا ہے۔ میری ان سے بات ہوئی تھی، وہ بہت حد تک اس میں کامیاب بھی ہو گئے ہیں کہ جو ان کی دسترس میں لوگ ہیں، وہ اکٹھے ہو جائیں اور تم دیکھنا کہ اب وہ وقت دور نہیں ہے۔" نوتن کور نے پرجوش انداز میں کہا تو جسپال بولا۔

"ایسا ہونا چاہئے اور بہت جلد ہونا چاہئے۔"

"ہاں، رتن دیپ جی صرف یہی چاہتے تھے کہ

جو گروہ زیادہ دلیری اور حوصلے سے کوئی بڑا کام کرے، باقی سارے انہیں کے ساتھ کام کریں۔ دیر صرف اسی بات کی تھی، جو میرا خیال ہے کہ اب دیر نہیں ہوگی۔" وہ کافی حوصلہ افزا لہجے میں بولی تو جسپال نے پوچھا۔

"تم ایسا کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"جسپال، یہ جو ہرنیت سنگھ کو ہم نے مارا ہے، یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے، یہ تو اس کی قسمت ماری گئی ہوئی تھی کہ خود مرنے چلا آیا ورنہ ہمیں نجانے کتنے دن لگ جاتے اسے مارنے کے لیے، بہت سارے لوگوں نے کوشش کی ہے، اسے قتل کرنے کی۔" وہ یوں بولی جیسے انجانے میں ان سے بہت بڑا کام ہو گیا ہے۔ تبھی ان کی پشت سے سندیپ کور کی آواز ابھری

"نوتن ٹھیک کہہ رہی ہے جسپال۔"

"میں نے مان لیا، اب اس کا کوئی ردعمل بھی تو سامنے آئے۔" جسپال نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ اس کے دوسری جانب بیٹھتے ہوئے بولی۔

"اوئے یار، ہمیں جلدی کس بات کی ہے، سکون سے پڑے ہیں ادھر، چند دن مزید پڑے رہیں گے۔ پھر کوئی نہ کوئی کام نکل آئے گا۔" یہ کہہ کر اس نے نوتن کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"کپڑوں کا کوئی بندوبست ہوا، دیکھو، ہم سب کے کپڑے خراب ہو رہے ہیں۔"

"کہا ہے میں نے، ہو جائے گا کچھ نہ کچھ۔" نوتن نے کہا تو ان میں ایک دم سے خاموشی چھا گئی۔ وہ کتنی ہی دیر یونہی بیٹھے رہے، جیسے اپنے اپنے طور پر سوچ رہے ہوں۔ ان میں کوئی بات نہ ہوئی۔ ان کی خاموشی کو نوتن کور کے سیل فون کی گھنٹی نے توڑا، "ارے، یہ تو چنن سنگھ کا فون ہے، رب خیر کرے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اسپیکر آن کر دیا۔

"گاڑی ہے تم لوگوں کے پاس؟"

"ہاں ہے؟" نوتن نے جواب دیا۔

"اسے باہر نہ نکالنا، اسے وہیں کھڑے رہنے دینا، وہاں سے نکلو اور کسی طرح پرتاپ پیلس تک پہنچو، وہاں سے ایک فورڈ ہیل جیپ ملے گی، وہ لے آئے گی۔" اس نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ابھی نکلنا ہے یا......" نوتن نے پوچھا۔

"ابھی۔" اس نے تیزی سے کہا اور فون بند کر دیا۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اٹھ کر گیٹ کی طرف چل دیئے۔

دو چار گلیاں پار کر کے انہیں ٹیکسی مل گئی۔ نوتن پورے امرتسر کو اچھی طرح جانتی تھی۔ اس نے ٹیکسی والے کو بتایا اور اس میں بیٹھ گئے۔ آدھے گھنٹے بعد وہ پرتاپ پیلس کے پاس تھے۔ یہ ایک شادی ہال تھا، جو کافی بڑا تھا، اس لیے مشہور تھا۔ وہ اس سے ذرا پہلے ہی اتر گئے پھر پیدل ہی اس طرف چل پڑے۔ انہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ جیسے ہی وہ شادی ہال کے سامنے آئے ایک فورڈ ہیل ان کے پاس آ کر رک گئی۔ اس میں چنن سنگھ خود بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بڑے آرام سے اس میں بیٹھ گئے۔

"شہر میں ہرنیت سنگھ کے قاتلوں کی وجہ سے خاصا ہنگامہ ہے، وہ بہت شور مچا رہے ہیں۔" اس نے سامنے سڑک پر دیکھتے ہوئے بتایا

"اب کیا کرنا ہے؟" سندیپ نے پوچھا۔

"کچھ نہیں، مزے کرو، پھر دیکھتے ہیں۔" اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"چلو، دیکھتے ہیں کہ مزے کیسے ہوتے ہیں۔" سندیپ بھی اس کی بات سمجھتے ہوئے ہنستے ہوئے بولی۔

"اب صورت حال کیا ہے؟" نوتن نے پوچھا۔
اس پر چنن سنگھ اسے حالات کے بارے میں بتانے لگا کہ کیا ہو گیا ہے اور اب کیا کیا ممکن ہو سکتا ہے۔ انہیں باتوں میں وہ کوٹلی بہرام پور جا پہنچے۔ وہ شہر سے باہر نو تعمیر پوش علاقہ تھا۔ وہ ایک بنگلے میں آ گئے۔ جہاں انتہائی خاموشی تھی۔ وہ پورچ سے ہوتے ہوئے لاؤنج میں جا پہنچے۔ وہاں سامنے صوفے پر بیٹھی بانیتا کور کو دیکھ کر انہیں خوشگوار حیرت ہوئی۔ وہ انہیں دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔
"ویلکم ویلکم.....،" اس نے انہیں دیکھ کر دھیمے سے کہا تو اسے یوں دیکھ کر ان میں خوشی کے ساتھ جوش بھی بڑھ گیا۔ وہ اس کے ارد گرد جا بیٹھے۔ تبھی نوتن نے پوچھا۔
"تم یہاں، ابھی تو......"
"اسپتال میں سیکورٹی تو نہیں ہے نا اور پھر کئی نگاہیں مجھ پر لگی ہوئی تھیں۔ اب تو زخم ہی بھرنا ہے نا، یہاں پڑی رہوں گی۔" اس نے وجہ بتائی
"اچھا ہے۔" جسپال نے کہا۔
"تم لوگ اچھی طرح فریش ہو جاؤ، پھر ڈنر کرتے ہیں، رات اپنی ہے، باتیں بھی چلتی رہیں گی۔" بانیتا کور نے کہا تو وہ اٹھ گئے۔ انہیں الگ الگ کمرے دے دیئے گئے تھے، جہاں ضرورت کا ہر سامان پڑا ہوا تھا۔
ڈنر کے بعد وہ سب بانیتا کور ہی کے کمرے میں اس کے بیڈ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ چائے کا دور چل چکا تھا۔ چنن سنگھ کب کا چلا گیا تھا۔ وہاں ان دیکھی سیکورٹی موجود تھی۔ وہ یہاں سکون سے رہ سکتے تھے۔ ان باتوں کے ساتھ ہی اچانک بانیتا کور نے کہا۔
"نوتن۔! جمال کو فون لگاؤ اور میری بات کراؤ۔"
"ٹھیک ہے۔" اس نے کہا اور سیل فون نکال کر نمبر ملانے لگی۔ کچھ ہی دیر میں رابطہ ہو گیا۔ حال احوال کے بعد اس نے انتہائی گہری سنجیدگی سے کہا
"جمال۔! اب میں چاہتی ہوں کہ ہم اپنے ہونے کا احساس دلائیں، ہرنیت سنگھ جیسا مہرہ مار لینا کوئی بڑی بات نہیں، اس کے لیے بڑا سرمایہ بھی چاہئے۔"
"لیکن، اس سے پہلے تمہارا ٹھیک ہو جانا بہت ضروری ہے۔" جمال نے کہا۔
"میں تجھو ٹھیک ہوں، کسی بھی بڑے کام کے لیے وقت تو چاہیے ہوتا ہے نا۔ تب تک میں ٹھیک ہو جاؤں گی، تم اس کی فکر نہ کرو۔" اس نے کہا۔
"اچھا تم ایسے کرو، مجھے آج کی رات دو، میں کل تمہیں کسی وقت بتاؤں گا کہ کیا کرنا ہے۔" جمال کی آواز ابھری تو اس نے کہا۔
"میں تمہارے فون کا انتظار کروں گی۔"
"مجھے یہ بتاؤ، کیا تم ہوائی سفر کر پاؤ گی، نکل سکتی ہو بھارت سے، اور تمہارے ساتھ یہ لوگ بھی۔" جمال نے اچانک پوچھا۔
"کیوں، تمہارا کیا پلان ہے، اگر بہت ضروری ہے تو میں سفر کر لوں گی۔" بانیتا کور نے کہا۔
"نہیں ابھی تم ٹھیک ہو جاؤ، باقی میں سب دیکھ لیتا ہوں، تم کل تک میرا انتظار کرو۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ وہ کچھ دیر یونہی باتیں کرتے رہے پھر سو جانے کے لیے اٹھ گئے۔ رات کافی ہو گئی تھی۔

☆......☆......☆

برطانیہ سے حکومتی اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے نمائندگان کراچی پہنچ چکے تھے۔ انسپکٹر اور الماسیہ ہی ان سے ملے، باقی سامنے ہی نہیں آئے۔ یوں سارا کریڈٹ اسی انسپکٹر کو چلا گیا۔ ہمارا کام ختم ہو چکا تھا۔ علی نواز وہیں رہ گیا، جبکہ زویا اور سلمان رات

کے پچھلے پہر واپس لاہور آ گئے تھے۔
میں ساری رات جاگتا رہا تھا۔ بانیتا کور نے جو مجھے فون کیا تھا، یہ میرے لیے تائید غیبی ہی تھی۔ میرے ذہن میں کہیں تھا کہ میں بھارت میں اپنے انہی دوستوں سے کہوں گا۔ مجھے کہنا نہیں پڑا تھا، اس نے خود ہی کہہ دیا تھا۔ دراصل عالمی سطح پر جو تنظیمیں کام کر رہی تھیں، ان کی دلچسپی بھارت اور پاکستان کے لیے ایک ہی نکتہ نگاہ سے دیکھی جاتی تھی اور پھر اسی تناظر کو سامنے رکھ کر کوئی پلان بناتے تھے۔ انہی دونوں ملکوں کو روایتی حریف سمجھا جاتا رہا ہے۔ درہ خیبر سے لے کر کنیا کماری تک عالمی قوتوں کی آمجگاہ یہ ملک اسی لیے ترقی نہیں کر پا رہے کہ یہاں پر ایسے فروعی اختلافات کو ہوا دی جاتی ہے، جس کا کوئی مقصد نہیں ہوتا، نہ اس کا انسانیت کو فائدہ ہوتا ہے اور نہ انسان کا۔ ایک ایسا جنون پیدا کیا ہوا ہے، جس میں سوائے نفرت کے کچھ اور نہیں ہے۔ اس کی ایک واضح مثال دُنیا کے سامنے ہے کہ کراچی میں بھی ممبئی جیسا ماحول بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اصل میں وہ چند ایسے لوگ جو طاقت کے خواہاں ہوتے ہیں اور اپنی گرفت مضبوط رکھنا چاہتے ہیں، وہی بساط بچھاتے ہیں، وہی مہرے رکھتے ہیں، اور پھر خود ہی مہروں کو ہٹا دیتے ہیں۔
اس کے بارے میں کئی دن پہلے مجھے اروند نے اشارہ دیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ کچھ سیاسی دلال ہوتے ہیں، جو اپنی طاقت کا استعمال کر کے سیٹیں جتواتے ہیں اور پھر انہی سے حکومتوں کا کھیل کھیلتے ہیں۔ اس کا تجربہ انو جیت والی سیٹ کے بارے میں ہو چکا تھا۔ اس نے اسی دلال کو بنیاد بنا لیا۔ انہی دنوں میں نے اروند کو اس پر تحقیق جاری رکھنے کا کہا۔ وہ تو اس پر اتنا وقت نہ دے سکا لیکن مہوش اس بارے میں لگی رہی۔ اس دوران دو تین لوگ سامنے آئے۔ وہ ان پر کام کرتی رہی۔ یہاں تک کہ ایک دلچسپ انکشاف ہوا۔
میں ساری رات ایک ایسے شخص کے بارے میں معلومات اکٹھی کرتا رہا، جو شہری تو بھارت کا تھا، لیکن اس وقت اس کا ٹھکانہ برطانیہ کے شہر لندن کے کسی علاقے میں تھا۔ وہ اپنے لوگوں کو وہیں سے آپریٹ کر رہا تھا۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ وہیں ہوتا، کسی دوسرے ملک میں بھی ہو سکتا تھا۔ وہ کون تھا، اس کے بارے میں کوئی پتہ نہیں تھا، بس اس کے وجود کا احساس تھا کہ کوئی ہے۔ اس کا نیٹ ورک پاکستان تک پھیلا ہوا تھا۔ دلچسپ انکشاف یہ تھا کہ وہ کسی گارڈ فادر کی طرح تھا۔ اس کی اتنی طاقت تھی کہ کہیں بھی کسی بھی سیاسی حلقے میں مداخلت کر سکتا تھا۔ کسی کو رکن رکھنا یا اس کی رکنیت ختم کروانا ہی اس کا کھیل تھا۔ اس وقت تک تو مجھے اس کے بارے میں صرف اتنا ہی معلوم ہوا تھا۔ وہ یہ سب کیسے کرتا ہے، اس بارے میں پوری معلومات نہیں تھیں، لیکن ایک احساس تھا کہ وہ انہی بندوں سے کام لیتا ہوگا، جو اس کے وفادار ہیں۔
اس رات دو لوگ میرے سامنے آئے۔ ایک لبرل پارٹی کا اشوک مہرہ اور دوسرا ہندو شدت پسند تنظیم کا رکن پنڈت رام داس۔ مجھے یہیں سے دلچسپی ہوئی تھی کہ دو مخالف دھڑوں کے آدمی کس طرح ایک بندے کے لیے کام کر رہے ہیں۔ یہ اتنی حیران کن بات نہیں تھی۔ ایسا ہوتا ہی ہے۔ تاہم یہ دونوں ایسے حریف خیال کیے جاتے تھے، جن کے کارکن آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے اور ان کا آپس میں دشمنی تصور کی جاتی تھی۔
ان میں ایک تیسرا بھی تھا، جس کا نام اشوک سنگھ

تھا۔ وہ پیدا ہندو گھرانے میں ہوا تھا۔ اس کے دوسرے بہن بھائی خالص ہندو تھے، ہندوانہ رہن سہن تھا، ہندو طرز پر ہی اپنی پوجا کرتے تھے، لیکن یہ اشوک سنگھ ان سب سے الگ تھا۔ اس نے سکھوں کی طرح کیس رکھے ہوئے تھے۔ اسی طرح کرپان پہنتا تھا، خود کو امرت دھاری سکھ کہتا تھا اور اپنی عبادت کے لیے مندر کی بجائے گردوارے جاتا تھا۔ وہ پنڈت گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں تھی۔ پنڈت گھرانوں میں ایک آدھ لڑکا اسی طرح سکھ بنا کر رکھا جاتا رہا ہے۔ اس میں ان کی سب سے بڑی سیاسی ضرورت ہے۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ سکھ مذہب ان سے الگ نہیں، ہندو ہی کا ایک حصہ ہے۔ دوسرا سکھ کمیونٹی کو اپنے قریب لانا مقصد تھا۔ وہ لمبے قد کا گھیم شیم، بڑے ڈیل ڈول والا بھی ہندو، سکھ کے روپ میں بڑا گیانی سمجھا جاتا تھا۔

ان تینوں میں ایک شے مشترک تھی۔ یہ تینوں پنجاب سے تھے۔ تینوں اگرچہ مختلف شہروں سے تعلق رکھتے تھے، لیکن اس وقت امرتسر میں موجود تھے اور پنجاب کی سیاست پر پوری طرح چھائے ہوئے تھے۔ یعنی اپنے مختلف سماجی رتبے میں وہ جو بھی تھے، لیکن ان تینوں کی تان ایک سیاست پر آ کر ختم ہو جاتی تھی۔

میری ان تینوں سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی لیکن یہ لوگ اس وجہ سے میرے سامنے آئے تھے کہ انہوں نے اس انسٹیٹیوٹ کو پوری طرح تحفظ دیا ہوا تھا۔ جس میں سندیپ کور تھی۔ وہ وہاں سے کس طرح کے لوگ پیدا کر رہے تھے اور اس کے ساتھ اپنے دشمنوں کو ختم کرنے کا کس حد تک سوچ رہے تھے۔ وہ خطرناک ہی نہیں ہلاکت خیز بھی تھا۔ وہ اپنے گھر کی آگ دوسروں کے گھروں میں پھینک رہے تھے۔ یہ لوگ تو میرے سامنے آ گئے، لیکن جیسے ہی ان کی پشت پر میں نے کسی نادیدہ بندے کو محسوس کیا تو ان سے دلچسپی ختم ہو کر رہ گئی۔ میں یہی سوچتا رہا کہ ان کے ذریعے میں اس بندے کو کیسے بے نقاب کر سکتا ہوں؟ وہ کیسا شخص ہے کہ جو خود پردے کے پیچھے ہے اور پوری طرح حکومت کر رہا ہے؟ آخر کیوں اور کیسے ہے اس طرح؟ کیسی طاقت ہے اس کے پاس؟ میں اس تک کیسے پہنچوں؟ یہی اک سوال تھا۔ بہت دیر تک سوچ کر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ انہی تینوں کو چھیڑوں، ظاہر ہے جب اس کے مہروں کو میں ہٹاؤں گا، تب وہ کسی نہ کسی صورت میں سامنے آئے گا۔

لہٰذا، جس وقت سورج مشرق سے نکل آیا تھا، اس وقت تک میں نے بھارتی پنجاب سے چند لوگوں کا ایک گروہ تیار کر لیا تھا، جن کی اپنی ایک طاقت تھی اور اپنی اپنی جگہ وہ کوئی نہ کوئی اہمیت رکھتے تھے۔ سکندر حیات کی طرف سے مجھے بھارت اور اس کے علاوہ دیگر ممالک میں سے لوگوں کی ایک فہرست دے دی گئی تھی، جن سے جب چاہے میں کوئی بھی کام لے سکتا تھا۔ یہ سارا کام فہیم اور اروند نے کیا تھا، انہوں نے ہی مختلف لوگوں کے پروفائل دیکھے تھے کہ کون بندہ کس کام آ سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے ممبئی سے ایک ایسا بندہ وہاں بلوا لیا تھا، جس کے پاس جدید ترین الیکٹرونکس آلات تھے۔ وہ سب امرتسر پہنچ رہے تھے۔

صبح کے نو بجے تھے، جب میں بانیتا کور کو کال کی۔ وہ، جسپال اور نوتن تینوں ہی ناشتے کی میز پر تھے۔ تبھی میں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

''اُد سوہنیو...! پرشادے چھکھ رہے او۔''

''ہاں، بس تیرے انتظار میں تھے۔'' اس نے

سنجیدگی سے کہا۔ میں سمجھ گیا کہ اس کے دماغ میں اس وقت سوائے انتقام لینے کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔

"دیکھ۔! میں نے تمہاری مدد کے لیے......" میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹ کر بولی۔

"مجھے مدد نہیں معلومات چاہئے۔"

"بانیتا کور، تم جذباتی ہو رہی ہو اور ایسے کام میں جذبات نہیں چلتے، ان میں ہوش درکار ہوتا ہے۔ اگر تم میری بات مانو گی تو میں آگے کہوں گا۔" میں نے تھوڑا سخت لہجے میں کہا تو وہ چند لمحے خاموش رہی پھر بولی۔

"اچھا کہو، جو کہو گے مانوں گی۔"

"یہ جو بھی ٹاسک ہوگا، اس کا انچارج، جسپال ہوگا، تم نہیں، کیا تمہیں یہ بات منظور ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ٹھیک ہے، وہی ہوگا، میں بھی ابھی پوری طرح صحت مند نہیں ہوں، فکر نہ کرو۔" وہ میری بات سمجھ گئی تھی اس لیے نارمل لہجے میں بولی۔

"تو پھر میری جسپال سے بات کراؤ۔" میں نے کہا تو اس کے ساتھ ہی آواز ابھری۔

"میں سن رہا ہوں جمال، تم کہو۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ اسپیکر آن کر کے بیٹھے تھے۔ میں اسے اُن لوگوں کے بارے میں بتایا جو امرتسر میں آ چکے تھے۔ کچھ دیر وہ بھی اس سے رابطہ کرنے والے تھے۔ میں نے اسے سمجھا دیا کہ کرنا کیا ہے۔ باقی ساری معلومات وہ فہیم اور اروند سے لے سکتا تھا۔ میں کچھ دیر ان سے باتیں کرتا رہا اور پھر فون بند کر دیا۔

میں چند لمحے سوچتا رہا، پھر میں نے تانی سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ بہت عرصے بعد میں اس سے بات کرنے والا تھا۔ ان چند لمحوں میں وہ گزرا ہوا وقت آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ ایک لمحے کے لیے دل بھر آیا۔ وہ مہ جبیں، مجسمہ حسن، اندر سے کس قدر سخت تھی۔ کوئی پہلی نگاہ میں یہ اندازہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ انتہائی نرم و نازک دکھائی دینے والی وہ تانی، جب وحشت پہ اترتی تھی تو حیران کر دیتی تھی۔ وہ لندن میں اپنا بہت اچھا بزنس چلا رہی تھی۔ اس نے ایک ریسٹوران بنا لیا تھا اور اس کے ساتھ گروسری کی دوکان بنائی ہوئی تھی۔ جہاں لوگ کام کرتے تھے اور وہ گھر میں رہتی تھی۔ مجھے احساس تھا کہ برطانیہ میں اس وقت رات کا آخری پہر چل رہا تھا۔ اس لیے اس سے بات کرنا ذرا موخر کیا اور سلمان سے گپ شپ کرنے کے لیے لاؤنج میں آ گیا۔ جہاں وہ فریش ہو کر آ چکا تھا۔

ہم کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اس دوران مہوش، فہیم اور اروند کے ساتھ رونیت بھی آ گئی۔ جنید ایک طرف خاموش بیٹھا رہا۔ ہمارے درمیان وہی نادیدہ شخص تھا، جو ایک گاڈ فادر کی طرح ان دو ملکوں میں اپنی ہی حکومت بنائے ہوئے تھا۔

"آپ کو اندازہ ہی نہیں کہ وہ کہاں تک رسائی رکھتا ہے، اس کا پتہ تو اس وقت چلتا ہے جب کوئی واقعہ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد بھی کوئی گہری نگاہ رکھنے والا ہی ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ یہ کس سلسلے کی کڑی ہے، ورنہ پتہ ہی نہیں چلتا۔" فہیم نے اپنی رائے دی

"مثلاً، کیسے؟" سلمان نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"یہی تینوں بندے، جب ان کے بارے میں تجزیہ کیا گیا تو ان کے ساتھ جڑے ہوئے واقعات کہیں ایک جگہ جا کر ایک خاص مقصد میں ڈھل جاتے ہیں۔ ایسا ہی میں نے پاکستان میں دیکھا ہے۔ یہاں چند لوگ ہیں، بالکل اسی طرح کام کرتے ہیں۔ یہ اس وقت پتہ چلتا ہے جب

دونوں ممالک کے میڈیا چیخ اٹھتے ہیں اور وہاں پر ایک جنگ برپا ہو جاتی ہے۔" فہیم نے کہا تو اروند نے بڑے سکون سے کہا۔

"میں بتاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا اور پھر بولا۔

"اب دیکھیں، یوں لگتا ہے کہ جیسے دونوں ممالک ایک دوسرے کے خلاف میڈیا پر محاذ آرا ہیں۔ کسی بھی واقعے کو بنیاد بنا کر وہ ایک دوسرے پر تابڑ توڑ حملے کرتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن کبھی کسی نے یہ تنقید کی کہ عوام کی بھوک ختم کرنے کے لیے وہ اقدامات کریں، یہ سوچ ابھرنے ہی نہیں دیتے، پاکستان میں ڈیم بنانے کی بات ہوتی ہے، لامحالہ جس کا فائدہ عوام کو ہے، اس پر سیاست دان ہی چیخنے لگتے ہیں۔ کیا وہ لوگ داویلا کرنے کی بجائے، مل جوڑ کر نہیں بیٹھ سکتے کہ اس کا حل کیا ہے؟ مطلب ہر طرف کنفیوژن پھیلایا ہوا ہے۔"

"دیکھیں، اگر یہ جمہوری ملک ہیں، تو جمہوریت کا مطلب یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ عوام کی حکومت، عوام کے ذریعے، عوام پر، لیکن کیا ان دونوں ملکوں کے سیاست دانوں کا رویہ عوامی خدمت یا اس کی فلاح ہے؟ نہیں بالکل نہیں، یہ رویہ کون بنائے گا؟ یا کون نہیں بننے دے رہا ہے؟ یہ وہ نکتہ ہے، جہاں سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔" فہیم نے زور دیتے ہوئے کہا۔

"اب کرنا کیا ہے؟" میں نے پوچھا تو ایک بحث چھڑ گئی، کچھ دیر بعد یہ طے ہو گیا کہ ابھی پاکستان اور بھارت میں مبینہ گاڈ فادر کے جو مہرے ہیں، انہیں ہٹایا جائے۔ اس کے بعد کیا ہوتا ہے، اس کے مطابق فیصلہ ہو جائے گا۔ یہ طے کر لینے کے بعد میں نے تانی کو فون کیا۔ اس نے فوراً ہی فون پک کر لیا۔

"بہت عرصے بعد میری یاد آئی، اپنی شادی پر بھی نہیں بلایا۔" اس نے خوشگوار لہجے میں شکوہ کیا

"تمہیں پتہ ہی ہے کہ حالات کیسے ہیں۔" میں نے کہا تو وہ بولی۔

"ہاں میں جانتی ہوں۔" اس نے مختصر سا کہا تو میں نے بھی اختصار سے اسے بات بتائی

"ٹھیک ہے، میں اروند اور فہیم سے رابطہ رکھتی ہوں، انہی کے مطابق یہاں پر بھی نگاہ رکھوں گی، میری سمجھ میں آیا تو میں ضرور بتاؤں گی، لیکن مجھے لگتا ہے کہ ایسا کچھ ہوگا نہیں، کیونکہ میں بھی نگاہ رکھتی ہوں، مجھے اس کام کے علاوہ اور کوئی کام نہیں ہے۔"

"او کے دیکھنا، اور نظر رکھنا، میں دوبارہ رابطہ کروں گا۔" میں نے الوداعی بات کی تو وہ بولا تو وہ حسرت بھرے لہجے میں گویا ہوئی۔

"ایک بات مانو گے۔"

"بولو۔" میں نے کہا۔

"ایک بار یہاں چکر لگا جاؤ، اماں اور سوہنی کے ساتھ۔" اس نے بڑے مان سے کہا۔

"میں جلد از جلد آنے کی کوشش کروں گا۔" میں نے اس سے وعدہ کر لیا۔ وہ کچھ دیر میرے ساتھ باتیں کرتی رہی، پھر اس نے فون بند کر دیا۔ میں کافی دیر تک اس کے خیالوں میں کھویا رہا۔

☆......☆......☆

جسپال اور نوتن کے سامنے امرتسر کا نقشہ پھیلا ہوا تھا۔ بانیتا کور کے ہاتھ میں مارکر تھا، جہاں پر وہ نشان لگا چکی تھی کہ کون کہاں پر ہے۔ وہ کل دس لوگ تھے جو پنجاب ہی کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے تھے۔

"یہ سب یہاں پر تو آ گئے ہیں۔ لیکن یہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو پائیں گے، جب تک ان تینوں کے بارے میں پوری طرح معلومات نہیں مل جاتیں۔" بانیتا کور نے کہا تو جسپال ہنس دیا پھر بولا۔

"یار تجھے اتنا عرصہ ہو گیا جسپال کے ساتھ، تجھے اس کے کام کرنے کا انداز سمجھ میں نہیں آیا۔"

"تم سمجھا دو۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

"کتنے دن ریکی کرو گی، اتنے دنوں میں ریکی کرنے والے نگاہوں میں آجاتے ہیں۔ یہ اچانک حملہ ہوتا ہے، جیسے آسمان سے کوئی شاہین، اپنے شکار پر جھپٹتا ہے اور پھر اسی طرح پرواز کر جاتا ہے۔" اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"مگر اس پرواز میں ان تینوں کے بارے میں معلومات کہاں ہیں، کہاں پر جا کر جھپٹیں گے۔"

"وہ سب پتہ ہے، جب ان کے بارے میں معلومات لی جاتی رہی تھی، اس وقت ان کا پتہ بھی چل گیا تھا کہ کون کیا کرتا ہے، فکر نہ کرو، بس پلان کرو، کرنا کیا ہے؟"

"اچھا تو بات یہ ہے۔" اس نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا اور نقشے پر دیکھنے لگی۔ تبھی نوتن کور بولی۔

"اگر چاہو تو میں بلدیو سنگھ کو بلا لوں۔"

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے سوچ لیا ہے کہ کیا کرنا۔ کیا وہ بندہ آگیا، جس نے ممبئی سے آنا تھا۔

"ہاں، آگیا ہے۔" نوتن نے بتایا تو وہ بولی۔

"ٹھیک ہے، ان سب کو ایک بار یہاں بلا لو، ایک پلان کرتے ہیں، پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ یوں بولی جیسے ٹرانس میں ہو۔

"نہیں، مجھے تم سے اختلاف ہے بانیتا، میں ایسا نہیں چاہوں گا۔" ایک دم سے جسپال نے اس کی مخالفت کر دی تو بانیتا کور نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں؟"

"وہ میں کروں گا، جو مجھے کرنا ہے، تم آرام کرو۔"

جسپال نے کہا اور اٹھ گیا۔ بانیتا اس کی طرف دیکھتی رہی، منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا۔ وہ باہر نکل گیا۔

ممبئی سے آنے والا شخص شکتی نگر علاقے کے ایک گھر میں موجود تھا۔ جسپال سنگھ ایک ایسے نوجوان کے ساتھ اس کے پاس گیا، جو الیکٹرانکس کی چیزوں کا ماہر تھا۔ اس شخص نے وہ تمام سامان، جس میں خصوصی سیل فون سے لے کر بڑی اہم ڈیوائس تھیں۔ جن سے وہ ایسے رابطے میں منسلک ہو جاتے، جو کہیں ٹریس بھی نہیں ہو سکتے تھے اور ان کے درمیان ہر وقت رابطہ رہتا۔

سہ پہر تک وہ تمام سیل فون ان لوگوں تک پہنچا دیئے گئے۔ اس وقت جسپال واپس آچکا تھا۔ وہیں پر بیٹھ کر اس نے سب سے رابطہ کیا۔ یہاں تک کہ معلومات کی بنیاد پر وہ پلان کرتے رہے، ان کا ارادہ تھا کہ یہ ایکشن ایک ہی وقت میں ہو۔ تاکہ وہ جو کوئی بھی ہے اسے پتہ چلے کہ یہ خاص انہی کو نشانہ بنایا گیا ہے۔

وہ تینوں امرتسر کے مختلف علاقوں میں رہتے تھے۔ ان میں اشوک مہرہ شہر کے شمال مغرب کے علاقے رنجیت ایونیو میں رہتا تھا۔ پنڈت رام داس مشرقی علاقے اندرا کالونی میں اور اشوک سنگھ جنوبی علاقے گرونام نگر میں رہائش پذیر تھا۔ ان کی اپنی اپنی مصروفیات تھیں۔ لیکن ایک بات طے تھی کہ یہ تینوں سیاست سے متعلق تھے۔ ان کی مصروفیت کے بارے میں پوری جانکاری مل گئی تھی کہ وہ آج شام سے لے کر رات گئے تک کیا کرنے والے تھے۔

جس طرح انہوں نے یہ سوچا تھا کہ ایک ہی وقت میں یہ ایکشن ہو، وہ رات کا دوسرا پہر بنتا تھا۔ اس وقت اشوک مہرہ اور اشوک سنگھ نے حکومت بنانے کی ایک سیاسی میٹنگ سے واپس آنا تھا اور اسی وقت

کے پنڈت رام داس کی ایک مذہبی میٹنگ تھی، وہاں سے اس نے واپس آنا تھا۔ فیصلہ یہ کیا گیا کہ انہیں میٹنگ اور گھر کے درمیان راستے میں کہیں پکڑا جائے، وہ کون سی جگہ ہو سکتی ہے، یہ انہوں نے طے کرنا تھا۔ جس وقت شام ڈھل رہی تھی، تب تک یہ فیصلہ بھی کر لیا گیا۔ ان تینوں نے کورٹ روڈ اور کوئنز روڈ کے کراس پر سے ہو کر جانا تھا۔ وہی جگہ انہوں نے منتخب کر لی تھی۔ ہر بندے کے ذمے ایک کی نگرانی تھی۔ وہ اس پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔

رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ جسپال سنگھ کے ساتھ نوتن کور ایک کار میں نکل پڑے۔ ان کے پاس جدید ترین اسلحہ تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے کار میں بم لگا دیا تھا، جسے ریموٹ سے ہی آپریٹ کیا جا سکتا تھا۔ جسپال کا نوتن اور بانیتا سمیت سب سے رابطہ تھا۔ وہ سب ہی ایک دوسرے کی گفتگو سن سکتے تھے۔ وہ بھی شہر میں موجود اپنے ٹھکانوں سے نکل پڑے تھے۔ وہ تیزی سے اسی کراس کی جانب جا رہے تھے۔ انہیں ہر پل کی خبر مل رہی تھی کہ کون کہاں پر ہے۔ اشوک مہرہ اور اشوک سنگھ دونوں میٹنگ میں تھے۔ ان کی گاڑیاں اور گارڈز باہر موجود تھے۔ جبکہ پنڈت رام داس جس مذہبی میٹنگ میں تھا، وہاں وہ تقریر کر رہا تھا۔ جسپال اور نوتن اس کراس کے نزدیک ایک ہوٹل کے کمپاؤنڈ میں چلے گئے۔ ان کا انداز ایسا ہی تھا، جیسے وہ کسی کا انتظار کر رہے ہوں۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا چلا گیا۔

سب سے پہلے اشوک سنگھ کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ میٹنگ سے باہر آ گیا ہے۔ وہ الرٹ ہو گئے اور اپنی کار میں بیٹھ کر وہاں سے چل پڑے۔ انہیں تھوڑا گھوم کر واپس اس کراس پر آنا تھا۔ اسی دوران پتہ چلا کہ اشوک مہرہ بھی وہاں سے نکل پڑا ہے۔ وہ دونوں ذرا سے فاصلے سے آگے پیچھے اسی کراس کی جانب بڑھ رہے تھے۔ اسی لیے انہیں پتہ چلا کہ پنڈت رام داس بھی اپنی میٹنگ ختم کر کے وہاں سے نکل پڑا ہے۔ اب ان میں منٹوں کا فرق تھا۔ انہوں نے اسی کراس سے گزرنا تھا۔

اس کراس پر روڈ لائٹ کی زردی کافی روشنی تھی۔ جسپال سنگھ وہاں پہنچا تو کراس کی مشرق سائیڈ پر مختلف رینک کے چھ سات پولیس والے کھڑے تھے۔ انہوں نے ایک بیریئر لگایا ہوا تھا اور ہر آنے والی گاڑی کو روک رہے تھے۔ اس کے آگے چار پانچ کاریں تھیں، جنہیں وہ بڑی تیزی سے نمٹا رہے تھے۔ ان کے پیچھے لائن کوئی اتنی زیادہ نہیں تھی۔ جسپال کے اندر سنسنی اتر آئی تھی۔ اس کے کان میں یہ صدا آ رہی تھی کہ اشوک سنگھ کی گاڑی اسی لائین میں آ گئی ہے۔ اس کا ایک گارڈ اتر کر پولیس والوں کی جانب بڑھ رہا ہے۔ اسی اثناء میں اشوک مہرہ کی کار بھی وہیں آن لگی۔ اس کا بھی گارڈ اتر کر پولیس والوں کی جانب بڑھ گیا۔ جسپال کی کار کے آگے دو کاریں رہ گئی تھیں۔ پولیس والے انہیں نمٹا رہے تھے۔ وہ دونوں گارڈ پولیس والوں سے کہہ رہے تھے کہ کون آدمی ہیں، جنہیں تم لوگوں نے روکا ہوا ہے، انہیں جانے کی اجازت دو، جبکہ پولیس آفیسر ان کی بات ہی نہیں سن رہا تھا۔ اسی دوران یہ پتہ چل گیا کہ پنڈت رام داس بھی اس لائین میں آ کر لگ گیا ہے۔ اسی وقت جسپال سنگھ کار سے اترا، اس کے ساتھ ہی نوتن کور بھی اتر گئی۔ وہ دونوں مخالف سمتوں سے پولیس والوں کے پاس جا پہنچے۔ نوتن کور نے پولیس آفیسر کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"دیکھیں اگر وہ وی آئی پیز ہیں تو انہیں جانے دیا جائے، آپ جا کر کنفرم کر لیں کہ وہ کون ہیں۔"

”دیکھیں اگر ہم وی آئی پیز کو نہ روکیں تو عام آدمی کا کیا قصور ہے، انہیں بھی جانے دیتے ہیں۔“ پولیس آفیسر نے کہا۔

”چلیں آپ جا کر کنفرم تو کرلیں اور جانے دیں کیوں اپنی نوکری کے پیچھے پڑے ہیں۔“ نوتن کور کا لہجہ طنزیہ ہو گیا تھا۔ تبھی آفیسر نے اپنے سپاہیوں سے کہا کہ جاؤ جا کر کنفرم کرلو، اور انہیں جانے دو۔

آفیسر وہیں کھڑا رہا اور چھ کے چھ پولیس والے تصدیق کرنے ان کی گاڑیوں کی جانب چلے گئے۔ آفیسر نے لائین میں لگی پہلی دونوں گاڑیوں کو چلے جانے کا اشارہ دے دیا۔ وہ نکل گئے۔ وہ پیچھے کی جانب چل پڑا، جسپال اور نوتن وہیں کھڑے رہے۔ آفیسر نے غصے میں ان لوگوں کی کاریں نکال دیں، جو عام لوگ ان تینوں کی گاڑیوں کے درمیان تھے۔ جیسے ہی ان تینوں کی گاڑیاں سڑک پر رہ گئیں۔ جسپال اپنی کار کی جانب بڑھا، اس نے کار سڑک میں یوں ٹیڑھی کھڑی کی جس سے سڑک بلاک ہوگئی۔ وہ بھی نکل کر اس پولیس آفیسر کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ اس پولیس آفیسر کو یہ تصدیق ہوگئی تھی کہ یہ تینوں وی آئی پی ہیں۔

”تمہیں یہاں ناکہ لگانا ہی نہیں چاہیے تھا۔“ اشوک مترہ کے ایک گارڈ نے آگے بڑھ کر کہا۔

”آپ جا سکتے ہیں، اب تو میں نے نہیں روکا۔“ پولیس آفیسر نے کہا۔ تب تک ان تینوں گاڑیوں کے ارد گرد پولیس والے اکٹھے ہو چکے تھے۔

”تم روک بھی نہیں سکتے۔“ گارڈ نے کہا اور پلٹ کر گاڑی کی طرف جانے لگا۔ تبھی پولیس والے کو غصہ آ گیا اس نے آگے بڑھ کر اس گارڈ کو کالر سے پکڑ لیا اور گھما کر سڑک پر پھینک دیا۔ اس کے تو گماں میں بھی نہیں تھا کہ کوئی پولیس والا ایسا کرنے کی جرات کر سکتا ہے۔ اسی لمحے تینوں گاڑیوں کے دروازے کھلے اور سب اس میں سے باہر آ گئے۔

جسپال کو یہ آواز ہر طرف سے آ گئی تھی کہ کسی بھی گاڑی میں کوئی نہیں ہے۔ اب انہیں زیادہ وقت دینا بے وقوفی تھا۔ اس لیے جسپال نے ایکشن کا اشارہ دے دیا۔ وہ بھی گھیرے میں کھڑے تھے۔ ان کے پاس اسلحہ بھی تھا۔ جیسے ہی اشارہ ملا۔ ہر طرف سے فائرنگ ہونے لگی۔ اگرچہ مزاحمتی فائرنگ بھی ہونے لگی تھی لیکن پولیس والوں کی طرف سے فائرنگ ہی اتنی شدت کی گئی تھی کہ ان سے کچھ بھی نہیں ہو پا رہا تھا۔ ان کے بچاؤ کے لیے صرف وہی راستہ کھلا ہوا تھا، جہاں جسپال کی کار کھڑی تھی۔ فطری طور پر سب اسی کی آڑ لینے کو بھاگے۔ وہاں تک چند لوگ ہی پہنچے، باقی سڑک پر تڑپنے لگے۔ ان میں وہ تینوں کون تھے، یہ دیکھنے کی نہ انہوں نے زحمت کی اور نہ ہی اتنا وقت تھا۔ سڑک کے دونوں طرف کوئی بھی نہیں جا سکا تھا۔ جو بھی ادھر بڑھتا، فائرنگ کی زد میں آ جاتا۔ تبھی جسپال نے دیکھا سارے لوگ کار کی آڑ میں آ چکے ہیں اور وہیں سے فائرنگ بھی کر رہے ہیں۔ اس نے سب کو پلٹنے کا اشارہ دے دیا۔ وہ سب پیچھے پلٹنے لگے۔ جیسے ہی وہ رینج سے باہر آئے، نوتن نے ریموٹ کا بٹن دبانے کا کہا۔ اس کے ساتھ ہی ایک خوفناک دھماکہ ہوا۔ روشنی سے ہر شے چمک اٹھی۔ وہاں کوئی بھی نہیں بچا تھا۔ سڑک پر آگ ہی آگ تھی۔ انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے اپنی وردیاں اتاریں اور آگ میں پھینک دیں۔ یہ ان لوگوں کے منصوبے کی انتہا تھی۔ ان وردیوں کے نیچے عام لباس تھا۔ انہوں نے کہہ دیا کہ وہ اپنے اپنے ٹھکانوں پر واپس جا رہے ہیں۔ وہ نگاہوں سے غائب ہو گئے لیکن ان کے ساتھ رابطہ تھا۔ نوتن کور اور جسپال پیدل ہی ایک

طرف چل پڑے۔ کافی آگے جا کر انہیں ایک گلی دکھائی دی وہ اس میں گھس گئے۔ بانیتا کور سے ان کا رابطہ تھا ہی، اس نے لوکیشن پوچھ لی تھی۔ اس نے کار بھیج دی تھی جو اسی گلی سے نکلتے ہی مارکیٹ میں کھڑی تھی۔ وہ اس میں بیٹھ گئے۔ ان کا رُخ اب اس گھر کی طرف تھا، جہاں بانیتا کور پہنچنے والی تھی۔ اس نے اپنا ٹھکانہ بدل لیا تھا۔

☆......☆......☆

سجاد فصیح، ایک بیوروکریٹ تھا۔ وہ ایک ایسی پوسٹ پر تھا، جہاں تمام حکومتی معاملات اس کی نگاہوں سے ہو کر گزرتے تھے۔ ظہیر بابر ایک سیاست دان تھا، جو اپوزیشن لیڈر کے طور پر مانا جاتا تھا۔ اس پر نجانے کتنے کرپشن کے الزامات تھے لیکن کوئی بھی ثابت نہیں ہو پایا تھا۔ اخباری بیانات میں وہ ایسا لیڈر مانا جاتا تھا، جو بڑا شعلہ بیاں تھا۔ وہ اس وقت بہت سارے، رکن اسمبلی کی نمائندگی کر رہا تھا۔ ان کے ساتھ تیسرا بندہ فخر الدین تھا۔ وہ ایک ایسا کاروباری شخص تھا، جس کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ پاکستان کے ہر بڑے کاروبار میں تھوڑا یا زیادہ اس کا شیئر ضرور ہوتا ہے۔ وہ کسی ایک پراڈکٹ کو جب چاہے خرید کر اسے مہنگی کر دیتا تھا۔ اس کے بارے میں دوسری بات یہ مشہور تھی کہ وہ رکن اسمبلی پالتا ہے۔ وہ کئی عوامی نمائندوں پر انوسٹمنٹ کرتا تھا اور پھر حکومتوں سے اپنے کام نکلواتا تھا۔

اس رات یہی تین بندے ٹریس ہوئے۔ ان کے ٹریس ہو جانے کی وجہ یہ تھی کہ یہ دنیا میں چاہے کہیں بھی ہوں، ایک رات کا کچھ حصہ وہ ساتھ میں گزارتے تھے۔ اس میں وہ کیا باتیں کرتے یا کیا پلان ہوتا یا نہیں ہوتا، یہ تو وہی جانتے تھے۔ لیکن یہی تین لوگ سیاست میں جو کھیل ہوتا تھا وہ کھیلتے تھے۔

بہت غور کرنے پر پتہ چلا کہ یہی وہ لوگ ہیں، ہمیشہ گیم کسی ایک کے حق میں رہتی ہے۔ ان سے باہر جاتی ہی نہیں تھی۔ ملک میں کئی جگہ قتل ہوئے کہیں بھی سراغ نہیں ملا۔ وہ قتل جن کا سراغ نہیں ملا تھا، اس کے ڈانڈے کسی نہ کسی طرح ان کے ساتھ جا کر ضرور ملتے تھے۔ اس کا فائدہ انہی میں سے ایک کو ہوتا تھا۔ بظاہر ان کا آپس میں کوئی تعلق نہیں تھا لیکن اندر کھاتے وہ یہی کھیل کھیل رہے تھے۔ رات کے پہلے پہر ہی اروند سنگھ نے مجھے ان کے بارے میں تفصیل بتادی تو میں نے اس سے پوچھا۔

''یہ جو ایک رات ملتے ہیں، کیا یہ دن مخصوص ہے یا پھر آگے پیچھے بھی ملتے ہیں؟''

''نہیں، آگے پیچھے بھی ملتے ہیں۔'' اس نے بتایا

''تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟'' میں نے تصدیق چاہی

''دیکھیں، یہ ایک تفصیل طلب معاملہ ہے، لیکن آپ اتنا سمجھ لو کہ ان کے سیل فون سے جو کالیں جاتی ہیں یا آتی ہیں، وہ ایک ہی ٹاور سے ہوتی ہیں اور جگہ جو ہم نے تلاش کی ہے، وہ اسی علاقے میں ہے۔'' اس نے مجھے سمجھایا تو میں نے پوچھا۔

''وہ کیسی جگہ ہے اور کہاں ہے؟''

تب اس نے مجھے بتایا کہ وہ لاہور سے جنوب کی جانب تقریباً سولہ کلومیٹر پر ایک جدید ٹاؤن میں تھی۔ کچھ عرصہ پہلے میں بھی وہیں رہا تھا۔ جہاں راکٹ لانچروں سے اس گھر کو اُڑا دیا گیا تھا، یہ اسی ٹاؤن میں تھا۔

''اس وقت وہ لوگ کہاں ہیں۔''

''تینوں الگ الگ جگہوں پر ہیں۔ لیکن میں انہیں اس جگہ پر لا سکتا ہوں۔'' اس نے خوشگوار لہجے میں کہا تو میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''وہ کیسے اروند؟''

''وہ اتنے بے وقوف نہیں ہیں کہ براہ راست ایک دوسرے کو کال کریں۔ اس طرح تو کوئی بھی ان کے تعلق کو بے نقاب کر سکتا ہے۔ ان تینوں کے آگے فرنٹ مین ہیں۔ ان کا ایک بندے سے رابطہ ہے۔ یہ سب میں نے ان کے فون کالز کا سرا پکڑ کر معلومات لی ہیں۔ ایک دوسرے تک معلومات پہنچنے میں اگرچہ چند منٹ لگتے ہیں، لیکن یہ بہت محفوظ ہے۔''

''لیکن تم پہنچ گئے ہو۔'' میں نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا تو وہ بولا۔

''اس لیے کہ میں ذرا ہٹ کر سوچتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے قہقہہ لگا دیا۔ اس کے ساتھ میں بھی مسکرا دیا۔ پھر وہ میرے سامنے ایک کاغذ رکھ کر بولا۔

''یہ ہے وہ جگہ، اگر کہیں تو ایک گھنٹے بعد انہیں اس مقام پر جمع کر لوں۔''

''ہاں، یہ ممکن ہے انتہائی احتیاط کے ساتھ کہ انہیں ذرا سا بھی شک نہ ہو۔''

''ممکن ہے، صرف اس بندے کو پکڑنا ہوگا، جو ان کے فرنٹ مین کے درمیان محور ہے اور وہ وہیں رہتا ہے۔'' اروند نے بتایا تو میں نے چند لمحے سوچا اور فون کر دیا۔

''اس ٹاسک کو جنید پورا کرے گا۔ کیونکہ وہ اس وقت لاہور میں ہے۔ وہاں کے بندوں سمیت سب کو رابطے میں لو اور پلان کرو۔'' میں نے کہا تو وہ اٹھ گیا۔

یہ ساری باتیں سرِ شام ہوئی تھیں۔ یہ وہی وقت تھا، جب امرتسر میں جسپال اور باقی لوگ پلان کر رہے تھے۔ ادھر انہوں نے بھی پلان ترتیب دے لیا۔

اصل میں جب بھی کوئی پلان بناتا ہے تو وہ بڑا آئیڈیل ہوتا ہے۔ سوچا جاتا ہے کہ اگر یوں ہوگا تو ایسے ہوگا۔ یوں ہوگا تو ایسے ہو جائے گا۔ آئیڈیل حالات بہت کم ملتے ہیں۔ اس لیے پلان ''اے'' ہمیشہ ناکام ہوتا ہے۔ پلان ''بی'' میں وہی حالات سامنے آتے ہیں، جو کچھ سوچے ہوئے ہوتے ہیں اور کسی کے بارے میں گمان بھی نہیں ہوتا۔ وہاں وہی کامیاب ہوتا ہے، جو حالات کو اپنے قابو میں کر لے۔ تیسرا اور جو ہوتا ہے پلان ''سی''، یہ ایسے حالات ہوتے ہیں، جن کے بارے میں گمان بھی نہیں کیا جا سکتا اور یہ قسمت ہی سے اپنی دسترس میں لائے جاتے ہیں۔

یہی بات ہے کہ جو حاسد سازش کرتے ہیں، وہ پوری طرح اس وقت بے نقاب ہوتے ہیں، جب وہ حالات کو پوری طرح اپنی دسترس میں کر لیتے ہیں اور پھر وار کرتے ہیں۔ جبکہ منافق انتظار کرتا ہے کہ جب اسے پوری تسلی ہوتی کہ شکار اس کے قابو میں آ گیا ہے، تب وہ وار کرتا ہے۔ حاسد اور منافق میں فرق یہ ہوتا ہے کہ حاسد کے اندر غصہ ہوتا ہے، وہ مجبور ہو جاتا ہے، چاہے اس کا تعلق ہو نہ ہو۔ جبکہ منافق دوست بن کر ڈستا ہے۔ پہلے وہ کتے کی سطح پر اترتا ہے اور اپنا آپ وفادار کی صورت میں ظاہر کرتا ہے، پھر وہ سانپ بن جاتا ہے۔

رات کا پہلا پہر ختم ہونے کو تھا، جب وہ لوگ وہاں پہنچ گئے۔ چار کنال کے اس بنگلے میں چند سیکورٹی والے موجود تھے۔ یہ لگ بھگ پندرہ لوگ تھے۔ جو وقفے وقفے سے اس بنگلے میں داخل ہوتے چلے گئے۔ ایک گھنٹے میں وہ سب اندر تھے۔ اس دوران جو بھی سیکورٹی والا دکھائی دیتا، اسے پکڑ لیتے۔ وہ انہیں پکڑتے اور وہاں موجود سرونٹ کوارٹر میں لے جاتے۔ ہر ایک سے الگ الگ پوچھ تاچھ کرتے۔ جس سے مجموعی طور پر انہیں اندر کے

سارے حالات کا پتہ چل گیا۔ یہاں تک کہ وہاں کے سارے لوگ سرونٹ کوارٹر میں بند کر دیئے گئے۔
"دیکھو! ہماری تم لوگوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ سکون سے یہاں رہو گے تو کچھ نہیں کہا جائے گا، ورنہ جس نے بھی عقل مندی دکھانے کی کوشش کی وہ اپنی جان سے جائے گا۔"
اس دھمکی کے بعد باہر سے آئے لوگوں میں سے ایک نے اپنے بیگ سے ایک اسپرے بوتل نکالی اور سب کے چہروں پر اسپرے کر دی۔ جس کے چند منٹ بعد وہ سب بے ہوش ہوتے چلے گئے۔ انہوں نے ان سب لوگوں کو باندھ دیا۔ اس کے بعد دو لوگ وہاں چھوڑ کر وہ سارے عمارت کی جانب چلے گئے۔ دو بندے سیکورٹی والوں کی جگہ گیٹ پر چلے گئے۔
جنید داخلی دروازے سے اندر نہیں گیا بلکہ اس نے عمارت کی بغل میں کچن سے اندر جانے کا راستہ تلاش کر لیا۔ وہ سبھی اندر چلے گئے۔ لاؤنج سے ہوتے ہوئے وہ دوسری عمارت کے اس کمرے تک جا پہنچے جہاں سے ہلکی ہلکی موسیقی سنائی دے رہی تھی۔ جنید نے دروازے کو کھولا، جو کھلتا ہی چلا گیا۔ سامنے جہازی سائز کے بیڈ پر ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر شخص پڑا ہوا تھا۔ وہ دونوں برہنہ تھے۔ جنید کی آمد کا احساس پہلے لڑکی کو ہوا، وہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھی۔ لاشعوری طور پر اس نے اپنی لباس کی جانب ہاتھ بڑھایا، لیکن وہ اپنی کپڑوں تک نہ پہنچ سکی بیڈ کے ساتھ ہی گر پڑی۔ وہ نشے میں تھی۔ اس کے ساتھ پڑے ادھیڑ عمر شخص کو جب یہ احساس ہوا کہ بیڈ روم میں کوئی ہے تو آنکھیں پھاڑے جنید کی جانب دیکھنے لگا۔
"کون ہو تم، اور یہاں کیسے پہنچے ہو؟"
"میں تمہارا باپ ہوں اور اڑ کر یہاں آیا ہوں۔"
جنید نے طنزیہ لہجے میں کہا اور گھما کر ایک ٹھوکر اس کے سینے پر دے ماری۔ وہ اُوخ کی آواز کے ساتھ دوہرا ہو گیا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے لڑکی کے لبوں سے سسکاری نکل گئی۔
"تم کپڑے پہن کر ادھر کونے میں بیٹھ جاؤ، اگر کوئی حرکت کی تو اپنی جان سے جاؤ گی۔" جنید نے کہا تو وہ ادھیڑ عمر بولا۔
"کیا چاہتے ہو؟"
"تمہارا سیل فون کہاں ہے؟" یہ کہتے ہوئے اس نے نگاہیں ادھر ادھر دوڑائیں، سیل فون کہیں دکھائی نہیں دیا۔ تبھی اس ادھیڑ عمر شخص نے سرہانے کے نیچے پڑا ہوا سیل فون نکال کر اسے دے دیا۔
"یہ لو۔"
جنید نے سیل فون پکڑا اور اس میں سے ان تینوں کے نمبروں کی تصدیق کی۔ اس میں کالیں بھی تھیں اور پیغام بھی تھے۔ تصدیق کے بعد جنید نے اس سے پوچھا۔
"زندگی چاہتے ہو یا موت۔"
"زندگی۔" ادھیڑ عمر شخص نے احساس سے عاری لہجے میں یوں کہا جیسے اسے موت کا پورا یقین ہو گیا ہو۔
"تو ان تینوں کو یہاں بلاؤ۔ میں تم دونوں کو کچھ نہیں کہوں گا، یہ میرا وعدہ ہے۔"
"کیسے بلاؤں، کیا کہوں؟" ادھیڑ عمر شخص نے پوچھا۔
"یہ تم جانتے ہو۔" جنید نے کہا اور اس کے پاس بیڈ پر بیٹھ گیا۔ ادھیڑ عمر شخص نے سیدھا ہوتے ہوئے اپنے اوپر چادر لینے کی اجازت چاہی، جس پر جنید نے سر ہلا دیا۔ اس نے اپنے اوپر چادر لی اور سیل فون پر نمبر پش کرنے لگا۔ اس نے سب کو یہی پیغام دیا کہ

جتنی جلدی ہو سکے پہنچیں، ایمرجنسی ہے۔ کچھ ہی دیر بعد ان تینوں ہی کی طرف سے یہ پیغام مل گیا کہ وہ آ رہے ہیں۔

تقریباً آدھا گھنٹہ اسی سنسنی خیزی میں گزر گیا۔ یہ وہ لمحات تھے، جب جسپال روڈ پر آ چکا تھا۔ جنید کو اس بارے میں کوئی خبر نہیں تھی۔ آدھے گھنٹے کے بعد سب سے پہلے فخر الدین آ گیا۔ اس کے ساتھ گارڈز تھے۔ وہ لاؤنج سے باہر ہی رہ گئے۔ جبکہ وہ خود اکیلا اندر لاؤنج میں آ گیا۔ جیسے ہی وہ اندر آیا، اسے ایک بندہ ملا، ہاتھ ملاتے ہی فخر الدین نے پوچھا۔

''وہ کہاں ہے؟''

''وہ مصروف ہے، آپ تشریف رکھیں۔''

فخر الدین بیٹھ گیا اور بیٹھتے ہی اپنا سگار سلگا لیا۔ اگلے دو منٹ میں ظہیر بابر اور اس کے بعد سجاد فصیح آ گیا۔ وہ جیسے ہی آمنے سامنے ہوئے تو پہلا سوال یہی تھا کہ بات کیا ہے اور 'وہ' کہاں ہے؟ یہ وہ وقت تھا، جب جسپال اپنا کام کر کے جا چکا تھا اور میں نے یہ خبر جنید کو بتا دی تھی۔

''اس سوال کا جواب میرے پاس ہے۔'' اچانک جنید سامنے آ کر بولا تو وہ چونک گئے۔

''تم کون ہو؟''

''سمجھ لو کہ موت کا فرشتہ ہوں۔ اپنے گاڈ فادر کو اطلاع دے دو کہ اس کی سلطنت اب ختم ہونے کو ہے۔'' جنید نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

''اسے کوئی کچھ نہیں کر سکتا، لیکن تمہارا کام ابھی کر دیتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے باہر لوگوں کو آواز دینا چاہی۔ فطری طور پر اس کا منہ باہر کی جانب ہوا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ آواز نکالتا، سائیلنسر لگے پسٹل سے ایک بار ٹھک ہوئی اور اس کے ماتھے میں سوراخ ہو گیا۔ وہ کوئی لفظ منہ سے نکالے بغیر لڑھکتا ہوا قالین پر گر کر تڑپنے لگا۔

''اب تم میں سے کون بتائے گا اپنے گاڈ فادر کو؟'' جنید نے انتہائی وحشت سے کہا۔

کوئی بھی نہیں۔'' سجاد فصیح نے اٹھتے ہوئے کہا تو جنید نے اس پر پسٹل تان لیا اسی لمحے وہ تیزی سے بولا ''ہمیں صرف حکم ملتا ہے، ہم کوئی بات نہیں بتا سکتے، یہ ہماری مجبوری ہے۔''

''دونوں کو مار دو'' میں نے جنید سے کہا تو اس نے پہلے سجاد فصیح کو اور پھر ظہیر بابر کے دل پر نشانہ لگایا۔ تینوں ختم ہو چکے تھے۔ باہر ان کے گارڈز انتظار کر رہے تھے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ انہیں بھی ختم کیا جاتا لیکن جنید نے ایسا نہیں کیا۔ سب ایک دوسرے کے رابطے میں تھے، انہیں باہر نکلنے کو کہا۔ جنید کچن سے باہر آ گیا اور اگلے ہی لمحے لان میں داخل ہو کر باؤنڈری وال کی طرف چلا گیا۔ ان سب نے ایک ہی جگہ نہیں جانا تھا۔ ہر کوئی اپنے ٹھکانے کی جانب چلا گیا، جبکہ جنید اپنے ٹھکانے تک جانے کے لیے ایک ٹیکسی میں بیٹھ چکا تھا۔

اروند سنگھ میرے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس کے ذریعے یہ خبر بانیتا کور تک پہنچا دی۔ نوتن اور جسپال ابھی اس کے پاس نہیں پہنچے تھے۔ بانیتا کور نے مجھ سے پوچھا۔

''یار یہ کیا ہے، کیسی جادو کی چھڑی ہے، جسے تم استعمال کرتے ہو؟''

''یہ کوئی جادو کی چھڑی نہیں ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ انفارمیشن کا دور ہے، جس کے پاس جتنی زیادہ اور تیز ترین معلومات ہوں گی، وہ چھا جائے گا اور دوسری بات یہ ہے بانیتا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی اتنی تیزی سے آ گئی ہے کہ لوگ اسے سمجھ ہی نہیں پا رہے ہیں۔ اس کا استعمال وہیں تک ہے جتنا اسے

سمجھتے ہیں۔ جو بہتر انداز میں استعمال کر گیا، وہی کامیاب ٹھہرا۔ یہی جادو ہے۔''

''ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' اس نے یہ کہہ کر فون بند کر لینے کو کہا تا کہ وہ اُن دونوں سے رابطہ رکھ سکے۔

اروند سنگھ کافی پینا چاہتا تھا۔ ایسے میں مہوش آ گئی تو مجھے وہاں دیکھ اسے خوشگوار حیرت ہوئی۔ وہ مجھ سے باتیں کرنے لگی تو میں نے کہا۔

''مہوش تم بیٹھو، میں اروند کے لیے کافی بنا کر لاتا ہوں، تم پیو گی؟''

''ارے نہیں، آپ بیٹھو میں لے آتی ہوں۔'' وہ تیزی سے اٹھتے ہوئے بولی تو دروازے میں رونیت کور نمودار ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی، جس میں چار مگ رکھے ہوئے تھے۔

''آپ کوئی بھی نہ جاؤ، میں لے آئی ہوں۔''

''یہ تو تم نے بہت بڑا کام کیا ہے۔'' میں نے کہا اور کافی کا مگ پکڑ لیا۔

''لیکن آپ نے یہ کرنا ہے کہ کافی پئیں اور جائیں سوہنی بھابی کے پاس، آپ صبح سے مصروف ہیں، کچھ آرام کر لیں۔'' رونیت نے کہا اور میرے ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''اور یہ چوتھا مگ کس کے لیے ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''فہیم آ رہا ہے، اس کے لیے۔'' اس نے سکون سے کہا اور ایک کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ گئی۔

''وہ آرام نہیں کر رہا، میرا مطلب ہے تم سارے......'' میں بات سمجھنے کے لیے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تو رونیت بولی۔

''ابھی جو اتنے بڑے ہنگامے ہو گئے ہیں، یہی موقعہ جب ان کی کالیں پکڑی جائیں گی۔ اسی افراتفری میں ہی کوئی آگے کا سراغ ملے گا۔ یہی ایک دو گھنٹے ہیں بس۔'' اس نے اسکرین پر دیکھتے ہوئے کہا۔

میں کافی پینے تک ان سے باتیں کرتا رہا، پھر اٹھ کر بیڈ روم میں آ گیا۔ جہاں سوہنی میری آمد کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔

☆......☆......☆

جسپال صبح سویرے ہی اٹھ گیا۔ رات کا ہنگامہ اس کے ذہن سے نہیں نکلا تھا۔ وہ اٹھ کر کچن میں گیا، اپنے لیے چائے بنائی اور چھت پر چلا گیا۔ یہ بالکل ہی نیا علاقہ تھا۔ جیسے شہر کا کوئی مضافاتی علاقہ ہو۔ وہ رات واپس اسی جگہ نہیں گئے تھے، جہاں سے وہ چلے تھے۔ اس دوران بانیتا کور نے ٹھکانہ بدل لیا تھا۔ بانیتا اور نوتن اپنے کمروں میں سوئی ہوئی تھیں۔ وہ چائے کا مگ لیے ابھرتے ہوئے سورج کو دیکھ رہا تھا۔ اسے ایک دم سے ہی اوگی پنڈ یاد آ گیا۔ وہ بھی یونہی تھا۔ ایک طرف اوگی پنڈ کی آبادی اور دوسری طرف کھیت ہی کھیت۔ وہاں کی بھی کوئی خیر خبر نہیں تھی۔ بس اتنا پتہ چلا تھا کہ انوجیت سنگھ رکن بننے کے بعد چنڈی گڑھ چلا گیا تھا۔ اگر وہ حکومت میں آ گیا تو اس کی وزارت پکی تھی۔ وہ کچھ دیر ہر ریت کو سوچتا رہا، لیکن لاشعور میں رات والا ہنگامہ نہیں گونج رہا تھا۔ اس کے اثرات ابھی تک اس پر تھے۔ بار بار ایک ہی سوال اس کے ذہن میں ٹھوکریں مار رہا تھا کہ اس کا ردعمل کیا ہو سکتا تھا؟ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ پنجاب پولیس اس واقعے کے ذمے داروں کو پکڑنے میں سردھڑ کی بازی نہ لگا دے۔ یہاں تک کہ بھارت کے سارے خفیہ ادارے انہیں پکڑنے کے لیے بے تاب ہو جانے والے تھے۔ وہ لوگ جو حکومتوں میں اہم کردار ادا کر سکتے تھے، جو یہ سمجھتے تھے کہ انہیں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا، یوں چیونٹی کی مانند مسل دیے جائیں، ایسا وہ گمان بھی

نہیں کرسکتے تھے تو ایسا ہو کیسے گیا؟ وہ یہی سوچتا چلا جا رہا تھا کہ اسے سیڑھیوں پر آہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہاں نوتن کور تھی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

"کوئی خبر کی خبر سنا نا نوتن۔" اس نے بھی مسکراتے ہوئے کہا تب وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"پتہ ہے آج ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"مجھے تو نہیں معلوم۔" وہ اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہمیں چند دن کی چھٹیاں مل گئی ہیں اور ہم کہیں بھی جاسکتے ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو جسپال بھی ہنس دیا، پھر اس نے پوچھا۔

"کس نے دی ہیں یہ چھٹیاں؟"

"تمہارے جمال نے، ابھی کچھ دیر پہلے اس کا فون آیا ہے، اس نے کہا ہے کہ چند دن باہر گھوم پھر آؤ، بانیتا کور کی صحت بھی ٹھیک ہو جائے گی۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میرے خیال میں نہیں ہے۔ ورنہ وہ ہمیں بتا دیتا۔ کوئی اور ہی بات ہوگی، جس بارے میں کم از کم مجھے نہیں معلوم۔" اس نے کہا اور مگ سے چسکی لے لی۔

"ہم نکل جائیں گے یہاں سے؟" اس نے پوچھا۔

"سارا بندوبست ہو سکتا ہے اگر تم رضامند ہو جاؤ۔" اس نے کہا اور پھر چائے کی چسکیاں لینے لگی۔ جسپال چند لمحے سوچتا رہا پھر اس نے پوچھا۔

"اور وہ لوگ جو پورے پنجاب سے آئے ہوئے ہیں، ان کا کیا بنے گا؟"

"ارے وہ لوگ واپس اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں گے۔ اگر ہم ملک سے باہر جائیں گے تو بلدیو سنگھ کا ان سے رابطہ رہے گا۔ وہ سب تھوڑا عرصہ تک بالکل کچھ نہیں کریں گے۔ اپنی دنیا میں جیسے نارمل زندگی گزار رہے تھے، ویسے رہیں گے۔ جب ان کی ضرورت ہوئی، انہیں کال کرلیا جائے گا۔" اس نے بتایا تو جسپال نے تشویش سے کہا۔

"اگر کوئی کہیں پھنس گیا تو، وہ کہیں بک ہی نہ دے۔"

"اصل میں وہ لوگ جرائم پیشہ نہیں ہیں۔ صرف سکھی کی خاطر انہوں نے تربیت لی ہوئی ہے، وہ اپنا اپنا کام کرتے ہیں اور ایک نارمل زندگی گذارتے ہیں۔ ان پر کوئی شک بھی نہیں کرسکتا۔ خیر تم ان کی فکر چھوڑو۔ اور چلو تیار ہو جاؤ، ہمیں نکلنا بھی ہے۔" نوتن نے تیزی سے کہا۔

"او کے تم چلو میں آرہا ہوں۔" اس نے کہا اور چائے کا ایک بڑا گھونٹ لیا۔ اس کے دل میں ایک خواہش ابھری، کاش اس سفر میں ہرپریت بھی اس کے ساتھ ہوتی۔ یہ خواہش اس کے دل میں تھی اور نیچے آ گیا جہاں بانیتا کور بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

"کہاں جانا ہے؟"

"کہیں بھی نہیں، کم از کم ملک سے باہر نہیں جانا۔" اس نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ایک تو میں ابھی جسمانی طور پر ٹھیک نہیں ہوں، دوسرا، یہاں حکومت بن رہی ہے، اس کا بھی خیال کرنا ہے، میں باپو جی کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔" اس نے حتمی لہجے میں کہا تو جسپال نے پوچھا۔

"جمال نے جو کہا وہ کس......"

"وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ ہم چند دن منظر پر نہ آئیں، یہ جو اتنا بڑا کام کردیا ہے، اس نے بہت سوں کو

ہلا کر رکھ دیا ہے، ان کے صرف پاؤں نہیں اکھڑے، دماغ بھی پھاڑ دیئے ہیں۔'' اس نے پورے اعتماد سے کہا۔

''تو پھر کیا خیال ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''کم از کم باہر نہیں جانا، یہ شہر امرتسر خطرناک ہے اس وقت، اس کے علاوہ کہیں بھی چلو۔'' اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تو جسپال بولا۔

''تو پھر اوگی چلتے ہیں۔ یہی ہے، گھر میں رہیں گے، باہر نہیں نکلیں گے، وہاں سیکورٹی کے علاوہ، یہ پتہ رہے گا کہ ارد گرد کیا ہو رہا ہے۔'' اس نے کہا۔

''چلو، وہیں چلتے ہیں، لیکن بہت احتیاط کے ساتھ۔'' بانیتا نے کہا تو وہ تیاری کرنے لگے۔

دوپہر سے ذرا پہلے وہ امرتسر سے نکلنے کے لیے تیار تھے۔ وہ تینوں نور وہیل جیپ میں تھے۔ جمال نے بانیتا کور کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا، اس لیے جسپال نے مزید کوئی کرید نہیں کی تھی۔ اس وقت اس کا سارا دھیان یہاں سے نکل جانے کی طرف ہی تھا۔ وہ شہر کے مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے ترن تارن ہائی وے کی طرف آ چکے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد انہیں شہر سے نکل جانا تھا۔ وہ تینوں خاموش تھے۔ وہ کسی نادیدہ خطرے کو محسوس کرتے ہوئے پوری طرح محتاط تھے۔ یہاں تک کہ وہ شہر سے نکل گئے۔ اگرچہ خطرہ بہت حد تک کم ہو گیا تھا لیکن تھا۔ وہ ذہنی طور پر دباؤ کا شکار رہے۔ یہاں تک کہ وہ اوگی کے لیے ترن تارن سے بھی نکل گئے۔

☆......☆......☆

ہیتھرو ائیر پورٹ قریب آ رہا تھا۔ میں ذہنی طور پر تیار ہو گیا۔ کچھ دیر بعد جہاز لینڈ کر جانے والا تھا۔ ایک طویل اور تھکا دینے والا سفر ختم ہونے کا تھا۔ جس رات جسپال اور جنید نے بڑے آپریشن کیے تھے۔ اس رات میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مجھے یوں برطانیہ کا سفر کرنا پڑے گا۔ اس رات کی صبح جب میں بیدار ہوا تو مجھے اروند نے ایک چونکا دینے والی خبر بتائی۔ وہ ساری رات یہی دیکھتے رہے تھے، وہ ان دیکھا گاڈ فادر کہاں ہو سکتا ہے؟ اس کا کہیں کھوج لگ سکتا ہے؟ یا اس کے نقش قدم کہاں تک جاتے ہیں، جہاں سے مزید سراغ مل سکے؟ انہیں ایسا کچھ نہیں ملا۔ سوائے اس کے کہ تمام تر کالیں جب کی جاتی ہیں تو نمبر برطانیہ کا ملایا جاتا ہے، لیکن آگے انہیں ریسیو کون کرتا ہے، سامنے سے یہی پتہ ملتا ہے کہ یہ نمبر استعمال ہی میں نہیں ہے۔ یوں اس بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوتا، وہ بالکل وہی ٹیکنالوجی استعمال کر رہا تھا، جو ہم کر رہے تھے۔ جس طرح ہمارے نمبر کسی جگہ ٹریس نہیں ہوتے تھے، اس طرح وہ نمبر بھی پردہ غائب میں تھا۔

کچھ عرصہ پہلے اروند نے ایک ایسا سوفٹ وئیر بنایا تھا، جس سے کال ٹریس ہو جاتی تھی، لیکن بہر حال، وہ ہم سے بھی آگے تھا۔

''میں کوشش کرتا ہوں کہ اس کا نمبر مل جائے، کوئی مزید کام کرتا ہوں۔'' اروند نے اپنی طرف سے مجھے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، تم کرو کوشش، ہم کامیاب ہو ہی جائیں گے۔'' میں نے بھی اس کے کام کو سراہتے ہوئے اسے حوصلہ دیا۔

''لیکن ایک چیز ہمیں ملی ہے، اب پتہ نہیں وہ اس کا سرا ہو سکتا ہے کہ نہیں، مجھیں ایویں شک والی بات ہے۔'' اس نے سوچتے ہوئے انداز میں کہا۔

''وہ کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''لندن شہر کے مشرقی علاقے 'اورسیٹ' میں، ممکن ہے یہ جگہ کہیں مضافات میں ہو، ایک نمبر جال

میں آیا ہے اور وہ کسی کیسینو کا ہے۔ وہاں پر بھی چند اہم لوگوں نے فون کیا ہے۔ اس سے اتنا شک کیا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی ہوا تو اسی علاقے میں ہوگا۔ کیونکہ ان سارے نمبروں سے ایک جگہ کال ہوئی ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے 'اور سیٹ میں؟" میں نے پوچھا۔

"یہی وہ جوا خانہ ہے، وہاں بھارت سے زیادہ کالیں گئی ہیں۔" اس نے بتایا

"یہ 'اور سیٹ والے جوئے خانے والا نمبر بولتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، میں نے اس پر بات کی ہے۔ تب تک وہ بند ہو رہا تھا۔ کوئی بہت بدمزاج بندہ تھا، پھر میں نے نہیں کیا۔" اروند نے بتایا

"اور وہ جو نمبر ٹریس نہیں ہو رہا ہے، وہ؟" میں نے پوچھا تو اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

"وہ نمبر تو ہے، لیکن وہاں سے یہی ریسپانس ملتا ہے کہ وہ نمبر کسی کے استعمال ہی میں نہیں ہے۔"

"اوکے، ناشتے کی میز پر ہم اس بارے میں مزید بات کر لیتے ہیں۔" میں نے کہا تو وہ اٹھ گیا۔

ناشتے کی میز پر سب ہی تھے۔ وہاں اس بارے میں کافی بات ہوتی رہی۔ ایک خیال یہ تھا کہ اس ان دیکھے گاڈ فادر کو ہم تک پہنچ جانے دیا جائے۔ پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ دوسرا خیال یہ تھا، وہ جب سامنے آئے گا، سو آئے گا، کیوں نہ ہم پہلے اس تک پہنچ جائیں۔ کوشش کر لینے میں کوئی حرج نہیں، انتظار تو کرنا ہی، ممکن ہے وہ اس خاموشی میں اس قدر طاقت سے آئے کہ ہم اس کا حملہ ہی برداشت نہ کر پائیں۔ کچھ دیر بعد یہ فیصلہ ہو گیا کہ لندن جایا جائے۔ ممکن ہے اس آوارہ گردی میں کوئی سرا ہاتھ لگ جائے۔ میں نے اسی وقت بانیتا کور کو فون کر دیا کہ وہ لوگ کہیں باہر کے ملک چلے جائیں۔ اور میں نے اپنے ساتھ جنید اور مہوش کو لے کر لندن جانے کی تیاری کر لی۔ بانیتا کور نے باہر نہ جانے کا فیصلہ کیا اور راوی چلی گئی۔ وہ دو دن سے وہیں تھی اور سکون سے تھی، جبکہ ہمارے کاغذات کی تکمیل میں وقت لگا اور ہم بھی فلائی کر گئے۔ جنید اور مہوش میرے اسسٹنٹ کی صورت میں میرے ساتھ تھے۔ میں بزنس ٹور پر تھا۔ ہم نے تانی کے پاس ہی ٹھہرنا تھا۔

ہیتھرو ائیر پورٹ کے مراحل طے کر لینے کے بعد جب میں باہر آیا تو تانی میرے سامنے کھڑی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بڑے وقار سے آگے بڑھی اور کسی بزنس وویمن کی طرح اس نے ہاتھ ملایا۔ میں اس کے ہاتھ کی گرفت سے اس کے جذبات کا اندازہ لگا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی جوت بتا رہی تھی کہ اس کے اندر کیا کچھ مچل رہا ہے۔ اس کے ساتھ کچھ دوسرے لوگ بھی تھے۔ ان سے میرا تعارف کرایا۔ ان سب نے باری باری ہاتھ ملایا۔ اسی دوران مہوش اور جنید بھی آ گئے۔ وہ ان سے ملنے لگی۔ ان کا تعارف اس نے اپنے دوستوں کی حیثیت سے کرایا۔ تھوڑی دیر بعد ہم سب کاروں کے ایک قافلے کی صورت میں چل پڑے۔ ہمارے سفر کا اختتام رومفورڈ کے علاقے میں ہوا۔ جہاں پرانے وقت کا ایک بڑا سا سارا گھر تانی کی ملکیت میں آیا تھا۔ باقی سب لوگ چلے گئے اور ہم گھر کے اندر آ گئے۔ ابھی ہم بیٹھے بھی نہیں تھے کہ تانی تیزی سے اندر آئی اور سیدھے میرے گلے لگ گئی۔

"یہ دنیاداری بھی نا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے بھینچ لیا۔ چند منٹ میرے ساتھ لگے رہنے کے بعد وہ مہوش اور جنید سے بھی یونہی ملی۔ پھر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"کیا کروں یار، یہاں قدم قدم پر کچھ ایسا ہے کہ بڑا محتاط رہنا پڑتا ہے۔ آزادی جو ہے سو ہے، لیکن ذرا

سی بے احتیاطی شک میں مبتلا کر دیتی ہے اور پھر اس پر نگاہ رکھنے لگتے ہیں۔ خیر چھوڑو، ان باتوں کو، فریش ہو جاؤ، باتیں تو چلتی رہیں گی۔"

وہ کہتی چلی جا رہی تھی اور میں اس کی طرف دیکھتا رہا تھا، وہ ذرا سی بھی نہیں بدلی تھی بلکہ کہیں زیادہ نکھر گئی تھی۔

اس رات کھانے کے بعد میں دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا۔ وہ مجھے وہاں کے ماحول کے بارے میں بتاتی رہی۔ پھر جو میں سویا تو اگلے دن کی خبر لایا۔

اگلا سارا دن یونہی ایک فرضی کارروائی میں گذر گیا۔ میں ایک بزنس مین تھا اور تانی کی کمپنی کے ساتھ کاروبار کا خواہش مند تھا۔ اس کے منیجر طارق نے جو پاکستانی نژاد تھا، مجھے بہت سارے آپشن دیئے۔ جن پر ہماری بات چیت ہوتی رہی۔ میں یہ وقت اس لیے بھی لے رہا تھا کہ جن چند لوگوں کو میں نے اپنے بارے میں بتا دیا تھا، وہ مختلف علاقوں سے لندن پہنچ رہے تھے۔

میں نے طارق سے اچھی خاصی دوستی کر لی۔ سہ پہر کے وقت جب میں اس سے رخصت ہونے لگا تو اس نے پوچھا۔

"سر اگر آپ لندن کی سیر کرنا چاہیں، یا کوئی دوسری انٹرٹینمنٹ تو مجھے بتائیں، میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں، آپ کو گائیڈ بھی کر دوں گا اور ہمیں بھی کمپنی سے کچھ اچھا وقت گزارنے کو مل جائے گا۔"

"کمپنی کو چھوڑو، یہاں سے چھٹی کے بعد تم میرے ساتھ رہو، ایک دوست کی حیثیت سے، چلو ہماری دوستی کا آغاز یہیں سے ہو جائے۔" میں نے اس سے کہا تو وہ پھیکی ہنسی ہنستا ہوا بولا۔

"سر میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ....."

"اوہ چھوڑو، اور یہ سر کہنا بھی، سیدھے جمال کہو اور اب بتاؤ، ہمیں آج کی شام کہاں گذارنی چاہئے۔"

میرے یوں کہنے پر اسے کچھ حوصلہ ہوا۔ پھر مختلف ڈانس کلب، ہوٹل، اور کئی جگہوں کے نام لیتا رہا، یہاں تک کہ اس نے جب کیسینو گنوائے تو میں نے کہا۔

"کوئی خاص کیسینو ہے تو چلتے ہیں۔"

"اس میں خاص یہ ہے کہ وہ ایک لارڈ کے محل میں بنا ہوا ہے، وہ یہاں کے دارالامرا کا رکن رہا ہے۔ اس کے بیٹے نے اسے پرانے لندن کی ایک جھلک کے طور پر بنایا ہے، عام آدمی وہاں جا ہی نہیں سکتا، بہت امیر کبیر لوگ جاتے ہیں، وہ لوگ جن کے پاس دولت کا شمار نہیں۔ بہت بڑی سطح پر جوا ہوتا ہے وہاں اور خرچ بہت زیادہ ہے۔" اس نے مجھے بتایا تو میں ہنس دیا۔

"وہیں چلتے ہیں۔ منفرد تو ہے نا۔" میں نے کہا تو اسے خوشگوار حیرت نے گھیر لیا۔

"اوکے، آپ کو میڈم کے گھر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ میں ٹھیک تین گھنٹے بعد آپ کو وہیں سے لے لیتا ہوں۔"

"اوکے، میں انتظار کروں گا۔" یہ کہہ کر میں اٹھا اور باہر کی طرف چل دیا۔ مجھے کار تانی کے گھر تک لے گئی۔

نو بجے کے بعد کا وقت تھا جب ہم اس کیسینو تک جا پہنچے۔ ہماری کار ایک پارکنگ میں لگوانے کے بعد ہمیں ایک راستے سے آگے بھجوا دیا گیا۔ وہ پودوں کی بڑی ساری باڑ تھی، اس کے دوسری طرف پہنچتے ہی یوں لگا جیسے ہم اٹھارویں صدی کے لندن میں آ گئے ہوں۔ ہمارے بالکل سامنے ایک بگھی کھڑی ہوئی تھی۔ جس کے پاس پرانی وضع کا لباس

پہنے ایک انگریز کھڑا تھا۔ وہ ہمیں دیکھ کر ہماری جانب بڑھا۔ اس نے آکر ہاتھ ملایا اور بڑے اسٹائل سے پوچھا کہ ہم نئے آئے ہیں۔ طارق کے بتانے پر اس نے ہمیں ایک سمت کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ پہلے وہاں سے ٹکٹ لیا جائے۔ میں نے طارق کو اسی وقت پاؤنڈ کی ایک گڈی تھما دی، جسے اس انگریز نے بڑی دلچسپی سے دیکھا۔ طارق ٹکٹ لے کر آگیا تو وہ انگریز یوں بچھنے لگا جیسے ہم ہی اس کے لارڈ ہوں۔ وہ ہمیں اس پرانی وضع کی بگھی تک لے گیا۔ جلدی سے پائیدان لگایا، ہم اس میں سوار ہو گئے۔ اندر ایک لالٹین روشن تھی جو تیل کے بغیر تھی۔ وہ بگھی چند منٹ چلی اور پھر ایک پورچ میں جا رکی۔ سامنے بٹلر قسم کے چند لوگ کھڑے تھے۔ انہوں نے پرانے انگریزوں والی وضع داری نبھائی اور ہمیں راستہ دکھا کر اندر لے گئے۔

''سر کس سمت جانا پسند کریں گے، ڈائننگ ہال کی جانب یا کیسینو؟'' ایک انگریز نے قدرے جھک کر پوچھا۔

''ڈائننگ ہال۔'' میں نے فوراً کہا تو اس نے اس جانب ہماری رہنمائی کر دی۔

ہال میں پرانی موسیقی بج رہی تھی۔ سامنے کئی سازندے مختلف ساز بجا رہے تھے۔ ایک لڑکی جو آدھے سے زیادہ برہنہ تھی، وہ کبھی لہکتی اور کبھی گاتی پھر رہی تھی۔ میں نے اس کی طرف سے نگاہیں ہٹا کر پوچھا۔

''یار طارق، یہاں حلال فوڈ تو ملنے سے رہا، کیا کریں کھانے کے بارے میں؟''

اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتا، ایک اٹھارویں صدی کا لباس پہنے سفید بالوں والی انگریز لڑکی مسکراتی ہوئی ہمارے پاس آگئی۔ اس نے آرڈر کے لیے پوچھا تو طارق نے وہی سوال اس سے کہہ دیا۔ اس نے اطمینان دلایا۔ اس نے بتایا کہ ان کے پاس ایک مسلم شیف بھی ہے، جو ایشیائی کھانے بناتا ہے۔ اگر کوئی پرانی ڈش چاہیے تو وہ بھی مل جائے گی۔ بہرحال طارق نے آرڈر کر دیا۔ اور ہم ماحول سے لطف اندوز ہونے لگے۔

جس وقت ہم کھانا کھا کر چائے پی رہے تھے۔ اس وقت ایک لڑکی ہمارے پاس آکر بے تکلفی سے بیٹھ گئی۔ اس نے کافی مختصر لباس پہنا ہوا تھا، جس میں پرانے زمانے کی جھلک تھی۔ اس کے بال سفید رنگ کے تھے، جسے اس نے کہیں کہیں سے رنگا ہوا تھا۔ ان بالوں میں پیلے رنگ کا پھول سجایا ہوا تھا۔ بھاری میک اپ، پپوٹوں پر نیلا رنگ تھا، گہری لپ اسٹک، گلے میں نقلی موتیوں کا ہار تھا اور کانوں میں اسی رنگ کے بندے تھے۔ وہ ہمارے قریب پڑی کرسی پر آن بیٹھی اور خمار آلود لہجے میں بڑے نخرے سے پوچھا۔

''کیا آپ لوگ انجوائے کرنا چاہیں گے؟''

''مثلاً یہاں انجوائے کے لیے کیا کچھ ہو سکتا ہے؟'' میں نے تیزی سے پوچھا، کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس معاملے میں طارق کوئی بات کرے۔

''بہت کچھ، میں ہوں، اگر میں پسند نہیں تو میرے جیسی مزید بہت ساری ہیں۔ جو رات پھر آپ کو سونے نہیں دیں گی اور اس دنیا میں لے جائیں گی جہاں مزہ اور......'' اس نے کہنا چاہا تو میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

''اس کے علاوہ کیا ہے؟''

''قسمت آزمانے کے بہت سارے سنسنی خیز مواقع، جن میں ڈھیروں دولت کمائی بھی جا سکتی ہے اور آپ کی دولت جا بھی سکتی ہے۔ ہر طرح کا کھیل اور کھلاڑی یہاں موجود ہے۔'' اس نے میری آنکھوں

میں دیکھتے ہوئے یوں کہا جیسے مجھے چیلنج کر رہی ہو۔
یہ اس کا کاروباری طریقہ تھا۔ میں سمجھ رہا تھا اور جان بوجھ کر اس کی باتوں میں آ کر بڑے غور سے کہا۔

"یہ تو بہت اچھا ہے، کیا تم مجھے کسی ایسے کھلاڑی سے ملوا سکتی ہو، جو کبھی نہ ہارا ہو۔"

میرے یوں کہنے پر وہ ایک لمحہ کے لیے چونکی، پھر طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔

"کیا تمہارا ہار جانے کا ارادہ ہے۔"

"دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے، قسمت ہی آزمانا ہے نا تو کسی ایسی جگہ آزمائیں جو بہت مشکل ہو۔"

میں نے یوں کہا جیسے مجھے خود پر حد سے زیادہ اعتماد ہو۔ تبھی اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بڑی ادا سے بولی۔

"آؤ، تمہیں ایک حسین کھلاڑی سے ملاتی ہوں۔"

میں اس کے ساتھ اُٹھ گیا۔ وہ مجھے لے کر ہال سے باہر آ گئی۔ طارق میرے پیچھے تھا۔ ایک لمبی راہداری کے بعد وہ مجھے ایک اور ہال میں لے گئی، جہاں بہت سارے لوگ مختلف میزوں پر بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ وہاں شور نہیں تھا، مجھے ایک لمحے کے لیے تو یوں لگا جیسے میں کسی لائبریری میں آ گیا ہوں۔ وہ مجھے لیتے ہوئے سامنے بنے کاؤنٹر تک گئی۔ وہاں پر موجود لوگ مجھے بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ لازمی بات ہے، اس وقت میری حیثیت ایک "بکرے" کی سی تھی، جسے وہ ذبح کرنے والے تھے۔ وہ مجھے لے کر ایک ایسی میز کی جانب بڑھ گئی جہاں پر ایک اداس سی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ہولڈر تھا، جس کے آگے سگریٹ سلگ رہی تھی۔ اس کے سامنے میز پر شیشے کا ایک گلاس دھرا ہوا تھا، جس میں سرخ رنگ کی شراب تھی۔ اس نے دزدیدہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور گلاس اٹھا کر اس میں سے گھونٹ لے لیا۔ وہ یوں لگ رہی تھی جیسے کوئی شہزادی ہو، یا کم از کم کسی لارڈ کی بیٹی سے کم تو دکھائی نہیں دے رہی تھی، جس کے پاس بے انتہا دولت ہو۔

"یہاں بیٹھیں۔" میرے ساتھ آئی لڑکی نے کہا، میں بیٹھ گیا تو مجھ سے ذرا فاصلے پر طارق بھی ایک کرسی پر جم گیا۔ تبھی ایک گرانڈیل شخص وہاں آ گیا۔ اس کے پاس ٹوکن سے بھری ٹوکری تھی اور اس کے ساتھ تاش کے بالکل نئے پیکٹ۔ میرے ساتھ لڑکی نے کہا۔

"رقم دو، تمہیں ٹوکن ملیں۔"

طارق نے ٹوکن نکال کر دے دیئے، تب تک سامنے بیٹھی لڑکی نے اپنے پرس میں سے کافی ساری رقم نکال کر دے دی تھی۔ ٹوکن سامنے آ گئے تو اس نے مجھے اشارہ کیا کہ میں کوئی سا بھی تاش کا پیکٹ لے لوں، میں اسے اٹھا لینے کا اشارہ کیا۔ اس نے بے دھیانی سے ایک پیکٹ اٹھایا اور اسے کھول کر میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے پتوں کو شفل کیا اور اس کے سامنے رکھ دیئے۔ اس نے پتے اپنے ہاتھوں میں لے کر دوبارہ شفل کیے۔ اس دوران اس نے غور سے میری طرف دیکھا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ اس کی آنکھیں سیاہ نہیں ہیں، بلکہ لینز لگائے ہوئے ہیں۔ میں پتوں پر کم اور اس کی طرف توجہ زیادہ دے رہا تھا۔ اس نے پتے بانٹ دیئے۔

میں پہلے راؤنڈ میں ہار گیا۔ وہ بڑے اطمینان سے گلاس سے سپ لیتی رہی۔ لیکن اگلے راؤنڈ میں گڑبڑ ہو گئی۔ وہ میں جیت گیا۔ اور پھر مسلسل میں جیتنے لگا۔ وہ پریشان ہونے لگی۔ اس نے پریشان ہونا تھا، میں نے ان کیسینو والوں کا وہ کمال پکڑ لیا تھا، جس کی وجہ سے وہ کبھی نہیں ہاری تھی۔ میں اچھی

خاصی رقم جیت گیا تھا۔ دو گھنٹے مسلسل کھیلنے کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا تم مزید کھیلنا چاہو گی یا تمہارے پاس رقم ختم ہوگئی ہے۔"

"آج میں جتنے لائی تھی، کھیل چکی ہوں۔ اب مجھے اُدھار لینا ہوگا، جو مجھے پسند نہیں۔" اس نے شانِ بے نیازی سے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

"اوکے۔" میں نے کہا اور اٹھ گیا۔ اسی لمحے وہ بھی اٹھ گئی پھر مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولی۔

"میں آج تک نہیں ہاری ہوں، لیکن آج ہار گئی ہوں، کیا میں نام پوچھ سکتی ہوں تمہارا؟"

"میرے بارے میں ان سے پوچھ لو۔" میں نے طارق کی طرف اشارہ کیا اور وہاں سے پلٹ کر باہر کی جانب جانے لگا۔

میں کھلے میں آ گیا۔ وہاں آ کر چند منٹ لمبے لمبے سانس لیے۔ اندر تمباکو کا دھواں بہت زیادہ تھا۔ اتنے میں طارق آ گیا۔ وہ آتے ہی بولا۔

"آپ نے بہت پونڈ جیتے ہیں۔"

"اس کے پاس تھے ہی اتنے، اس کے بھی کیا، چھوڑو، آؤ۔ صبح وہ ہم سے ملے گی۔" میں کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا تب طارق بھی میرے پیچھے آتے ہوئے بولا۔

"ہاں وہ ڈنر کی آفر کر رہی تھی۔"

"بڑی بات ہے۔" میں نے بے پروائی سے کہا اور سامنے کھڑی بگھی کو دیکھنے لگا۔ ہم اس میں سوار ہوئے، وہ ہمیں لے کر پارکنگ تک آ گئی۔

گھر آ کر ہم بہت دیر تک گپ شپ کرتے رہے۔ تانی کی تان یہی ٹوٹتی تھی کہ تم جس شخص کو تلاش کرنے آئے ہو، وہ تمہیں ملے گا کیسے؟ میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ سو رات گئے ہم سو گئے۔

دوپہر سے کچھ دیر پہلے تک مہوش، جنید، تانی اور میں باتیں کرتے رہے۔ میرا ارونd کے ساتھ رابطہ تھا۔ وہ پوری طرح تلاش میں لگے ہوئے تھے۔ ان کی ساری توجہ اسی جانب تھی۔ میں نے انہیں رات ہی کیسینو کے بارے میں بتا دیا تھا لیکن انہیں وہاں سے کچھ بھی ایسا نہیں ملا تھا، جس سے پیش رفت ہوتی۔

میں تانی کے ساتھ اس کے آفس چلا گیا۔ میں جیسے ہی وہاں پہنچا طارق نے مجھے بتایا

"وہ رات والی لڑکی کا دو بار فون آ چکا ہے۔ وہ آپ سے ملنا چاہتی ہے۔"

"چلو اب فون کرے گی تو اسے یہیں بلا لینا۔" میں نے کہا اور صوفے پر جا بیٹھا۔ تب اس نے کہا۔

"سر وہ اب فون نہیں کرے گی، میں نے اس سے کہا تھا کہ ہم خود فون کریں گے۔ میں نے سوچا شاید آپ اس سے ملنا چاہتے ہیں یا نہیں۔"

"لاؤ وہ مجھے نمبر میں کال کرتا ہوں۔" میں نے کہا تو طارق نے لکھا ہوا نمبر مجھے دے دیا۔ میں نے کال ملائی تو دوسری طرف سے فوراً فون ریسیو کر لیا گیا۔

"ڈیورا بات کر رہی ہوں۔" وہ اسی خمار آلود لہجے میں بولی تو میں نے کہا۔

"میں وہی جس نے رات کا کچھ حصہ تمہارے ساتھ گذارا تھا اور تم مجھے ملنا چاہتی ہو۔"

"ہاں میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ تم کہاں ملو گے۔" اس نے ملائمت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"جہاں تم چاہو۔" میں نے کہا تو وہ چند لمحے سوچنے کے بعد بولی۔

"کیا آپ میرے ساتھ ڈنر کرنا پسند کریں گے۔"

"کیا یہ ڈنر ضروری ہے؟" میں نے پوچھا۔

''ہاں، بہت ضروری۔'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔
''کہاں؟'' میں نے پوچھا۔
''میرے گھر۔'' اس نے کہا۔
''ٹھیک ہے، میں اپنا شیڈول دیکھ لوں، میں کچھ دیر بعد آپ کو کنفرم کر دیتا ہوں۔'' میں نے اسے کہا تو چند منٹ باتیں کرتے رہنے کے بعد اس نے فون بند کر دیا۔ میں نے وہ نمبر اروند کو دے دیا کہ وہ اس پر بھی توجہ کرے۔ مجھے نمبر دیئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اروند کا فون آ گیا۔
''یہ تو وہی نمبر ہے، جس کی وجہ سے آپ اُس کیسینو میں گئے تھے۔''
''بہت خوب۔! اس کا مطلب ہے ہم درست سمت میں جا رہے ہیں۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔
''لیکن بہت احتیاط سے کہیں یہ جال ہی ثابت نہ ہو۔'' اس نے مجھے محتاط ہونے کا مشورہ دیا۔
''وہ میں دیکھ لوں گا۔'' یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔ میں دن کا کچھ حصہ تانی کے آفس میں رہا۔ پھر اس کے بعد میں کچھ لوگوں سے ملنے ساؤتھ ہال چلا گیا۔ وہاں سے میری واپسی شام کو ہوئی۔ اس دوران میں نے فون کر کے ڈیورا کو بتا دیا کہ میں ڈنر اس کے ساتھ لوں گا۔ اس نے اپنے گھر کے بارے میں بتا دیا۔
میں اس کے گھر تنہا جانا چاہتا تھا، لیکن جنید نہیں مانا، وہ میرے ساتھ ہو لیا۔ تانی نے ایک بندہ ڈرائیور کے طور پر ساتھ میں کر دیا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے سے زیادہ کے سفر کے بعد ہم کانوائے آئیز لینڈ میں جا پہنچے جو بالکل ساحل سمندر پر تھا۔ میرے سامنے ایک محل نما گھر تھا۔ پورچ میں کار رکی تو بٹلرز نے ہمارا استقبال کیا۔ ایک راہداری کے بعد ہال میں آئے تو ڈیورا سامنے کھڑی تھی۔ اس نے سیاہ اپر لیس ڈنر سوٹ پہنا ہوا تھا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا تو وہ میرے گلے لگ گئی۔ اس نے بڑی خوشگوار خوشبو لگائی ہوئی تھی، جس نے مجھے معطر کر دیا۔ پھر ہاتھ کے اشارے سے آگے بڑھنے کو کہا۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر ایک ایسے کمرے میں آ گئے جہاں دھیمی روشنی تھی، اور شیشے کی ایک دیوار تھی، جس کے پار سمندر کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ جہاں تک روشنی جا رہی تھی، سمندر دکھائی دے رہا تھا۔ گرم کمرے کے خواب ناک ماحول میں باہر کا منظر بہت صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہاں سیاہ صوفے پڑے ہوئے تھے۔ جیسے یہ کمرہ صرف گفتگو کے لیے استعمال کیا جاتا ہو۔ ہم آمنے سامنے بیٹھ گئے تو اس نے کہا۔
''خوش آمدید، مجھے یقین نہیں تھا کہ آپ یوں میری دعوت پر آ جائیں گے، لیکن میں اسے اپنی خوش نصیبی خیال کرتی ہوں۔''
''میں نے بھی سوچا، اتنی حسین لڑکی، مجھے بلا رہی ہو تو نہ جانا اچھا نہیں ہوگا، میری یادیں ہی خوشگوار رہیں گی۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو چند لمحوں کے لیے ہمارے درمیان خاموشی چھا گئی۔
''اچھا، تم اس کیسینو میں کیسے آئے؟'' اس نے اچانک پوچھا تو میں مسکرا دیا۔ یہ بڑا اہم سوال تھا۔ میں نے اپنے طور پر یہ طے کیا ہوا تھا کہ اگر وہ سوال کرے گی تو اس کا مطلب ہے اس کے پیچھے کوئی اور ہی کہانی ہے۔ سو میں نے اس کا جواب پہلے ہی سوچ رکھا تھا۔ لیکن سوچنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔
''دراصل جب مجھے یہ بتایا گیا کہ یہاں پرانے لندن کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے تو مجھے یہ دیکھنے کا شوق ہوا کہ پرانا لندن جسے ہم نے صرف پرانی فلموں میں دیکھا ہے، یا کتابوں میں پڑھا ہے وہ

دیکھنے میں کیسا ہوگا۔ شاید میں ڈنر کے بعد وہاں سے لوٹ آتا۔ مگر وہ کیسینو کی ملازمہ لڑکی مجھے اپنے ساتھ لے گئی۔"

"ہاں، گاہکوں کو گھیرنے کے لیے وہاں کئی لڑکیاں ہیں۔" اس نے کہا تو ہمارے درمیان پھر خاموشی در آئی یوں لگا جیسے باتیں ختم ہوگئی ہوں۔ تبھی وہ اٹھی اور میرے قریب آن بیٹھی۔ خوشگوار خوشبو کا جھونکا مجھے مسرور کر گیا۔ وہ میرے اتنے قریب آ گئی کہ اس کی سانسیں مجھے اپنے چہرے پر محسوس ہونے لگیں۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیا چاہ رہی ہے۔ میں خاموش رہا اور اس کی پیش رفت کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ مجھے گرم کر دینا چاہتی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے میرے اوپری بدن پر سے لباس اُتار دیا۔ اس کا سیاہ ایر لیس بھی اتر چکا تھا۔ اس کے بدن پر صرف سفید انڈر گارمنٹس ہی تھے۔ وہ آدھے گھنٹے تک اپنی کوشش کرتی رہی لیکن میرا وجود ٹھنڈا رہا۔ اس میں ذرا بھی حرارت نہ ہوئی تو وہ تھک کر الگ ہوگئی۔

"تم میں جذبات نہیں ہیں۔" اس نے غصے اور شرمندگی بھرے لہجے میں پوچھا، بلاشبہ وہ جذبات میں بہہ کر اس سطح پر تھی جہاں جنون سر چڑھ جاتا ہے۔ حیوانی جذبے اپنا آپ منوا لیتے ہیں۔ پھر کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

"ہیں، کیوں نہیں ہیں۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"میں نہیں مانتی کہ تم مرد ہو سکتے ہو، ورنہ ایک صحت مند نارمل آدمی، اس قدر ٹھنڈا رہے، تم مرد نہیں ہو۔" اس نے پاگلوں کی طرح دائیں بائیں سر مارتے ہوئے کہا۔

"تم صحت مند ہو، نارمل ہو؟" میں نے پوچھا۔

"بے شک میں ہوں۔" اس نے غصے میں کہا تو میں نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

"آؤ، اب کوشش کرو۔"

وہ چند لمحے مجھے دیکھتی رہی۔ وہ جس سطح پر پہنچ چکی تھی، اس کا بدن چیخ چیخ کر پکار رہا تھا۔ وہ مجھے منع کر ہی نہیں سکتی تھی، میں نہ بھی کہتا تو وہ مجبور تھی۔ ایک دم اس کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ وہ دوبارہ میرے قریب ہوئی، جیسے ہی اس نے میرے بدن کو ہاتھ لگایا، وہ ٹھٹک گئی۔ چند لمحے کسی مجسمے کی مانند رہی پھر پیچھے ہٹ گئی۔

"کیا ہوا؟"

"پتہ نہیں، مجھے یوں لگ رہا ہے کہ جیسے میں برف ہوگئی ہوں۔ چند لمحے پہلے والے جذبات ہی نہیں ہیں۔" وہ حیرت زدہ انداز میں بولی۔

"تم تو نارمل ہو صحت مند ہو؟" میں نے اسے یاد دلایا تو اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ پھر یوں اس نے طویل سانس لیا جیسے ہار گئی ہو۔ جیسے اسے سمجھ میں آ گیا ہو کہ برف بدن کیسے ہوتے ہیں۔ وہ اٹھ گئی۔ اس نے اپنا لباس پہنا اور سامنے پڑے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر کئی سوال تھے۔ میں خاموش رہا تو اس نے پوچھا۔

"اپنے بارے میں کچھ بتائیں گے۔" اس نے پوچھا تو میں نے یونہی جھوٹ سچ اسے سنا دیا کہ میں اپنے ملک میں ایک بزنس مین ہوں اور کاروبار کے سلسلے ہی میں یہاں آیا ہوں۔ اسی طرح میں نے اس کے بارے میں پوچھ لیا تو وہ بولی۔

"میں ڈیورا، ایک یہودی ہوں، ایک بدقسمت عورت، تمہیں یہاں بلانے کا مقصد بھی یہی ہے کہ میں تمہیں اپنے بارے میں بتا دوں اور پھر تم سے ایک استدعا کروں۔"

"مقصد، استدعا؟ میں سمجھا نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"دنیا کے بیشتر لوگوں کی مانند شاید تم بھی نہیں جانتے ہو کہ یہودیوں میں شادی تو ہو جاتی ہے لیکن طلاق لینا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ہم ایسی عورتوں کو "اگونا" کہتے ہیں، مطلب زنجیروں میں جکڑی ہوئی عورت، میں طلاق چاہتی ہوں، لیکن جب تک میرا شوہر اپنی مرضی سے مجھے طلاق نہیں دے گا، میں آزاد نہیں ہو سکتی۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" میں نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

"ایسا ہی ہے، یہودی معاشرے میں اگر کسی بیوی کا شوہر طلاق دینے پر رضامند نہ ہو تو پھر وہ جبر بھری زندگی گزارتی ہے۔ سمجھو قید تنہائی ہے۔"

"یہ اصول ہے یا......"

"دراصل پرانے زمانے میں جنگ پر چلے جانے والے مردوں کی ان بیویوں کو 'اگونا' قرار دے دیا جاتا تھا، جو مرد واپس نہیں آتے تھے یا لاپتہ ہو جاتے تھے۔ وہ عورتیں دوسری شادی نہیں کر سکتی تھیں۔ یہ اصول جدید صورت میں اس طرح لاگو ہے۔ میں قید تنہائی اور جبر کی زندگی گزار رہی ہوں۔ میرا شوہر مجھے طلاق نہیں دے رہا اور میں زندگی گزارنے پر مجبور ہوں۔" اس نے غم ناک لہجے میں بتایا تو میں نے پوچھا۔

"میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں ڈیورا؟"

"یہی کہ تم میری معاشی حالت کو برقرار رکھ سکتے ہو۔" اس نے واضح لفظوں میں کہا۔

"میں سمجھا نہیں۔" میں نے الجھتے ہوئے کہا۔

"یہ جو تم ٹھاٹھ بھاٹ دیکھ رہے ہو، یہ شاہانہ زندگی، یہ محل، یہ میرا نہیں، میرے مالک کا ہے، جس کے پاس میں نوکری کرتی ہوں اور اس سے اپنی ضروریات زندگی چلاتی ہوں۔ یہ اس نے مجھے رہنے کے لیے دیا ہوا ہے۔ کل رات جب تم جیت گئے تو میرے مالک نے مجھے بلا کر وارننگ دی ہے۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔

"کیسی وارننگ؟" میں نے پوچھا۔

"یہی کہ میں پہلی بار اس طرح کیوں ہاری ہوں۔ اس کی وجہ پتہ کرو یا پھر نوکری چھوڑ دو۔"

"تو یہ سب کچھ تم نے اس لیے کیا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، میں نے اپنا بدن استعمال کرنا چاہا مگر تم وہ نہیں ہو جو دکھائی دے رہے ہو۔ تم یہ جانتے ہو کہ میرے ہارنے کی کوئی وجہ نہیں تھی، میں نے جیتنا ہی تھا تو پھر......" وہ کہتے کہتے رک گئی۔

میں اس کی بات سمجھ چکا تھا۔ اس کا ایسا کرنا اس کی سمجھ کے مطابق درست تھا۔ دراصل کیسینو والے ہر طرح سے دولت اکٹھی کرنے کے تمام حربے آزما رہے تھے۔ ایک حسین لڑکی کو شوپیس کے طور پر رکھا ہوا تھا۔ وہ جو تاش وہاں دیتے تھے، وہ ایسی تھی کہ ان پتوں کے بارے میں پتہ چل جاتا تھا۔ وہ ایسے لینز پہنتی تھی۔ جن سے ان پتوں کی دوسری طرف کا پتہ چل جاتا تھا۔ اس طرح اس کے ہارنے کا کوئی جواز تھا نہ کوئی وجہ۔ میں جان گیا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ میرے ہاتھوں پر لگے کیمیکل سے ان پتوں میں وہ وصف ہی نہ رہا۔ وہ عام پتے بن گئے۔ لینز سے ان کا تعلق ختم ہو گیا۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ یہ سب کیا تھا اور میں نے کیا کیا؟

"کیا چاہتی ہو نوکری کرنا یا نہیں؟"

میرے اس سوال پر وہ میری طرف دیکھتی رہی اور پھر روکھتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"ظاہر ہے میں نوکری چاہتی ہوں۔"

"اپنے مالکان کو بتا دینا کہ جس طرح کے تم نے لینز پہنے ہوئے تھے۔ میں تمہارے ان لینز کے

بارے میں پہلے ہی سے معلومات رکھتا تھا۔ میں ایسے موقعہ کے لیے کیمیکل رکھتا ہوں۔ وہ لگا دیا، تیرے مالکان جانتے ہیں کہ وہ کیا ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا اور اٹھ گیا

"کہاں جا رہے ہو، ابھی بیٹھو، وہ کیمیکل نہیں تھا، کچھ بھی نہیں تھا۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا تو میں بولا۔

"تمہارا کام ہو گیا، اب کیا ہے؟"

"نہیں تم ڈنر تو کر کے جاؤ گے اور پھر مجھے یہ بتاؤ گے کہ ایسا کیا کیا کہ پتہ مجھے......" اس نے کہنا چاہا تو میں نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں اب نہیں، پھر سہی۔"

"میں مانتی ہوں کہ یہ سب بعد میں......" وہ تیزی سے کہنے لگی تو میں نے اشارے سے روک دیا۔

"تمہیں اپنی نوکری بچانا ہے، وہ بچاؤ بس۔" میں نے کہا اور اس کے گال یوں تھپتھپا دیئے، جیسے چھوٹے بچے کو منایا جاتا ہے۔ میں نے کمرے سے باہر جانے کے لیے قدم بڑھا دیئے۔ وہ میرے ساتھ باہر تک آئی، جنید ہال ہی میں تھا۔ میں پورچ میں گیا اور کار میں بیٹھ کر وہاں سے چلا آیا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں اس ان دیکھے گاڈ فادر کے کہیں قریب ہی ہوں۔

☆......☆......☆

مجھے لندن آئے وہ تیسرا دن تھا۔ میرا اروند سے پورا رابطہ تھا۔ اس دن چھٹی تھی۔ تانی اس دن میرے ساتھ وقت گذارنا چاہ رہی تھی۔ اپنے ساتھ مجھے لندن گھمانے کی خواہش تھی اُسے۔

"دیکھ تانی، مجھے یہاں کی تاریخ جغرافیہ یا نظاروں سے کوئی رغبت نہیں، مجھے جو کام کرنا ہے، میری ساری توجہ اس طرف ہے۔ کیونکہ میں سیر کے لیے نہیں آیا۔" میں نے اسے صاف لفظوں میں بتا دیا تو وہ بولی۔

"میں تمہارے ساتھ دریائے ٹیمز کے کنارے بیٹھ کر باتیں کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"چلو! وہیں چلتے ہیں۔" میں نے ایک دم سے کہا تو وہ دھیمے سے لہجے میں بولی۔

"کہیں تم ناراض تو نہیں ہو؟"

"او نہیں تانی، میں نے اصل میں کچھ لوگوں کے ذمے کام لگایا ہے، میرا رابطہ انہی کے ساتھ ہے۔ میں اگر ایک دم کہیں چلا گیا، یا فون کالز آتی رہیں تو......" میں نے کہنا چاہا تو وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"او یار، کیا میں نہیں سمجھتی ہوں، مجھے گارڈ کے طور پر ہی ساتھ لے لو۔" اس نے کہا اور ایک دم سے ہنس دی۔ کچھ دیر بعد ہم پیدل ہی گھر سے نکل پڑے۔ موسم ابر آلود تھا اور سردی کافی تھی، لیکن اتنی نہیں تھی کہ برداشت سے باہر ہوتی۔ ہم چلتے چلے گئے۔

"کیا پیدل ہی جانا ہے دریائے ٹیمز تک۔" میں نے پوچھا تو وہ ہنس دی۔

"نہیں نہیں نزدیک ہی ٹیوب ہے، اس سے جائیں گے، بس یہ ذرا سا آگے۔" اس نے سامنے اشارہ کرتے ہوئے کہا اور اس جانب بڑھ گئے۔

ہم ٹیوب میں جا پہنچے، گیٹ کے بالکل سامنے سیٹیں خالی تھیں۔ جہاں تانی میرے دائیں جانب بیٹھ گئی اور بائیں جانب ایک شخص آ کر بیٹھ گیا جس پر میں نے فطری طور پر توجہ نہیں دی۔ اس نے بیٹھتے ہی اخبار اپنے سامنے پھیلا لی۔ کچھ دیر گذری تھی کہ اس کی کہنی میرے پہلو میں زور سے لگی۔ اس سے پہلے

کہ میں اس سے پوچھتا یا اسے احساس دلاتا، میرے کانوں میں آواز آئی

''ڈیورا سے ملاقات کیسی رہی؟''

بلا شبہ آواز اسی شخص کی تھی۔ جس نے اپنے سامنے اخبار پھیلایا ہوا تھا۔ اس نے اخبار اسی طرح اپنے سامنے پھیلائے رکھا۔

''کون ہو تم؟'' میں نے اسی طرح دھیمے لہجے میں پوچھا تو اس نے اخبار ہٹائے بغیر کہا۔

''اس نے ٹھیک کہا ہے کہ تم وہ نہیں ہو، جو دکھائی دیتے ہو اور ہاں میری طرف دیکھنے کی بجائے صرف میری بات سنو۔''

میں نے اپنا چہرہ سامنے کرلیا تاکہ اس کی بات سن سکوں کہ آخر وہ کہنا کیا چاہتا ہے۔ تبھی میں نے کہا۔

''بولو۔''

''سنو۔! ایک گریٹ آفر ہے تمہارے لیے۔ جتنا تم نے ایک رات میں کمایا ہے، ہر رات کما سکتے ہو، آفر پر اگر بات کرنا چاہو تو ڈیورا کو فون کر کے جگہ بتا دینا، میں آ جاؤں گا۔'' اس کے لفظ ابھی منہ ہی میں تھے کہ ٹرین رک گئی۔ وہ اٹھا اور انتہائی تیزی سے کھلے ہوئے دروازے سے باہر نکل گیا۔ میں بھی اس کی طرف تیزی سے لپکا، لیکن اس وقت سامنے سے کئی لوگ اندر آ گئے۔ میں باہر نہ نکل سکا۔ میں نے باہر دیکھنا چاہا، لیکن وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا۔ دروازہ بند ہو گیا۔ اور ٹرین چل پڑی۔ میں کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح سیٹ پر آ بیٹھا۔

''کیا بات تھی، یہ تم اچانک.....؟'' فطری طور پر تانی نے مجھ سے پوچھا تو میں نے دھیمے سے لہجے میں اسے بتا دیا کہ ہوا کیا تھا۔ تبھی وہ بولی۔

''پھر کیا سوچا تم نے؟''

''ابھی سوچنے کا وقت ہی کہاں سے ملا ہے، لیکن میں اس سے دوبارہ ضرور ملنا چاہوں گا۔'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''لیکن سوچ لو، یہاں کچھ بھی ممکن ہے؟''

تانی نے کہا تو میں خاموش رہا۔ سوچ لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

ہم دریائے ٹیمز کے کنارے جا پہنچے تھے۔ یہاں سے لندن کے نظارے سامنے تھے لیکن میرے ذہن پر وہی اجنبی سوار تھا۔ میں کچھ دیر وہاں کھڑا رہا۔ پھر میں نے ڈیورا کو فون کرنے کے لیے کال ملا دی۔

''مجھے تمہارے فون کا انتظار تھا۔'' اس نے خوش کن لہجے میں کہا۔

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہیں جو آفر ہوگی سو ہوگی۔ لیکن میں خود تم سے ملنا چاہتی ہوں۔'' اس نے یوں کہا جیسے مجھ سے بات کر کے اسے خوشی مل رہی ہو

''میں پھر پوچھوں گا کہ کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''تم نے میری زندگی آسان کر دی ہے۔ زندگی میں پہلی بار مجھے یہ سکون ملا ہے کہ زندگی کسی مرد کے بنا بھی گذاری جا سکتی ہے۔ بدن کی آگ اس طرح ٹھنڈی ہو جائے گی، میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ میں برف کی سل بن گئی ہوں۔''

''جبکہ تم نارمل ہو۔'' میں نے اسے یاد دلایا

''مجھے اب پتہ چلا ہے، اسے ہی نارمل زندگی کہتے ہیں جب آپ اپنے جذبات پر کنٹرول رکھتے ہوں۔ ایب نارمل تو وہ ہوتے ہیں جو اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکتے۔ جو اپنے بدن پر کنٹرول نہیں رکھ سکتا، وہ کیا کرے گا۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا تو میں لمحہ بھر خاموش رہا، پھر پوچھا۔

''وہ کون ہے جو آفر دینے آیا تھا اور غائب ہو گیا؟''

''میں خود اس کے بارے میں نہیں جانتی ہوں،

سوائے اس کے کہ وہ کیسینو کے مالک سے بہت قریب ہے۔ یہاں محل میں کبھی کبھار مالک کے ساتھ آتا ہے۔ کبھی کئی کئی دن تک یہاں رہتا ہے۔ آج صبح وہ آیا، مجھ سے تمہاری باتیں کرتا رہا اور چلا گیا۔“

”تم نے کیا بتایا؟“ میں نے پوچھا۔

”یہی کہ شعلے سے برف بن جانے کی کہانی۔ تمہاری اور میری ملاقات کی روداد۔“ اس نے کہا۔

”اچھا، اس سے کہو کہ مجھ سے ملے، مگر اس طرح کہ میرے ساتھ جو لڑکی ہے، اسے پتہ نہ چلے۔“

”ٹھیک ہے، میں کہہ دیتی ہوں۔“ اس نے کہا اور میں نے فون بند کر دیا۔

ایک بوجھ میرے ذہن سے اُتر گیا تھا۔ وہ جو میں پریشان تھا کہ وہ شخص جو اچانک میرے سامنے غائب ہو گیا، اس کے بارے میں اطمینان ہو گیا کہ وہ کہیں نہیں گیا، وہ خود مجھ سے ملنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ وہ مجھے ملے گا۔

تانی سامنے ایستادہ عمارتوں کو دیکھ رہی تھی۔ میں اس کی محویت کو دیکھتا رہا، پھر پوچھا۔

”کیا دیکھ رہی ہو؟“

”یہ جو سامنے عمارتیں ہیں، میں انہیں دیکھ کر سوچ رہی ہوں کہ ان عمارتوں کو کھڑا کرنے میں کتنے انسانوں کا خون بہا ہے۔ ان انگریزوں نے دنیا کے بیشتر سے زیادہ حصے پر حکومت کی ہے، وہاں کی دولت لوٹ کر انہوں نے اپنا ملک بنایا ہے۔“

”میں نہیں سمجھتا کہ اس میں ان انگریزوں کا کوئی قصور ہے، کیونکہ جو قومیں اپنی آزادی کی قدر نہیں کرتیں، اپنے قومی مفادات کو شک کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ ان کے ساتھ جلد یا بدیر ایسا لمحہ آتا ہے کہ وہ قوم مُردہ قوم بن جاتی ہے۔ اس کا لہو بہہ جائے تو بھی کچھ نہیں ہوتا۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ وہ قربانی نہیں ہوتی۔ قربانی ہمیشہ زندہ کی ہوتی ہے مُردہ کی قربانی نہیں ہوتی۔ زندہ قومیں ہی اپنی آزادی کی حفاظت کر سکتی ہیں۔“ یہ کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔ پھر میں نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

”چھوڑو، ان باتوں کو کوئی اور بات کریں۔“

ہم یوں ہی ماضی میں کھو گئے۔ وہ روہی کی باتیں کرتی رہی۔ روہی میں گزرا ہوا وقت یاد کرتی رہی۔ میں جب وہاں گیا تو انہوں نے کیا سوچا۔ انہی باتوں کے دوران اس نے یہ انکشاف کر دیا۔

”کیا کبھی تم نے محسوس کیا کہ تم کہیں بھی ہو، روہی کا تم سے رابطہ رہتا ہے، دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہہ سکتے ہو کہ روہی والوں کو تمہارے بارے میں خبر ہوتی ہے کہ تم کہاں ہو؟“

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

”ہاں میں نے محسوس کیا ہے۔ بلکہ جسپال نے تو کئی بار مجھ سے باقاعدہ یہ سوال بھی کیا ہے، چونکہ میرے پاس جواب نہیں تھا، اس لیے میں نے یہی کہا کہ جب روہی جائیں گے تو پوچھ لینا۔ کیا تم جانتی ہو کہ ایسا کیسے ہے؟“

”ہاں۔! میری طرح تم اور جسپال دونوں میں بھی ایک چپ لگی ہوئی ہے۔ یہ کسی وقت انہوں نے ہم میں لگا دی تھی، جس کا ہمیں نہیں پتہ تھا۔“

”تمہیں کیسے پتہ چلا؟“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”انہوں نے مجھے بتا دیا تھا، یہ چپ کہاں لگی ہے، مجھے نہیں معلوم اور نہ ہی میں نے پتہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ میں سمجھتی ہوں یہ ہمارے فائدے کے لیے ہے۔ میں نے کئی بار محسوس کیا ہے۔“ وہ بتا چکی تو میں بولا۔

”ہاں میں نے کئی بار محسوس کیا ہے، یہ ہمارے

فائدے ہی کے لیے ہے۔ خیر، میں یہ بات جسپال کو بتا دوں۔'' یہ کہہ کر میں نے فون نکالا ہی تھا کہ مجھے سامنے سے ڈیورا اور وہی شخص آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ اس شخص کا چہرہ آدھے سے زیادہ ڈھکا ہوا تھا۔ سر پر بڑی سی ٹوپی تھی۔ جس میں سے ڈیورا کی طرح اس کے بھی لمبے بال دکھائی دے رہے تھے۔ غور سے دیکھنے پر بھی اس کا چہرہ نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ انہوں نے لانگ کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ وہ ہمارے پاس آ کر رک گئے۔ ڈیورا نے مجھ سے ہاتھ ملایا، پھر تانی سے، وہ شخص ویسے ہی کھڑا رہا۔ تبھی ڈیورا نے مجھ سے کہا۔

''کیا تمہارے پاس چند منٹ ہوں گے، میرے اس ساتھی کی بات سن لو۔''

''کیوں نہیں۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں اتنا وقت تمہاری ساتھی کو وقت دیتی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اس کے ساتھ بینچ پر بیٹھ گئی۔ وہ سامنے ریلنگ کی جانب بڑھ گیا۔ میں اس کے ساتھ جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ دریا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا، اس لیے میری بات غور سے سننا، میں جو بھی کہوں اس پر ردعمل نہ دکھانا، تم جانتے ہو کہ میری ایک ساتھی تمہاری ساتھی کے ساتھ بیٹھی ہے اور اسے نہیں معلوم کہ ہم کیا بات کر رہے ہیں۔''

''بولو۔'' میں نے صورت حال کو سمجھتے ہوئے کہا۔

''میں نے تمہارے بارے میں جاننے کی کوشش کی ہے، تھوڑا بہت پتہ چلا ہے، خیر! کیا تم جانتے ہو کہ اس وقت دنیا میں افراتفری ہے، جنگیں ہیں، قوموں کے درمیان کشمکش ہے یہ کیوں ہے؟ یہ صرف طاقت کے لیے ہے۔ بڑا طاقتور چھوٹے کو نگل رہا ہے اور بے وقوف قومیں اپنے ہی لوگوں کا گلا کاٹ رہی ہیں۔ مجھے اس پر بحث نہیں کرنی، میں تمہیں ایک بزنس ڈیل دینا چاہتا ہوں، اگر تم مان لو۔''

''کون سی بزنس ڈیل؟''

''دیکھو! ہم ایک کمپنی چلاتے ہیں۔ اس کے لیے ملازمین رکھتے ہیں۔ مینیجر سے لے کر شوفر تک کتنے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ سب اس لیے کہ ہم دولت کما سکیں۔ بزنس کی دنیا میں نام بنا سکیں، ایک ایمپائر کھڑی کر سکیں۔ دنیا میں ایسا ہی ہو رہا ہے۔ ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ جو بھی ملازم بھرتی کریں، وہ ایماندار ہو، اپنے کام کا ماہر ہو، ہم اس کی مہارت کے بدلے میں اسے اس کا معاوضہ دیتے ہیں۔''

''یہ تمہید ہے یا تم کوئی معلومات دے رہے ہو۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا تو اس نے برا منائے بغیر کہا۔

''میری بھی ایک کمپنی ہے۔ میں نے اس میں اتنے لوگ بھرتی کئے ہیں کہ مجھے خود نہیں معلوم، لیکن اتنا پتہ ہے کہ وہ لوگ کیسے ہیں۔ ان میں سیاست دان ہیں، مذہبی لیڈر ہیں، قانون دان ہیں، اداکار ہیں، غنڈے ہیں۔ یہ سب میرے اشاروں پر وہی کچھ کرتے ہیں، جو میں چاہتا ہوں۔ میں نے انہیں ہائیر کیا ہوا ہے۔ جس معاشرے میں جو چاہوں، وہی کروا لیتا ہوں۔'' اس نے کہا تو میں چونک گیا، کہیں یہ وہی گارڈ فادر تو نہیں جس کے پیچھے میں یہاں تک آ پہنچا ہوں؟ میں نے تیزی سے اس کی طرف دیکھا۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

ابن حق

محبت اور نفرت کی دھیمی دھیمی آنچ اور آنسوؤں کی روشنائی سے تحریر دوستوں کی دوستی کا احوال۔
نئے آہنگ اور نئے رنگ میں رنگی خوب صورت تحریر۔

سال ہونے کو آیا تھا' ہم تایا کے ہاں نہیں گئے تھے' انہوں نے بہت اصرار کیا تھا بلآخر امی نے آج اعلان کر دیا کہ اس اتوار کو ہم سب تایا کے ہاں پنڈی جائیں گے۔ یہ سننا تھا کہ ہم سب نے یا ہو کا نعرہ لگایا تھا۔ ہم سب میں شامل ہیں یعنی کمیل اور میری چھوٹی بہن شمائل' چھوٹا بھائی شہیر اور امی ابو تھے۔ امی اور ابو بھی سامان ضرورت پیکنگ کر رہے تھے' امی بھی اپنی ضروریات کی اشیاء اکٹھی کرنے میں لگی ہوئی تھیں۔ شمائل اور شہیر تو خوشی کے مارے اچھل رہے تھے۔

''آپا بڑا مزہ آئے گا تایا کے ہاں۔'' شہیر بول رہا تھا۔ ''میں تو شریفے توڑ توڑ کر کھاؤں گا ان کے صحن میں لگے ہوئے درختوں سے۔''

''میں تو املی کے ٹارے کھاؤں گی' اُم...... ہاہا۔'' شمائل بولی۔ کٹارے کا ذکر آتے ہی اس کے منہ میں پانی آ گیا تھا۔ اس کے اس طرح کرنے سے ہمارے منہ میں بھی پانی اتر آیا تھا۔

''آپ تو آپا...... آپ کیا کریں گی؟'' شہیر نے کچھ سوچ کر پوچھا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتی کہ اتنے میں وہاں سے امی کا گزر ہوا' شہیر کے الفاظ ان کے کان میں بھی پڑے تھے' سن کر بولیں۔

''یہ کیا کریں گی اپنے کزن شمیم بھائی کی ڈائری لے کر ایک کونے میں بیٹھ جائیں گی اور مجال ہے پھر کوئی اس سے کام ہو پائے جب تک کہ کوئی افسانہ نہ پورا کرلے۔ اس کی اسی حرکت پر تو بھائی بھی عاجز ہیں' لاکھ منع کرتے کرتے بھی وہ شمیم کی ڈائری کمیل کی معصوم اوپر نکال کر دے دیتی ہیں۔''

''ہائے امی...... آپ اگر پڑھی لکھی ہوتیں تو ہمارے شمیم بھائی کی ڈائری پڑھتیں۔ کیا غضب کا لکھتے ہیں وہ' میں تو ان سے کئی مرتبہ کہہ چکی ہوں کہ کیوں اپنی تحریروں کو چھپا کر رکھا ہے' اسے کسی ڈائجسٹ یا میگزین کی نذر کریں۔ اس پر ان کا کہنا ہے کہ رائٹر کی بھی کوئی زندگی ہوتی ہے۔ گنتی کے چار پیسے دے کر ادارے والے احسان کر دیتے ہیں جبکہ عمر بھر بلکہ ان کی نسلیں بھی ان کہانیوں کو چھاپ کر کھاتی رہتی ہیں۔ رائٹر بے چارہ ایک مرتبہ چند روپے کا معاوضہ لے کر صبر کے گھونٹ پیتا رہتا ہے۔'' اس نے اپنی امی کو یہ سنا کر مبہوت کر دیا تھا یوں بھی انہیں کیا پتا تھا یہ لکھنا لکھانا کیا ہوتا ہے۔

''ائی ہو گا نگوڑ مارا...... میری بلا سے۔'' امی نے جھٹکے دار انداز میں کہا اور پھر میری پیٹھ پر تھپکی دیتی ہوئی اپنے اٹھتے قدموں کے ساتھ بولیں۔ ''بیٹی کمیل! اپنی تیاری تو مکمل کر لو' دور کا سفر ہے کہیں کوئی سامان رہ نہ جائے۔''

''جی اچھا امی!'' ہم نے کہا اور پھر ہم یعنی مابدولت کمیل صاحبہ اپنی تیاری میں لگ گئیں۔ ہمیں تو اور کوئی شوق نہ تھا سوائے بھائی شمیم کی

ڈائری پڑھنے کا' وہ ڈائری دیتے بھی نہیں تھے کہ چلو پڑھ کر واپس کر دیں گے۔ سال پہلے بھی تایا کے ہاں جانا ہوا تھا مگر پڑھنے کا موقع نہیں ملا تھا خیر اب کے تو ہم نے عہد کیا تھا کہ ضرور ان کی ڈائری پڑھیں گے۔

بہرطور خدا خدا کر کے اتوار آیا اور ہم سب ہوائی جہاز کے ذریعہ پنڈی کے لیے روانہ ہوئے۔ میرا دل تو چاہتا تھا کہ اڑ کر جلد از جلد تایا کے ہاں پہنچ جاؤں لیکن یہ اڑنا اس ہوائی جہاز سے بھی تیز تھا مگر مجبور تھے کیوں کہ پر نہ تھے۔

❁......❁......❁

ہمیں تایا کے گھر آئے ہوئے آج ایک ہفتہ ہو گیا تھا' سب بہت خوش تھے۔ امی بھی اپنی ساس کے ہمراہ کسی کام میں لگی ہوئی تھیں' شمائل اور شہیر اپنے چھوٹے کزن کے ساتھ اس کی گاڑی میں کہیں گھومنے نکلے ہوئے تھے۔ ہمیں ابھی تک شمی بھائی سے ڈائری لینے کا موقع نہیں ملا تھا کیوں کہ رات کو وہ دیر سے آتے تھے اور صبح جلدی نکل جاتے تھے لہٰذا ملاقات نہ ہو پائی تھی بالآخر ہم نے مسز شمیم سے رابطہ کرنے کی ٹھانی اور ان کی منت سماجت کر کے آخر کار ان سے ڈائری حاصل کر لی۔ ڈائری کیا ملی ہمیں بس کل جہاں کی دولت مل گئی۔ ہمیں ڈائری پاتے اور اچھل کود کرتے دیکھ کر بھابی بولیں۔

''احتیاط سے پڑھنا' کوئی چیز ضائع نہ کرنا۔''

''اچھا بھابی اچھا!'' ہم نے وہیں سے صدا لگائی اور کمرے میں گھس کر دروازہ بند کر لیا۔

ریوالونگ چیئر پر بیٹھ کر ہم نے ڈائری کھولی اور ورق الٹے۔ پہلے صفحے پر اشعار لکھے ہوئے تھے۔

ضبطِ غم اس قدر آساں نہیں ہے شمیم
آگ ہوتے ہیں وہ آنسو جو پیے جاتے ہیں

☆

مجھے تو شوق تھا پھولوں سے تیرا نام لکھوں
مجھ ہی پر پھول کھلانا' بہار بھول گئی

''بہت خوب' واہ واہ......'' ہمارے منہ سے نکلا۔ ''جواب نہیں شمیم بھائی! کیا اشعار ہیں' لگتا ہے ماضی میں آپ نے کسی سے چوٹ کھائی ہوئی ہے۔'' پھر ہم نے صفحہ پلٹا تو اچھل ہی پڑے اگلے صفحے پر ہماری من پسند تحریر تھی یہ کوئی افسانہ تھا یا کوئی کہانی تھی۔ اس کی پہلی سطر نے جو ہمیں گرفت میں لیا تو آخر تک ہم اپنا آپ بھول گئے۔

❁......❁......❁

جب نیلگوں آسماں تلے سیاہ بادلوں کے لہریئے شہرِ پرستان کو کہر کی چادر میں لپیٹنے لگے۔

فلک بوس عمارتوں کے دیو پیکر وجود کہر کی دبیز چادر تلے ڈوب گئے۔ آنکھوں کے روشن ڈھیلوں نے کہر کے اس طوفان میں اپنی چمک کھونی شروع کردی۔ کہر کے تاریک اندھیرے پھیلنے لگے۔ ظلمات کا دیوتا اندھیروں کی کالی گھٹا تان کر شہنشاہ خاور کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ خاور کے منہ چھپاتے ہی دن' رات کی تاریک فضاؤں میں سوگیا۔ دن کا اجالا سب کی کالی زلفوں کا شکار ہوگیا۔ کہر...... اور کہر' شباب بن گیا۔ پرندے پھڑپھڑاتے اور کہر کی اطاعت قبول کرتے' جیسے زندگی کہر بن گئی ہو۔ زندگی کا رواں دواں قافلہ ٹھٹک گیا۔ زندگی کا تموج ایک کہر سے کیسے رک سکتا ہے؟ موت کا سمندر بھی یک لخت زندگی کی روانی ختم نہیں کرسکتا لیکن......

لیکن ساجد کو ان فاصلوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ یادوں کے دیپ تو مدت کے لاشے تلے بھی روشن ہوجاتے ہیں۔ آگ کا دریا ہو یا موت کا سمندر' یادوں کے چراغ اس کے کہر کی اندھی چادر تلے بھی روشن ہوگئے۔ وہ یادوں کے جھلملاتے چراغوں میں کھوگیا تھا۔

اچانک وہ چونک پڑا کیوں...... کیسے...... کوئی ہاتھ اس نے اپنے شانے پر محسوس کیا تھا۔

''کک...... کون......؟'' اس کے منہ سے ادا ہونے والے حرف میں لرزا تھا۔ خوف تھا' تجسس تھا' کھوج تھا...... غائب حواسی تھی' تحیر تھا' سوال تھا' تعجب تھا۔

''میں......'' کہنے والے نے کہا تو وہ پلٹ کر اندھیرے میں بغور دیکھنے کی کوشش کی' اسی کوشش میں کہنے والے نے پھر کہا۔ ''رفیق۔''

''اوہ...... تم' میں کچھ اور سمجھا تھا'' ساجد کے منہ سے بس اتنا نکلا۔

''تم نے بہت بُرا کیا ساجد! بہت بُرا کیا...... تمہیں معاف نہیں کیا جاسکتا۔ تمہارا تھپڑ میرے رخسار پر تپش کی سوزن بھڑکا گیا ہے' تمہارے ہاتھوں میں اتنی سکت کہاں سے آئی۔ ٹوٹ کیوں نہیں گئے یہ ہاتھ' جن میں اتنی جرأت پیدا ہوئی۔ اُف تم نے یہ کیا کیا...... تم نے یہ کیا کردیا ساجد! کاش...... کاش تم ایسا نہ کرتے۔ کچھ تو سوچ لیا ہوتا۔ اُف گویا آگ بھڑک تھی یہ' بارش ضرور ہوگی۔ اندھیروں کے بعد اجالے ضرور چمکتے ہیں تم...... تم......''

اور پھر اس بڑھتے ہوئے کہر کے طوفان باد و باراں میں ایک اور طوفان آگیا اور وہ طوفان جذبات کا سمندر بن گیا۔ جذبات کی یلغار نے رفیق کو جملہ ہی پورا نہ کرنے دیا۔ آنسوؤں کا ٹھاٹیں مارتا ہوا بے چین و بے تاب و بے لگام دریا پلکوں کی چلمن کی اوٹ سے چپکے سے بہہ نکلا۔

ایسے جیسے سیلابی ریلا بند توڑ کر نکل جاتا ہے۔
بارش شروع ہو چکی تھی آگ کی تپش ختم تو نہ ہوئی تھی البتہ کم ضرور ہونے لگی تھی۔ آنسوؤں کی اس سیل رواں میں دفعتاً ایک درد بھری آواز ابھری۔

''تت...... تم...... رو رہے ہو رفیق!'' زندگی بھر کا درد سمٹ کر آواز میں آسمایا۔ ''تمہیں نہیں رونا چاہیے رفیق! تمہیں نہیں رونا چاہیے۔'' ساجد کہے جا رہا تھا جیسے درد والم کا دریا امڈ آیا ہو۔ وہ پھر رقت سے بولا۔

''چپ ہو جاؤ...... ان بہتے ہوئے آنسوؤں کے سمندر کو روک لو رفیق ورنہ احساسِ ندامت مجھے پاگل کر دے گا۔ ان آنسوؤں کو پی جاؤ' واپس لے جاؤ ان آنسوؤں کے نذرانے کو۔'' ساجد پاگلوں کی طرح اتنی زور سے چیخ اٹھا کہ رفیق گھبرا گیا' اس کے وحشت برستے چہرے کو دیکھ کر چونک پڑا۔

''اگر تم یونہی روتے رہو گے تو...... میں...... میں''

''تڑاخ......'' کی بھرپور آواز سے ساجد کے تھپڑ نے رفیق کو لڑکھڑا کر دور جا گرایا تھا۔ وہ اپنا گال تھام کر اٹھا' آنسوؤں کا سیلاب تھم گیا' آگ سرد ہو گئی۔ وہ اپنا گلا تر کرتا ہوا تھوک نگلتے ہوئے بولا۔

''بس مجھے اور کچھ نہیں چاہیے' اب میرے آنسو نہیں بہہ سکیں گے۔ میری آنکھیں نہیں ڈبڈبائیں گی۔'' رفیق کی آواز نے جیسے تمام کہر کی چادر یک لخت ہٹا دی ہو۔

''اُف میرے خدایا! بس کرو رفیق! بس کرو...... میں نے...... میں نے تو صرف تم پر اٹھے ہوئے تھپڑ کا جواب طلب کیا تھا لیکن میں یہ بھول ہی گیا تھا کہ وہ تھپڑ خود میرا اپنا تھا۔ تم عظیم ہو

برکات تقویٰ

☆ خوف خدا رکھنے والے متقی لوگوں کو تقویٰ کی برکت سے اللہ تعالیٰ کا قرب اور معیت حاصل ہوتی ہے۔ تقویٰ اور خوف خدا کی برکت سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور تھوڑے عمل پر زیادہ اجر کا وعدہ ہے۔ دنیا اور اس کی پریشانیوں کا خوف اور ڈر متقی شخص کے دل سے زائل کر دیا جاتا ہے پھر اپنے حقیقی رب کے سوا کسی چیز سے نہیں ڈرتا۔ ہر مشکل اور ہر پریشانی میں متقی شخص کی من جانب اللہ مدد و نصرت اور کامل رہنمائی و رہبری کی جاتی ہے۔ متقی و پرہیز گار شخص عنداللہ و عندالناس تمام مخلوق سے افضل و اہم ہوتا ہے تقویٰ و پرہیز گاری کی پہلی اور اہم برکت یہ ہے کہ متقی و پرہیز گار شخص کو اللہ تعالیٰ دنیا کی محنت و مشقت اور ہموم و غموم سے نجات دے کر اپنے فضل و کرم اور دست غیب سے بلا مشقت و محنت کے آسان روزی عطا کرتا ہے۔

انتخاب: سید کاظم رضا...... سیالکوٹ

میں...... میں بھی عظیم ہوں اور وہ بھی عظیم ہے۔ میرا قصور' میرا گناہ صرف اتنا ہی ہے' میں نے صرف اتنا پوچھا تھا کہ تم کیوں ناراض ہو؟'' ساجد بولے گیا۔ اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ کر ایک ٹھنڈی آہ بھری پھر ہاتھوں کو اوپر سے پھیرتا ہوا تھوڑی تک لایا۔ اب اس کی نگاہیں خلاؤں میں کچھ گھور رہی تھیں' وقت بلا کی رفتار سے ریورس ہونے لگا۔

وقت کی رفتار میں اتنی تیزی آ گئی کہ ماضی کے اوراق ننگے ہونے شروع ہو گئے اس کہانی کو یہیں ختم کر دو...... تت...... تمہیں...... تمہیں تمہاری پوتر دوستی کا واسطہ۔''

لیکن شمیم اسے تو جیسے سکتہ سا ہو گیا ہو' یک ٹک ساجد کو گھورے جا رہا تھا اور جب وہ کچھ نہ بولا تو

ساجد وہاں سے منہ چھپاتا ہوا بھاگ اٹھا۔
اس لمحے وقت کے بے رحم دیوتا مسکرا اٹھے اندھیرے سائے بڑھتے گئے ایک طویل عرصہ گزر گیا۔
"یہ تھی کل رام کہانی رفیق صاحب! ورنہ رفیق صاحب وہ تو میرا اس وقت کا ساتھی ہے جب ہمارے لیے ہوش وحواس کی باتیں کسی الف لیلٰی کی داستان سے زیادہ اہمیت نہ رکھتی تھیں۔ اب تم ہی بتاؤ قصوروار کون ہے' ہر چیز تمہارے سامنے ہے۔" ساجد گویا جواب کا منتظر تھا۔
"تم...... تم ٹھیک ہو لیکن میرے دوست...... دوست وہی اچھا ہوتا ہے وہی عمر بھر کا ساتھ دے سکتا ہے جو دوست کی غلطیوں کو اسی وقت معاف کردے اگر وہ یہ سوچ کر نظر انداز کردے کہ چلو کل معاف کردیں گے یا کل معافی مانگ لیں گے تو پھر دوستی میں رخنہ شروع ہوجاتا ہے دوستی پائیدار نہیں ہوتی۔ تمہارا کہنا ٹھیک ہے' میں بھی اتنا شقی القلب نہیں ہوں۔ شمیم ہمارا دوست ہی نہیں بہت کچھ ہے اور پھر......" دونوں خاموش ہوگئے ایک پُرہول سناٹا طاری ہوگیا۔

❁......❁......❁

ہنس مکھ کردار شریر شخصیت والا خالد ان تمام باتوں سے باخبر تھا وہ اس کشیدگی کے بڑھتے ہوئے طوفان کو روکنے کے ذرائع تلاش کررہا تھا۔ کڑیاں ملاتے ملاتے خود اس کی اپنی کڑیاں ڈھیلی پڑنے لگیں۔ وہ سوچ کے گہرے گرداب میں پھنس کر رہ گیا۔ جتنا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتا ذہن اتنا ہی ماؤف ہوجاتا۔ رفیق خالو' ساجد' شمیم...... شمیم' گویا بات شمیم پر آ کر ٹھہرتی ہے۔ نفرت کے بڑھتے ہوئے عفریت نے چاروں کو رگید کررکھ دیا۔ ساجد و رفیق کے انداز میں سوچنا اس کے بس کی بات نہ تھی عرصہ ہوا اس کی بھی علیک سلیک شمیم سے ختم ہوگئی تھی۔
عزت اس کی نظر میں ڈھکوسلا تھی لیکن ان تینوں کرداروں کے آگے وہ بے بس تھا۔ محبت تو کرسکتا ہے مگر نفرت اس کے اپنے بس سے باہر ہے۔ شمیم سے جذباتی وابستگی قائم رہنے کی وجہ سے اس کے جانے کے لیے دل پتھر بنانا ضروری تھا۔ اس رنجش کے سیلاب کا منہ موڑنے کے لیے اس نے ایک دن شمیم کو گھیر لیا اس نے آستینیں چڑھاتے ہوئے کہا۔
"آج یا تو آپ نہیں یا میں نہیں۔" دنیا والوں کا دستور ہے کہ اگر ناچاقی ہو جائے تو ناچاہتے ہوئے بھی نفرت کا اظہار کرنے پر مجبور ہوتی ہیں لیکن دل خون کے آنسو روتا ہے تو پھر شمیم اس چیز سے کیسے جدا ہوسکتا' خواہ بناوٹی انداز ہی کیوں نہ ہو۔ اس نے منہ پھیر لیا جواب دینا تو درکنار لیکن پھر یہ دیکھ کر اس کے سامنے کون ہے سوئی ہوئی محبت جاگ اٹھی۔ اس کی عادت تھی کہ جواب اس انداز میں دیتا تھا کہ سوال کرنے والا سوچتا ہی رہ جاتا۔ آیا یہ میرے سوال کا جواب ہے یا سوال کیا گیا ہے اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"معلوم ہوتا ہے کہیں سے پٹ کرآرہے ہو؟"
شمیم کی مسکراہٹ ایسی تھی کہ خالد کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ یہی آگ جملے کی صورت اختیار کرکے لبوں سے باہر آگئی۔
"آپ کی تو ایسی کی تیسی! آپ اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں؟"
"اوہ...... یہ بات ہے۔" شمیم نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ نے تو ضرور کچھ سمجھ لیا ہوگا' میں تو کچھ نہیں سمجھا۔ رہا ایسی کی تیسی کا سوال

وہ تو آپ کی ادا بتا دیتی ہے پڑھے لکھے مہذب با اخلاق، باشعور لوگ اسی طرح گالیاں دیتے ہیں۔ اگر آپ کو بھی یہ سوال لاحق ہے تو سیدھی طرح سے شروع ہو جائیے' لفظوں کے ہیر پھیر سے کیا فائدہ۔'' خالد کا پارہ اور چڑھتا گیا۔

''بعض لوگ اپنے آپ کو بڑا عقل مند تصور کرنے لگتے ہیں' دماغ آسمان کی وسعتوں سے بھی بلند ہو جاتا ہے' اس بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں۔'' خالد نے دونوں ہاتھوں کو مسلتے ہوئے افق کے پار دیکھتے ہوئے کہا۔

''اوہ...... میں سمجھا...... خالد صاحب!'' شمیم کے اس انداز پر خالد یکدم اچھل پڑا۔

''تت...... تم کو کیسے معلوم ہوا۔'' ذہن پر یلغار حیرت کی وجہ سے وہ سب کچھ بھول گیا' تکلف سے بے تکلفی پر اتر آیا۔ آپ سے تم پر' کڑواہٹ سے مٹھاس پر۔

''کامن سنس' ٹیلی پیتھی مائی ڈیئر!'' شمیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''فضا بڑی خراب ہوتی جا رہی ہے۔''

''جی ہاں! فضا بڑی خراب ہوتی جا رہی ہے لیکن جناب اس کی سو فیصد ذمہ داری آپ پر ہی عائد ہوتی ہے۔'' خالد نے پھر تلخ لہجے میں کہا۔ ''بہتری اسی میں ہے سیدھی طرح سے راہ پہ آ جائیں۔''

''آپ کہہ رہے ہیں؟''

''جی ہاں! میں کہہ رہا ہوں۔'' خالد کو پھر غصہ آ گیا۔

''اچھی بات ہے تو آؤ' ہم سب مل کر اس نفرت کے عفریت کا گلہ دبا دیتے ہیں۔'' شمیم نے ہلکی مسکراہٹ سے کہا۔

کہر آہستہ آہستہ گھٹنے لگی' سیاہ چادر دھیرے دھیرے سرکنے لگی پھر عقل کا اندھا پن ختم ہو گیا لیکن اب سیاہ بادلوں نے آسمان پر گرنا شروع کر دیا تھا۔ ہوا ہلکی اور سرد ہو گئی' خالد' رفیق' ساجد اور شمیم چاروں موسم کے بدلتے ہوئے تیور دیکھ رہے تھے۔ خاموش...... بالکل خامش...... جیسے کوئی متنفس نہ ہو' ہوا کی ہلکی سی سرسراہٹ بادلوں کی گرج' بجلی کی چمک اور کچھ نہیں۔

بچے تو پھر بچے ہیں

☆☆☆

ایک بچے کا دھیان پڑھائی میں کم تھا امتحانات کے دنوں میں اس کی ماں نے کہا تم پورا سال نہیں پڑھتے اور امتحانات آتے ہی کتابوں میں لگ جاتے ہو آخر کیوں پورا سال نہیں پڑھتے؟

بچہ (شاعرانہ انداز میں بولا) لہروں کا سکون تو سبھی کو پسند ہے لیکن طوفانوں سے کشتی نکالنے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔

ماں غصے سے کہنے ادھر آ تجھے بتاؤں، ٹائی ٹینک کا ڈرائیور نا ہو تو۔

پھول اور کانٹے

☆☆☆

کچھ لوگ زندگی میں پھولوں کی طرح ہوتے ہیں پودے کے ساتھ ہوں تو اس کی خوب صورتی کا باعث بنتے ہیں کوئی توڑے تو اس کے ہاتھوں کو بھی خوشبو دے جاتے ہیں اور کچھ لوگ کانٹوں کی طرح جنہیں کوئی بھی چھونا نہیں چاہتا وہ پودے کے ساتھ ہی سوکھتے اور پھر آخر کوئی نہ کوئی اس کانٹوں بھری جھاڑی کو جڑ سے اکھاڑ پھینک دیتا ہے سو پھول بنیے خوشبو پھیلایئے کانٹے نہیں۔

انتخاب: حسن شاہد...... کراچی

شام کے سائے گہرے ہوئے ہوتے گئے...... چار دل' چار انسانی ہیولے جن کے دل ایک ہی طرح سے دھڑکنا جانتے ہیں' صرف سوچ و انداز کا فرق......

دفعتاً خاموشی کے جمود کو توڑتی ہوئی شمیم کی آواز سنائی دی۔

''ہماری آنکھیں بتاتی ہیں کہ ہم میں سے ہر ایک کا دل ایک بوجھ سا محسوس کر رہا ہے۔ ہم اپنی نظر میں خود مجرم ہیں' کس نے کیا کہا' کس نے کیا نہیں کہا سب فضول ہے۔ ماضی کو کریدنے سے رنجش میں اضافہ بڑھتا ہی جاتا ہے' آہاہاہاہا...... ہاہاہا......'' نہ جانے کیوں اور کیا سوچ کر شمیم نے ایک وحشت ناک قہقہہ لگایا۔ تینوں دوست بے اختیار چونک پڑے' ان کی آنکھوں میں حیرت کے لہریئے تھے۔ شمیم نے پھر کہنا شروع کیا۔

''تمہارے آنسو اور میرے قہقہے جاندار نہیں ہوسکتے' تم رو نہیں سکتے۔ میں...... میں ہنس نہیں سکتا' تم میرے اپنے ہو اور اپنوں سے معافی نہیں مانگی جاتی۔ جو کچھ کرنا ہے ہم ساتھ ہی کریں گے۔'' اس کی آواز جذبات کی شدت سے بھاری ہوتی گئی اور یکدم اس پر اضمحلال سا طاری ہونے لگا جیسے بہت تھک گیا ہو قدم لڑکھڑائے۔

''میں...... میں بہت تھک گیا ہوں ساجد!'' اس نے دونوں ہاتھوں سے دل کو مسلتے ہوئے کہا جیسے اٹھتے ہوئے درد کو دبانے کی کوشش کر رہا ہو۔ درد و الم کے طوفان کو روکنے کی سعی کر رہا ہے۔

''مم...... میں...... میں بہت تھک گیا ہوں رفیق مجھے...... مجھے سہارا دو۔'' ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کی آواز دور کسی بہت ہی گہرے کنویں سے آرہی ہو۔ ڈوبتی ہوئی آواز' تینوں تڑپ اٹھے۔ اس نے سہارے کے لیے ہاتھ بڑھائے' ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اسے کچھ بھائی نہ دے رہا ہو جیسے وہ یکدم اندھیروں سے سبز روشنی میں آگیا ہو۔

رفیق اور ساجد نے اسے بڑھ کر تھام لیا۔ شمیم نے دونوں کو اپنی بانہوں میں بھینچ لیا۔

''ہمیں دنیا کی کوئی طاقت جدا نہیں کرسکتی۔''

جیسے ہی شمیم کے منہ سے نکلا یکبارگی بجلی تڑپی' تڑپ کر زمین کی طرف جھپٹی عین اسی لمحے گرج' چمک اور طوفانی موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ یوں جیسے انہیں جدا کرنا چاہتی ہو لیکن ان میں سے کوئی نہ جدا ہوسکا' بارش میں بھیگتے رہے جیسے بارش کا قطعی احساس نہ ہو۔ اچانک سرد ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا چاروں کے جسم کپکپا اٹھے۔ تب انہیں احساس ہوا کہ وہ بالکل بھیگ چکے ہیں' آج انہیں بھیگنے میں لذت محسوس ہو رہی تھی۔

جو پیار و محبت کرنا جانتے ہیں وہی سمجھ سکتے ہیں کہ رنجش اور کدورتیں دھونے میں کتنا مزہ آتا ہے۔ وہ انسان ہی کیا جو کدورتیں ختم کرکے خوش نہ ہو وہ خود بھیگتے رہے۔ رنجشیں' کدورتیں' گلے شکوے اور شکایتیں بارش انہیں بھی اپنے ساتھ بہائے لے گئی۔ بارش گویا آج تمام برائیوں' گندگیوں کو دھو ڈالنے پر تلی ہوئی تھی۔ رکنے کا نام ہی نہ لے رہی تھی' ہواؤں کے یخ بستہ طوفانی جھکڑ بھی چلنے شروع ہوگئے۔ قریب ہی ایک پرنالے سے گرتے ہوئے پانی کا شور عجب سماں پیش کر رہا تھا۔

ایک ایسے کھلاڑی کی مانند خالد کا سر فخر سے تن گیا جس نے اپنا لہو دے کر بازی جیت لی ہو لیکن اچانک دل میں چھپا ہوا درد جاگ اٹھا اور وہ وہاں ٹھہر نہ سکا۔ بہر حال اسے شمیم سے جذباتی لگاؤ تھا اس نے ایسے جواری کی مانند سر جھکالیا جس نے

جان بوجھ کر جیتی ہوئی بازی ہار دی ہو۔

"ٹھہ..... رو....." شمیم کی آواز بادلوں کی گرج میں دب کر رہ گئی۔ شمیم دونوں کو چھوڑ کر خالد کی طرف لپکا۔ "سنو تو سہی آخر کیوں جا رہے ہو' کیا بات ہے؟" خالد کے جسم میں لرزش محسوس کر کے شمیم کو احساس ہوا جیسے وہ آنسوؤں کو پینے کی حتی الامکان سعی کر رہا ہو۔ بارش کی رفتار میں مسلسل تیزی آتی گئی' بھیگتے بھیگتے وہ لوگ پانی کا جز ہی معلوم ہونے لگے۔ آنکھوں کے گوشے صاف کرتے ہوئے شمیم نے کہا۔

"مجھ سے ناراض ہو گئے ہو کیا؟"

"میں آپ کو نہیں جانتا۔"

"کیا.....؟" شمیم حیرت سے اچھل پڑا۔

"جی ہاں۔" خالد نے مڑے بغیر روکھے لہجے میں جواب دیا۔

"میں سمجھا نہیں؟" شمیم نے اس کا چہرہ اپنی طرف کرتے ہوئے کہا۔ "کیا مطلب.....؟" خالد کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب دیکھ کر وہ اپنا جملہ پورا نہ کر سکا اور پھر بھلا اس طوفانی بارش کے سیلاب میں کون محسوس کر سکتا ہے کہ آنسوؤں کا سیلاب کہاں ہے۔ دل سے دل ملے ہوں تو پتا چل جاتا ہے جو دل کسی کے لیے درد رکھتے ہیں وہ محسوس کر لیتے ہیں۔ شمیم کے دل کو ٹھیس لگی' اس نے اپنا سر جھکا لیا لیکن وہ نیرنگی انداز کو نہ سمجھا۔

"پگلے..... روتے کیوں ہو؟" شمیم اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا' اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ خالد نے اسے بانہوں میں سمیٹ لیا اور کہا۔

"میرے آنسو ان کا سبب کچھ بھی نہیں بس یونہی نہ جانے کیوں..... فراق..... اور تمہاری خوشی میں بہہ نکلتے ہیں۔ میں نے یہ خلش اپنے لہو سے سنائی ہے اب میں تمہیں جدا نہیں کر سکتا۔ میرے دوست میری دوستی میرے پیار کی اس خلش کو سنبھال کر رکھنا۔" اس کا اشارہ رفیق اور ساجد طرف تھا۔ "یہ میری سوغات ہے اسے تم جان سے عزیز رکھنا' پریم پوتر..... دوستی کے عظیم سنگم کو بھول نہ جانا اور..... اور بس..... کاش ہم اسی طرح مر جائیں' یہ خلش پھر نہ بڑھے۔" اس کی گرفت سخت ہوتی گئی۔

بارش بدستور ہوتی رہی' رکنے کا امکان معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ وہ چاروں خاموش کھڑے ہوئے تھے۔ ماحول پر رات کے تاریک سائے پھیلنے لگے اور وہ تینوں بارش میں بھیگتے ہوئے اپنے پیارے دوست کے بے جان لاشے کو سہارا دیئے کھڑے بھیگتے رہے۔ خالد نے اپنا حق ادا کر دیا تھا' آپس کی نفرت کی دیوار کو گرا کر اس نے اپنے آپ کو امر کر لیا تھا' حقیقی دوست وہی ہے جو اپنی جان بھی داؤ پر لگا دے۔

کہانی کا اختتام ہوتے ہی ابھی میں ڈائری کا ورق الٹنے ہی والی تھی کہ دروازے پر ہونے والی دستک نے مجھے شمیم بھائی کی اس کہانی کے سحر سے باہر آنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے ڈائری بند کی اور الماری میں رکھی اور امی کی آواز اور حکم کی تعمیل میں کمرے سے باہر نکل گئی' معلوم ہوا کل ہماری تایا کے ہاں سے واپسی ہے۔

ستم

طاہرہ جبیں تارا

لالچ کسی بھی چیز کی ہو وہ انسان کی سوچنے، سمجھنے کی صلاحیت کو مفلوج کر دیتی ہے اور پھر انسان اس لالچ کی دلدل میں دھنس کر اپنا آپ بھی کھو دیتا ہے۔
ایک ایسے سیاست دان پر لکھی گئی تحریر جس نے دولت کی لالچ میں اپنے بچوں کے ساتھ اپنی پہچان بھی مٹی میں ملا دی۔

میں اسے کافی عرصے سے دیکھ رہی تھی کبھی وہ بے تحاشہ رونا شروع کر دیتا اور کبھی اونچے اونچے قہقہے لگاتا اور کہتا ہوں۔ ''میں کون میں کون ہوں دیکھو مجھے میں.....''

اور پھر خلاؤں میں تکنا شروع کر دیتا اندازہ ہوتا تھا کہ عمارت کبھی بہت طاقت ور تھی مگر نہ جانے کیا بیتی کہ اب یہ عمارت ملیا میٹ ہوگئی میں نے بارہا سوچا کہ پوچھوں کیا ہوا تمہاری یہ حالت کیوں ہے جب اس مقصد کے لیے میں ایک دن اس کی مخصوص جگہ پر پہنچی تو وہ وہاں موجود ہی نہ تھا میں نے ایک آدمی سے پوچھا کہ ''یہاں ایک آدمی بیٹھا ہوتا تھا وہ کہاں گیا؟''

''وہ آدمی بہت خطرناک حد تک پاگل ہوگیا تھا لوگوں کو پتھر مارنے لگا تھا اس لیے اسے مینٹل ہاسپٹل داخل کروادیا گیا۔''

''کیا آپ جانتے ہیں کہ وہ کون ہے اس کے گھر والے کہاں ہیں؟''

''نہیں وہ کافی عرصے سے یہاں دن کے وقت آتا تھا' بس لوگوں کو دیکھتا رہتا تھا' کبھی خود سے باتیں کرنے لگتا' کبھی اونچے اونچے قہقہے لگاتا' کبھی رونے لگتا اور رات کو نہ جانے کہاں چلا جاتا۔ نہ کبھی اس کو کوئی لینے آیا۔ یہاں لوگ کھانے کو دے دیتے تو کھالیتا نہ دیتے تو مانگتا نہیں تھا۔

نہ جانے بیچارے کے ساتھ کیا بیتی کیونکہ شکل و صورت سے تو کسی خوشحال گھرانے کا لگتا تھا بلکہ سچ پوچھیں تو کبھی کبھی مجھے اس میں کسی بڑے آدمی کی جھلک نظر آتی تھی' جیسے یہ کوئی مشہور ہستی ہو۔ میں نے اسے ٹیلی ویژن پر دیکھا ہو لیکن پھر خود ہی اپنی بات کی نفی کر دیتا ہوں کہ مشہور آدمی اس چھوٹے سے دیہات میں کیوں آئے گا۔ ہمارے سیاسی لیڈر ووٹ لینے کے لیے ضرور ان ناخواندہ دیہاتوں میں آتے ہیں۔ لفظوں کے جال میں جکڑتے ہیں۔ سنہری خواب ہم جاہلوں کی آنکھوں میں بساتے ہیں اور پھر ووٹ لینے کے بعد ان علاقوں کو ایسے بھول جاتے ہیں جیسے یہ علاقے پاکستان میں شامل ہی نہ ہوں۔''

وہ شخص اپنے دل کے پھپھولے پھوڑ رہا تھا۔ میں نے اپنے چاروں اور دیکھا یہ گاؤں واقعی پسماندہ تھا۔ کچے گھر تھے شاذ ونادر ہی کوئی پکا گھر نظر آرہا تھا۔ بجلی اور گیس سے محروم' زندگی کی سہولتوں سے محروم یہ لوگ شہریوں کے لیے اپنے کھیتوں میں محنت ومشقت کی آگ میں جھلس رہے تھے۔ مجھے بے اختیار جوش ملیح آبادی کی نظم ''کسان'' یاد آگئی' جس میں شاعر انقلاب نے کسان کی

محنت و مشقت کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ محنت کسان کرتا ہے اور اناج شہری لوگ درآمد کر کے تکبر کرتے ہیں کہ ہم ترقی کر رہے ہیں۔

میں اس پسماندہ گاؤں میں اپنے تھیسز کے سلسلے میں آئی تھی اور ریسٹ ہاؤس میں قیام تھا۔ لوگ بہت مہمان نواز تھے۔ بہرحال ایک ہفتے میں اپنا کام مکمل کر کے میں اپنے شہر واپس آ گئی مگر اس شخص کو چاہنے کے باوجود فراموش نہ کر سکی۔ کئی دفعہ مجھے اس کا قہقہہ سنائی دیتا۔ کبھی میرے کانوں میں اس کی سسکیاں سنائی دیتیں، کبھی میں کون کی آوازیں گونجتیں۔ مجھے لگتا جیسے وہ خود کو جانتا ہے مگر گمنامی میں خود کو کھونا چاہتا ہے۔

ناشتے کی ٹیبل پر میں یوں ہی کھوئی ہوئی تھی جب ماما نے کہا۔ ''کیا بات ہے اتابیہ! جب سے تم گاؤں سے آئی ہو کھوئی کھوئی سی ہو۔ کیا پرابلم ہے؟''

''کچھ نہیں ماما! بس ایسے ہی تھکاوٹ ہے۔''

''ماما جانی! کچھ نہ کچھ تو کالا ہے، جس کی پردہ داری ہے یہ ا‌لجھی الجھی باتیں، یہ کھویا کھویا رہنا، یہ اداسیاں، یہ خلاؤں میں تکنا، آثار بتاتے ہیں کہ کوئی گاؤں کا گھبرو بھا گیا ہے ہماری بہنا کو۔''

''زنابیہ جی! یہ فزکس پڑھنے والوں نے شاعری کیسے شروع کر دی دال میں کالا تو مجھے یہاں نظر آ رہا ہے۔''

''فزکس پڑھنے والے بھی انسان ہیں مائی ڈیر سسٹر! اور انسان محبت، احساسات، جذبات سے گندھا ہوا ہے، وہ فطرت سے محبت کرتا ہے وہ فطرت میں بنانے والے کا عکس دیکھتا ہے اور یہ عکس اسے دوسروں سے محبت کرنے کا درس دیتا

ہے۔ میں تو اس انسان کو انسان ہی نہیں سمجھتی جو دوسروں کے درد کو محسوس ہی نہ کر سکے۔ بے حس انسان اور جانور میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔''

''بیا! کہتی تو تم بالکل ٹھیک ہو مگر آج جانور اور انسان میں کوئی فرق نہیں رہا۔ یہ قتل عام چند سکوں کے عوض خون کی ندیاں بہا دینا بے حسی ہی تو ہے۔ کوئی رشتہ رشتہ نہیں رہا۔ اولاد جائداد کی خاطر والدین کو قتل کر رہی ہے تو والدین چند سکوں کے عوض اولاد کا سودا کر رہے ہیں۔ بھائی بھائی کا ساتھ نہیں دشمن کے ساتھ ہے۔ ہوس پرستی چھا گئی ہے ہر طرف۔''

''انا جی! ایسا نہ کہیں مانا کہ آج انسان وحشی ہو گیا ہے پشاور میں معصوموں کے خون سے ہولی کھیلنے والے درندے ہی تھے۔ وحشی جانور تھے مگر ان معصوموں کی شہادت نے کتنے دلوں کو سوگوار کیا ہے۔ کتنی آنکھوں سے سیلِ رواں جاری ہوا اور ابھی تک ان معصوم کلیوں کا ذکر آنکھوں کو لہو رنگ کر دیتا ہے۔ ابھی بھی اس نفسا نفسی کے دور میں انسانیت باقی ہے جس کے دم سے یہ دنیا چل رہی ہے۔''

''ماما! آپ اتنے غور سے کیا دیکھ رہی ہیں ہم دونوں کو۔''

''میں دیکھ رہی ہوں اللہ نے مجھے کتنی اچھی بیٹیاں دی ہیں۔ دوسروں کے دکھ پر تڑپنے والی‘ انسانیت کا درد رکھنے والی یا اللہ تیرا شکر ہے۔''

''ماما! وہ بات تو رہ ہی گئی۔ ہاں تو انا جی بتائیں نا کیا بات ہے گاؤں میں کیا بھول آئی ہیں جو رہ رہ کر یاد آرہا ہے؟''

''جھلی لڑکی! ایسی کوئی بات نہیں‘ بس ایک سرا الجھا ہوا ہے جب سلجھا لوں گی تو بتا دوں گی۔''

''اوکے اوکے‘ میں یونیورسٹی چلی۔''

''ماما! مجھے آج دارالفلاح جانا ہے۔ رات ثانیہ کا فون آیا تھا اس نے مجھے کسی سے ملوانا ہے۔''

''اوکے بیٹا! جاؤ لیکن وقت پر گھر آجانا۔ دہشت گردی کی وجہ سے سرشام ہی سڑکیں بھائیں بھائیں کرنے لگتی ہیں۔ تمہارے پاپا سے بھی میں نے کہا ہے کہ آپ نو بجے گھر آجایا کریں۔ جیسے جیسے شام ہوتی ہے میرا دل ہولتا رہتا ہے۔''

''اوکے ماما! آپ پریشان نہ ہوں اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہے۔''

وہ ثانی کے آفس پہنچی۔ ''ہاں بھئی بتاؤ میرا کام کہاں تک پہنچا؟''

''جناب‘ آپ کا کام ہم نے کر لیا ہے‘ اس لیے بلایا ہے کہ جس کی یاد نے تمہیں بے چین کر رکھا تھا‘ اسے اپنے ہی ہاسپٹل لے آئی ہوں۔ آؤ میرے ساتھ۔'' اس نے دیکھا وہ شخص دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اس کے چہرے پر صدیوں کی تھکن طاری تھی اور ایسا درد بھرا پچھتاوا تھا۔ وہ اسے کوئی نام نہ دے سکی۔

''اس کی ہسٹری کا کچھ پتا چلا؟''

نہیں یار! گاؤں والوں کا کہنا ہے کہ ایک دن اچانک وہ گاؤں آیا تھا۔ اس کی حالت بہت بدتر تھی۔ گاؤں والوں نے اس کی دیکھ بھال کی‘ بس یہ کبھی روتا تھا کبھی ہنستا تھا اور کچھ نہیں کہتا تھا۔ ان دنوں بم بلاسٹ ہوا تھا۔ گاؤں والوں کا خیال ہے کہ شاید اس کے پیارے اس بم دھماکے میں مارے گئے ہوں گے‘ اس صدمے سے اس کی یہ حالت ہوگئی ہے۔ دو مہینوں کے بعد یہ تشدد پر اتر آیا‘ کبھی اپنے آپ کو مارتا‘ کبھی دوسروں کو اس لیے گاؤں کے نمبردار نے اسے مقامی ہاسپٹل داخل کروا دیا۔ تمہارے کہنے پر میں نے ہاسپٹل کا وزٹ

کیا تو مجھے پتہ چلا کہ اس شخص کو گاؤں سے لایا گیا ہے۔ سو میں اسے اپنے ہاسپٹل لے آئی ہوں۔''

''ثانی! مجھے اس کے چہرے پر کہانی نظر آرہی ہے۔ کہانی کی کھوج میں ہی اسے تلاشا ہے۔''

''او کے' رائٹر صاحبہ' میں اپنے آفس میں ہوں۔''

'بابا جی! میں یہاں بیٹھ جاؤں؟'' اس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

''بابا جی! کیا دکھ ہے آپ کو؟ مجھے آپ کا چہرہ بہت الجھا ہوا نظر آتا ہے۔ کبھی ندامت تو کبھی پچھتاوا' کبھی اپنے آپ سے بے خبری کی کیفیت تو کبھی بے نام سا خوف' جب اتنی ساری کیفیات چہرے پر سمٹ آئیں تو وہ انسان پاگل نہیں ہو سکتا بلکہ صرف ایک ہی وجہ سامنے آتی ہے کہ وہ لوگوں کا سامنا نہیں کرنا چاہتا اس لیے اس نے سب سے بچنے کے لیے پاگل پن کا ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ میں آپ کی بیٹی کی طرح ہوں۔ اپنے دل کی بات بتا دیں۔ بیٹیاں تو والدین کا دکھ اپنے آنچل میں سمیٹ لیتی ہیں' اپنے دل میں سمالیتی ہیں اور کسی کو خبر بھی نہیں ہونے دیتیں۔ پلیز بابا جی!''

میں نے اپنا ہاتھ ان کے کندھے پر رکھا۔ بابا جی نے ایک دم اپنی آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا آنسوؤں سے لبریز آنکھیں میرا دل چیر گئیں۔

''اف اتنا درد بابا جی!'' وہ میرا ہاتھ جھٹک کر اٹھ گئے۔ میں ان کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ میں آپ کا درد بانٹ کر رہوں گی میں نے مصمم ارادہ کیا۔

''ہاں انابیہ! کچھ پتہ چلا کہ بابا جی کون ہیں؟''

''ثانی ڈیئر! کوئی پہلی ملاقات میں بھی کھلتا ہے۔ ابھی میں اس کا اعتماد تو حاصل کرلوں۔ انابیہ! اس نفسا نفسی کے دور میں رشتے زوال کا شکار ہو رہے ہیں' ہو سکتا ہے اس کی اولاد نے ہی جائیداد کی خاطر اسے کہیں پھینک دیا ہو' آج کل ہر دوسرے دن اخبارات اس قسم کی خبروں سے بھرے پڑے ہیں اور یہاں ہاسپٹل میں بھی کئی ایسے لوگ ہیں جن کی اولادیں اپنے والدین کو اپنے ساتھ نہیں رکھتی اور یہاں پاگل کہہ کر چھوڑ جاتی ہیں اور کہیں جائیداد کے بٹوارے کی خاطر والدین اپنی بیٹیوں اور بیٹوں کو سڑکوں پر پھینک جاتے ہیں' جو اس بری حالت میں یہاں لائے جاتے ہیں کہ وہ دوبارہ باہر کی دنیا میں جانا ہی نہیں چاہتے۔ بس یار' شاید زندگی اسی کا نام ہے۔''

''ہاں ثانیہ! یہ قیامت کی ہی تو نشانی ہے کہ خاندانی نظام تباہ ہو کر رہ گیا ہے۔ مغرب پرستی نے ہمیں فادر ڈے، مدر ڈے، ڈاٹر ڈے، سن ڈے، سسٹر ڈے' برادر ڈے اور ولنٹائن ڈے تک محدود کر دیا ہے۔ ہم مغرب کی نقالی کرتے ہوئے بڑے فخر سے صرف انہی ڈیز ہی کو سلیبریٹ کرتے ہیں' ان رشتوں کے تقاضے کیا ہیں' ایثار اور محبت کیا ہے' احترام کیا ہے' سب بھلا چکے ہیں۔''

''چل اٹھ یار باہر چلتے ہیں بہت بات نا پک چھیڑ دیا میں نے تجھے اچھی سی کافی پلاتی ہوں۔''

''نہیں ابھی تو مجھے یونیورسٹی جانا ہے پھر وہاں سے پبلک لائبریری کچھ کام ہے۔ تیرے اس دارالفلاح میں تو اب روز چکر لگیں گے۔ کل میں ناشتہ تیرے ساتھ کروں گی۔ کل آنٹی سے آلو بھرے پراٹھے بنوا کر لانا۔''

''دوسرے دن میں پھر ہاسپٹل میں موجود تھی۔

''بابا جی! کچھ تو بولیں پلیز' اپنا دکھ مجھ سے شیئر کریں۔'' مگر لگتا تھا میں پتھر سے سر پھوڑ رہی ہوں۔

بابا جی نے ایک نظر مجھے دیکھا اور اٹھ کر چل دیے۔

''اف ثانی! یہ بابا جی تو پتھر کے بنے ہیں۔ پر میرا نام بھی انابیہ ہے' بابا جی سے دل کا راز نہ اگلوایا تو اپنا نام ہی بدل ڈالوں گی۔''

''او کے ڈیئر! لگی رہو۔ پتھر سے سر پھوڑو گی تو اپنا ہی نقصان کرو گی۔ پتہ نہیں بیچارے کو کس نے اس حال تک پہنچایا ہے کہ اب وہ کسی پر اعتبار ہی نہیں کر پا رہا۔''

''میں ان شاء اللہ اس کا اعتماد جیتوں گی دیکھنا۔'' میں نے عزم سے کہا۔

کئی دنوں کی خواری کے بعد بابا جی نے مجھ سے کہا۔ ''تم کیا پوچھنا چاہتی ہو میرے پاس تمہیں بتانے کے لیے کچھ بھی نہیں۔''

''آپ کون ہیں' آپ یہاں کیوں ہیں' آپ کے رشتہ دار بیوی بچے کہاں ہیں' آپ کی یہ حالت کیوں ہے؟'' میں نے ایک دم دو تین سوال ایک ساتھ کر دیئے۔

''میں یہاں اس لیے ہوں کہ دنیا سے میرا دل اچاٹ ہو چکا ہے۔ بس زندگی کے دن پورے کر رہا ہوں۔ میں کون ہوں ایک انسان ہوں جو غلطیوں کا پتلا ہے۔ اپنے گناہوں کی سزا بھگت رہا ہوں۔ بس یا کچھ اور...'' بابا جی نے سرد مہری سے کہا۔

''بابا جی! میں رائٹر ہوں۔ اپنی خطا بتائیں ہو سکتا ہے لوگ اس سے نصیحت حاصل کریں اور اپنے لیے سیدھی راہ متعین کر لیں' اس طرح بھی تو ہم اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر سکتے ہیں۔''

''تم اب جاؤ کل آنا میں اپنے ماضی کے بکھرے ہوئے ورق یکجا کر لوں بس اب تم جاؤ۔''

''ثانی! آج پتھر کو جونک لگ گئی۔ بابا جی کل مجھے اپنے بارے میں بتائیں گے۔ آج میں بہت خوش ہوں۔ میرا روز روز آنا بے کار نہیں گیا۔''

''کل کی آس میں تجھے آج نیند نہیں آئے گی۔'' ثانیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اب ایسی بات بھی نہیں' سو میں سکون سے جاؤں گی' ہاں کہانی سننے کا شوق نہ سونے دے تو......''

دوسرے دن جب میں ہاسپٹل پہنچی تو بابا جی اپنی مخصوص جگہ پر موجود تھے۔

''بابا جی! میں آپ کی ورق ورق بکھری ہوئی کہانی سننے آ گئی ہوں۔''

بابا جی نے خلاؤں میں تکتے ہوئے کہا۔ ''جانتی ہو میری عمر کتنی ہے؟''

''نہیں بابا جی! لیکن اندازہ لگا سکتی ہوں کم از کم ستر سال۔''

''نہیں تمہارا اندازہ غلط ہے۔ میری عمر ابھی پچاس سال بھی نہیں لیکن دکھوں اور پچھتاوے کی آگ میں جل جل کر میں نے اپنی عمر بڑھالی ہے۔''

''بابا جی! بات تو آپ بالکل ٹھیک کر رہے ہیں۔ غم اور دکھ زندگی کو کم کر دیتے ہیں۔ وقت سے پہلے بڑھاپا طاری کر دیتے ہیں۔''

بابا جی یوں گویا ہوئے۔ ''میں نے ایک متوسط طبقے میں آنکھ کھولی' جن کے پاس صرف ایک ہی سرمایہ ہوتا ہے عزت کا سرمایہ جو چاہتے ہوئے بھی کوئی ایسا کام نہیں کرتے کہ لوگ کیا کہیں گے۔ معاشرہ کیا کہے گا۔ بس اسی کہے کے چکر میں، میں نے اپنی بہت سی خواہشات اپنے دل میں دفن کر لیں۔ اپنے ساتھیوں کو جب موٹر سائیکل پر ادھر ادھر گھومتے دیکھتا تو دل مسوس کر رہ جاتا۔ میں چار بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا مگر کوئی آسائش میرے نصیب میں نہ تھی۔ ابو ایک سرکاری ادارے میں

کلرک تھے۔ میں نے مصمم ارادہ کیا کہ میں بڑا آدمی بنوں گا‘ ڈھیر ساری دولت کماؤں گا اور اس معاشرے میں سر اٹھا کر جیوں گا کیونکہ یہاں صرف عزت کی ویلیو نہیں ہے۔ پیسا ہونا بے حد ضروری ہے بلکہ عزت دار وہی ہے جس کے پاس طاقت اور پیسا ہے۔ میں دل لگا کر پڑھتا رہا اور میٹرک کے بعد میرے دل میں اس خواہش نے جڑ پکڑ لی کہ مجھے سیاسی لیڈر بننا ہے کیونکہ سیاست ایسا کھیل ہے جس میں عزت، شہرت اور پیسا ہی پیسا ہے۔

میں نے کالج میں پولیٹیکل سائنس کے ساتھ ایک مشہور سیاسی جماعت کی ممبر شپ حاصل کر لی اور یونین میں اسی سیاسی جماعت کی فیور کرنے لگا۔ لفظوں کی بازی گری میں مجھے کمال حاصل تھا۔ ہمارے سیاست داں لفظوں کے جادوگر ہی تو ہیں‘ ایسے ایسے سنہرے خواب آنکھوں میں سجاتے ہیں کہ انسان جاگتے میں خواب دیکھنے لگتا ہے۔ میں بھی پڑھائی کے ساتھ ساتھ اسٹوڈنٹ کا ہر دل عزیز ساتھی بن گیا۔ ہر ایک کی مدد کرنا نوٹس دینا‘ لفظوں کے جال میں جکڑنا اسٹوڈنٹ میرے ارد گرد جمگھٹا بنائے رکھتے۔ دن بہ دن میں پورے کالج میں مشہور ہو گیا اور پھر اس سیاسی جماعت نے مجھے اتنا سپورٹ کیا کہ میں یونین کا صدر بن گیا۔ یونیورسٹی میں بھی یونین بازی جاری رہی اور میں سیاسی لیڈروں میں اٹھنے بیٹھنے لگا یوں سیاسی میدان میں میری اچھی جان پہچان ہو گئی۔

میں نے ایم اے پولیٹیکل سائنس کیا تو جاب ڈھونڈنے کے بجائے سیاست میں قدم جمانا شروع کر دیا۔ مختلف علاقوں میں جاتا اور ایسی دل پذیر تقریر کرتا کہ لوگ عش عش کر اٹھتے۔ میں لوگوں کو کہتا میں ایک غریب کلرک کا بیٹا ہوں جو آپ کی

خدا دوست درویش

ملک شام کے ایک غار میں ایک درویش ہر وقت عبادت الٰہی میں مشغول رہتا تھا اس کا نام ”خدا دوست“ تھا وہ فی الواقع اسم بامسمٰی تھا۔ دنیا کے جھگڑوں جھمیلوں سے اسے کوئی سروکار نہ تھا اور اس کی قناعت اور بے نیازی کو دیکھ کر بھی لوگ اس کی عزت کرتے تھے اور عقیدت کے پھول اس کے قدموں پر نچھاور کرتے تھے۔ اس علاقے کا حاکم بڑا ظالم اور مردم آزار تھا اور لوگ اس سے بڑی نفرت کرتے تھے۔ یہ حاکم بھی کبھی کبھی خدا دوست کی زیارت کے لیے جاتا لیکن وہ مرد خدا کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا تھا۔ ایک دن حاکم نے شکایتاً کہا کہ آپ اللہ کے نیک بندے ہیں میں حاضر ہوتا ہوں لیکن آپ نفرت سے میری طرف سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ مانا کہ میں تمام ملک کا بادشاہ نہیں ہوں لیکن عزت میں کسی درویش سے کم نہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ مجھ سے کوئی امتیازی سلوک کریں تاہم اتنی توقع ضرور رکھتا ہوں کہ آپ عام لوگوں جیسا سلوک ہی میرے ساتھ کریں۔

خدا دوست نے جواب دیا کہ اے حاکم کان کھول کر سن لے کہ اللہ کی مخلوق تیرے ظلم سے نالاں ہے اگر تو اللہ کے بندوں کا دشمن ہے تو میں تیرا دوست کیسے بن سکتا ہوں اور اگر میری تیری دوستی کی کوئی راہ بھی نکل آئے تو اس کا کیا علاج کہ خدا تجھے دشمن سمجھتا ہے اور خدا سے دوستی رکھنے والے کی اگر کھال بھی ادھیڑ دی جائے تو وہ دوست کے دشمن کا دوست نہیں ہو سکتا یہاں سے چلا جا اور احسان اور رحم پر کمر باندھ تاکہ خلق خدا تیرے حق میں دعا کرے۔

شہروز..... کراچی

اور ملک کی تقدیر بدلنے آیا ہے۔ میں آپ میں سے ہی ہوں‘ غربت کی چکی میں پس کر تعلیم حاصل کی ہے اس لیے آپ کی مشکلات سے آگاہ ہوں‘ آپ کے مسائل جانتا ہوں۔ جب الیکشن قریب آئے تو مجھے اسی جماعت نے ٹکٹ دے دیا۔ ٹکٹ کے پیسے میں نے بہن کا زیور بیچ کر پورے کیے۔ یوں میں نے اپنے علاقے میں الیکشن جیت لیا‘ یہ

بہت بڑی کامیابی تھی۔ میری جماعت نے مجھے وزارت کا قلمدان سونپ دیا اور یوں میرے وارے نیارے ہو گئے۔ جس مقصد کے لیے میں نے اس خاردار راہ کو چنا تھا یہ کانٹوں بھرا راستہ ہی تو ہے جس میں بھائی نہ بھائی کا رہتا ہے نہ بہن بہن نہ ماں نہ باپ نہ بیٹی نہ بیٹا۔ ہوس بھرا راستہ ہے ہماری سیاست کا۔ بہن نے بھائی کا قتل کر دیا۔ شوہر نے بیوی کا قتل کر دیا کون پکڑا گیا' سب جانتے ہیں مگر لبوں پر قفل پڑے ہیں اور سیاست کی گاڑی بڑی خوبی سے چل کیا دوڑ رہی ہے۔ سیاست داں ایوانِ اقتدار میں بڑے طمطراق سے وزارتوں کا قلمدان تھامے اپنے بینک بیلنس بڑھا رہے ہیں۔ بس میں بھی اسی مقصد کے لیے کام کرنے لگا۔ اپنے علاقے کے مسئلے حل کرائے تاکہ جب دوبارہ الیکشن ہوں تو زیادہ ووٹ حاصل کرسکوں اور اپنی مرضی کی وزارت حلب کرسکوں۔ اس عہدے پر رہتے ہوئے میں نے ہر جائز ناجائز طریقے سے دولت کمائی۔

میں نے اپنی چاروں بہنوں کی شادی بڑی دھوم دھام سے کی ماں باپ نے میری شادی بھی ایک سیاسی خاندان میں کردی۔ سیاست میں لوگ اپنے مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے لوٹا بن جاتے ہیں مگر میری وابستگی شروع دن سے جس سیاسی پارٹی سے تھی اسی سے رہی اور میں نے جب بھی الیکشن لڑا اسی سیاسی جماعت کے ٹکٹ سے لڑا اور جیتا اس لیے ہمیشہ کوئی نہ کوئی وزارت مجھے سونپی گئی۔ جب مجھے وزیرِ داخلہ بنایا گیا تو مانو میری لاٹری نکل آئی۔ مختلف ملکوں کے دورے وہ بھی گورنمنٹ کے کھاتے سے اور پھر مختلف ملکوں کے لوگوں سے ملنا جلنا' تحفے تحائف کے تبادلے میرا گھر امپورٹڈ چیزوں سے بھر گیا مگر میری ہوس ختم نہ ہوئی۔ مجھے دولت حاصل کرنے کا جب بھی موقع ملتا میں اس سے بھرپور فائدہ اٹھاتا۔ اللہ نے مجھے بیٹے اور بیٹی کی نعمت سے نوازا۔

میرے ابو اور امی مجھے حلال اور حرام کا فرق سمجھانے کی کوشش کرتے' وعظ و نصیحت کرتے مگر میں ایک کان سے سنتا دوسرے سے نکال دیتا۔ جن خواہشوں کو حسرتیں بنتے میں نے دیکھا تھا اور جس طرح ایک ایک چیز کے لیے ترستا رہا اب نہیں چاہتا تھا کہ میرے بچے بھی ترسیں اپنے بچوں کو ہر قسم کی آسائش فراہم کرنے کے لیے میں حرام اور حلال کی تمیز بھول گیا۔ یاد رہا تو صرف دولت روپیہ پیسہ انہی دنوں کچھ غیر ملکی لوگ میرے پاس ٹھہرے ان لوگوں کو خفیہ ٹھہرانے کی جس ملک اور شخص نے مجھ سے درخواست کی تھی اس نے اس کے بدلے کروڑوں روپے ادا کیے اور میں بے تحاشا خوش تھا اس لیے ان مہمانوں کا کسی سے ذکر نہ کیا بلکہ اپنے ایک فارم پر ٹھہرالیا۔ آہ کتنی بڑی بھول کردی اپنے دشمنوں' لٹیروں کو اپنے ہی گھر میں ٹھہرالیا۔ ایک دم سے بڑھتی ہوئی دہشت گردی نے مجھے اتنا مصروف کردیا کہ میں صرف فون پر ہی ان سے رابطہ کرسکا خود فارم ہاؤس نہ جاسکا۔

کبھی بازاروں میں بم بلاسٹ ہوتا اور زمین خون سے رنگین ہوجاتی اور بچے یتیم اور عورتیں بیوہ ہوجاتیں۔ عدم تحفظ بڑھتا جارہا تھا۔ وزیرِ داخلہ ہونے کی وجہ سے میری ذمہ داری تھی کہ میں ملک میں امن و امان قائم رکھتا۔ میڈیا چیخ رہا تھا۔ میں لوگوں کو تسلیاں دیتا۔ اسپتالوں کے دورے کرتا لوگوں کے گھروں میں جاتا اور پریس کانفرنس کرکے بیان دیتا کہ دہشت گردوں سے آہنی ہاتھوں

سے نمٹا جائے گا۔ نہ جانے دہشت گرد کہاں سے آتے، خون کی ندیاں بہا کر غائب ہو جاتے اور پولیس دیکھتی رہ جاتی۔

میں خود بے حد پریشان تھا۔ عوامی اور حکومتی دباؤ مجھ پر بڑھتا ہی جا رہا تھا کہ ایک ایسا سانحہ ہوا جس نے ملک کے طول عرض میں طوفان برپا کر دیا ہر آنکھ اشک بار ہوگئی۔ غیر ملکی سطح پر بھی اس کی شدید مذمت کی گئی۔ بچوں کے اسکول میں بم بلاسٹ نے ہر دل کو دکھی کر دیا اور میں جس کی آنکھوں میں کبھی آنسو نہ آئے تھے۔ معصوم بچوں کی کٹی پھٹی لاشیں دیکھ کر میری روح کانپ اٹھی۔ بیگ کہیں پڑے تھے، کاپیاں کتابیں بکھری ہوئی در و دیوار لہو سے رنگین اور میری بیٹی اور بیٹا بھی تو اسی اسکول میں تھے۔ جب میری بیوی نے کہا آمنہ اور عبید کا پتہ کرو وہ ٹھیک ہیں نا میں پاگلوں کی طرح انہیں ڈھونڈنے لگا اور پھر مجھے آمنہ نظر آئی اسے ایمبولینس میں لے جایا جا رہا تھا اور بہت سے بچے تھے خون میں لت پت اعضاء بکھرے ہوئے۔

میں وزیر نہیں رہا تھا۔ میں صرف باپ تھا جس کی زندگی کا سرمایہ آمنہ تو مل گئی مگر عبید کا نہیں پتہ نہیں چل رہا تھا۔ اخباری نمائندے دھڑا دھڑ سوال کر رہے تھے۔ ''سر! سنا ہے اس اسکول میں آپ کے بچے بھی زیر تعلیم تھے وہ کہاں ہیں، زخمی ہیں، کون سی کلاس میں تھے؟'' لیکن میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ کسی دل جلے نے کہا اب اپنے چمن کو آگ لگی ہے اب تو یقیناً دہشت گرد پکڑے جائیں گے۔ میں کیا کہتا سینے میں آگ جل رہی تھی۔ جب اسپتال پہنچا بیوی وہاں پہلے پہنچ چکی تھی اور پاگلوں کی طرح آمنہ اور عبید کو ڈھونڈ رہی تھی۔ کسی کا واحد سہارا شہید ہوا تو کسی کی گود اجڑی ہر طرف چیخ و پکار تھی آہ مجھے آمنہ نظر آئی۔ ''بابا بابا عبید بھیا مجھے بچانے آئے تھے کہ ایک انکل نے ان کو پورا برسٹ مار دیا۔ بابا، بھیا میرے سامنے زمین پر گرے تھے۔ بہت خون نکل رہا تھا اور انہوں نے آپ اور ماما کو بھی بلایا تھا اور پھر وہ چلے گئے۔ انکل نے مجھے بھی مارا، مجھے بہت درد ہو رہا ہے بابا۔'' میری بیٹی فریاد کر رہی تھی مگر میں بے بسی سے اسے دیکھ رہا تھا یہ دہشت گرد کہاں سے آئے میں ان کو نیست و نابود کر دوں گا۔

جب میں نے اخباری بیان دیا تو یہی کہا ہر بچی میری آمنہ اور ہر بچہ میرا عبید ہے میں کسی کا خون را

دل اور زبان

ایک دن حکیم لقمان نے اپنے ملازم سے کہا کہ ''آج کھانے میں بکری کے وہ اعضا پکا کر لاؤ جو جسم انسانی میں سب سے بہتر عضو خیال کیے جاتے ہوں۔'' ملازم نے دل اور زبان پکا کر پیش کر دیئے۔

دوسرے دن لقمان نے بدترین اعضاء پکانے کا حکم دیا تو ملازم اس روز بھی دل اور زبان پکا کر لے آیا۔

لقمان نے اس سے سوال کیا کہ ''یہ کیا بات ہے کہ جب میں نے بہترین اعضاء پکانے کو کہا تو تم دل اور زبان لے کر آئے اور جب میں نے بدترین اعضاء کی تاکید کی تب بھی تم یہی دونوں چیزیں پکا کر لے آئے۔'' ملازم نے جواب دیا کہ ''اے حضرت اگر دل اور زبان ذکر الٰہی میں معمور اور ارشاد خداوندی کے تابع ہوں تو یہ بہترین حصہ جسم ہیں اور اگر اس کے برعکس صورت حال ہو تو یہ بدترین حصہ جسم ہیں۔''

(مرسلہ: ساجد علی..... ملتان)

یگاں نہیں جانے دوں گا۔ دشمنوں کو قطرہ قطرہ خون کا حساب دینا ہوگا۔ معصوم بچوں کی درس گاہوں کو نشانہ بنانا کسی مسلمان کا کام نہیں۔ یقیناً اس ظلم و بربریت میں غیر مسلموں کا ہاتھ ہے۔ ہمارا مذہب تو بچوں کو پھول قرار دیتا ہے کوئی کتنا بھی شقی القلب ہو وہ بچوں پر اتنا ظلم نہیں کر سکتا۔ تمام داخلی راستے بند کر دیے گئے تاکہ دہشت گردوں کو گرفتار کیا جا سکے۔

ابھی بیٹے کو کفن پہنا کر فارغ نہیں ہوا تھا کہ میری معصوم آمنہ بھی زخموں کی تاب نہ لا سکی اور اپنے بھائی کے پاس چلی گئی میرا گھر نعمت اور رحمت سے خالی ہو گیا میرا اتنا بڑا گھر جہاں میرے بچوں کی چہکاریں گونجتی تھیں شہر خموشاں بن گیا میری بیوی کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ تھا وہ بھی اپنے بچوں کے پاس چلی گئی اور میں تنہا رہ گیا اس واقعہ کو گزرے دو مہینے ہو گئے کافی لوگوں کو گرفتار کیا گیا دہشت گردی میں کمی واقع نہ ہوئی بلکہ کہیں نہ کہیں بم بلاسٹ ہوتا اور عرض وطن لہو سے رنگین ہو جاتا۔ دہشت گرد جلاد تھے جو لوگوں کو خون میں نہلا کر غائب ہو جاتے پوری فورس لگانے کے باوجود کچھ پتہ نہ چلتا۔

ایک دن میں اپنے فارم ہاؤس کی طرف گیا۔ میرے ذہن سے ہی نکل چکا تھا کہ یہاں کچھ مہمان ٹھہرے ہوئے ہیں۔ پے در پے صدمات نے میرا ذہن ماؤف کر رکھا تھا۔ جب میں اندر گیا تو کمرے سے سرگوشیوں کی آواز آ رہی تھی۔ ”ہاں سر ہم اپنے مقصد میں کامیاب رہے ہیں۔ کسی کو ہم پر شک نہیں ہوا۔ اسکول کا تجربہ بہت کامیاب رہا ہے۔ مسلمانوں کی آئندہ آنے والی نسل کو ہی اڑانا چاہیے۔ بوڑھوں اور عورتوں کو مار کر کیا کرنا۔ بچوں کو ماریں گے تو پاکستان کا فیوچر تاریک ہوگا۔ اسی آنے والی نسل نے ملک کو سنبھالنا ہے جب یہ نسل نہ رہے گی تو ملک کیسے بچے گا بس سر دیکھے گا۔ چند برسوں میں یہ پاک دھرتی بھی ہماری ہوگی۔“

میں نے اپنے کانوں سے سنا۔ میں کیسا بدنصیب شخص تھا جس نے خود دشمنوں کو بلایا اپنی آستین میں سانپ پالے اور اپنے بچوں کی زندگیوں کا سودا کیا۔ میں نے اپنے بچوں کے خون کے پیسے لیے یہ صرف آمنہ اور عبید نہ تھے یہ تو ہزاروں بچے تھے۔ آہ میرے ہاتھوں پر ان بچوں کا خون قطرہ قطرہ ٹپکنے لگا آوازیں آنے لگیں۔ انکل ہمارے ماں باپ نے آپ کو اس لیے ووٹ دیئے تھے کہ آپ ہمیں مار دیں بس پھر مجھے کچھ یاد نہ رہا یاد رہا تو اتنا کہ یہ میرے بچوں کے دشمن ہیں۔ میں نے گارڈ سے گن لی اور ان دس لوگوں کو گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ نہ جانے مجھ میں کہاں سے طاقت آ گئی کہ میں بس گولیاں چلاتا گیا اور ان ظالموں کو سنبھلنے کا موقعہ ہی نہ مل سکا اور پاک دھرتی کو ان سوروں سے پاک کر دیا اور گارڈ سے کہا ان کی لاشوں کو جلا دو یہ وطن کے دشمن تھے مگر کسی کو بتانا نہیں وہ میرا وفادار گارڈ تھا میں ان کو مار کر گھر آ گیا لیکن سکون نہیں ملا، کبھی بچوں کی آوازیں گونجتی ہیں تو کبھی ماؤں کی سسکیاں کانوں کے پردے پھاڑتیں کبھی باپ چیختے چلاتے نظر آتے۔ اپنا دامن خون سے بھرا نظر آتا ہے میں راتوں کو سو نہیں سکتا اس لیے میں نے تمام دولت ٹرسٹ کے نام کی اور ایک رات سب سے چھپ کر گاؤں چلا گیا۔ میرا حلیہ تبدیل ہو گیا اس لیے گاؤں کی گلیوں میں پھرتا رہا چین نہیں ملا تو پھر یہاں آ گیا۔

میں پاگل ہونا چاہتا ہوں مگر اللہ مجھے پاگل نہیں

کرتا اور یہ ہوش کی دنیا مجھے ہر پل اذیت دیتی ہے اس لیے میں خود سے سوال کرتا ہوں کہ میں کون ہوں؟ یہ دیکھو میرے ہاتھوں پر کتنے سارے لوگوں کا خون ہے جو پکار پکار کر کہہ رہا ہے یہ خونی ہے اس نے تمھارا سودا کیا ہے اس نے چند ٹکوں کے عوض تمھاری زندگی بیچی ہے۔ میں کتنا ظالم ہوں خالی ہاتھ ہوں مگر یہ سرخی میرے ہاتھوں سے صاف نہیں ہوتی۔ ہمیں تو لوگوں نے اپنا قیمتی ووٹ دیا کہ ہم ان کا تحفظ کریں ان کے لیے آسانی فراہم کریں مگر ہم سیاست داں کیا کرتے ہیں؟ صرف اپنے مفاد کا سودا۔ اپنا ہی ملک اپنے ہی لوگوں کو بیچ دیتے ہیں اور پھر بھی آزاد رہتے ہیں کیوں؟ سنو تم میری بیٹی کی طرح ہو مجھے اس زندگی سے نجات دے دو۔ میں نیند کے لیے ترس رہا ہوں مجھے نیند نہیں آتی کیونکہ جب آنکھیں بند کرتا ہوں تو معصوم چہرے نظر آتے ہیں خون سے تر بہ تر اور پھر میں آنکھیں بند نہیں کر پاتا۔"

"سر! آپ......"

"میں سر نہیں ہوں۔ بیٹی تم نے خبر نہیں پڑھی کہ وزیر داخلہ اپنے گھر سے غائب ہیں پتہ نہیں ان کو اغواء کیا گیا ہے یا وہ خود کہیں چلے گئے ہیں۔ دراصل بیٹے بیٹی اور پھر بیوی کی موت کے صدمے نے انہیں نیم پاگل بنا دیا تھا اب نئے وزیر داخلہ کے لیے نام زیر غور ہیں تم مجھے بابا جی ہی کہو۔"

"آپ اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگیں۔ اللہ غفور ہے رحمٰن اور رحیم ہے۔ وہ آپ کو معاف کرے گا۔ آپ کو سکون دے گا۔ آپ سچے دل سے بارگاہ الٰہی میں سر جھکائیں۔ میں پھر آپ سے ملنے آؤں گی۔"

انابیہ جی! کیا بتایا بابا جی نے۔"

"بہت کچھ ثانی! بس بہت دکھ ہوا کاش ہم انسانیت کی سطح سے نیچے نہ گریں اگر لوگ ہم پر اعتماد کرتے ہیں ہمیں اپنا محافظ بناتے ہیں تو ہم عوام کی توقع پر پورا اتریں۔ اس وطن کے لیے کام کریں۔ روپے پیسے کو اہمیت نہ دیں۔ اس چمن کا چند ٹکوں کے عوض سودا نہ کریں تم ان کا خیال رکھنا بتاؤں گی تمھیں۔"

"پورا ہفتہ ہو گیا تم نے نہ فون کیا اور نہ آئی ہو بڑی مطلبی ہو یار سنو وہ بابا جی تمھارے جانے کے تیسرے دن ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے ان کے چہرے پر بڑا سکون تھا۔ وہ کشمکش بے چینی اور بے قراری جو ہر وقت ان کے چہرے پر نظر آتی تھی بالکل بھی نہیں تھی۔ بہت پر سکون چہرہ تھا ان کا بس ہم نے دفنا دیا۔"

"ثانی! تم مجھے بتا دیتی تو میں آ جاتی۔ وہ بہت بڑے سیاستدان تھے اپنے کردہ گناہوں کی سزا بھگت رہے تھے شکر ہے کہ انہیں اپنے گناہوں کا احساس تھا اور یقینی طور پر اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی اس لیے مرتے وقت ان کے چہرے پر سکون تھا۔ کاش ہمارے تمام سیاستدان نیک نیتی سے ملک کے مفاد کے لیے کام کریں عوام کی بھلائی کے لیے کام کریں۔ دیکھو زندگی تو یہ ہے نا کہ اتنا مشہور آدمی کس گمنامی کی موت مرا کہ کوئی اس کے جنازے میں شرکت ہی نہ کر سکا۔"

"انابیہ کون تھا وہ؟"

"سابقہ وزیر داخلہ عبداللہ۔"

"کیا.....!" ثانی کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

ایجنسی

کے ایم خالد

طنز و مزاح ادب کی سب سے مشکل صنف ہے۔ اس پر لکھنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ کے ایم خالد نے اسے جس طرح نبھایا اس کے لیے وہ قابل ستائش ہیں یہ حقیقت ہے کہ اداس لمحوں پر مسکراہٹیں بکھیرنا بھی عبادت ہے اور انہوں نے اس تحریر کے ذریعے اپنے قارئین کو مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ امید ہے وہ آئندہ بھی اپنے قارئین کو یونہی ہنساتے رہیں گے۔

اس شخص کی روداد' جو اپنے تئیں شاعر' ادیب اور بہت بڑا کالم نگار بھی تھا۔

فخر الدین کو بچپن سے ہی ادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ وہ بڑے فخر سے اپنا سلسلہ نصب لکھنو کے شعراء سے جوڑتے، مگر جب بھی انہوں نے اپنی اماں سے شجرہ بنوانے کی کوشش کی نہ جانے کون سی غلطی ہو جاتی ان کے شجرے کے ڈانڈے ''لکھنو بینڈ باجے'' سے جا ملتے۔ لکھنو دور کا مڑا تڑا پائجامہ، ایک کڑھا ہوا کرتہ اور چند غزلیں اور نظمیں ان کو وراثت میں ملی تھیں۔ جوان کو زبانی یاد ہو چکی تھیں۔ جب مشاعرے میں فخر الدین لکھنو دور کے کرتہ اور چوڑی دار پائجامہ کی سلوٹیں دور کر کے پہنتے تو لکھنو کے بانکے معلوم ہوتے۔ لوگ ان سے ان کے والد کی نظم صرف اس وجہ سے سن لیتے کہ وہ لکھنو کے ایک عظیم شاعر کی نظم ہے۔ وہ جب سٹیج پر چڑھ کر للکارا مارتے

تانگے کے آگے گھوڑا
گھوڑے کے پیچھے تانگہ
سرپٹ بھاگ گھوڑے
ورنہ چابک دوں گا

تو سننے والے واہ واہ کے ڈونگرے برساتے اور فخر الدین کا فخر سے سینہ چوڑا ہو جاتا۔ فخر الدین نے اپنی حتی الوسع کوشش کی وہ شاعری کے میدان میں اپنے باپ سے آگے نکل جائیں۔ مگر باوجود کوشش کے وہ ایک بھی شعر کا اضافہ نہ کر سکے۔ ان کی خواہش تھی کہ عزت اور دولت جلد ان کے قدم چوم لے۔ مگر ان کی یہ خواہش دل کی کسک بن کر رہ گئی۔ شاعری کو اپنے ہاتھ سے جاتا دیکھ کر انہوں نے نثر کے میدان میں قدم رکھ دیا۔ شروع میں انہوں نے بچوں کے لئے کہانیاں لکھیں۔ وہ بڑوں کے لئے لکھنا چاہتے تھے۔ مگر ان کو کوئی چھاپنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ بچوں کی کہانیوں کی فوٹو کاپی کرواتے اور کبھی کبھار خود بچوں کو سناتے اور بعض اوقات ان میں فوٹو کاپیاں تقسیم کر دیتے اور یوں ان کا ادب سموسوں، پکوڑوں میں تل رہا تھا۔

❀......❀......❀

فخر الدین سوا چار فٹ کے کڑیل جوان تھے۔ بچپن میں پولیو کی وجہ سے ایک ٹانگ میں ہلکا سا لنگ تھا۔ بڑے بخار میں کوتاہی کی وجہ سے چیچک ان کے چہرے پر اپنی ''بہار'' چھوڑ گئی تھی۔ ان کی صحت ان کو آندھی میں گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے دنیا جہان کے ''لاڈ پیار'' ان کے حصے میں آئے تھے اور اسی لاڈ پیار نے انہیں پھلنے پھولنے نہیں دیا۔ اعلیٰ تعلیم میٹرک تک پہنچانے میں اس قدر ان کے اساتذہ کا کردار نہیں تھا جتنا اس میں حصہ گورنمنٹ نے ڈالا۔ پانچویں میں پہنچے تو حکومت نے اعلان کر دیا اس سال بچوں کو بغیر امتحان اگلی کلاسوں میں بھیج دیا جائے۔ آٹھویں میں بھی بغیر امتحان تکا لگ گیا اور میٹرک میں ایف گریڈ کی سند کو انہوں نے موصول ہوتے ہی پلاسٹک کور کروالیا تاکہ ان کی واحد ڈگری خراب نہ ہو جائے۔ انہوں نے کالج میں داخلے کی کوشش کی مگر جہاں بھی گئے ایف گریڈ ان کے آڑے آ گیا اور یوں انہوں نے اعلیٰ تعلیم کی خواہش کو دل میں ہی دبا دیا۔

باپ نے جلد اپنا بوجھ بھی فخر الدین پر لاد کر مٹی کی چادر اوڑھ لی۔ فخر الدین کی ماں جلد اپنے ''چاند'' کے چہرے پر سہرا سجانا چاہتی تھی۔ وہ چولن نے ان کے ''رخ روشن'' کو دیکھ کر ان کی اماں سے کہا ''بچہ کرتا کیا ہے؟''

اور اماں نے کہا ''نہیں، ابھی ہم نے شادی نہیں کرنی۔ ابھی تو کری نہیں لگا برخوردار۔''

''بہن، چھوکری مل جائے تو اس کے بھاگ بھی ا

س کے ساتھ ہی جاگ جائیں گے۔" وچولن نے کہا۔

"مگر بہن! ایسے میں اس کے ساتھ کون شادی کرے گا۔ ہے تو لاکھوں میں ایک مگر......" اس کی اماں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"ہاں ہے تو واقعی لاکھوں میں ایک۔" وچولن نے معنی خیز نظروں سے فخر الدین کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو پھر بات چلاؤ کہیں۔" اماں نے خیالی دنیا میں اپنے برخودار کے سر پہ سجے سہرے دیکھے۔ اور پھر ان کے درمیان "بر" کا "ریٹ" طے ہو گیا۔

جب وچولن نے انہیں کامیابی کی خوشخبری سنائی تو ماں، بیٹے کو اپنی سماعت پر یقین ہی نہ آیا۔ شادی سے چند دن قبل وچولن نے فخر الدین کو شادی کے دن سسرال کے گھر میں کامیابی کے چند گر بتائے۔ اس نے کہا۔ "بس بارات والا دن خیر، خیریت سے گزر جائے بس پھر سے خیراں ہیں۔"

سسرال میں فخر الدین کا سہرے کو چہرے سے نہ اٹھانا شرمیلے پن اور مشرقی روایات کی پاسداری قرار دیا گیا۔ سالیوں نے بار بار اصرار کیا "ذرا درشن تو کروا دیں، نظر نہیں لگے گی۔"

انہوں نے اپنی پاٹ دار آواز کا سہارا لیا۔ "نہیں، یہ ہماری خاندانی روایات ہیں۔ شادی کے دن ایسے نظر لگ جاتی ہے۔" وچولن نے کہا "اری سالیوں! درشن کرو گی تو منہ میں انگلیاں داب لو گی۔" وچولن نے چند اور چکنی چپڑی باتیں کیں اور رخصتی سے قبل ہی اپنا مال کھرا کیا اور یہ جا وہ جا۔

فخر الدین کے گھر میں اس کی بیوی کی چیخیں دل دہلا رہی تھیں۔ سبھی محلے دار اور رشتہ دار اس چیخ پکار کو سن کر اکٹھے ہو گئے تھے۔ فخر الدین سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔ نئی نویلی دلہن چیخ رہی تھی۔

"کون میرے گھر فون کر دے، کوئی میرے ابا کو بلا دے۔ خدا کی پناہ اتنا بڑا دھوکا۔"

"بیٹی! جو ہوا سو ہوا اب تم اس کی منکوحہ ہو یہی تمہارا خاوند ہے۔" ایک بڑی بی نے تسلی دی۔

"اچھا، چلو میں تمام عمر تمہاری غلامی کروں گا اتنا ذلیل تو نہ کرو۔" فخر الدین نے روہانسو ہو کر کہا۔ اور نہ جانے وہ کونسا لمحہ تھا کہ نئی نویلی دلہن کا دل فخر الدین اور اس کی اماں کی منت سماجت کو دیکھ کر پسیج گیا۔ جو شرمندہ شرمندہ سے ملتجی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ رہے تھے۔

ولیمے کے دن فخر الدین کو دیکھ کر ان کے سسرال والے غصے سے بپھرے ہوئے تھے۔ وہ اس وچولن کو ڈھونڈ رہے تھے جس نے یہ "بر" ان کے پلے باندھ دیا تھا۔ سالیاں منہ میں انگلیاں دابے چہ میگوئیاں کر رہی تھیں "وچولن ٹھیک ہی کہہ رہی تھی منہ میں انگلیاں داب لو گی۔" اس کی ساس اور سسر شرمندگی سے اپنے رشتہ داروں کا سامنا کرنے سے کترا رہے تھے۔

"بیٹی! میں تو اب بھی کہتی ہوں اس جہنم سے نکل آ۔" اس کی ماں نے اس کے کان میں کہا۔

مگر فخر الدین کی بیوی نے اپنے خاوند کی منتوں اور ترلوں کا مان رکھ لیا۔ "اماں تم نے ہی تو کہا تھا اس گھر سے اب تمہارا جنازہ ہی نکلنا چاہیے۔"

❀......❀......❀

ایف گریڈ کی سند کے ساتھ انہوں نے سرکار کی "خدمت" کرنے کی بہت کوشش کی مگر کہیں کسی اور کی سفارش آ گئی اور کہیں ایف گریڈ اور فخر الدین کی اپنی "شخصیت" کام دکھا گئی۔ ابا کی وفات کے بعد انہیں آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوا ان کے ایک ادبی دوست نے ان کو مشورہ دیا کہ اچھی کتابیں پڑھو خود ہی اچھا لکھنا شروع کر دو گے اور فخر الدین دوسرے دن

ہی ٹارزن، جنوں اور بھوتوں کی کتابیں اٹھالایا۔ جن کو دیکھ کر ان کا ادبی دوست ان کے "ادبی ذوق" کا معترف ہو گیا۔ ان کے دوست نے ان سے کہا۔ "یہ بھی ٹھیک ہے مگر لوگوں پر اپنا ادبی رعب ڈالنے کے لیے مفتیانے، علی پور کا ایلی، راجہ گدھ، اشفاق احمد کے ناول اور زاویہ جیسی کتابیں لا کر رکھو، پڑھو بے شک نہ"۔ اور انہوں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

کتابیں خریدنے کے لیے وہ چند دن پیسے جوڑتے رہے اس مقصد کے حصول کے لیے نئی نویلی دلہن بہت کام آئی۔ اس نے میکے کی جمع پونجی فخر الدین کے قدموں میں ڈھیر کر دی۔ وہ کتابیں خریدنے کے لیے بے تاب تھے۔ اس لئے وہ شہر کی کتابوں کی سب سے بڑی دوکان پر پہنچے۔ "جی"۔ سیل مین نے عینک سے اس کی جانب گھورتے ہوئے کہا۔ اس نے کتابوں کی لمبی، چوڑی لسٹ اس کے ہاتھ میں تھما دی۔

"یہ کتابیں چاہئیں۔"

"اتنے پیسے ہیں۔" سیل مین نے ان سے استفسار کیا۔

"جی۔۔۔۔جی وہ میں بیوی۔۔۔۔۔میرا مطلب ہے لے کر آیا ہوں۔" انہوں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"پہلے آپ کو کتابوں کا ٹوٹل نہ لگا دوں۔ اگر نکل دیں تو پھر مشکل ہو جائے گی۔" سیل مین نے آنکھوں ہی آنکھوں میں انہیں ٹٹولتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔" اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"پانچ ہزار تین سو پچپن روپے" سیل مین نے کیلکولیٹر پر انگلیاں مارتے ہوئے کہا۔

"وہ آپ تو تھوک میں کتابیں فروخت کرتے ہیں۔ پھر اتنا زیادہ بل۔" فخر الدین نے بمشکل تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"تھوک میں ہی فروخت کرتے ہیں، ردی میں نہیں۔ آپ کے پاس کتنے پیسے ہیں۔"

"سات سو چودن روپے۔" انہوں نے جیب کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"رہنے دیں جناب! اتنے میں تو "مفتیاتے" بھی نہیں آئے گی۔ اس کے وزن کا پتہ ہے۔" سیل مین نے کتاب ان کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے کہا۔

"ہاں کافی بھاری ہے" فخر الدین نے بمشکل اس کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

"او بھائی میرے۔ میں اس کے ادبی وزن کی بات کر رہا ہوں اور تم اسے ہاتھوں میں تول رہے ہو۔ ایک مشورہ دوں ردی کی دوکان کھول لو تم جیسے کئی بے ذوق ردی میں قیمتی کتابیں بیچ جاتے ہیں۔ ویسے تم نے کتابیں کرنی کیا ہیں؟" سیل مین نے اسے ایک نیک مشورہ دیا۔

"میں خود ایک شاعر اور ادیب ہوں۔" انہوں نے فخر سے گردن اکڑاتے ہوئے کہا "بس ذرا ان لوگوں کو بھی پڑھنا چاہتا تھا۔" لسٹ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ویسے آپ نے مجھے مشورہ خوب دیا، ردی کی دوکان، مگر ایک بات بتا دوں آپ کو میری کتاب ردی کی دوکان سے نہیں ملے۔" انہوں نے اپنے کالر کو فخریہ انداز میں ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"جی۔۔۔۔جی چھپے گی تو ملے گی۔" سیل مین نے مسکراتے ہوئے ان کی جانب الوداعی مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

❀......❀......❀

ردی کی دوکان نے فخر الدین کے لیے ایک پنتھ دو کاج والا کام کیا۔ ان کی دوکان میں ادبی محفلیں بھی جمنے لگیں اور وہ ادب بھی "سستا" پڑھنے لگے۔ یوں ردی نے ان کے روزی رزق کا دروازہ بھی کھول

دیا۔ ایک دن وہی "مفتیانے" جس کے لیے انہوں نے سیل مین سے بے نقط سی تھیں ایک جہاز ران کے پاس تمیں روپے میں بیچ گیا۔ جب دوکان کی ادبی محفلوں میں وہ اپنی مشہور زمانہ کہانی ٹارزن کی واپسی اور عمرو عیار کوہ قاف میں، سناتے تو ان کے "ادبی دوست" دل کھول کر ان کو داد دیتے کچھ دوستوں نے تو انہیں "جلدی میں" انگریزی کا شکسپیئر اور اردو کا اشفاق احمد بھی قرار دے دیا۔ محفل کے اختتام پر ادبی نواز دوستوں کی چائے اور پکوڑوں کے ساتھ تواضع کی جاتی۔ کبھی کبھار پیپسی اور مٹھائی کا دور بھی چلتا۔

"فخر الدین! میرے خیال میں یہ چائے اور بوتل والا کام بھی اب مکا ہی ڈالو۔ چائے دور سے آتے ہوئے ٹھنڈی اور بوتل گرم ہو جاتی ہے۔" ایک رضا کار سپاہی نے لڈو منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"بات تو تمہاری ٹھیک ہے مگر میری جیب ابھی اجازت نہیں دیتی۔"

"تو اس میں پریشانی والی کون سی بات ہے کریڈٹ کارڈ بنوالو بعد میں تھوڑے تھوڑے کر کے لوٹا دینا۔ میرا ایک دوست بینک میں ہے کارڈ بھی جلدی بن جائے گا۔ میں اسے تمہارا موبائل نمبر دے دوں گا۔ ان کی سروس بہت تیز ہے۔" ایک اور ناقد دوست نے ایک قیمتی مشورہ دیا۔

"ہاں یار! بات تو تمہاری دل کو لگتی ہے اس سے بات کرو" فخر الدین نے اطمینان کا سانس لیا۔

"دکان میں رنگ روغن کروالو میں کسی سے بات کروں۔" ایک دوست نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں، تمہاری بات بھی ٹھیک ہے ذرا دکان بھی چمک جائے اور میں چند اور کرسیوں کا بھی بندوبست کرتا ہوں۔ اب میرے ادبی مہربان بڑھتے جا رہے ہیں۔" انہوں نے اپنے دوست سے کہا۔

"فخر الدین! میں تو کہتا ہوں اگر اللہ نے آپ کو صلاحیت دی ہے تو کھل کر لکھیں۔" ایک دوست نے سڑ سڑ کر کے چائے پیتے ہوئے کہا۔

"کیا لکھوں کوئی چھاپتا ہی نہیں۔ کوئی لوکل اخبار بھی بڑی منتوں کے بعد چھاپتا ہے۔ سب یہی کہتے ہیں ابھی محنت کرو۔" فخر الدین نے رنجیدہ سے لہجے میں کہا۔

"اچھا تو پھر ایسا کرتے ہیں آج کے ادبی اجلاس کا اختتام کرتے ہیں۔ میرے ایک دوست کالم نگار ہیں۔ ان سے مشورہ کرتے ہیں۔ بھئی جلدی چائے اور مٹھائی ختم کرو۔" ان کے دوست نے خود ایک رس گلے کو گلے میں اتارتے ہوئے کہا اور بھی ناقدین میں افراتفری مچ گئی۔

فخر الدین نے دکان سے سائیکل نکالی۔ ہاتھ لگا کر ٹائروں کی ہوا چیک کی۔ خود قینچی چلا کر گدی پر بیٹھے اور دوست کو پیچھے بیٹھنے کے لیے آواز دی۔ دوست نے ان کی آواز پر اچک کر کیریئر پر بیٹھنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں سائیکل فخر الدین سے بے قابو ہو گیا مگر جلد ہی انہوں نے سائیکل کو سنبھالا دیا۔ اسی طرح ڈولتے ہوئے وہ اپنے دوست کے دوست کے گھر پہنچے۔ کالم نگار دوست نے ان کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ چائے وغیرہ سے تواضع کی اس کے بعد انہوں نے اپنے دوست سے پوچھا۔

"ہاں اب بتاؤ کیا بات ہے؟"

"بات یہ ہے میرا دوست فخر الدین ایک ادبی آدمی ہے تقریباً بیس سال سے لکھ رہا ہے۔ مگر کامیابی اور شہرت اس سے کوسوں دور ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ آپ کی طرح لکھے اور راتوں رات مشہور ہو جائے۔" دوست نے اپنے آنے کا مدعا بیان کیا۔

"آپ کس میدان میں لکھ رہے ہیں؟" کالم نگار

نے فخرالدین سے پوچھا۔
"میدان میں تو نہیں زیادہ تر اپنی دکان پر ہی لکھتا ہوں۔" فخرالدین نے حیرت سے ان کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔
"میرا مطلب ہے افسانہ لکھ رہے ہیں یا کہانیاں۔" کالم نگار نے نظروں ہی نظروں میں ان کی ذہانت کا جائزہ لیا۔
"اوہ اچھا، شاعری بھی کی ہے۔" انہوں نے سلوکے کی جیب سے ایک ضخیم بوسیدہ سی ڈائری نکالتے ہوئے کہا۔
"شاعری، بس ٹھیک ہے۔ اس کے علاوہ کیا لکھا ہے۔" کالم نگار نے گھبراتے ہوئے کہا۔
"زیادہ تر کہانیاں لکھی ہیں۔ ٹارزن کی پندرہ، عمرو عیار کی تقریباً بیس۔ اس کے علاوہ رحم دل چور، شہزادی سویرا، مینڈک کی شادی، شہزادی گل بہار اور......"
"بس...... بس میں سمجھ گیا۔" کالم نگار نے فخرالدین کو چپ کراتے ہوئے کہا۔ "بھائی میرے، کالم نگار بننے کے لئے حکومت اور ایجنسیوں سے پنگے لینے پڑتے ہیں اور یہ بڑے دل گردے کا کام ہے۔"
"وہ کیسے؟" فخرالدین نے اپنے دل کی دھڑکن کو بے ترتیب محسوس کیا مگر پھر بھی پوچھ ہی لیا۔
"آپ نے کبھی کالم لکھا ہے۔" کالم نگار نے بغور ان کے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔
"ہاں علامہ اقبال اور قائداعظم پر لکھا تھا"۔
"اچھا تعلیم کتنی ہے؟"
"میٹرک۔" فخرالدین ایف گریڈ کو چھپا گئے۔
"تعلیم تو میٹرک بھی بہت ہے۔ بہت سے ایسے کالم نگار ہیں جن کا اس وقت طوطی بول رہا ہے اور وہ میٹرک بھی نہیں ہیں۔ لاکھوں کما رہے ہیں۔" یہ سن کر فخرالدین کے چہرے پر رونق آ گئی۔ "ویسے آپ نے کون کونسے کالم نگاروں کو پڑھا ہے۔"
"میں تو کالم نگاروں کو روز تولتا ہوں اور میں نے ان کو کلو کے حساب سے پڑھا ہے۔"
"تو اس کا مطلب ہے آپ کا مطالعہ اس فیلڈ میں کافی وسیع ہے۔ جو شخص کالم نگاروں کے کام کو نظروں ہی نظروں میں تول لیتا ہو وہ کالم لکھے گا بھی خوب۔" کالم نگار نے ان سے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "اچھا آپ ایسا کریں۔ آج کل اخبارات، چینلز، عوام، حکومت سب جنرل مشرف سے استعفیٰ کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ آپ بھی ایک کالم لکھیں اپنے اس کالم میں ان سے اقتدار چھوڑنے کا مطالبہ کریں۔ اگر انہوں نے اقتدار نہ چھوڑا تو ان کا نہ صرف مواخذہ بلکہ محاسبہ بھی کیا جائے گا۔ ذرا سخت لکھیں تبھی بات بنے گی۔ یاد رہے وہ فوجی ہے۔ کوئی ایجنسی بھی آپ کے کالم پر ردعمل ظاہر کر سکتی ہے۔ دل گردہ تو مضبوط ہے نا۔"
"ہاں...... ہاں مضبوط ہے۔" فخرالدین نے گھبراہٹ چھپاتے اور ماتھے پر آئے پسینے کے قطروں کو بازو سے صاف کرتے ہوئے کہا۔
"تو پھر لکھو کالم، اس کی کاپیاں کروا تمام قابل ذکر اخبارات میں پوسٹ کر دو اور ایک اہم بات ان سب کو کالم کی تاریخ اشاعت ایک ہی دو۔ اس سے کالم نگار کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہم بھی چاہتے ہیں ہمارے شہر کے کالم نگار کی اس قدر شہرت ہو جائے کہ غیر ملکی دوروں میں آپ بھی نظر آئیں۔ ٹی وی کے ٹاک شوز میں آپ کے کالم پر بحث کی جائے۔ آپ تخت و تاج کو گرانے والے بھی بنیں اور سیاسی شطرنج کی نئی بساط بچھانے والے بھی بنیں۔ کالم نگار نے

الوداعی مصافحہ کے لیے ان کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔

❁......❁......❁
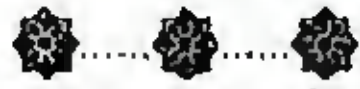
جب آخری بچہ بھی سو گیا تو رات کا ایک بج رہا تھا۔ بیوی کے بے ترتیب خراٹے اس کے خیالات کی روانی کو بھگا رہے تھے۔ اس نے کباڑ میں آیا ہوا ایک گرد آلود ٹیبل لیمپ نکالا۔ اس کو پھونکوں سے صاف کیا۔ کاغذ گتے پر لگائے۔ خود کو کرسی پر گرایا۔ ٹیبل لیمپ کی روشنی کاغذ پر پڑنے لگی۔ پنسل کو انگلیوں میں پکڑا۔ خیالات کی یلغار کو ایک لائن میں کرنے کے لیے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگے۔ یکا یک صدر جنرل مشرف اس کی آنکھوں کے سامنے آگئے۔ بارعب چہرہ، فوجی وردی، کاندھوں اور سینے پر اسٹارز کی ایک لمبی قطار، وہ ٹکٹکی باندھے اس کی جانب دیکھ رہے تھے۔ فخر الدین نے چہرے سے ذرا نیچے نظر کی تو ان کے ہاتھ میں بید کی چھڑی گردش کر رہی تھی اسے یوں لگا جیسے وہ میز پر اتر آئے ہوں۔

"ہوں، میرے خلاف لکھو گے۔" جنرل نے اسے گھورتے ہوئے کرخت لہجے میں پوچھا۔

اس کا دل دھڑک اٹھا۔ زبان پر لکنت طاری ہو گئی۔ اس نے اپنی ڈھارس بندھوائی "ہاں لکھوں گا۔ میں بنوں گا سولہ کروڑ عوام کی آواز۔" انہوں نے ڈرتے ڈرتے کہہ دیا۔

"اچھا تمہاری مرضی۔"

اس نے سر کو جھٹکا شاید اونگھ آگئی تھی۔ سردی کے باوجود وہ پسینے میں شرابور تھے۔ مختلف طرح کے خیالات ان کو بہکا رہے تھے۔ ابھی کاغذ اور پنسل کے بیچ بہت فاصلہ تھا۔ انہوں نے دیکھا ایک بے ہنگم سا ہجوم ایک جانب کو نظریں لگائے ہوئے ہے۔ ٹکٹکی پر کوڑے کھاتے شخص کی تصویر کچھ واضح نہیں تھی۔ جنرل ضیاالحق کے دور میں کوڑے کھاتے لوگوں کا انہوں نے کئی بار تماشا دیکھا تھا۔ فخر الدین نے آنکھوں کو سکیڑا تو تصویر واضح ہوئی ٹکٹکی پر کوڑے کھاتے وہ خود تھے۔ وہ لرز گئے۔ ہاتھ سے پنسل گر پڑی وہ ایک مرتبہ پھر اونگھ گئے تھے۔ وہ اٹھے انہوں نے پانی کے ٹھنڈے چھینٹے منہ پر مارے صحن میں تازہ ہوا سے پھیپھڑوں کو بھرا اور ایک مرتبہ پھر کرسی پر آ بیٹھے۔ انہوں نے پنسل کاغذ پر ٹکا دی خیالات الجھتے رہے وہ بالوں میں انگلیاں پھیر کر ان کو سلجھاتے رہے۔ انہوں نے دیکھا جنرل مشرف ان کے سامنے گھٹنے ٹیکے بیٹھا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ فخر الدین سے رحم کی درخواست کر رہا ہو۔ مگر فخر الدین نے کوئی پروا نہ کی انہوں نے تھوڑی ہی دیر میں تین سو چھبیس الفاظ کا کالم لکھ مارا۔ اس کے باوجود وہ تازہ دم تھے۔ سب منظر غائب ہو چکے تھے۔ انہوں نے اپنے کالم میں مواخذہ اور محاسبہ کے تقریباً دو سو ننانوے الفاظ استعمال کیے تھے۔ انہوں نے اپنے کالم کا اختتام ان الفاظ میں کیا تھا۔ یہ الفاظ انہوں نے ایک انڈین فلم" میں ہوں نا" سے لیے تھے۔ "جنرل مشرف اگر سولہ کروڑ عوام تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکے تو پھر میں تو ہوں نا۔"

❁......❁......❁
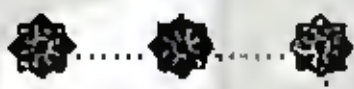
صدر جنرل پرویز مشرف کے خلاف مواخذہ اور محاسبہ کی تحریک زوروں پر تھی۔ حیرت انگیز طور چند قومی اخبارات نے اسے بطور مراسلہ اور تین مقامی اخباروں نے اسے کالم کے طور پر چھاپ دیا۔ فخر الدین ایک بک سٹال پر چمگادڑ بنے اخبارات کو الٹا سیدھا ہو کر دیکھ رہے تھے۔ خوشی ان کے چہرے سے عیاں تھی۔ انہوں نے سبھی اخبارات خرید لیے۔ دکان دار حیرانی سے ان کی جانب دیکھ رہا تھا۔

ان کی دکان پر میلے کا سماں تھا اور وہ ہیرو بنے سب

کی آؤ بھگت میں مصروف تھے۔ دکان میں ہر جانب اخبار بکھرے ہوئے تھے۔ چائے بوتل کے دور چل رہے تھے۔ تعریفوں کے پل باندھے جا رہے تھے۔"اب جائے گا فخر الدین کالم نگاروں کی صف میں۔" ایک مداح نے بوتل کے گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"میں تو کہتا ہوں پہلا کالم اور اتنا زبردست اور آخری فقرہ اتنا جاندار میں ہوں نا۔ واہ بھئی واہ مشرف تجھے تو لازمی ڈھونڈے گا۔" ایک نحیف سے رضا کار سپاہی نے چائے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے پھونک مارتے ہوئے کہا۔

"اوے، ماٹھے ماٹھے ان پڑھ لاکھوں کما رہے ہیں۔ ہمارا فخر الدین تو پھر میٹرک ہے۔" ایک دوست نے کالم پڑھتے ہوئے کہا۔

"میں تو کہتا ہوں سیدھی جنرل سے ٹکر پاکستان میں ایسا کالم نگار نہ ہوگا۔" ایک نیا دوست دکان میں داخل ہوا اور آتے ہی مدح سرائی شروع کر دی۔ اس کے جواب میں فخر الدین نے جلدی سے اس کو ٹھنڈی ٹھار بوتل سے چپ کروا لیا۔

دکان میں آمد و رفت جاری تھی۔ جو "مستفید" ہو چکے تھے وہ اپنے کاروبار پر نکل چکے تھے۔ راستے میں انہیں کوئی بھی نظر آتا وہ فوراً اس کو فخر الدین کا بتاتے اور ساتھ ہی چائے، پانی کی اضافی خوبی کے بارے میں آگاہ کرتے۔ ایک ایک کرکے "تبصرہ نگار" اپنے کاموں پر جا چکے تھے۔ دکان میں فخر الدین اور نحیف سا رضا کار سپاہی رہ گئے۔ اس نے چائے کی آخری چسکی لیتے ہوئے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا۔"احتیاط کرنا تم نے کالم ایک جنرل کے خلاف لکھا ہے۔ میرا مطلب ہے کوئی ایجنسی وغیرہ بھی تمہیں اٹھا سکتی ہے۔"

اس کا دل شیدے گٹے والے کی ٹلی کی طرح کھڑک اٹھا، بے ترتیب سا، ٹھنڈا پسینہ آ گیا۔ اس نے اپنے دل کو ڈھارس دی ابھی کہاں ایجنسی ابھی تو پہلا کالم ہے۔ مگر فخر الدین اتنا سخت نہیں لکھنا چاہیے تھا۔ اس نے اپنے آپ سے کہا آخری فقرہ ایڈیٹر کاٹ دیتا تو بہتر تھا۔

"پیسے جناب!" چائے والے لڑکے کی آواز نے سکوت توڑا۔ رضا کار بھی مشورہ دے کر جا چکا تھا۔ وہ چونک اٹھا۔ "پیسے جناب! کس سوچ میں ہیں" لڑکے کی آواز دوبارہ گونجی۔

"کتنے پیسے؟" فخر الدین نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

"تین سو باون روپے" لڑکے نے جیب سے پرچی نکالتے ہوئے کہا۔

"اتنے زیادہ" انہوں نے اس کے ہاتھ سے پرچی لیتے ہوئے کہا۔

"آپ بھی تو ہر ایک کے لیے چائے، بوتل سموسے، لڈو منگوا لیتے ہو۔"

"اچھا چھوڑ، تمہیں پتہ ہے میرا کالم چھپا ہے ان اخباروں میں۔" فخر الدین نے دکان میں بکھرے ہوئے اخبارات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا، پھر تو آپ بڑے کالم نگار ہوئے نا۔ مجھے بھی اس خوشی میں بوتل پلائیں۔"

"ایک بوتل تم بھی پی لینا۔ سنو یہ اخبار لے جانا اور جو گاہک چائے پینے آئے اس کو میرے کالم کے بارے میں ضرور بتانا، میری دکان کی جانب اشارہ کرکے۔" فخر الدین نے اس کو پیسے اور اخبار پکڑاتے ہوئے کہا جو انہوں نے پہلے ہی زیادہ لے رکھے تھے۔ لڑکا پیسے اور اخباریں لے کر جا چکا تھا۔ انہوں نے دکان میں بکھرے ہوئے اخبارات کو سمیٹنا شروع کر دیا۔ صبح سے نہ جانے کتنی بار وہ ان کو پڑھ چکے

تھے۔انہوں نے ایک بار پھر ایک قومی اخبار کے مراسلے میں وہ فقرہ پڑھا۔"اگر سولہ کروڑ عوام تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکے تو پھر میں تو ہوں نا۔" خوشی پر اچانک خوف غالب آ گیا۔ایجنسی اور خفیہ والے اس کے حواس پر چھانے لگے۔اسے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد سی لہر اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ٹھنڈا سا پسینہ نہ جانے کہاں، کہاں سے بہنا شروع ہو گیا۔اسے یوں محسوس ہوا جیسے دکان میں فوجی چل رہے ہوں۔ان کے بوٹوں کی دھمک اسے دل سے ہوتی ہوئی دماغ میں جاتی محسوس ہو رہی تھی۔صدر جنرل پرویز مشرف ان کے سامنے کھڑے تھے۔جنرل نے کرخت نگاہوں سے فخر الدین کی جانب دیکھا "ہوں، تو تم باز نہیں آئے"۔بید کی چھڑی ان کے ہاتھوں میں گردش کر رہی تھی۔وہ شرمندہ سے کوئی جواب نہ دے سکے۔ان کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کی پسلیاں بلا سر آف پیرس کی ہوں اور ان کا دل ابھی پھڑک کر باہر آ گرے گا۔کلاک کی گھنٹی سے وہ خیالات کی دنیا سے باہر آیا۔تین بج چکے تھے۔وہ پسینے میں شرابور تھے۔اس نے جلدی سے اپنے شٹر گرانے کی کوشش کی کہ لوگوں کو پتہ نہ چلے۔چند لوگوں نے سرسری نگاہوں سے ان کی جانب دیکھا مگر کوئی توجہ نہ دی۔وہ لوگوں کی نظروں سے بچتے بچاتے گھر کی جانب چل دیئے۔ان کے پاؤں من من کے بھر ہو چکے تھے۔وہ اگر دو قدم آگے کی جانب چلتے تو چار قدم پیچھے کی جانب آتے۔انہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ موسلا دھار بارش میں چل رہے ہوں اور رستے کا کیچڑ انہیں آگے بڑھنے سے روک رہا ہو۔نہ جانے کیسے گھر پہنچے۔گھر کی دہلیز پر ہی وہ غش کھا کر گر پڑے۔ان کے بیوی اور بچوں نے انہیں گھسیٹ کر چارپائی پر منتقل کیا۔وہ بخار میں تپ رہے تھے۔منہ سے جھاگ جاری تھی۔

"کیا ہوا؟" ان کی بیوی نے گھبراتے ،انہیں جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"اماں! ابا کو لگتا ہے مرگی کا دورہ پڑ گیا ہے میں جوتا لاتا ہوں وہ سنگھا ئیں۔" چھوٹے صاحبزادے نے کمرے کی طرف بھاگتے ہوئے کہا۔

"جوتا نہیں، جلدی سے پانی لا۔" ایک دوسرے لڑکے نے جلدی سے پانی کا گلاس اپنی اماں کو پکڑایا۔فخر الدین کی بیوی نے جلدی سے پانی کا گلاس ان کے ہونٹوں سے لگایا۔جسے انہوں نے گھٹ گھٹ کر کے پی لیا۔"کیا ہوا؟" ان کی بیوی نے پھر پوچھا۔قبل اس کہ وہ کوئی جواب دیتے۔ان کا دروازہ بری طرح پیٹا گیا۔بڑے لڑکے اکرم کو دروازے کی طرف جاتا دیکھ کر انہوں نے اسے اشارے سے اپنے پاس بلایا اور کہا۔"میرا کوئی پوچھے تو کہنا ابا گاؤں گیا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" اکرم نے سر ہلاتے ہوئے دروازے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"چچا کہاں ہے؟" آنے والی آواز کو وہ پہچان گئے۔یہ چائے والے لڑکے کی آواز تھی۔

"وہ تو گاؤں گئے" ان کے برخوردار نے جھوٹ بولا۔

"مگر ابھی تو آدھ گھنٹہ پہلے دوکان پر تھے۔لڑکے کی آواز میں حیرانی تھی۔

"بس چلے گئے۔کیا کوئی کام تھا تمہیں؟"

"وہ کوئی ایجنسی والے آئے تھے۔چاچا کا پوچھ رہے تھے۔میں نے ان سے کہا شاید گھر گئے ہوں۔میں تو دیکھنے چلا آیا۔"

"اس کو اندر بلاؤ۔" فخر الدین نے کراہتے ہوئے اپنے اکرم سے کہا۔

چائے والا لڑکا فخرالدین کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔انہوں نے اس کے بولنے سے پہلے ہی کہا۔"ڈالا ہوگا۔"

"چاچا!ایک ڈالا نہیں بلکہ ڈالے تھے۔"

"اچھا بات سنو اب اگر تمہیں ملیں یا دوبارہ آئیں تو انہیں کہنا چاچا گاؤں گیا ہوا ہے۔"

"ٹھیک ہے چاچا!میں کہہ دوں گا مگر......"

"اس مگر کو چھوڑ دو۔"

لڑکا باہر جا چکا تھا فخرالدین پریشانی اور خوف کے عالم میں اپنی بیوی کی جانب دیکھ رہے تھے۔"کیا ہوا؟ یہ ایجنسی والی کیا بات ہے؟"اس کی بیوی نے پریشانی سے پوچھا۔

"بات دراصل یہ ہے میں نے جنرل مشرف پر کالم لکھا جو کہ میرے ماڑے مقدر کافی سارے اخباروں میں چھپ چکا ہے۔پہلی چوری اور پہلا پھاہ۔اب خفیہ ایجنسی والے مجھے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔"ان کی بیوی یہ بات سن کر سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"یہ تم نے کیا کیا وہ تمہیں کہاں چھوڑیں گے۔"ان کی بیوی کی اپنی آواز کانپ رہی تھی۔

اتنے میں ان کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔اس پر عجیب سا ٹیلی فون نمبر نمودار ہوا۔"یہ کس کا نمبر ہے 12020135۔"انہوں نے موبائل اکرم کو دکھاتے ہوئے کہا۔

ابا!نمبر تو عجیب سا ہے میرا دوست کہہ رہا تھا۔خفیہ والے عموماً جو فون کرتے ہیں ان کے نمبر موبائل سکرین پر نہیں آتے۔اگر آئیں تو عجیب سے ہوتے ہیں۔ابا اس کو اٹینڈ نہ کرنا۔"

مغرب کا اندھیرا پھیلنے تک فخرالدین کی طبیعت بگڑ چکی تھی۔بخار تھا کہ کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے ابھی اندھیرا اور زیادہ پھیلنے کا انتظار کیا جا رہا تھا۔دروازے کی بیل بجی۔ان کا دل جو پہلے ہی"چھڑا پئے"مار رہا تھا دھڑکنا بھول گیا۔اس نے اشارے سے اکرم کو باہر بھیجا۔کان باہر سے آنے والی آواز پر لگا دیئے۔"فخرالدین کا گھر یہی ہے۔"بظاہر تمیز سے پوچھا گیا۔

"جی یہی ہے۔"اکرم کی آواز آئی۔

"کہاں ہیں وہ؟انہوں نے فون بھی اٹینڈ نہیں کیا؟"

"جی گاؤں گئے ہیں شاید کوئی سگنل کی پرابلم ہو۔"ان کے صاحبزادے نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا۔

"کب تک آجائیں گے؟"تمیز کا دوبارہ مظاہرہ کیا گیا۔

چند دنوں تک،کوئی کام ہے تو بتا دیں۔"

"نہیں بس انہی سے ملنا تھا۔"انہیں موٹر سائیکل کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔اکرم اندر داخل ہوا تو اس کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔فخرالدین کے خود پسینے چھوٹ رہے تھے۔"کون تھے"ان کی آواز بمشکل حلق سے نکلی تھی۔

"پتہ نہیں ابا!صرف آپ کا پوچھ رہے تھے۔"برخوردار نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"خفیہ والے ہوں گے۔تم نے موٹر سائیکل کا نمبر نوٹ کیا۔"انہوں نے بستر میں کانپتے ہوئے ایک خیال پیش کیا۔

"میں نے تو نوٹ نہیں کیا۔مگر انہوں نے ہمارے سارے گھر کا نقشہ بنایا ہے۔گیٹ کا رنگ بھی لکھا ہے۔سامنے والے دکان دار کا نام بھی لکھ کر لے گئے ہیں۔"اکرم ہتا تا چلا گیا۔

"بس بھی کر ابا کو دیکھ لے۔"فخرالدین کی بیوی

چلاتے ہوئے ان کی جانب دوڑتی۔ فخرالدین کے منہ سے جھاگ ایک مرتبہ پھر جاری تھی اور ان کی آنکھیں آسمان کی جانب کھلی ہوئی تھیں۔

❀ ❀ ❀
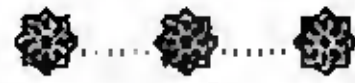
رات سات بجے کا عمل تھا لوڈشیڈنگ نے سارے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اچانک موسم ابرآلود ہوگیا۔ گھٹاٹوپ اندھیرے نے لوڈشیڈنگ کی ''کالک'' کو مزید گہرا کر دیا۔ فخرالدین پر غنودگی طاری تھی۔ بخار تھا کہ کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ ان کی بیوی بار بار ان سے ڈاکٹر کے پاس جانے کا کہہ چکی تھی۔ مگر ان کی جانب سے مسلسل انکار جاری تھا۔ چند سیانے بچے ان کو رو چکے تھے۔

ان کی بیوی نے ایک مرتبہ ان کو پھر سمجھانے کی کوشش کی۔ ''فخرو! ہر جانب اندھیرا طاری ہے تمہیں کوئی نہیں پہچانے گا۔''

''نہیں، خفیہ والے مجھے اٹھا کر لے جائیں گے۔''

''اگر تم نے دوا نہ لی تو صبح تک تمہیں موت اٹھا کر لے جائے گی۔''

''اچھا چلتا ہوں مگر احتیاط کرنا۔'' فخرالدین نے چارپائی پر بیٹھے ہی کمبل اوڑھتے ہوئے کہا۔

''لوڈشیڈنگ اور موسم کا اندھیرا تمہاری مدد کرے گا۔ ایسے میں کون ڈیوٹی پر ہوگا۔ اس وقت تو کتے بھی کہیں دبکے ہوں گے۔'' ان کی بیگم نے برقعہ اوڑھتے ہوئے کہا۔

صحن میں ہی فخرالدین کو اچھی طرح لپیٹ کر سائیکل کے کیریئر پر بٹھایا گیا۔ ان کے چہرے کو اچھی طرح چادر میں لپیٹ کے اس کے پلو ایک چھوٹے لڑکے کے حوالے کر دیے گئے۔ ان کی بیوی نے ان سے کہا ''نہ تم نے کوئی بات کرنی ہے اور نہ تمہارے منہ سے کوئی کراہ نکلے۔''

''ٹھیک ہے۔'' فخرالدین کے منہ سے شاید آخری کراہ ابھری۔

ان کی بیوی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ گلی میں جھانکا اور اکرم کو سائیکل آگے لے آنے کا اشارہ کیا۔ لوڈشیڈنگ اور بارش نے گلیاں سنسان کر دی تھیں۔ اکرم سائیکل کو ہینڈل سے پکڑ کر چلا رہا تھا۔ ان کی بیوی اور چھوٹے لڑکے نے فخرالدین کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ وہ گلی میں موجود بارش کے پانی سے بچتے بچاتے چلے جارہے تھے۔ اچانک اکرم کی سرگوشی نما آواز ابھری ''اماں! ہوشیار رکوئی آ رہا ہے۔''

کمبل اور چادر میں فخرالدین کسمسا کر رہ گئے۔ سنسنی سی ان کے رگ و پے میں دوڑ گئی۔ ان کا دل بری طرح دھڑک کر پوچھ رہا تھا ''کون؟'' مگر وہ چپ تھے۔ آنے والا قریب آچکا تھا۔

''کیا بات ہے پتر! اس وقت کہاں جارہی ہو؟ اور اس کمبل میں کون ہے۔'' ایک ہی سوال میں بہت سے سوال تھے۔

''بس ماسی! ڈاکٹر تک جارہی تھی۔'' ان کی بیوی کی آواز سنائی دی۔ فخرالدین کے دل کی دھڑکن یک دم ایک ٹریک پر آگئی۔ وہ سمجھ گئے یہ ماسی برکتے تھی۔ مگر اب ماسی برکتے سے بچنا بھی کسی ایجنسی سے بچنے کے مصداق تھا۔

''کیوں کیا ہوا؟'' ماسی نے حیرت سے فخرالدین کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ ماسی ابا...... نہیں نہیں کتا ہے۔'' چھوٹے لڑکے نے چادر پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

''اتنا بڑا کتا مگر تمہارے گھر میں تو کتا نہیں

ہے۔" ماسی نے ٹھوڑی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
"یہ چھوٹا سا تھا جب فخرو گاؤں سے لائے تھے۔ تب سے چھت پر بندھا رہتا تھا۔" ان کی بیوی نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
"مگر تمہارے گھر سے کبھی اس کے بھونکنے کی آواز تو نہیں آئی۔"
"بے چارہ گونگا ہے۔"
"گونگے کتے کا کیا فائدہ۔ اتنا بڑا ہے کھاتا کیا کم ہوگا۔ فائدہ کوئی نہیں۔ میں تو کہتی ہوئی گولی مارو اس نحوست مارے کو مرنے دو۔" ماسی کتے کی جان کے درپے تھی۔
"مگر ماسی انسان تو ہے..... میرا مطلب ہے جاندار تو ہے۔"
"اچھا تمہاری مرضی، میری تو اپنی طبیعت خراب ہے۔ ڈاکٹر سے دوائی لے کر آرہی ہوں۔ تمہارا کتا ضرور دیکھتی مگر اندھیرا ہے۔ پھر تمہارا کتا گونگا بھی ہے کہیں کاٹ ہی نہ لے۔ وہ بھی بے آواز، بغیر بتائے۔" ماسی برکتے نے بارش کے پانی سے بچتے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

❀......❀......❀
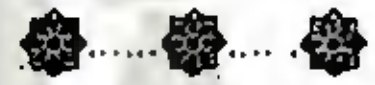
لوڈشیڈنگ اور موسم نے ڈاکٹر اللہ دتہ کی دوکان ویران کر دی تھی۔ کلینک میں روشن سوئی گیس کا لیمپ اندھیرے کو دور کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ ڈاکٹر اللہ دتہ ڈگری میں ہومیو پیتھک تھے۔ مگر تیر تکے انگریزی کے ہی چلاتے تھے۔ سردی سے بچاؤ کے لیے انہوں نے گرم کمبل کو سر تک لپیٹا ہوا تھا۔ اسی گرم کمبل میں پھونکیں مار کر اسے گرم رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کیونکہ ان کی نظر میں کمپوڈر نحوست کی علامت تھا۔ اس لئے وہ اس وقت دوکان میں اکیلے تھے۔ سائیکل کی کھڑ کھڑ کی آواز پر انہوں نے دوکان کے باہر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے نے ان کی نظر کو خالی لوٹا دیا۔ مگر مریض کے خوش کن احساس نے ان کے بدن میں گرمی دوڑا دی۔ انہوں نے سردی سے بجتے دانتوں اور کپکپاتے ہونٹوں سے پوچھا۔ "کون ہے؟ اندر آجاؤ کلینک کھلا ہے۔"
آنے والا سرتاپا کمبل میں لپٹا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے ایک چھوٹا لڑکا اور عورت تھی جس نے اسے مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ اس سے پیچھے سائیکل کو کھڑا کر کے ایک بڑا لڑکا داخل ہوا۔ انہوں نے کمبل والے مریض کو ڈاکٹر کے سامنے بٹھا دیا۔
"کیا جل گیا ہے؟" ڈاکٹر نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔
"آپ نے کیسے اندازہ کیا۔"
"کمبل میں لپیٹا ہوا ہے۔"
"اچھا جو جل جاتے ہیں وہ کمبل میں لپٹے ہوتے ہیں۔" عورت نے معنی خیز نظروں سے ڈاکٹر کے کمبل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"اوہو" وہ کھسیانا ہو گیا۔ "میرا مطلب یہ نہیں تھا..... میرا مطلب ان کی طبیعت سے تھا۔"
"ڈاکٹر ہمارے کتے..... نہیں نہیں ابے کو بخار ہے۔" چھوٹے لڑکے نے فخر الدین کے منہ سے کمبل اتارتے ہوئے کہا۔
"کیا مطلب کتے ..... ابے کو" ڈاکٹر نے گردن کمبل سے نکالتے ہوئے حیرانی سے کہا۔
"یہ میرے خاوند ہیں۔ ان کو بخار بہت تیز ہے اور ساتھ دل کی دھڑکن بھی بہت تیز ہے۔"
"کب سے بخار ہے؟" ڈاکٹر نے تھرما میٹر ان کے منہ میں رکھتے اور بلڈ پریشر چیک کرنے کے لیے ان کی آستین اوپر کرتے ہوئے کہا۔

"آج دوپہر سے۔"

"اوہو، بخار تو بہت تیز ہے ان کو پٹیاں کرنا پڑیں گی۔" ڈاکٹر نے فکر مندی سے کہا۔

"مگر ڈاکٹر صاحب! یہ زخمی تو نہیں ہیں۔ صرف بخار ہی ہے۔" ان کی بیگم نے حیرانی اور پریشانی سے کہا۔

"بی بی! میرا مطلب ہے بخار دور کرنے کے لئے ٹھنڈے پانی کی پٹیاں کرنا پڑیں گی اور بلڈ پریشر بھی بہت بڑھا ہوا ہے ان کو اپنے کلینک میں داخل نہ کر لیں۔" ڈاکٹر نے دوائی کے لیے پڑیاں سیدھی کرتے ہوئے کہا۔

"مگر ڈاکٹر وہ مجھے اٹھا کر لے جائیں گے۔ میں گھر جاؤں گا۔" فخر الدین نے روہانسو ہو کر کہا۔

"کون اٹھا کر لے جائیں گے۔" ڈاکٹر نے ان کی جانب حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ موت کے فرشتوں کی بات کر رہے ہیں۔" ان کی بیوی نے جلدی سے کہا۔

"اچھا، اگر یہ گھبرا رہے ہیں تو پھر یہ دوائی لے جائیں۔ مگر ان کو گھر جا کر پٹیاں ضرور کریں۔" ڈاکٹر اللہ دتہ نے ان کے بازو میں ایک لمبے سے ٹیکے کی سوئی پیوست کرتے ہوئے کہا۔

فخر الدین کو دوبارہ کمبل اور چادر میں لپیٹا گیا۔ خوش قسمتی سے بجلی کا نام ونشان نہیں تھا۔ بارش رک چکی تھی اور سرد ہوا چل رہی تھی۔ یہ قافلہ جس طرح آیا تھا اسی طرح گھر کی جانب روانہ ہوا۔

❀......❀......❀

دوائی اور ٹھنڈی پٹیوں سے فخر الدین کا بخار تو اتر گیا مگر دل کی دھڑکن کو قرار نہ آسکا۔ انہوں نے اپنے خیالات کو بھٹکانے کی بہت کوشش کی مگر وہ اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے۔ وہ ذرا سی پلکیں بند کرتے جنرل پرویز مشرف ان کے سامنے آ موجود ہوتے۔ فوجیوں کے بوٹوں کی دھمک ان کے دل کی دھڑکن کو مزید بے ترتیب کر دیتی۔ خیالات کا ایک ایسا تانتا بندھا تھا جو ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ سارے خیالات اور سپنے ایک سے بڑھ کر برے تھے۔ لوڈ شیڈنگ خراب موسم کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی طویل ہو چکی تھی۔ انہوں نے احتیاطی تدابیر کے طور پر بلیک آوٹ کا ہنگامی آرڈیننس جاری کر دیا تھا۔ گھر کے سبھی لوگ سردی کی وجہ سے اپنے اپنے لحافوں میں دبکے ہوئے تھے۔ فخر الدین کو جب کچھ زیادہ برا خیال آ جاتا تو لحاف سے منہ باہر نکال لیتے اور جب دل کی دھڑکن معمول پر آ جاتی تو پھر لحاف کے اندر منہ کر لیتے۔ مگر اندر اور باہر سوائے اور سردی کے کوئی فرق نہیں تھا۔

"میں آ جاؤں؟" پرویز مشرف فوجیوں سمیت ان سے اندر داخل ہونے کی اجازت طلب کر رہے تھے۔ وہ گھبراتے ہوئے دروازہ میں پھنسے چلا رہے تھے۔ "نہیں...... نہیں میں وہ فخر الدین نہیں ہوں۔ میں تو ایک ردی فروش ہوں آپ کو نام کی غلطی لگی ہے۔"

جنرل مشرف ان کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے گھر میں گھس گئے۔ فوجی ان کے پیچھے داخل ہونا شروع ہو گئے۔ ان کے اندر داخل ہونے سے دروازہ بری طرح کھڑک رہا تھا۔ ان کی اپنی ہی گھٹی گھٹی چیخ سے انکی آنکھ کھل گئی۔ وہ پسینے میں شرابور تھے۔ ان کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ انہوں نے اس کو خواب سمجھ کر ابھی سکون کا سانس لیا ہی تھا کہ صحن کے بجنے والے دروازے نے ان کے رونگٹے کھڑے کر دیئے۔ گھر کے سبھی افراد اٹھ کر بیٹھ گئے۔ سب ہی کے چہروں پر ایک ہی سوالیہ نشان تھا کہ اب کیا ہوگا۔ انہوں نے

کانپتے ہاتھوں سے گھڑی کا بٹن دبا کر لائٹ کر کے ٹائم دیکھا رات کے نو بج رہے تھے۔ دروازے کو پھر کھٹکھٹایا گیا۔ باہر سے ان کا نام لے کر پکارا گیا۔ گھر کے سب ہی افراد ان کی چارپائی کے نزدیک آ گئے۔ انہوں نے اپنی بیوی کو دروازہ کھولے بغیر پوچھنے کا کہا۔ خود وہ کانپتے ہوئے صحن میں لگی کھڑکی کی جانب بڑھ گئے۔ انہیں نے اندھیرے میں کھڑکی کی ایک چھوٹی سی درز سے باہر جھانکا۔ انہوں اندھیرے میں ایک جنگلے والی گاڑی نظر آئی۔ ہوں قیدیوں والی گاڑی۔ ان کے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔ اسٹیرنگ پر لمبی مونچھوں والا کوئی حوالدار محسوس ہو رہا تھا۔ گاڑی کے جلتے سبز اور سرخ ڈائل اس کے چہرے کی کرختگی کو مزید بڑھا رہے تھے۔ اس کی بیوی نے اس کے سمجھائے ہوئے طریقے سے بغیر دروازے کھولے پوچھا۔ ”کون؟“

”فخر الدین صاحب گھر پر ہیں۔“ دوسری جانب سے پوچھا گیا۔

”جی کیا کام ہے؟“ اس کی بیوی نے بڑے حوصلے سے کہا۔

”ہم صبح دکان پر بھی آئے تھے مگر ان کی دوکان بند تھی۔ ہم ایجنسی والے ہیں۔ اگر کوئی بڑا بیٹا ہے تو اس کو باہر بھیج دیں۔“ اکرم نے یہ سن کر جلدی سے منہ کے اوپر لحاف کھینچ لیا۔

”اس وقت تو کوئی نہیں ہے۔ آپ صبح پتہ کر لیں۔“ ان کی بیوی نے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے اگر وہ جلدی آ جائیں تو ہمارا پتا ضرور دیجیے گا۔“ انہوں نے گاڑی کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔

دروازے کی طرف آنے والے تعداد میں تین تھے۔ وہ تینوں ڈرائیور کے ساتھ آگے بیٹھ گئے۔ گاڑی سٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ ڈرائیور نے گاڑی کو آگے بڑھاتے ہوئے گھر پر ایک طائرانہ سی ڈالی۔

”اب مشکل ہی بچوں گا۔ اتنا کونک ایکشن، میرے بے ضرر سے کالم نے کیا کر دیا فخر الدین نے اپنے بستر پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔

”اور کالم لکھو۔ کتنی بار سمجھایا تھا امن بڑی چیز ہے۔ تم نہ سامنے آئے تو وہ میرے معصوم بیٹے کو اٹھا کر لے جائیں گے۔ یہ معصوم کس گناہ کی سزا بھگتے گا۔“ ان کی بیوی نے اپنے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”میں کہتا ہوں صبح منہ نہار بھاگ نہ چلیں“ انہوں نے ایک تجویز پیش کی۔

”کہاں بھاگو گے؟“

”تمہارے اماں، ابا کے گاؤں چلتے ہیں۔“

”نہیں، میں انہیں بڑھاپے میں ذلیل نہیں کروانا چاہتی اور سن لے میں تیری جگہ اپنا بیٹا نہیں دوں گی۔ صبح ہوتے ہی گرفتاری دے دینا۔ میرے لعل کو دیکھ خوف سے کتنا کانپ رہا ہے۔“ ان کی بیوی نے اپنا آخری فیصلہ سنا دیا۔

وہ رات اس کے لیے قیامت سے کم نہیں تھی۔ وہ سوچتا رہا میری گرفتاری کے خلاف جلسے جلوس نکلیں گے۔ اخبارات کے مدیر اور مالکان جنرل مشرف کے خلاف اداریے لکھیں گے۔ چینلو پر ان کے انٹرویو کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوگا اور آخر کار جنرل کو ان کو چھوڑنا پڑے گا، مگر فخر الدین جنرل کو نہیں چھوڑے گا۔ یہ آخری بات ان کے دل کے سوال کے جواب میں دماغ نے کہی تھی۔ نہ جانے رات کے کون سے پہر ان کی بیوی کے خراٹے ان کے لیے لوری ثابت ہوئے۔

دن کے تقریباً گیارہ بج چکے تھے مگر ایجنسی والے اب تک نہ پہنچے تھے۔ فخر الدین کے دل کی دھڑکن تو معمول پر نہ آسکی تھی، مگر خود کو انہوں نے ذہنی طور پر گرفتاری کے لیے تیار کر لیا تھا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے شیو بنا کر نیا سوٹ اور شادی والی ویسٹ کوٹ پہن لی تھی۔ انہوں نے دل میں سوچ لیا تھا۔ وہ جنرل مشرف کے پاؤں پڑ جائیں گے اور اس وقت تک ان کے پاؤں نہیں چھوڑیں گے۔ جب تک وہ ان کو معاف نہ کر دیں اور ہاں انہوں نے اگر ان کو کالم نگاری چھوڑنے کے لئے بیان حلفی دینے کے لیے کہا تو وہ اسی وقت بیان حلفی پر دستخط کر کے ان کے حوالے کر دیں گے۔ اس مقصد کے لیے کچھ عرصہ قبل کرایہ کی دکان کے لیے گیا بیان حلفی انہوں ویسٹ کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال لیا تھا۔ ان کے بیٹے اکرم کو سوچ اور پریشانی نے بخار میں مبتلا کر دیا تھا۔ ان کی بیوی اپنے بیٹے کی جانب سے بہت فکر مند تھی۔ وہ اپنے میاں کی تیاری دیکھ ضرور رہی تھی منہ سے کچھ نہ بول رہی تھی۔

"کچھ تو بولو۔" فخر الدین نے اپنی بیوی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"میاں! روٹی لے کر آیا کروں تمہارے لیے۔"

"بیگم! نہ جانے کون سی جیل میں لے کر جاتے ہیں۔ کوٹ لکھپت، اڈیالہ، میانوالی یا شاہی قلعے کے کسی ڈیتھ سیل میں رکھیں گے۔ جو مقدر میں روکھی سوکھی ہو گی مل جایا کرے گی۔" فخر الدین کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔

"فخرو! زیادہ سے زیادہ کتنی سزا دیں گے۔" ان کی بیوی نے کہا۔

"میں نے کونسا چوری کی ہے۔ اب مجھے کیا پتہ کالم نگاری کی کتنی سزا ہوتی ہے اور یہ ساری سزا مجھے میں ہوں ناں کی وجہ سے ملے گی۔"

فخر الدین نے ویسٹ کوٹ کے نیچے سلوکے کی جیب سے دو ڈائریاں نکالیں۔ ایک ڈائری انہوں نے اپنی بیگم کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ایک عظیم شاعر کی شاعری تمہارے پاس امانت ہے۔ اگر یہ میرے ساتھ چلی گئی تو دنیا ایک عظیم شاعر سے محروم ہو جائے گی۔ جابر سلطان اس میں سے بھی بغاوت کی بو سونگھ لیں گے۔"

"اپنے ایک کالم سے تو نبٹ لو۔ شاعری کا ایٹم بم ساتھ لئے پھر رہے ہو۔" بیگم نے ڈائری ان کے ہاتھ سے چھینتے ہوئے کہا۔

فخر الدین اب ٹیلی فون والی ڈائری کے اوراق الٹ پلٹ رہے تھے۔ انہوں نے اپنی ڈائری میں اخبارات اور ٹی وی چینلز کے نمبرز سرخ روشنائی سے لکھ رکھے تھے۔ یہ ساری معلومات انہوں نے ردی میں آئے ہوئے اخبارات سے حاصل کی تھیں۔ انہوں نے ان اخبارات کے دفتر فون کیا جنہوں نے ان کے کالم کو اپنے اخبار میں جگہ دی تھی اور ان کو اپنی گرفتاری کے متعلق بتایا۔ سبھی اخبارات نے ان کی گرفتاری کی کوریج کی ہامی بھر لی تھی۔ اکرم ابھی تک بستر میں تھا۔ اس نے بخار سے کانپتے ہوئے کہا۔ "ابا! آپ کا ٹیلی فون ٹیپ ہو رہا ہوگا۔

"برخوردار! اب تو ڈراپ سین ہو رہا ہے۔ اگر ٹیلی فون ٹیپ بھی ہو رہا ہے تو اس سے کیا؟" انہوں نے ایک مرتبہ پھر ایک ٹیلی ویژن چینل کو نمبر ملاتے ہوئے کہا۔

تبھی ٹی وی چینل نے اس شرط پر کوریج کی ہامی بھری کہ آپ کسی دوسرے چینل کو فون نہیں کریں گے۔ اس کام سے فارغ ہو کر انہوں نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنی ادبی بیٹھک کے دوستوں کو فون کرنے

شروع کر دیے۔انہوں نے اپنے دوستوں کو ان چائے، پیپسی، لڈو اور فروٹ کیک کے واسطے دیئے جو ماضی کا حصہ بن چکے تھے۔اخبارات،چینل اور دوستوں کو انہوں نے گھر کا دروازہ کھٹکھٹانے سے منع کیا۔ان کا اصرار تھا کہ وہ صرف اس وقت باہر آئیں گے جب ایجنسی والے آئیں گے۔

تقریباً ساڑھے بارہ بجے ان کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ان کا دل شیدے گنّے والے کی ٹلّی کی طرح کھڑک اٹھا۔وہ بے اختیار بستر پر لیٹ گئے۔ان کا ہاتھ سینے پر تھا۔انہوں نے اپنی بیوی سے کہا۔"پوچھو کون ہے؟"

ان کی بیوی نے دروازہ کھولے بغیر پوچھا"کون ہے؟"

"چاچی!میں چائے والا ہوں۔چاچا کہاں ہے؟"

انہوں نے اپنی بیوی سے دروازہ کھولنے کا کہا۔دروازہ کھلنے کی دیر تھی کہ چائے والے لڑکے سمیت اخبارات کے نمائندے،چینل کا کیمرا مین،ان کے دوست احباب ان کے ساتھ بہت سے محلے دار اور چھوٹے بڑے بچے تھے۔ان کے دوستوں کے ہاتھوں میں پھولوں کے ہار تھے۔انہوں نے آتے ہی اپنی اپنی نشستیں سنبھال لیں۔چینل نے ان کی فلم بنانی شروع کر دی۔اخبارات کے کیمرہ مین ان کی تصاویر بنا رہے تھے۔ان کے یار دوست ان کے ساتھ فلم بنا رہے تھے۔تصویریں بنا رہے تھے۔اتنے سارے لوگوں کو دیکھ کر ان کے دل کو ڈھارس ہوئی۔دل کی دھڑکن کچھ نارمل ہوئی مگر دوسرے ہی لمحے اس سوچ نے کہ ایجنسی نے پکڑنا تو صرف انہیں ہی ہے۔یہ تو سارے تماش بین ہیں۔میت تو وہ ہیں یہ تو سارے پھولوں کے ہار لے کر دفنانے آئے ہیں۔ان کے دل کی دھڑکن ابنارمل ہوتی چلی گئی۔

"چاچا!آپ کی دوکان کے سامنے دو ایجنسی والے کھڑے ہو گئے ہیں۔وہ دونوں آپس میں جھگڑ بھی رہے تھے۔اب وہ آپ کے گھر کی جانب آ رہے ہیں۔"اس شور میں چائے والے لڑکے نے چیختے ہوئے کہا۔

"نہ ہونے دیں گے گرفتاری فخر الدین کی۔"ان کے ایک جیالے دوست نے نعرہ لگایا۔

اس کے جواب میں ہر جانب سے نعرے پھوٹ پڑے۔"انہیں اٹھانے دیں گے۔ایجنسی سے چھین لیں گے۔"

ایک جانب سے ایک اور نعرہ آیا"یہ ملک جنرل کی جاگیر نہیں۔جو دل چاہے وہ کرے۔"

ان کی بیوی اپنے بچوں سمیت سیڑھیوں میں کھڑی تھی۔ٹی وی کیمرہ مین نے ان کو کلوز کیا اور اپنے نمائندے کو ان کے پاس جانے کا اشارہ کیا۔نمائندہ لوگوں کے رش سے بچتا ہوا سیڑھیوں کی جانب گیا۔اس کی طرف دیکھ فخر الدین کی بیوی نے جھٹ پردہ کر کے منہ دوسری طرف کر لیا۔کیمرہ مین شرمندہ سا نیچے اتر آیا۔ایک جانب سے گرما گرم نعرہ بازی ہو رہی تھی"جنرل!تمہارے لیے سولہ کروڑ عوام فخر الدین ثابت ہوں گی۔تم کتنے فخرو مارو گے۔"فخر الدین نے جھٹ سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ایک اور دوست نے سب کو چپ کراتے ہوئے ایک پرانے نعرے میں بخیہ گری کی"یا اللہ یا رسول۔فخر الدین بے قصور۔"جس کا سبھی حاضرین نے بے قصور،بے قصور کے للکارے کے ساتھ یک زبان جواب دیا۔

دوستوں نے فخر الدین کو پھولوں کے ہاروں کے

ساتھ لا دیا۔ ایک دوست نے انہیں کاندھوں پر اٹھا
لیا۔ ان کی آنکھوں سے فرط جذبات سے آنکھوں سے
آنسو رواں تھے۔ گلی میں گاڑیوں کے رکنے کی
چرچراہٹ سنائی دی۔ ایک بلند آواز ابھری "ایجنسی
والے آگئے ہیں۔"

اخبارات کے فوٹو گرافراز اور چینل کے کیمرہ مین
نے اپنی اپنی نشستیں سنبھال لیں۔ سب دیدے
پھاڑے باہر والے دروازے کی جانب دیکھ رہے
تھے۔ ایجنسی کے خوف سے کوئی دروازے کی جانب
جانے کی جرات نہیں کر رہا تھا۔ چائے والا لڑکا بھاگ
کر باہر گیا پھر اندر بھاگ آیا۔ "چاچا ایجنسی والے آ
گئے ہیں۔" پھر اس نے باہر کی جانب منہ کر کے
کہا "اندر ہی آجائیں۔"

فخر الدین کی بیگم اور بچوں کی چیخیں سنائی دے رہی
تھیں۔ آنے والے سادہ وردی میں تھے۔ وہ اندر کے
حالات کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ مجمع کو سانپ سونگھ چکا
تھا۔ ان میں سے ایک بولا۔ "فخر الدین صاحب کون
ہیں۔"

"جی یہ ہیں" فخر الدین کو اٹھائے ہوئے شخص نے
اوپر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

چند لمحے قبل فخر الدین کے حق میں نعرے لگانے
والے یوں لگتا تھا جیسے گونگے ہو گئے ہوں۔ صرف چچا
ان کی بیوی اور بچوں کی سسکیوں کی آوازیں آ رہی
تھیں۔ فخر الدین کاندھوں سے نیچے اتر آئے
تھے۔ پہلے بولنے والا دوبارہ مخاطب ہوا۔ "جناب ہم
پیپسی کولا ایجنسی کی جانب سے آئے ہیں۔ ہماری
ایجنسی نہ صرف آپ کی دکان میں مفت رنگ و روغن
کروا دے گی۔ ہم آپ کو اسٹاک میں رعایت دیں
گے۔"

ان کے ساتھ آنے والے دوسرے شخص نے
کہا۔ "جناب ہم کوکا کولا ایجنسی کی جانب سے آئے
ہیں۔ ہماری ایجنسی نہ صرف آپ کو فریج فری دے گی
بلکہ آپ کی دوکان کا بجلی کا آدھا بل بھی ہماری ایجنسی
ادا کرے گی۔ یہ معاہدہ آپ ہمارے ساتھ کریں۔"

قہقہے تھے جو فخر الدین کے صحن میں گونج رہے
تھے۔ ایجنسی والے بونقوں کی طرح مجمع کی جانب
دیکھ رہے تھے۔ اچانک ہنسی کو پھر بریک لگ
گئے۔ باہر والے دروازے سے ایک سوٹڈ بوٹڈ نوجوان
داخل ہوا۔ اس نے ڈائری نکالتے ہوئے کہا۔
"فخر الدین صاحب کون ہیں؟"

فخر الدین نے آگے بڑھتے ہوا کہا۔ "میں
ہوں۔ آپ کون سے خفیہ ادارے سے آئے ہیں؟"

"جناب میں بینک کے کریڈٹ کارڈ سیکشن سے
آیا ہوں۔ آپ کے ایک دوست نے بتایا تھا کہ آپ
کریڈیٹ کارڈ بنوانا چاہتے ہیں۔ میں کل بھی آیا تھا
آپ نہیں ملے۔ فون بھی اٹینڈ نہیں کیا۔ میں تو یہاں
سے گزر رہا تھا رش دیکھ کر اندر آ گیا معذرت چاہتا
ہوں۔ ویسے آپ کا کریڈٹ کارڈ چند دنوں میں بن
جائے گا۔ بس چند انفارمیشن دے دیں۔"

فخر الدین کے دل کی دھڑکن معمول پر آ چکی
تھی۔ اس کے گھر والوں کے چہروں کی رونق لوٹ آئی
تھی۔ ہنستے ہوئے چہرے کھل اٹھے تھے۔ وہ
وہیں بے اختیار سجدے میں گر گئے۔ ان کے کانوں
سے ان کی بیوی کی شوخ آواز ٹکرائی۔ "سجدہ توبہ کے
ساتھ کرنا"

بیگم شیطان

اقبال بھٹی

اس کے ہونٹ ہر وقت مسکراتے تھے اور انگ انگ بجلیاں گراتا تھا‘ مگر اس کی روح خون کی پیاسی تھی اور وہ قتل پر قتل کیے جارہی تھی۔ اپنے محبوب کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے ناگن بن جانے والی حسینہ کی روداد‘ انتقام کے کھیل نے اسے شیطان کی محبوبہ بنا دیا تھا۔

وہ خانہ بدوشوں کے ڈیرے میں تنہا بیٹھی ہوئی تھی اس کے چہرے پر حزن وملال کے تاثرات تھے لیکن وہ تنہائی محسوس نہیں کررہی تھی کیونکہ لوگوں کے ساتھ کرسمس کے میلے میں نہ جانے کا فیصلہ خود اس کا اپنا ہی تھا۔ وہ جانتی تھی کہ میلے میں کیا ہوگا‘ لوگ رقص کریں گے گائیں گے اور...... کسی لڑکی کو بہلا پھسلا کر اسے اس کی متاعِ حیات سے محروم کردیں گے۔

کرسمس کے موقع پر ہر سال وہ اسی طرح اکتاہٹ‘ بے زاری اور جھنجلاہٹ کا شکار ہوجاتی تھی اور اس کی کنپٹیوں میں خون ٹھوکریں مارنے لگتا تھا‘ چنانچہ جب خانہ بدوش قبیلے کے سردار نے اسے بھی میلے میں ساتھ چلنے کو کہا تو اس نے صاف انکار کردیا تھا اور پھر وہ خانہ بدوشوں کو ریچھ‘ بندروں اور کتوں سمیت میلے میں جانے کے لیے روانہ ہوتے ہوئے دیکھتی رہی تھی جب وہ لوگ پہاڑ کے عقب میں گم ہوگئے تھے تو اس نے ایک طویل سانس لے کر اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں۔

ڈیرے میں اب خاموشی اور خنکی کا راج تھا۔ کل شدید برف باری ہوئی تھی اور دور دور تک برف‘ سفید ریت کی طرح پھیلی نظر آرہی تھی۔ برف کے نیچے کہیں کہیں سبز گھاس کے تنکے بھی نظر آرہے تھے۔ خانہ بدوشوں کے خالی خیموں پر سناٹا طاری تھا‘ کبھی کبھی بپھری ہوا ان خیموں کو پریشان کرتی اور پھر سیٹی بجاتی ہوئی اپنی نامعلوم منزلوں کی تلاش میں پہاڑوں کی طرف نکل جاتی تھی۔ خیموں کے عقب میں ایک بڑا غار نظر آرہا تھا‘ یہ خانہ بدوش قبیلے کے سردار کی قیام گاہ تھی لیکن اس وقت یہ غار بھی خالی تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ یہ سرد رات اس غار کے پُرسکون اور حرارت سے بھرپور ماحول میں ہی گزاری جاسکتی ہے۔

وہ چند لمحوں تک اپنے خیمے کا بانس پکڑے کھڑی رہی اس کی وہ آنکھیں جن کے بارے میں نوجوان خانہ بدوش تک مثالیں دیا کرتے تھے اس وقت ویران تھیں۔ ان میں ستاروں جیسی چمک نہیں تھی‘ حسین اور نوجوان چہرے پر شگفتگی نہیں بلکہ اداسی کی گہری تہہ تھی اور اس کا دل سامنے ہی بہنے والے دریا کی طرح منجمد اور سرد تھا۔ اس نے دریا کی طرف دیکھا اس کا پانی برف باری کے بعد یا تو جم چکا تھا یا برف کے نیچے چھپ چھپ کر بہہ رہا تھا اس وقت اسے وہ درخت بھی اچھے نہیں لگ رہے تھے جو اسے ایک ہفتے قبل پہلی ہی نظر میں بے حد پسند آئے تھے۔ اب یہ تناور درخت اسے بھوتوں کی طرح لگ رہے تھے۔

وہ جانتی تھی کہ کل کرسمس ہے‘ اسے آج سے چار سال پہلے والا کرسمس بھی اچھی طرح یاد تھا۔ وہ سردی یا پھر اس کرسمس کے کرب کی وجہ سے کانپ گئی جس کی تلخ‘ تکلیف دہ اور بدنما یادیں آج بھی اس کے ذہن میں موجود تھیں‘ وہ انہیں فراموش نہیں کرسکی تھی‘ وہ خیالوں میں ڈوب گئی۔

ٹھیک چار سال قبل وہ البانیہ میں تھی‘ خانہ بدوشوں کے قافلے نے ایک ایسے ہی پہاڑی علاقے میں ڈیرہ جمایا تھا

اور سرکس کے میلے میں حصہ لینے کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ ان دنوں وہ ہر وقت مسکراتی رہتی تھی۔ لوگوں نے اس کا نام ہی اسمائلنگ گرل رکھ دیا تھا وہ متبسم دوشیزہ تھی اور اس کی اس مستقل مسکراہٹ کا سبب مارٹن تھا۔

"مارٹن......" وہ ایک جھرجھری سی لے کر رہ گئی اس نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے۔ خون اس کی کنپٹیوں پر ٹھوکریں مارنے لگا۔ اس کے چہرے کی رنگت زرد ہوگئی' ہونٹ تڑخنے لگے۔ حلق میں کانٹوں جیسی چبھن محسوس ہونے لگی۔

"مارٹن....." اس نے ہونٹوں پر خشک زبان پھیر کر ایک طویل سانس لی اور ماضی کے تاریک جھروکے میں جھانکنے لگی۔

وہ مارٹن کی دیوانی تھی' مارٹن عمر میں اس سے ایک سال چھوٹا تھا لیکن عمروں کے اس تضاد کی وجہ سے ان کی چاہت کبھی متاثر نہیں ہوئی تھی۔ وہ بھی اس سے محبت کرتا تھا دونوں ڈیرے سے دور کسی درخت کی اوٹ میں بیٹھے مستقبل کے خواب دیکھتے رہتے تھے۔ مارٹن کا تعلق بھی خانہ بدوشوں ہی سے تھا لیکن وہ ایلی کی طرح اس زندگی سے نجات حاصل کرکے کسی شہر میں آباد ہونا چاہتا تھا۔ دونوں ایک چھوٹی سی جنت بنانے کے خواب دیکھتے رہتے تھے اور انہیں یقین تھا کہ یہ خواب ایک نہ ایک روز ضرور شرمندۂ تعبیر ہوں گے۔ مارٹن نے اس کے لیے تیاریاں بھی شروع کردی تھیں' وہ ویلڈنگ کا کام سیکھ رہا تھا۔

پھر مارٹن اور ایلی کی محبت زبان زد عام ہوگئی' قبیلے کے بوڑھے داستان گو قدیم کہانی سنانے کے بہانے ان کی کہانیاں سنانے لگے۔ اس کا علم مارٹن اور ایلی کو بھی ہوگیا لیکن انہیں کوئی خفت نہیں ہوئی بلکہ وہ خوش ہوئے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ وہ شادی سے قبل مکمل محبت کے گناہ کا ارتکاب نہیں کررہے ہیں۔

چار سال قبل خانہ بدوشوں قبیلہ امریکہ کے ایک دور

افتادہ پہاڑی علاقے میں پہنچا تو کرسمس سر پر آچکا تھا' وہیں اینی کی ملاقات میلے کے ایک مقامی منتظم سے ہوئی۔ مارٹن بھی اس کے ساتھ تھا منتظم جارج اینی کو دیکھتے ہی اپنا دل ہار بیٹھا اور پھر کرسمس کی شب جب اس نے دست درازی کی کوشش کی تو اینی کی چیخ سنتے ہی مارٹن دندناتا ہوا اس کے خیمے میں داخل ہوگیا۔ اس نے لپک کر جارج کو کندھے سے پکڑلیا' وہ جنونی حالت میں تھا اور اس پر خون سوار تھا۔ اس نے جارج کو بُری طرح مارا پیٹا لیکن پھر جارج کے اپنے آدمی آگئے اور انہوں نے مارٹن کو ٹھوکروں' لاتوں اور گھونسوں پر رکھ لیا۔ وہ تڑپتی رہی مگر وہ غنڈوں نے اسے نہیں چھوڑا' جارج کی ہدایت پر اسے اغوا کرلیا گیا اور اس رات وہ ایک ویران علاقے میں پتھریلی زمین پر کرب کی تمام منزلوں سے گزر گئی' وہ پانچ تھے اور بہت غصے میں تھے۔

اگلی صبح جب وہ لٹی پٹی ڈیرے میں واپس آئی تو پادری مارٹن کی آخری رسوم ادا کررہا تھا۔ پولیس بھی موجود تھی جارج اور اس کے ساتھیوں پر قتل عمد اور اغوا کا مقدمہ قائم ہوچکا تھا مگر وہ گرفتاری سے قبل ہی فرار ہوچکے تھے' اینی ٹوٹ کر بکھر گئی۔

اس کے چینے...... چینے ہی رہے' مارٹن کبھی واپس نہ آنے کے لیے چلا گیا اور پھر شوخ وشنگ اینی نے جب سنبھالا لیا تو وہ بالکل ہی بدل گئی تھی۔ اس نے زندہ رہنے کا فیصلہ کیا اور ہر مرد سے انتقام لینے کا عزم کرلیا۔

"مارٹن......" اس نے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے زیرلب کیا۔ مارٹن کو اس کی سیاہ زلفیں بہت پسند تھیں' وہ کہتا تھا کہ تمہاری سیاہ آنکھوں میں زندگی کے دیپ روشن ہیں' تمہارے رخساروں میں سورج کی چمک ہے اور تم...... تم زندگی کا سورج ہو۔

سردی اور بڑھی تو وہ غار میں چلی آئی ایک جگہ الاؤ کے انگارے دہک رہے تھے۔ اس نے موم بتی تلاش کر کے روشن کی لیکن اندھیرا کم نہ ہوا اس نے دوسری موم بتی بھی جلائی پھر وہ اپنے سرد ہاتھ گرمانے کے لیے الاؤ کے قریب بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد اس نے غار کا جائزہ لیا' قریب ہی اسے لکڑیوں کا ڈھیر نظر آیا اور پھر کیتلی بھی مل گئی۔ فرش پر کمبل اور کھالیں بکھری ہوئی تھیں اور ایک کونے میں سوا کیہ کی بوتل رکھی ہوئی تھی۔ یہ خانہ بدوشوں کی مخصوص اور تیز ترین شراب تھی جس کی عادت اسے مارٹن کی موت کے بعد پڑی تھی۔ عام لوگ اس شراب کی تیزی برداشت نہیں کرسکتے تھے' چھت کے ساتھ ایک کنڈے میں جھولتی ہوئی ران دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ بھنی ہوئی نمکین ران سے بھی اسے بڑی رغبت تھی' چار سال پہلے وہ مارٹن کے لیے بڑی مہارت سے رانیں بھونتی تھی' وہ مسکرانے لگی۔ رات بھر سونے اور پیٹ بھر کر کھانے کے بعد وہ صبح ہوتے ہی شکاگو جاسکتی تھی' شکاگو میں ایک کلب کا کلرک اس کا دوست تھا جس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے رقاصہ کی حیثیت سے ملازمت دلوا دے گا۔

اینی لبوں میں ایک سگریٹ دبا کر کچھ سوچنے لگی پھر اس نے تاش کے پتے نکالے اور اپنی قسمت کا حال دیکھنے لگی۔ اس نے پتے اچھی طرح پھینٹ کر دو گڈیوں میں تقسیم کیے اور پھر ان دو گڈیوں کی چار گڈیاں بنائیں' آنکھیں بند کر کے ایک گڈی پر انگلی رکھی یہ اس کے بائیں ہاتھ سے تیسری اور دائیں ہاتھ سے دوسری تھی' اس نے پانچواں پتہ نکالا۔

"حکم کا بادشاہ۔" وہ بڑبڑا کر رہ گئی۔

اس کی عمر بیس سال تھی لیکن وہ زمانے کی سختیاں جھیلتے جھیلتے تیس پینتیس سال کی لگنے لگی تھی پھر حکم کا بادشاہ دیکھتے ہی وہ بوڑھی لگنے لگی لیکن یہ تاثرات صرف ایک لمحے کے لیے برقرار رہے اور اس کے بعد وہ پہلے کی طرح بیس سال کی لگنے لگی۔

اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کے سراپا میں کتنی قوت ہے مارٹن کی زندگی میں وہ ہرنی جیسی نازک تھی لیکن اس کی موت کے بعد شیرنی جیسی خونخوار ہوگئی تھی۔ اس

کی آنکھوں میں ستاروں کے حسن کے بجائے سختی اور عیاری آ گئی تھی۔ اس نے بڑے گلے کا بلاؤز پہن رکھا اور اس کے ہاتھوں میں دھات کی رنگین چوڑیاں تھیں۔ پیروں میں پنڈلیوں تک لوہے کے کڑے تھے اور کان کی لوؤں میں سکتہ نما بُندے جھول رہے تھے۔ وہ حکم کے بادشاہ کو غور سے دیکھتی رہی اور پھر اس کے چہرے پر سفا کی کے تاثرات نمودار ہونے لگے۔

حکم کا بادشاہ ایک مرتبہ نیو جرسی میں بھی سامنے آیا تھا اور اگلے ہی روز وہ جیل پہنچ گئی تھی۔ ایک مرتبہ سینٹ ہیلن میں بھی نکلا اور چوتھے روز اس کے ہاتھوں ایک شخص مارا گیا تھا اور ایک مرتبہ یہ پتہ اس وقت نکلا تھا جب وہ مارٹن کے ساتھ تھی تو اگلے ہی روز مارٹن قتل ہو گیا تھا۔

اس نے حکم کے بادشاہ کو نظروں میں رکھتے ہوئے غار کی دیوار سے ٹیک لگالی۔

"اب کیا چاہتے ہو؟" اس نے حکم کے بادشاہ سے پوچھا۔ "کیا مجھے قتل کے الزام میں گرفتار کراؤ گے لیکن سینٹ ہیلن میں جس شخص کو میں نے قتل کیا تھا وہ اسی سزا کا مستحق تھا۔ کسی بچی کو اغوا کر کے اس کی آبرو سے کھیلنے والے کی یہی سزا ہو سکتی تھی۔ وہ بچی صرف نو سال کی تھی اور میری آنکھیں اس کو تڑپتے ہوئے دیکھ رہی تھیں' میں خود پر قابو نہ رکھ سکی اور اس درندے کو قتل کر دیا۔"

معاً اس نے بڑی حقارت سے حکم کے بادشاہ پر تھوک دیا تو اچانک ہی اسے احساس ہوا کہ سردی بڑھ گئی اس نے اٹھ کر سوا کیہ کی بوتل اٹھائی اور غٹا غٹ کئی گھونٹ پی گئی۔ شراب کسی تیز دھار چاقو یا شرارے کی طرح حلق اور سینے کو کاٹتی اور کھرچتی چلی گئی۔

"آہ...... کتنا سکون مل رہا ہے۔" اس نے آستین سے ہونٹ پونچھتے ہوئے کہا۔ وہ بوتل رکھنے ہی والی تھی کہ چونک پڑی اس نے سماعت پر زور دیا اور پھر کسی بلی کی طرح تیزی سے لیکن بے آواز چل کر غار کے تاریک حصے میں چھپ گئی۔ یہ حصہ غار کے دروازے سے زیادہ دور نہیں تھا۔

قدموں کی آہٹ قریب آتی تھی کوئی غار کی طرف ہی آ رہا تھا' اس کی نظریں باہر اندھیرے میں آنے والے کو تلاش کرنے لگیں اور پھر وہ اسے نظر آ گیا۔

"حکم کا بادشاہ!" اس کا دل شدت سے دھڑک اٹھا۔

"کیا اندر کوئی ہے؟" آنے والے کی آواز غار میں گونجی اور پھر سنگی دیواروں سے ٹکراتی ہوئی گم ہو گئی یہ یقیناً کوئی اجنبی تھا مگر پولیس والا نہیں تھا۔ وہ بلا خوف و تردد سامنے آ گئی۔

"کیا چاہتے ہو؟" اس نے سپاٹ لہجے میں اجنبی سے پوچھا۔

"مجھے سردی لگ رہی ہے اور میں راستہ بھول گیا ہوں' کیا مجھے سر چھپانے کی جگہ مل سکتی ہے؟" ایپی نے بجھا ہوا سگریٹ سلگایا' ماچس کی ہلکی سی روشنی میں اس نے اجنبی کے چہرے کی طرف دیکھا مگر پہچان نہیں سکی۔ اسے صرف اتنا اندازہ ہو سکا کہ اجنبی نے کوئی ایسا ماسک پہن رکھا ہے جس کی وجہ سے اس کی شکل بدلی ہوئی ہے۔

"آ جاؤ! اندر الاؤ جل رہا ہے۔" اجنبی نے قدم آگے بڑھائے تو ایپی یہ دیکھنے میں کامیاب ہو گئی کہ وہ لنگڑا رہا ہے۔

"آہ...... ایک لنگڑا آدمی اس موسم میں اگر رستہ بھول جائے تو......"

"بڑا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔" اجنبی نے شاید ہنستے ہوئے جواب دیا تھا۔ ایپی نے الاؤ میں لکڑیوں کے چند ٹکڑے ڈال دیئے اور پھر اجنبی کی طرف دیکھا وہ دراز قد تھا۔ ایپی کو صرف اتنا ہی اندازہ ہو سکا کیونکہ اس کا چہرہ ربر کے چہرے میں چھپا ہوا تھا۔

"تم نے نقاب کیوں لگا رکھی ہے؟"

"میرے چہرے پر بدنما دھبے ہیں اس لیے میں ہر وقت ماسک پہنے رہتا ہوں۔" اجنبی کا لہجہ عجیب سا تھا اس

کی آنکھیں ایپی پر مرتکز تھیں اور ایپی کو یقین تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اس کا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔

"اپنی قسمت دیکھ رہی تھیں؟" اجنبی نے تاش کے پتوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں...... اور میری قسمت میں حکم کا بادشاہ نکلا ہے جو شاید تم ہو۔"

"میں جانتا ہوں۔"

"کچھ پیو گے؟"

"میں شراب نہیں پیتا۔"

"تب پھر زندگی کی لطافتوں سے بھی ناواقف ہو۔" ایپی نے ایک گلاس میں سوا کیہ انڈیلتے ہوئے جواب دیا۔ "ویسے خوش قسمت ہو کہ اس موسم میں تمہیں یہ غار مل گئی۔"

"ہاں تمہاری تلاش میں مجھے بڑی ٹھوکریں کھانی پڑیں۔" ایپی سنبھل کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں جلنے لگیں اور ان میں تحصیلی ناگن جیسی چمک پیدا ہو گئی۔

"تم کون ہو اجنبی...... اور مجھے کیوں تلاش کر رہے تھے؟ میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

"لیکن میں تم سے اچھی طرح واقف ہوں، کئی بار تمہیں دیکھ بھی چکا ہوں۔" اجنبی نے جواب دیا۔

"کہاں......؟" اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"کئی مقامات پر...... کئی بار......"

"تم جھوٹے ہو؟" وہ چیخ پڑی۔

"میں نے آخری بار تمہیں نیو جرمنی میں دیکھا تھا، جہاں تم قسمت کا حال بتانے کے بہانے لوگوں کی جیبیں کاٹ رہی تھیں اور پھر اس رات تم نے دو افراد کے بٹوے، ایک کی گھڑی، ایک طلائی سگریٹ کیس اور پانچ سو ڈالر اڑا لیے تھے۔"

"تم...... تم پولیس مین ہو؟" اس بار ایپی کے لہجے میں خوف نہیں بلکہ غصہ تھا۔

"نہیں...... بلکہ میں تمہارا چاہنے والا ہوں، تم جہاں بھی گئی ہو میں تمہارا سایہ بنا رہا ہوں۔ ایک بار میں نے تمہیں واشنگٹن میں بھی دیکھا تھا، چرچ کے باہر صبح سویرے تمہارے ساتھ ایک مرد بھی تھا جو تم سے محبت کرتا تھا۔ تم نے اسے مجبور کیا کہ وہ چرچ میں جا کر طلائی ظروف چرا لائے۔ اگلے روز تم نے وہ ظروف ایک یہودی کے ہاتھ فروخت کر دیئے مگر تمہارا عاشق جیل چلا گیا۔"

"مجھے اس سے محبت نہیں تھی۔" ایپی نے دانت پیس کر کہا۔ "وہ بھی جارج اور اس کی ٹولی میں شامل لوگوں کی طرح درندہ تھا اور میں نے اس سے انتقام لیا تھا۔"

اجنبی کے ہاتھ عدالاؤ سے کچھ دور تھے اچانک ہی سمٹ گئے۔ وہ کچھ دیر ساکت رہا جیسے کچھ کہنے سے پہلے لفظوں کو تولنا چاہتا ہو لیکن چند لمحوں کے بعد اس کی سپاٹ آواز غار میں پھر گونجنے لگی۔

"اور...... بخارسٹ میں کیا ہوا تھا، تم نے اس نوجوان بحری افسر کو کیوں چھوڑ دیا جو تمہاری رفاقت میں دیوانہ ہو رہا تھا؟"

"میں نے اس کے گھر سے تمام قیمتی سامان چرا لیا لیکن کیوں کہ اس پر میرا حق تھا وہ میرا معاوضہ تھا۔ اسے مجھ سے محبت تھی لیکن میں اس سے محبت نہیں کر سکتی تھی وہ بھی جارج کی طرح ایک مرد ہی تو تھا۔ قابل نفرت اور درندہ صفت......"

"کیا تمہیں جارج سے نفرت ہے؟" اجنبی نے ایک لمحے توقف کے بعد پوچھا۔ "میں جانتا ہوں کہ اس نے تم سے بڑی زیادتی کی تھی۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" ایپی نے تیز نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے سب کچھ معلوم ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم اپنے خانہ بدوش شوہر سے بھی نفرت کرتی تھیں۔"

"وہ مر چکا ہے اور اس کے ساتھ میری نفرت بھی مر چکی ہے۔ اس نے میری مظلومیت سے فائدہ اٹھا کر شادی کر لی تھی جبکہ میں قبیلے کے دباؤ کی وجہ سے احتجاج

بھی نہیں کر سکتی تھی۔

"تمہارے شوہر کو تو پھانسی ہوئی تھی اور اس نے جس شخص کو قتل کیا تھا وہ......"

"وہ جارج کا ساتھی تھا جس کو میں نے دامِ الفت میں پھانس لیا تھا اور پھر جب اس نے مجھے بھگا لے جانے کا ارادہ کیا تو میں نے سب کچھ اپنے شوہر کو بتا دیا پھر ایک شب وہ آیا تو میرا شوہر خیمے کے باہر اس کا منتظر تھا اور تب وہی کچھ ہوا جس کی مجھے تمنا تھی۔"

"اور پھر تم چار پانچ مہینوں تک جنگل میں چھپی رہیں حتیٰ کہ تم نے اپنے شوہر کے بچے کو جنم دیا۔"

"وہ میرے مارٹن کا بچہ نہیں تھا۔" ایمی کے ہاتھ ایک لمحے کے لیے کانپ اٹھے اور آواز بھرا گئی۔

"میں سب کچھ جانتا ہوں تم نے اس بچے کو ایک کاٹیج کے باہر رکھ دیا تھا جہاں اب وہ پرورش پا رہا ہے۔"

"کہاں ہے وہ؟" ایمی کی سانس یکا یک بھاری ہونے لگی۔

"بریلا ہائی وے پر مسٹر ایڈمنڈ کے گھر میں۔" اجنبی نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "کیا تم اسے واپس لینا چاہتی ہو؟"

"نہیں......" ایمی نے کھوکھلے لہجے میں جواب دیا۔

"مگر تم کون ہو؟"

"بتا دوں گا، بچے کو جنم دینے کے بعد تم نرس بن گئیں اور پھر تم نے ایک شخص تھیچر کو دام میں پھنسا لیا جس نے تمہیں اپنی بیوی کے تمام زیور دے دیے لیکن تم عین اس وقت پکڑی گئیں جب تھیچر کے ساتھ اس کے کمرے میں تھیں، تمہیں جیل بھی دیا گیا۔ یہ بھی نیو جرسی ہی کا واقعہ ہے نا؟"

"چلے جاؤ......" ایمی نے سرسراتے ہوئے خوفناک لہجے میں کہا۔ "میں نے کوئی جرم نہیں کیا میں بے قصور ہوں، مظلوم ہوں۔"

"میں اب کہیں نہیں جا سکتا حسین موتی۔" وہ اس

اقوال حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

☆ ایمان اس کا نام ہے کہ خدائے واحد کو دل سے پہچانے اور زبان سے اس کا اقرار کرے اور حکم شرع پر عمل کرے۔

☆ تم نے لوگوں کو کیوں غلام بنا رکھا ہے، حالانکہ ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا۔

☆ خشوع و خضوع کا تعلق دل سے ہے نہ کہ ظاہری حرکات سے۔

اقوال حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ

☆ تعجب ہے اس پر جو موت کو حق جانتا ہے اور پھر ہنستا بھی ہے۔

☆ تعجب ہے اس پر جو اس دنیا کو فانی جانتا ہے اور پھر اس کی رغبت رکھتا ہے۔

☆ تعجب ہے اس پر جو تقدیر کو پہچانتا ہے اور پھر جانے والی چیز کا غم کرتا ہے۔

☆ تعجب ہے اس پر جو حساب کو حق جانتا ہے اور پھر بھی مال جمع کرتا ہے۔

اقوال حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

☆ خندہ روئی سے پیش آنا سب سے پہلی نیکی ہے۔

☆ کارخانہ قدرت میں فکر کرنا بھی عبادت ہے۔

☆ عقیدہ میں شک رکھنا شرک کے برابر ہے۔

☆ بے موقع حیا بھی باعث محرومی ہے قابل صحبت لوگ بہت کم ہیں۔

☆ زمانہ کے پل پل کے اندر آفات پوشیدہ ہیں۔

انتخاب: حسن اختر...... ناظم آباد

کے قریب کھسک آیا۔ "تمہیں ایک عرصے بعد تنہا پایا ہے تم نے کبھی میری بات نہیں سنی۔ خوش قسمتی سے میں تمہاری تلاش میں بھٹکتا ہوا ادھر نکل آیا۔"

اینی جو پہلے بھی ایسے کئی نازک لمحوں کا شکار ہو چکی تھی' پُرسکون رہی وہ اس وقت ایک ایسے شخص کے ساتھ تھی جو اس کے کردار ماضی اور حال سے خوب اچھی طرح واقف تھا۔ اسے آہستہ آہستہ یقین ہوتا گیا کہ یہ شخص اس سے نفرت کرتا ہے اور اسے پامال کر کے بلآخر اس کو قتل کر دینا چاہتا ہے۔ اسے یقین تھا کہ اس شخص کو اس سے محبت نہیں ہو سکتی کیونکہ قسمت میں حکم کا بادشاہ نکلا تھا' پان کا بادشاہ نہیں۔ حکم کے بادشاہ کا مطلب موت تھی اور پان کے بادشاہ کا مطلب محبت...... اس نے سگریٹ پھینک دی۔

"تم کون ہو؟" وہ زخمی ناگن کی طرح بل کھا کر بولی۔

"کیا تم اندازہ نہیں لگا سکیں کہ میں کون ہو سکتا ہوں؟"

"نہیں...... اور اب شرافت سے اپنا تعارف کرادو ورنہ......"

"میں شیطان ہوں۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

"کیا واقعی؟" وہ طنزاً بولی لیکن اس کا دل شدت سے دھڑک اٹھا تھا کیونکہ اس نے ایک قدیم کہانی میں سن رکھا تھا کہ شیطان ہر سال اپنے لیے ایک نئی بیوی کی تلاش میں نکلتا ہے۔

"مگر تمہارے سینگ نہیں ہیں؟"

"فرشتوں کے سینگ نہیں ہوتے اور میں ایک دھتکارا ہوا فرشتہ ہوں۔"

"مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"یہ تو میں پہلے ہی بتا چکا ہوں میں ایک عرصے سے تمہارا تمنائی ہوں اور اب صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم میری بن جاؤ۔ صرف تمہاری وجہ سے دنیا میری دشمن ہے۔"

"کیا مطلب؟" وہ چونک کر حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"آہستہ آہستہ سب سمجھ جاؤ گی۔ میں آج رات تم سے شادی کروں گا اور پھر تم...... جہنم پر حکمرانی کرو گی۔"

"کیا تم مجھے بہت پہلے سے جانتے ہو؟"

"ہاں...... اور میں قائل ہو گیا ہوں کہ صرف تم ہی جہنم کی ملکہ بننے کی اہل ہو۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی اس کی چوڑیوں کی کھنک دور تک گونجتی چلی گئی اور پھر وہ ایک طرف دیکھنے لگی۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟"

"سوا کیہ کی بوتل...... اپنے بارے میں اتنے انکشافات سننے کے بعد مجھے پیاس محسوس ہونے لگی ہے۔" پھر وہ بوتل اور دو گلاس لے آئی۔

"میں نہیں پی سکتا۔" سوا کیہ کی بوتل دیکھتے ہی اجنبی نے کہا۔

"کیا تم اپنی ملکہ کی فرمائش پوری نہیں کرو گے؟"

"وہ فرمائش کیا ہے؟"

"میں ملکہ بن کر جہنم پر راج کرنے پر آمادہ ہوں بشرطیکہ تم اپنی شکل دکھادو۔"

"فی الحال یہ ممکن نہیں' میری بن جاؤ گی تو یہ فرمائش بھی پوری کردوں گا۔"

"تب پھر...... یہ لو۔" اینی نے بڑی چاہت سے گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اگر تم نے سوا کیہ نہ پی تو تمہاری ہونے والی ملکہ کا دل ٹوٹ جائے گا اور میں تمہاری بننے میں خوشی محسوس نہیں کرسکوں گی۔ میری فرمائش مت ٹالو' اپنی ہونے والی دلہن کا دل نہ توڑو۔" اس نے یہ سب کچھ اتنی لگاوٹ سے کہا کہ وہ شخص مسحور ہو گیا اور دیر تک غور کرتا رہا پھر اس نے گلاس لے کر اپنے ہونٹوں سے لگالیا۔ اس نے ایک ہی سانس میں سوا کیہ پی لی اور دیکھتے ہی دیکھتے سینہ مسلنے لگا اینی بڑی والہانہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"اُف...... اتنی جلن...... میری آنتیں کٹ رہی ہیں۔"

"نہیں' میرے مالک یہ تو محبت کی جلن ہے' یہ تو چند

گھونٹ اور پیو پھر ہم ہوں گے اور یہ محبت بھری رات ہوگی۔" وہ مزید سوا کیہ نہیں پینا چاہتا تھا لیکن پہلے گلاس کا نشہ کسی تند ھارے کی طرح اسے مفلوج کر چکا تھا پھر اینی کی محبت بھری ادائیں اسے پاگل کیے دے رہی تھیں اس نے دوسرا گلاس بھی پی لیا۔

"ڈارلنگ! میرے عزیز شوہر......" اینی نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ کر کہا۔ "آؤ میں ملن کی خوشی میں ایک گیت سناتی ہوں۔" اس نے گٹار اٹھا لیا اور پھر ایک مدھر دھن غار میں گونجنے لگی۔

اس شخص نے تیسرا گلاس بھی پی لیا مگر اب اس کی حالت ابتر ہو رہی تھی۔ اس کی سانس ناہموار تھی سینہ زور زور سے پھول اور پچک رہا تھا۔ وہ بمشکل اٹھ کر اس کی طرف بڑھا مگر اس سے قبل کہ وہ اسے اپنی گرفت میں لیتا اینی مچھلی کی طرح پھسل کر اس کے عقب میں ہو گئی اور ایک زوردار لات مار کر شیطان کو منہ کے بل گرا دیا۔

"تم میرے شوہر ہو...... تم جہنم کے مالک ہو نا اتنی سی سوا کیہ پی کر بہک گئے۔"

"میں......" شیطان کچھ اور نہ کہہ سکا کیونکہ اینی کی ٹھوکر اس کے پیٹ پر پڑی تھی وہ اوندھا ہو گیا اینی پھر گانے لگی۔

وہ گاتی رہی اور شیطان سینہ پیٹ پیٹ کر تڑپتا رہا وہ شدید کرب میں مبتلا تھا۔ پہلی بار گرنے کی وجہ سے اس کا سر پتھر سے ٹکرایا تھا اور خون کی بوندیں بہہ نکلی تھیں۔ دوسری ٹھوکر کے باعث نہیں بلکہ شراب کی وجہ سے اس کے پیٹ میں شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے دل اور آنتیں کٹ کر منہ کے راستے نکل رہی ہوں پھر وہ ساکت ہو گیا اور اسکی ناک سے خون کے قطرے ٹپکنے لگے۔

اینی نے گٹار ایک طرف رکھ دیا باہر جھانک کر دیکھا تو صبح ہونے والی تھی۔ اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور غار کے دہانے کی طرف بڑھ گئی یکایک چونک کر پلٹی اب اس کی نظریں اس شخص پر جمی ہوئی تھیں جس نے اپنے چہرے پر ایک جھلی دار چہرہ چڑھا رکھا تھا وہ بیگ رکھ کر اس پر جھک گئی۔

شیطان کی سانس ٹوٹ چکی تھی اور جسم سرد ہونے لگا تھا۔ اینی نے اپنے نوکیلے ناخنوں سے نقاب نوچ کر پھینک دیا اور پھر اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ ایک ہی ساعت میں اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے لیکن پھر آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے بھر گئیں اس کے ہونٹ ہلنے لگے۔

"مارٹن! مجرموں کا سرغنہ مارا گیا۔" اس کی بھرائی ہوئی آواز خوشی سے کانپ رہی تھی۔ "آج میرے انتقام کا بڑا حصہ پورا ہو گیا آج میں بے حد خوش ہوں۔"

اس نے جارج کی لاش پر تھوکا اور غار سے باہر آ گئی اب اسے شکا گو پہنچنے کی جلدی تھی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ باقی تین مجرم وہیں موجود ہیں۔

"شاید اگلے کرسمس تک میں ان سے بھی بدلہ لے سکوں۔" اس نے خود کلامی کی اور اس کی رفتار تیز تر ہوتی چلی گئی۔

اب وہ اس بچے کے بارے میں سوچ رہی تھی جس کا حوالہ جارج نے مرنے سے قبل دیا تھا۔ اس بچے کا خیال آتے ہی اینی کو اپنا دل اور دماغ سلگتا ہوا سا محسوس ہونے لگا۔ ممتا کا وہ جذبہ جس کے بغیر عورت کی تکمیل نہیں ہوتی نہ جانے کہاں جا سویا تھا اور اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ بچہ اس کے محبوب مارٹن کی محبت کی نشانی نہیں تھا بلکہ ان عذاب ناک لمحوں کا کڑوا پھل تھا جو جارج اور اس کے درندہ صفت ساتھیوں نے اس کی ہستی پر مسلط کر دیئے تھے۔

گمنام سپاہی

زرین قمر

حماس کا لیڈر محمد الضیف 1965ء میں جنوبی غزہ کے خان یوسف کے رفیوجی کیمپ میں پیدا ہوا کم عمری میں اس نے غزہ اسلامک یونیورسٹی میں سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اس نے اسلامک ہسٹری میں ماسٹرز کیا ہے بعد میں اس نے حماس کو جوائن کرلیا تھا 1989ء میں اسرائیل نے اسے 16 ماہ کی سزا دی پھر 1991ء میں جیل سے آزاد ہونے کے بعد اس نے حماس کا ملٹری ونگ "القسام" جوائن کرلیا وہ بم بنانے میں ماہر ہے اور حماس کے ملٹری ونگ کو کمانڈ کرتا ہے اس نے بہت سے اسرائیلی فوجیوں کو کیفر کردار تک پہنچایا ہے اور وہ اسرائیل کے دشمنوں کی ہٹ لسٹ پر ہے وہ انڈر گراؤنڈ رہتا ہے اور اسے بہت کم لوگوں نے دیکھا ہے۔

اسرائیلی چھ بار اسے مارنے کی ناکام کوششیں کر چکے ہیں لیکن ہر بار وہ معجزانہ طور پر بچ جاتا ہے اسے دنیا کا خطرناک ترین شخص قرار دیا جاچکا ہے اور وہ MOST WANTED ہے۔

زیر نظر کہانی محمد الضیف پر آخری اسرائیلی جان لیوا حملے کے بعد منظر عام پر آئی جب 20 اگست 2014ء اسرائیل نے غزہ میں واقع "الدالیل" کیمپ کے سرنگوں کے نیٹ ورک پر حملہ کیا اس وقت محمد الضیف کی بیوی ویدار اور اس کے دو بچے تین سالہ سارہ اور سات ماہ کا علی وہاں موجود تھے جو اس حملے میں مارے گئے۔ اس حملے میں اسرائیل نے 5,000 LB کے انتہائی BUNKAR BUSTAR BOMB سارے اس حملے میں محمد الضیف بچ گیا لیکن بیوی اور بچے نہ بچ سکے۔ یہ کہانی اس بیوی کی زبانی ہے جس نے مرنے سے پہلے اپنے شوہر کے نام ڈائری میں اپنے جذبات رقم کیے تھے ویدار کی یہ ڈائری پہلے فلسطین اخبار میں عربی زبانی میں شائع ہوئی جو اس اخبار کے صحافی جمیل عطا اللہ کو ویدار کی ماں ام ابراہیم اور بہن ایمن الصفوی نے دی تھی اور ویدار کی کچھ یادیں بھی اس کے ساتھ شیئر کی تھیں۔

ویدار الصفوراکی زندگی ایک عام فلسطینی عورت کی زندگی تھی اس نے ایک متوسط گھرانے میں آنکھ کھولی اپنے والدین کے وہ چھ بچے تھے ایک اس کا بھائی ابراہیم اور ویدار سمیت چار بہنیں تھیں جن میں چھوٹی ویدار ہی تھی اور چھوٹے ہونے کی وجہ سے تمام گھر والوں کی آنکھ کا تارا تھی اس کی ماں کی ہمیشہ سے خواہش رہی تھی کہ وہ ویدار کی شادی کسی مجاہد سے کریں انہوں نے دوسری اولادوں کی طرح ویدار کو بھی اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی ویدار بچپن ہی سے نہایت چلبلی اور شریر تھی اور چھوٹے ہونے کی وجہ سے اپنے بہن بھائیوں سے اکثر مراعات بھی لیتی رہتی تھی مثلاً کوئی اس کی شرارت پر اسے ڈانٹ نہیں سکتا تھا ورنہ فوراً اس کی شکایت والدہ سے ہوجاتی تھی جو ہمیشہ اس کی ہی طرفداری کرتی تھیں لیکن قسمت کی خوبی کہیں یا اس کی بدنصیبی کہ اس کی اور اس کی والدہ کی خواہش کے باوجود اس کی شادی کسی مجاہد سے ہونے کے بجائے ایک عام کاروباری آدمی سے ہوگئی تھی۔

بلال قصیا جب اس کی زندگی میں آیا تب وہ صرف سولہ برس کی تھی ابھی زندگی کو صحیح طور پر سمجھ بھی نہیں پائی تھی کہ ازدواجی زندگی میں مصروف ہوگئی لیکن بلال نے اس کا بے حد خیال رکھا۔ وہ اس سے بہت محبت کرتا تھا اپنے ہر کام اور ہر مصروفیت پر اس کو ترجیح دیتا تھا اسے بلال سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی وہ کبھی سوچتی بھی تھی کہ اگر بلال کو کچھ ہوگیا یا کبھی اس نے ویدار کو چھوڑ دیا تو وہ کیا کرے گی؟

اس کی زندگی کے تین خوشگوار سال بلال کے ساتھ گزرے اس عرصے میں خدا نے اسے دو بچوں سے نوازا ایک اس کا بیٹا ابوبکر اور بیٹی بیان تھی۔ بلال اپنے بچوں کو بہت چاہتا تھا وہ ان کی کوئی فرمائش رد نہیں کرتا تھا۔ اس نے ہمیشہ ضرورت سے زیادہ سامان ویدار اور بچوں کو فراہم کیا لیکن زندگی کے مختصر سے تین سال ویدار کے ساتھ گزارنے کے بعد اس کا انتقال ہوگیا۔

ویدار کی دنیا اندھیری ہوگئی تھی اس کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے، کہاں جائے دو بچوں کے ساتھ اس کی زندگی کے باقی دن کہاں اور کس طرح گزریں گے۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ اس کی ماں جو اسے سب سے زیادہ چاہتی تھی اس کے پاس آئی اور اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے جانے کی پیش کش کی۔

"لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے میں آپ لوگوں پر بوجھ بن جاؤں گی۔" ویدار نے افسردگی سے کہا۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو ویدار، بھلا بچے بھی کبھی اپنے ماں باپ پر بوجھ بنتے ہیں؟" اس کی والدہ نے کہا۔

"پہلے کی بات اور تھی ماں اب میرے ساتھ میرے دو بچے بھی ہیں اور ان کے تمام اخراجات...... ان کا لباس...... ان کا کھانا...... ان کی تعلیم...... میں کیا کروں گی۔"

"اللہ بہت بڑا ہے ویدار، اگر اس نے بلال کو اپنے پاس بلالیا ہے تو وہ تمہیں اور تمہارے بچوں کو نہیں بھولا ہوگا' جو بلال کی ذمہ داری تھے اور جن پر وہ جان نچھاور کرتا تھا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن جب تک مجھے کوئی ملازمت نہ مل جائے میں تمہارے ساتھ رہوں گی اور اس کے بعد الگ ہوجاؤں گی۔" ویدار نے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔" اس کی ماں نے بات کو طول دینے سے روکنے کے لیے کہا۔

"فی الحال تم بچوں کو اور سامان کو لے کر میرے ساتھ چلو۔" اس کی والدہ نے کہا۔

"اور ابراہیم اور ایمن میری سب بہنیں وہ کیا کہیں گی۔" ویدار نے پریشانی سے کہا۔

"کوئی کچھ نہیں کہے گا تمہیں کیا ہوگیا ہے ویدار تم

تو ایسی نہ تھیں۔" اس کی والدہ نے کہا۔ انہیں حیرت تھی کہ چند ہی دنوں میں ویدار کتنی بدل گئی تھی وہ تو کبھی اتنی سنجیدہ باتیں نہیں کرتی تھی۔

پھر ویدار کی والدہ کافی سمجھانے بجھانے کے بعد ویدار کو اپنے گھر لے آئی تھی لیکن ویدار کا رویہ بالکل تبدیل ہو گیا تھا وہ بہت زیادہ سنجیدہ ہو گئی تھی اب پہلے جیسی شرارتیں، ہنسنا اور مذاق کرنا جیسے وہ بھول ہی گئی تھی۔

"ویدار تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" ایک دن اس کی چہیتی بہن ایمن نے اس سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔"

"لیکن تم اتنی خاموش اور سنجیدہ کیوں ہو گئی ہو۔" ایمن نے پوچھا۔

"ایمن، میں دو بچوں کی ماں ہوں جو بہت چھوٹے ہیں۔ مجھے شرارتیں زیب نہیں دیتیں اب میرے آگے صرف اور صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ کسی طرح ان بچوں کی پرورش ہو جائے اور انہیں پڑھا لکھا کر کسی قابل بنا دوں۔" ویدار نے کہا تو ایمن کا دل کٹ کر رہ گیا اس کے سامنے اس کی وہ شریف اور چلبلی بہن بیٹھی تھی جو کبھی کسی کی پروا ہی نہیں کرتی تھی اور آج وہ اپنے مزاج سے بالکل مختلف باتیں کر رہی تھی۔

"دیکھو ویدار یہ ٹھیک ہے کہ بلال چلا گیا لیکن ہم سب تو تمہارے ساتھ ہیں بھلا ہمارے ہوتے ہوئے تم تنہا کیسے ہو سکتی ہو؟ پھر تمہیں کبھی بھی اکیلا نہیں چھوڑیں گے تمہارے یہ بچے اب ہم سب کی ذمہ داری ہیں۔" ایمن نے اسے سمجھایا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"ایمن بلال تمہیں بہت چاہتا تھا انہیں کبھی کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی اس کی زندگی میں یہ ناممکن تھا کہ میرے بچوں کی ضرورتیں کوئی اور پوری کرے میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔" ویدار کے آنسو اس کی آنکھوں سے رواں ہو گئے تھے۔

"نہیں ویدار تم ہرگز بھی ایسا مت سوچو ہم تمہارے اپنے ہیں تمہارا خون ہیں یہ بچے ہمارے ہیں انہیں کبھی بھی کسی بھی چیز کی کمی محسوس نہیں ہو گی۔" ایمن نے اسے سمجھایا۔

"اور ابراہیم وہ کیا سوچے گا کہ ویدار یہاں آ کر بیٹھ گئی۔ اس کے دو بچوں کی ذمہ داری بھی تم لوگوں پر آ گئی ہے؟"

"نہیں ایسا مت سوچو تمہیں پتا ہے جب سے تم آئی ہو وہ بہت اداس ہے وہ تم سے بات کرنا چاہتا ہے تمہیں دلاسہ دینا چاہتا ہے لیکن کہتا ہے اس میں ہمت نہیں ہے کہ ان دکھی دنوں میں تمہارا سامنا کر سکے۔ اس نے امی سے کہہ دیا ہے کہ وہ جب تک شادی نہیں کرے گا جب تک تمہارے بچے کسی قابل نہ ہو جائیں۔" ایمن نے اسے بتایا تو وہ حیران رہ گئی۔

"لیکن میں ایسا نہیں چاہتی ایمن، میں تم لوگوں کی زندگی میں کوئی مشکل یا پریشانی پیدا کرنا نہیں چاہتی۔" ویدار نے کہا۔

"ٹھیک ہے تم یہ سمجھ لو کہ ہمیں تمہاری وجہ سے کوئی پریشانی نہیں ہے۔"

"میں ملازمت کروں گی، آخر میں نے اتنا پڑھا لکھا ہے اس کا کوئی فائدہ ہونا چاہیے۔" ویدار نے کہا۔

"ابراہیم اس کے لیے بھی تیار نہیں ہے اس نے کہہ دیا ہے کہ تم اپنے دل سے ملازمت کا خیال نکال دو۔" ایمن نے کہا۔

"لیکن اسے کس نے بتایا کہ میں ملازمت کرنا چاہتی ہوں۔"

''امی نے، امی نے بتایا تھا کہ تم ضد کر رہی ہو کہ بچوں کے اور اپنے اخراجات کے لیے ملازمت کرو گی۔''

''امی کو اسے نہیں بتانا چاہیے تھا۔'' ویدار نے اداسی سے کہا۔

''لیکن یہ بات چھپ بھی تو نہیں سکتی تھی اسے بعد میں پتا چلتا تب بھی تو وہ ہم سب پر ناراض ہوتا کہ ہم نے اسے کیوں نہیں بتایا۔'' ایمن نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا تو ویدار خاموش ہو گئی وہ زیادہ بحث نہیں کرنا چاہتی تھی۔

دن یونہی گزرتے رہے کسی نے بھی اسے ملازمت کرنے کی اجازت نہیں دی اس کے بچے ماموں اور خالاؤں کے ساتھ ساتھ نانی سے بھی بہت جلد مانوس ہو گئے اور چھوٹے ہونے کی وجہ سے جلد ہی والد کے غم کو بھی بھول گئے لیکن ویدار کے دل میں ایک کانٹا سا چبھا تھا جو اسے کسی پل قرار نہیں لینے دیتا تھا اسے اٹھتے بیٹھتے سوتے، جاگتے ہر وقت بلال ہی کا خیال رہتا تھا جو اس کی پہلی محبت تھا جس نے اسے خوب صورت زندگی کا مطلب سمجھایا تھا اور تین سال کے عرصے میں ہی ویدار کو ایسا لگنے لگا تھا کہ اس دنیا میں اس کا سب کچھ اس کے محافظ اس کا محبوب، اس کا دوست بس بلال ہی ہے وہ اس پر اندھا اعتماد کرنے لگی تھی وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ بلال کبھی اس سے بے وفائی کر سکتا ہے لیکن موت نے بلال کو اس سے جدا کر دیا تھا۔

ایک روز وہ اداس بیٹھی تھی اس کے ہاتھ میں ایک اخبار تھا جس میں وہ اس روز کی تازہ خبریں پڑھ رہی تھی جن میں غزہ میں ہونے والی اسرائیلی اور حماس کے مجاہدوں کی جھڑپوں کے بارے میں لکھا تھا کچھ تصویریں بھی تھیں کہ اچانک اس کی ماں کمرے میں داخل ہوئی۔

''ویدار کیا کر رہی ہو؟ تمہیں پتا ہے کہ میں خواتین کی ایک محفل میں گئی تھی۔''

''کہاں؟'' ویدار نے حیرت سے پوچھا۔

''بھئی یہاں سے چند فرلانگ پر میری دوست صفیہ رہتی ہے اس کے یہاں ہر ہفتے خواتین جمع ہوتی ہیں اور اپنے مجاہدین کے لیے دعائیں پڑھتی ہیں میں بھی اس محفل میں جاتی ہوں دیکھو نہ ہم ان کے ساتھ میدانوں، خندقوں میں مل کر جہاد میں حصہ نہیں لے سکتے لیکن جو ہمارے لیے یہ کام کر رہے ہیں ان کی سلامتی کی دعا تو کر سکتے ہیں۔'' اس کی ماں نے اسے پوری بات بتائی۔

''ہوں۔'' ویدار نے آہستہ سے ہنکارا بھرا۔

''تمہیں پتا ہے آج کیا ہوا؟''

''کیا ہوا؟''

''آج وہاں محمد الدیف کا ذکر ہو رہا تھا۔''

''محمد الدیف؟''

''ہاں تم جانتی تو ہو وہی محمد الدیف جو حماس کی ایک بریگیڈ قسام کا کمانڈر ہے، بہت بہادر ہے۔''

''تو......؟''

''اس کے ساتھ بہت برا ہوا۔'' اس کی والدہ نے کہا۔

''کیا ہوا؟''

''کچھ عرصہ ہوا اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔''

''اوہ۔''

''صفیہ بتا رہی تھی کہ اس کی شادی کو چھ سال ہونے تھے لیکن اس کے یہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی اس سلسلے میں اس کی بیوی کے کئی آپریشن بھی ہوئے لیکن کچھ نہ ہوا اور ایک آپریشن کے دوران وہ خدا کو پیاری ہو گئی۔'' اس کی والدہ نے افسوس سے کہا۔

"اوہ، بڑی افسوسناک خبر ہے۔" ویدار نے جواب دیا۔

"ہاں ویدار لیکن میں نے تمہاری اجازت کے بغیر ایک کام کر دیا ہے۔" اس کی والدہ نے ڈرتے ڈرتے اس سے کہا۔

"کیا؟" ویدار نے حیرت سے پوچھا۔

"میں نے کہہ دیا ہے کہ اگر محمد الدیف چاہے تو میں اپنی بیٹی کا رشتہ اسے دینے کے لیے تیار ہوں۔"

"کیا، یہ آپ نے کیا کیا؟ میں شادی نہیں کروں گی۔" ویدار نے غصے سے کہا۔

"ویدار دیکھو تم جانتی ہو میری ہمیشہ سے یہ خواہش تھی کہ میں کسی جہادی سے تمہاری شادی کروں گی۔ پہلے ایسا نہیں ہو سکا لیکن اب خدا نے موقع دیا ہے کہ......!"

"لیکن میں بلال کے علاوہ کسی اور کو اپنے دل میں جگہ نہیں دے سکتی۔" ویدار نے کہا۔

"تم سوچ لو ویدار ابھی کوئی جلدی نہیں ہے کیونکہ مجھے پتا چلا ہے کہ محمد الدیف بھی دوسری شادی کے لیے تیار نہیں ہے لوگ اسے بھی سمجھا رہے ہیں کہ ایسے بہادر کمانڈر کے لیے ضروری ہے کہ کوئی اولاد ہو جو اس کا نام آگے چلا سکے اس کے خاندان کا نام اس دنیا میں باقی رکھ سکے اور مجھے امید ہے کہ وہ راضی ہو ہی جائے گا۔" ویدار کی والدہ نے کہا۔

"وہ راضی ہو یا نہ ہو لیکن میں دوسری شادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔" ویدار نے کہا۔

"یہ تم اپنے بچوں کے ساتھ بھی زیادتی کر رہی ہو ویدار۔"

"نہیں میں ان کے ساتھ زیادتی نہیں کر رہی میں نہیں چاہتی کہ سوتیلے باپ کا سایہ بھی ان پر پڑے اور الدیف...... وہ تو بہت ظالم ہے دیکھا ہے دشمن پر وار کرتے ہوئے اس کو کبھی رحم نہیں آتا۔" ویدار نے کہا۔

"وہ اور بات ہے ویدار کافروں پر فتح پانا اپنے حق کے لیے جہاد کرنا تو ہر مسلمان کا فرض ہے اسلام میں نیک کاموں میں یہی ایک افضل ترین نیک کام ہے۔" ویدار کی والدہ نے کہا۔

"کچھ بھی ہو، میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔" ویدار نے کھرا جواب دیا۔

"اچھا میں ابھی تم سے بحث نہیں کر رہی ہوں تم اس مسئلے پر اچھی طرح سوچ لو میں پھر بات کروں گی۔" انہوں نے کہا۔

"میرا ہر بار یہی جواب ہوگا۔" ویدار نے کہا۔

لیکن اس کی بات کا اس کی والدہ نے کوئی جواب نہیں دیا اور کمرے سے باہر چلی گئیں۔

ویدار حیران تھی کہ اس کی والدہ کے دماغ میں یہ بات آئی بھی کیسے وہ اگر اس کے بچپن میں یہ خواہش رکھتی تھیں کہ اس کی شادی کسی جہادی سے کریں گی تو تب میں اور اب میں بہت فرق ہے...... تب وہ بچی تھی اس کی زندگی میں کوئی اور نہیں تھا اور اب وہ بلال کی بیوہ ہے جس نے اسے زندگی کے معنی سمجھائے، جو اس کا پہلا پیار تھا اور اس کے دو بچوں کا باپ تھا۔ جس نے اس کی زندگی میں کبھی اسے کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی وہ اس کے ساتھ بے وفائی نہیں کر سکتی تھی اس کے بچوں کے ساتھ دھوکا نہیں کر سکتی تھی۔

کئی دن اسی طرح گزر گئے پھر ایک روز شاید والدہ کے سمجھانے پر ایمن نے بھی اس سے بات کی۔

"ویدار تم امی کی بات مان کیوں نہیں لیتیں۔"

"کون سی بات۔"

"وہی شادی والی بات۔"

"ہوں...... تو انہوں نے تمہیں بھی بتا دیا۔" ویدار نے غصے سے کہا۔

"ہاں اور میرا خیال ہے تمہیں یہ بات مان لینا چاہیے۔" ایمن نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"کیوں؟" دیدار نے جرح کرنے والے انداز میں پوچھا۔

"دیکھو دیدار ضد چھوڑ دو، تمہیں پتا ہے تمہاری عمر بھی صرف انیس سال ہے اور بچے بھی چھوٹے ہیں ہم سب لاکھ سہارا دیں لیکن آخر کار ایک دن سب اپنے اپنے گھر کے ہو جائیں گے امی بھی ضعیف ہیں والد کا انتقال ہو چکا ہے۔"

"یہ سب میں جانتی ہوں۔" دیدار نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"ہاں تم جانتی ہو لیکن تم اس کو سنجیدہ نہیں لے رہی ہو۔"

"تم کیا چاہتی ہو؟" دیدار نے ایمن کو کرید نے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں چاہتی ہوں کہ تم اپنے لیے پریشانیوں میں اضافہ مت کرو۔"

"مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اکیلی عورت کا اس دنیا میں تنہا رہنا جتنا مشکل ہے اس سے زیادہ مشکل بچوں کے ساتھ ان کی تمام ضرورتیں پوری کرتے ہوئے زمانے کے حوادث سے دامن بچا کر رہنا ضروری ہے اسی لیے اسلام نے عورت کو بھی دوسرے نکاح کی اجازت دی کیونکہ عورت کے سر پر کسی مرد کا ہاتھ ہونا بہت ضروری ہے۔" ایمن نے اسے سمجھایا۔

"میں تمہیں ایک بات بتاؤں ایمن تمہاری باتیں اپنی جگہ...... لیکن میں کیا کروں میں بلال کی جگہ کسی کو نہیں دے سکتی یہ اس کے ساتھ بھی بے وفائی ہو گی اور اس کے بچوں کے ساتھ بھی۔" ایمن نے کہا۔

"اچھا یہ بحث چھوڑ دو، مجھے پتا ہے تم اتنی آسانی سے نہیں مانو گی لیکن یہ سوچ لو کہ ایسا اچھا رشتہ پھر نہیں ملے گا۔" ایمن نے ہنستے ہوئے کہا۔

"مجھے ضرورت بھی نہیں ہے۔" دیدار نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔

"آج امی بھی اس خواتین کی محفل میں جا رہی ہیں صفیہ کے گھر ہو سکتا ہے کہ کوئی اور بات ہو۔" ایمن نے اطلاع دی۔

"ہاں، ہو سکتا ہے کہ محمد الدیف کو ہی عقل آ جائے اور وہ خود ہی اس رشتے کے لیے منع کر دے۔" دیدار نے کہا اور ایمن مسکراتی ہوئی اس کے کمرے سے نکل گئی۔

اب ایمن نے یہ طریقہ اختیار کر لیا تھا کہ وہ اٹھتے بیٹھتے دیدار سے کوئی نہ کوئی جملہ محمد الیف کے بارے میں کہہ دیتی تھی کبھی تو دیدار خاموش رہتی اور کبھی کوئی جلا کٹا جواب دے دیتی تھی۔ معاملہ یونہی چلتا رہا دو دن بعد پھر اس کی والدہ نے اس سے بات کی۔

"دیدار تمہیں ایمن نے بتایا تھا کہ میں دو دن پہلے صفیہ کے گھر گئی تھی۔" انہوں نے دیدار سے پوچھا۔

"جی بتایا تھا۔" دیدار نے مختصر سا جواب دیا۔

"پھر تم نے کیا سوچا؟"

"میرا جواب وہی ہے جو پہلے تھا۔"

"میں نے اس بار صفیہ سے کہہ دیا ہے کہ وہ تمہارے بارے میں ساری تفصیل محمد الدیف تک پہنچا دے اسے بتا دے کہ تمہاری ایک شادی ہو چکی ہے اور تمہارے دو بچے ہیں اور میری خواہش ہے کہ میں تمہاری دوسری شادی الدیف سے کرا دوں۔"

"امی آپ کو میں کیسے سمجھاؤں آپ یہ کیوں نہیں سمجھتیں کہ میرے بچے پریشان ہو جائیں گے بھلا سوتیلے باپ کے ظلم کا مقابلہ وہ کیسے کریں گے؟"

"تم نے یہ کیوں سوچ لیا کہ الدیف ان پر ظلم کرے گا۔" اس کی والدہ نے پوچھا۔

"وہ بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ ظالم بھی ہے۔"

"ویدار جنگ کی اور بات ہے جنگ کے دوران اپنے دشمن پر قابو پانے کے لیے اور اسے شکست دینے کے لیے ظالم بننا ہی پڑتا ہے تم نے وہ قول نہیں سنا کہ جنگ میں فتح حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ "مرد یا مار دو" کی پالیسی اپنانا پڑتی ہے جو پہل کرے وہی جیت جاتا ہے۔"

"بچے بہت چھوٹے ہیں ماں۔" ویدار نے بے چارگی سے کہا۔

"اسی لیے تو سمجھا رہی ہوں کہ بچے بہت ہی چھوٹے ہیں اور انہیں باپ کا سہارا چاہیے۔" ویدار کی والدہ نے کہا۔

"شاید میں اور میرے بچے آپ پر بوجھ بن گئے ہیں۔" ویدار نے مایوسی سے کہا۔

"توبہ کرو ویدار، یہ کیسی باتیں کر رہی ہو...... بھلا اولاد بھی کبھی ماں باپ پر بوجھ ہوتی ہے دیکھو اولاد کے اچھے برے کا خیال رکھنا ماں باپ کا فرض ہوتا ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ بلال کے چلے جانے کے بعد اب یہ میری ذمہ داری بنتی ہے کہ تمہیں آئندہ زندگی گزارنے کے لیے بہتر مشورہ دوں تم غور کرلو اور سمجھ لو کہ اگر محمد الدلیف دوسری شادی پر رضامند ہو گیا اور اس نے تم سے شادی کرنے پر ہامی بھر لی تو تمہیں بھی راضی ہونا پڑے گا میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گی۔"

"اور میرے بچے کیا وہ انہیں بھی قبول کرلے گا؟"

"میرا خیال ہے کہ کرلے گا وہ ایک بہادر مرد ہے اور بہادر مرد ذمہ داریوں سے نہیں بھاگتے۔" اس کی ماں نے کہا۔

"لیکن دوسرے کے بچوں کی ذمہ داریاں کوئی نہیں اٹھاتا۔" ویدار نے سمجھانے والے انداز میں

یہ زندگی ہے

ایک چھوٹا سا لڑکا اپنے باپ کے ہمراہ جنگل میں چہل قدمی کر رہا تھا اچانک ایک پتھر سے پھسل کر وہ گر پڑا اور درد سے اس کے حلق سے تیز آواز برآمد ہوئی...... آہ......

لڑکے کو جب "آہ" کی آواز پہاڑوں سے آتی محسوس ہوئی تو بہت حیران اور متجسس ہوا اس نے چلا کر کہا۔ "تم کون ہو؟"

اسے یہ جواب ملا۔ "تم کون ہو؟"

وہ چلایا۔ "تم بزدل ہو"

پہاڑوں سے آواز آئی۔ "تم بزدل ہو۔"

لڑکے نے باپ کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "ابو یہ کیا ہو رہا ہے؟"

باپ نے کہا۔ "بیٹا غور سے سنو۔" پھر وہ چیخا۔ "تم اچھے ہو۔" آواز آئی۔ "تم اچھے ہو۔" باپ زور سے بولا۔ "تم شاندار ہو۔" جواب آیا۔ "تم شاندار ہو۔"

لڑکا بہت حیران ہوا لیکن سمجھ نہیں سکا کہ کیا ہو رہا ہے باپ نے بیٹے کو سمجھایا لوگ اسے بازگشت کہتے ہیں لیکن حقیقت میں یہ زندگی ہے زندگی ہمیشہ تمہیں وہی کچھ دیتی ہے جو تم اسے دیتے ہو زندگی تمہارے عمل کا آئینہ ہے اگر تم زیادہ محبت چاہتے ہو تو زیادہ محبت دو اگر تم رحم دلی چاہتے ہو تو زیادہ رحم دلی دو، اگر عزت اور دوستی چاہتے ہو تو عزت اور دوستی دو، فطرت کا یہ اٹل قانون ہماری زندگی کے ہر پہلو پر لاگو ہوتا ہے۔"

زندگی ہمیشہ تمہیں وہی دیتی ہے جو تم دیتے ہو، زندگی کوئی حادثہ نہیں بلکہ تمہاری ہر حرکت بات اور کام کا آئینہ ہے۔

سبطین احمد...... لاہور

کہا۔

"دیکھا جائے گا اگر کوئی مسئلہ ہوا تب بھی میں چاہوں گی کہ تم اپنی زندگی بہتر انداز میں گزارو اور بچوں کو میں رکھ لوں گی۔" اس کی ماں نے پیشکش کی اور وہ حیرت سے انہیں دیکھتی رہ گئی اور وہ اس حد تک سوچ چکی تھیں اس کا مطلب تھا کہ وہ فیصلہ کر چکی ہیں اور اس فیصلے سے پیچھے نہیں ہٹیں گی۔

"میں سوچوں گی۔" اس نے کہا اس بار اس کے لہجے میں غصہ نہیں تھا۔

"ہاں سوچو لیکن جواب اثبات میں ہی ہونا چاہیے۔"

"اور اگر محمد الدیف ہی راضی نہ ہوا تو؟"

"تو...... دیکھا جائے گا۔" اس کی ماں نے کہا اور اس کے پاس سے اٹھ گئیں۔

"لیکن یہ سوچ لو کہ اگر وہ راضی نہ ہوا تب بھی میں کوئی بھلا شخص دیکھ کر تمہاری شادی ضرور کراؤں گی بھلا ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے ایسے کیسے ساری زندگی کٹ سکے گی۔" انہوں نے کہا اور چلی گئیں۔ دیدار اس روز کافی دیر تک سوچتی رہی تھی اور اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ اسے اپنی ماں کے فیصلے کے آگے ہتھیار ڈالنا ہی پڑیں گے۔

چند روز بعد آنٹی صفیہ اس کی والدہ سے ملنے آ گئیں اور اسے پتا چلا کہ محمد الدیف نے یہ رشتہ منظور کر لیا ہے گھر میں ہر شخص خوش نظر آنے لگا لیکن دیدار کو یوں لگ رہا تھا جیسے اس رشتے پر راضی ہو کر وہ بلال سے بے وفائی کرے گی۔

اسے شادی کے لیے رضامند کرنے میں اس کی ماں اس کی بڑی بہن ایمن اور ابراہیم کا بڑا ہاتھ تھا سب نے مل جل کر اسے قائل کر لیا تھا اور آخر کار اس نے ماں کے سامنے خاموشی سے رضامندی کا اظہار کر دیا تھا لیکن وہ اندر ہی اندر بہت ڈری اور سہمی ہوئی تھی اس کی نئی زندگی محمد الدیف کے ساتھ شروع ہونے جا رہی تھی اس کے بارے میں میں وہ فکرمند تھی کہ وہ کیسی ہوگی الدیف کا رویہ اس کے ساتھ کیسا ہوگا اس کے بچوں کے ساتھ اس کا رویہ کیسا ہوگا لیکن اس نے اپنے آپ کو اپنی ماں کے فیصلے کے آگے جھکا دیا تھا اور مخالفت کرنا بند کر دی تھی اس کی بہن ایمن اسے اٹھتے بیٹھتے دلاسے دیتی تھی اور ہمیشہ ساتھ نبھانے کا وعدہ کرتی تھی۔

اس کی محمد الدیف سے شادی کے لیے کوئی بھی خاص اہتمام نہیں کیا گیا تھا یہ اس کی خواہش بھی تھی اور حالات کا تقاضا بھی اس کے نکاح میں خاندان کے چند قریبی لوگوں نے شرکت کی تھی۔ محمد الدیف اپنے چند گھر والوں اور قریبی دوستوں کے ساتھ نہایت سادہ لباس میں آیا تھا اور نکاح کے بعد اسے رخصت کروا کر لے گیا تھا اس نے غزہ ہی کے علاقے میں ایک مکان کرائے پر لیا تھا اور دیدار کو رخصت کرا کر اپنے ساتھ وہاں لے گیا تھا اس مکان کو نہایت سادہ انداز میں زندگی کی ضرورتوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ محمد الدیف کے گھر والے اسے اس مکان میں پہنچانے کے بعد رخصت ہو گئے تھے صرف اس کی والدہ اس کے ساتھ موجود تھیں۔

"دیدار" محمد الدیف کی والدہ نے خلہ عربی میں اسے مخاطب کیا تو وہ چونک گئی اور سوچنے لگی کہ نجانے وہ اس سے کیا کہیں گی۔

"تم محمد الدیف کی زندگی کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہو۔ لیکن میں تمہیں اس کی کچھ خاص خوبیاں بتانا چاہتی ہوں۔" اتنا کہہ کر وہ رک گئیں شاید اس کے جواب کا انتظار کر رہی تھیں کچھ دیر بعد انہوں نے پھر بولنا شروع کیا۔

"ایک بہادر جہادی فوجی ہونے کے ساتھ ساتھ میرا بیٹا الدیف بہت درد مند دل کا مالک ہے وہ دوسروں کا بہت خیال کرتا ہے دوسروں کی تکلیف میں ان کے کام آنا چاہتا ہے بہت مذہبی ہے اور اسلام کے اصولوں کی سختی سے پابندی کرتا ہے کبھی کسی کا حق نہیں مارتا وہ سچا مجاہد ہے تم آئندہ زندگی میں دیکھو گی کہ وہ تمہارے اور تمہارے بچوں کے ساتھ کتنا اچھا سلوک کرتا ہے تم بھی اس کی پسند اور ناپسند کا خیال رکھنا میرا بیٹا اس معاملے میں بڑا ابھی ہے کہ اللہ نے اسے کوئی اولاد نہیں دی میری دعا ہے کہ تمہاری زندگی اس کے ساتھ اچھی گزرے اور تم اسے اولاد کے تحفے سے مالا مال کردو۔" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگئیں پھر وہ کھڑی ہوگئی تھیں۔

"میری دعائیں تمہاری آنے والی زندگی کے لیے وقف ہیں ویدار، خوش رہو۔" انہوں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا اور کمرے سے چلی گئی تھیں۔

ویدار کافی دیر تک بیٹھی محمد الدیف کا انتظار کرتی رہی تھی۔ رات کے آخری پہر میں وہ کمرے میں داخل ہوا تھا اور اس کے قریب بیٹھ گیا تھا۔

"میں کوشش کروں گا ویدار کہ تمہیں خوش رکھ سکوں لیکن تمہیں اکثر میری غیر حاضری برداشت کرنا ہوگی کیونکہ میں اپنے فرض سے غافل نہیں رہ سکتا۔ تم جانتی ہی ہوگی کہ میں کس جہاد میں مصروف ہوں اور کافروں کو ان کے انجام تک پہنچانا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ لیکن میرا وعدہ ہے کہ میری کسی سرگرمی کے منفی اثرات تم پر یا تمہارے بچوں پر نہیں پڑیں گے۔" الدیف کے لہجے میں بلا کا اعتماد تھا۔

"میں امید کروں گا کہ تم میرے بارے میں اپنے رشتے داروں، عزیزوں، سہیلیوں سے زیادہ بات نہ

دیدار نے کہا۔

"اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر تم چاہو تو ابو بکر اور بنیان کو بھی اپنے ساتھ لا سکتی ہو۔" اس کی ساس نے کہا تو حیرت سے انہیں دیکھنے لگی اسے امید نہیں تھی کہ الدیف اتنے کھلے دل کا مالک ہوگا۔

"نہیں...... ابھی نہیں...... یہ میرے بچے ہیں میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتی لیکن میں الدیف سے اس سلسلے میں تفصیل سے بات کرنا چاہتی ہوں۔" دیدار نے کہا تو اس کی ساس مسکرا کر خاموش ہو گئی پھر وہ اس کے ساتھ واپس الدیف کے گھر آ گئی تھی گھر میں ہر طرف خاموشی تھی اس کی ساس نے اسے پورا گھر دکھایا تھا جو وہ شادی کی صبح نہیں دیکھ سکی تھی کیونکہ اس کی والدہ صبح ہی اسے لینے آ گئی تھیں گھر ایک مختصر فیملی کے رہنے کے لیے مناسب تھا۔

وہ کئی دن تک اپنی ساس کے ساتھ ہی رہی تھی وہ دبے لفظوں میں کئی بار اپنے گھر جانے کے بارے میں کہہ چکی تھیں۔

"دیدار اگر تم کہو تو میں کچھ دیر کے لیے اپنے گھر چکر لگا آؤں؟"

"ہاں ضرور کیوں نہیں۔ آپ میری بڑی ہیں یوں مجھ سے پوچھ کر مجھے شرمندہ نہ کریں۔" دیدار نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ شاید تمہیں اکیلے رہنے کی عادت نہ ہو اور تم تنہائی میں گھبرا جاؤ۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں، مجھے ہر طرح کے حالات میں رہنے کی عادت ہے۔" دیدار نے کہا۔

"دراصل گھر پر الدیف کی چھوٹی بہنیں بھی ہیں وہ میری منتظر ہوں گی۔"

"ہاں، ہاں آپ ضرور جائیں۔"

دیدار سے اجازت لینے کے بعد اس کی ساس جلدی آنے کا کہہ کر چلی گئی تھیں اور اسے تاکید کر گئی تھیں کہ اندر سے دروازہ بند کر لے۔

"اچھا میں کرلوں گی۔" دیدار نے جواب دیا پھر اس نے ریڈیو کھولا جس سے ایک رزمیہ نغمہ آ رہا تھا۔

اوغزہ کے محافظو......او محافظو

قصام کے بہادرو......او بہادرو

قرآن پر ایمان ہے تلوار تمہاری شان ہے

الدیف تمہاری جان ہے تم اس پر قربان

اوغزہ کے محافظو......او محافظو

قصام کے بہادرو......اور بہادرو

دیدار بھی اس کے ساتھ ساتھ گنگنانے لگا۔

غزہ کے محافظو......او محافظو

قصام کے بہادرو......او بہادرو

اچانک اسے اپنے کاندھے پر کسی بھاری ہاتھ کا احساس ہوا اور وہ چونک کر مڑی۔

اس کے سامنے محمد الدیف کھڑا تھا لمبا خوب صورت مضبوط اعصاب کا مالک اس کی آنکھوں میں سمندروں جیسی گہرائی تھی اور وہ محبت بھری نظروں سے دیدار کو دیکھ رہا تھا دیدار نے شرم سے نظریں جھکا لیں۔

"کیسی ہو؟" محمد الدیف نے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں۔" دیدار نے جواب دیا اس کے لہجے میں کوئی شکوہ نہیں تھا۔

"میرا یوں چلے جانا تمہیں برا تو نہیں لگا؟"

"نہیں۔"

"تم سمجھتی ہو نا میرے کام کی نوعیت، مجھے کسی بھی وقت کسی ضروری آپریشن کے لیے جانا پڑ سکتا ہے۔" محمد الدیف نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا تو دیدار نے اثبات میں سر ہلا دیا الدیف نے اس کا ہاتھ تھاما اور کمرے میں پڑے ہوئے بیڈ پر لا کر بٹھا دیا دیدار کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا وہ سوچ رہی تھی

کہ نجانے الدیف اب اس سے کیا پوچھے گا۔
"والدہ کہاں ہیں۔" الدیف نے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔
وہ کچھ دیر کے لیے گھر گئی ہیں کہہ رہی تھیں کئی دن ہو گئے ہیں گھر کی کچھ خبر لے آؤں۔"
"انہیں تمہیں اکیلا چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے تھا۔"
"کوئی بات نہیں میں اکیلے رہنے سے نہیں گھبراتی۔" ویدار نے کہا۔
"ویدار میں پوری کوشش کروں گا کہ تمہارا ہر طرح خیال رکھوں لیکن میرے کام کی نوعیت کی وجہ سے تمہیں اکثر میرے بغیر بھی گزارنا ہوگا تم موبائل فون بھی استعمال نہیں کرو گی شاید تمہیں ٹی وی کی سہولت بھی نہ مل سکے اور کوئی مستقل گھر بھی نہیں جلدی جلدی ہمیں اپنے ٹھکانے بدلنے پڑتے ہیں کہ دشمن ہمیں ٹریس نہ کر سکے اور ہم اپنے پیچھے اپنا نشان بھی نہیں چھوڑتے۔"
"میں یہ سب باتیں جانتی ہوں میری ماں نے بچپن سے یہ سوچا ہوا تھا کہ وہ میری شادی کسی قصامی مجاہد سے کریں گی وہ وطن کے لیے لڑنے والے بہادروں کو بہت پسند کرتی ہیں اور میری تربیت بھی انہوں نے ایسی کی ہے کہ میں ہر ماحول میں خود کو ڈھال لیتی ہوں۔" ویدار کے جواب پر محمد الدیف کے چہرے پر اطمینان کی جھلک نظر آئی تھی۔
"تم اپنی زندگی میں آنے والے کس مرد سے زیادہ متاثر ہو؟" الدیف نے پوچھا ویدار اس کا مطلب سمجھ گئی تھی اس کا اشارہ خود اپنی طرف اور بلال کی طرف تھا۔
"میری روح میں دو قصامی مرد ہیں اور ان دونوں کے درمیان میرا دل ہے جو میرے مالک کے لیے دھڑکتا ہے اس دل کی سمجھ کسی عام عورت کو نہیں آ سکتی ایک عام عورت جو زندگی کی تمام آسائشوں کے درمیان زندگی گزار رہی ہو، میرا دل...... میرا دل وہ ہے جو عارضی جدائی سے نہیں ٹوٹنا چاہیے اس پر غم کا حملہ ہو یا جدائی کا اس دل کا پہلا محافظ "بلال قصیا" تھا اور دوسرے محمد الدیف تم ہو۔" ویدار خاموش ہو کر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی وہ اپنی کہی ہوئی بات کا رد عمل الدیف کے چہرے پر دیکھنا چاہتی تھی لیکن اس کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں تھے وہ بغور اس کی بات سن رہا تھا۔
"اور ایک سولہ سال کی لڑکی کے لیے یہ سہنا کتنا مشکل ہے کہ تین سال کی شادی شدہ زندگی گزارنے کے بعد اس کا محبت کرنے والا شوہر اسے چھوڑ جائے۔ وہ بیوہ ہو جائے دو بچوں کے ساتھ میں اس کرب کو بیان نہیں کر سکتی۔" ویدار نے ایک سسکی لی۔
"بلال تمہارا بہت خیال رکھتا تھا؟" الدیف نے پوچھا تو اس کی آنکھیں بھر آئیں۔
"بلال مجھ سے بہت محبت کرتا تھا اس کا اچھا رویہ میرے لیے ٹھنڈے پانی کی آبشار جیسا تھا جو میرے دل کی گہرائیوں میں اتر گیا تھا اس نے مجھے اور بچوں کو کبھی کوئی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔"
"ویدار انسان کی زندگی میں دکھ اور تکلیف آتے رہتے ہیں لیکن اصل بات یہ ہے کہ ہم ان کا مقابلہ کس بہادری سے کرتے ہیں اور ان کے آگے خود کو بے بس نہیں ہونے دیتے۔" الدیف نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔
"اس کے مرنے کے بعد میں تین سال تک اداس رہی، میں بہت زیادہ روتی رہتی تھی میری فیملی بھی میری وجہ سے پریشان تھی۔" ویدار کی سسکی نکل گئی تو الدیف نے اسے گلے سے لگایا اور دلاسہ دینے لگا۔
"مجھے اس کے بارے میں اور بتاؤ جب اس کا

انتقال ہوا تو تمہاری کیا کیفیت تھی۔

"میں اس کے مردہ جسم کے پاس کھڑی تھی میرا دماغ سن ہو گیا تھا میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا میرے ہاتھوں نے دعا کے لیے اٹھنے سے انکار کر دیا تھا اور میں دل میں یہی سوچ رہی تھی کہ خدایا مجھے حوصلہ دے کہ میں اس غم سے نبرد آزما ہو سکوں اور اس کے بدلے مجھے کوئی اور بہتر بدلہ دے۔" میری یہ خواہش اس لیے تھی کہ میں نے اکثر بڑے بوڑھوں سے سنا تھا کہ اللہ بے رحم نہیں وہ کسی کی کوئی چیز نہیں چھینتا اور اگر کچھ لیتا ہے تو اس سے بہتر دیتا بھی ہے وہ اپنے بندوں کا سب سے بڑھ کر خیال کرتا ہے۔"

"اور خدا نے تمہیں بدلہ دے دیا" الدیف نے کہا۔

"ہاں لیکن جب بلال کا انتقال ہوا تھا تب میں سوچ رہی تھی کہ بلال سے بہتر اور کیا ہو گا لیکن میں نے شادی کا ارادہ ترک کر دیا تھا میرے سامنے میرے دو بچے تھے اور میں انہیں آئندہ زندگی میں پریشان دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔

"ان شاء اللہ، وہ آئندہ زندگی میں کبھی پریشان نہیں ہوں گے یہ میرا تم سے وعدہ ہے ویدار تم ان کو یہاں اپنے ساتھ رکھ سکتی ہو، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا" الدیف نے کہا۔

"مجھے پتا چلا تھا کہ پہلے تم نے مجھ سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا" الدیف نے پوچھا۔

"ہاں، میں اقرار کرتی ہوں میں نے واقعی تم سے شادی سے انکار کر دیا تھا اور تم سے ہی کیا میں تو کسی سے بھی شادی نہیں کرنا چاہتی تھی بلال کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد ہی سے میری ماں نے مجھ سے ضد کرنا شروع کر دی تھی کہ میں اپنی خاطر نہ سہی لیکن اپنے چھوٹے بچوں کی خاطر دوسری شادی کر لوں کہ انہیں کوئی سرپرست مل جائے لیکن میں نے ہمیشہ انکار ہی کیا۔"

"آخر تم انکار کیوں کرتی تھیں۔"

"میں بلال سے بے وفائی کرنا نہیں چاہتی تھی اور مجھے یہ ڈر بھی تھا کہ میری زندگی میں آنے والا دوسرا شخص میرے بچوں کو بلال جیسا پیار نہیں دے سکے گا۔" ویدار نے کہا۔

"میں کوئی دعویٰ تو نہیں کروں گا لیکن میرے ساتھ زندگی گزارنے پر تم خود محسوس کرو گی کہ میں اور لوگوں سے بہت مختلف ہوں تمہیں مجھ سے ایسی کوئی شکایت نہیں ہو گی۔" الدیف نے کہا۔

"تم نے ایک بیوہ کو ترجیح دی الدیف جبکہ میرے ساتھ میرے بچے بھی ہیں مجھے منع نہیں ہے کہ میں نے تم سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا لیکن اب میں سوچتی ہوں کہ میں نے اچھا کیا۔" ویدار نے کہا۔

محمد الدیف اس کے ساتھ کچھ دن وہاں رہا اور ایک موقع پر اس نے ویدار کو 2006ء میں اپنے اوپر ہونے والے ایک اسرائیلی حملے کے بارے میں بتایا ویدار نے اس بارے میں اپنی شادی سے پہلے بھی سنا تھا لیکن الدیف کے منہ سے یہ سب سننا اس کے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔

"یہ 12 جولائی 2006ء کی بات ہے۔" الدیف نے ویدار کے بے حد اصرار پر کہنا شروع کیا۔

"میرے ساتھ حماس ملٹری ونگ کے کئی اہم اور ذمہ دار لوگ ایک بلڈنگ میں میٹنگ کے لیے جمع ہوئے تھے وہ ایک شدید حملہ تھا اچانک ہی اسرائیل کے ایئر کرافٹ نے کئی بم مارے تھے ساری بلڈنگ تباہ ہو گئی تھی کئی لوگ اس حملے میں مارے گئے تھے لیکن میں بچ گیا تھا لیکن شدید زخمی تھا اتنا زخمی کہ اپنی ذمہ داریاں صحیح طور پر ادا نہیں کر سکتا تھا تب میرے

ایک ساتھی احمد جباری کو ایکٹنگ کمانڈر بنایا گیا تھا اور میری جگہ کافی عرصے تک اس نے حماس کے ملٹری ونگ میں خدمات انجام دی تھیں۔"

"تمہیں کبھی ڈر نہیں لگا الدیف؟" ویدار نے پوچھا۔

"نہیں...... بلکہ میری خواہش ہے کہ میں شہادت کا اعزاز حاصل کروں اور جب اپنے اللہ کے سامنے حاضر ہوں تو مجھے کوئی شرمندگی نہ ہو۔" الدیف نے کہا۔

"دشمن تمہارے پیچھے لگا ہوا ہے وہ تمہارے لیے ہر وقت سرگرم ہے تمہاری کھوج میں رہتا ہے اگر کبھی تمہیں کچھ ہو گیا تو میں کیا کروں گی؟" ویدار نے اپنے دل میں آنے والے خیال سے اسے آگاہ کیا۔

"ایسا مت سوچو ویدار...... اللہ تعالیٰ سب کا پالن ہار ہے وہ اپنے کسی بندے کو نہیں بھولتا ایک مسلمان ہونے کے ناتے ہمارا فرض ہے کہ ہم اسلامی اصولوں پر عمل کریں اور خاص طور سے میرے لیے ضروری ہے کہ میں اپنے ملک کے مسلمانوں کے لیے اگر کچھ کر سکتا ہوں تو کروں۔"

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو، ہم ہر وقت خطرے میں ہیں اسرائیل کی طرف سے اکثر میزائل فائر کیے جا رہے ہوتے ہیں اور انہیں روکنے والا بھی کوئی نہیں۔"

"ہمیں خود ہی ہمت کرنا ہوگی ویدار باہر سے کوئی ہماری مدد کرنے نہیں آئے گا۔"

"میں تمہارے ساتھ ہوں الدیف، میرے لائق کوئی خدمت ہو تو......!"

"بس تم اتنا کرو کہ اپنی حفاظت کرو، میں نے یہ شادی اس لیے کی ہے کہ میں اپنے پیچھے کوئی اپنا نام لینے والا چھوڑ جاؤں، ممکن ہے جو کام میں پورا نہ کر سکوں وہ میری اولاد میں سے کوئی کر لے۔" الدیف نے کہا۔

"ہوں۔"

چند روز ویدار کے پاس گزارنے کے بعد الدیف پھر چلا گیا تھا وہ کبھی ویدار کو اپنے ٹھکانوں کے بارے میں نہیں بتاتا تھا اور نہ ہی کبھی اس سے رابطہ کرتا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ جو دشمن اسے کتوں کی طرح سونگھتے پھر رہے ہیں وہ اس کی بیوی تک پہنچ کر اس کو کوئی نقصان پہنچائیں۔

پھر ویدار کی شادی کے کچھ عرصہ بعد ہی غزہ میں اسرائیل نے باقاعدہ حملوں کا پھر آغاز کر دیا تھا اور اس بار غزہ کا کوئی بھی حصہ محفوظ نہیں رہا تھا ویدار چند روز کے لیے اپنے میکے آ گئی تھی اور اپنے بچوں کے ساتھ تھی۔

اس پر غزہ پر ہونے والے حملوں کو اسرائیل نے Operation Cast Land کا نام دیا تھا جب راکٹ فائر کیے جاتے تھے تو یوں لگتا تھا کہ صفحہ ہستی پر کوئی ذی روح محفوظ نہیں رہے گا۔ خاص طور پر رات کے وقت جب حملہ ہوتا تو یوں لگتا کہ اب صبح نہیں ہوگی سارے ہی گھروں میں لوگوں کا یہ اصول بن گیا تھا کہ وہ گھر میں موجود چٹائیاں یا گدے جمع کر کے کمرے کے درمیان میں یوں بچھا لیتے کہ وہ کھڑکیوں اور دروازوں سے دور رہیں تاکہ حملے میں اگر کھڑکیوں وغیرہ کے شیشے ٹوٹیں یا ٹوٹ پھوٹ ہو تو وہ لوگ محفوظ رہ سکیں۔

ایسے ہی ایک حملے کے دوران ویدار اپنے بچوں ابو بکر اور بُنیان کو لے کر ایک کمرے میں سب گھر والوں کے ساتھ موجود تھی رات کا وقت تھا اور سب کمرے کے وسط میں بچھی ہوئی چٹائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ویدار کی بیٹی بُنیان چیخنے لگی۔

"امی...... امی...... میں مر جاؤں گی ہم سب مر

جائیں گے...... یہ اسرائیلی ہمیں مار دیں گے۔" وہ زور زور سے چیخ رہی تھی اس کا انداز ہسٹیریائی سا تھا۔

"نہیں...... نہیں تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔" ویدار نے اسے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں ہوگا میری جان۔" ویدار نے اس کے گال پر پیار کیا ابوبکر بھی ایمن کی گود میں سہما ہوا بیٹھا تھا۔

"ابوبکر، تم تو بہت بہادر ہو نا؟" اس نے ابوبکر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ بُنیان بھی بہت بہادر ہے۔ وہ ڈر تو نہیں رہی۔" ویدار نے پھر بنیان کو پیار کیا۔

"لاؤ اسے مجھے دے دو۔" ویدار کی والدہ نے بُنیان کو اس سے لیتے ہوئے کہا اور اسی وقت فضا میں ڈرون جہازوں کی ہلکی سی آواز سنائی دی بچے پھر سہم گئے تھے۔

"امی وہ پھر آ گئے۔" بُنیان چیخی۔

"نہیں بُنیان وہ تمہیں کچھ نہیں کر سکتے میں ہوں نا۔" ویدار کے بھائی ابراہیم نے اپنی بھانجی کی ہمت بندھائی۔

"آؤ ابوبکر تم میرے پاس آ جاؤ۔" اس نے اپنے بھانجے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور اسی وقت کہیں قریب ہی ڈرون نے راکٹ گرایا ایک زوردار دھماکا ہوا تھا۔

"اس بار تو یہ سارا غزہ تباہ کر دیں گے۔" ایمن نے غصے سے کہا۔

"کوئی گھر...... کوئی اسکول...... کوئی بازار محفوظ نہیں ہے۔" ویدار کی والدہ نے کہا۔

"دنیا بھر سے کوئی بھی ہماری مدد کو نہیں آیا۔" ایمن نے کہا۔

"ہاں کوئی نہیں آیا محمد الدیف کا کہنا ہے کہ کوئی ہماری مدد کو نہیں آئے گا ہمیں اپنی جنگ خود ہی لڑنا ہوگی۔" ویدار نے کہا۔

"وہ ٹھیک کہتے ہیں۔" ابراہیم نے کہا۔

"یوں لگ رہا ہے کہ کئی ڈرون ہیں۔" ویدار نے جہازوں کی آواز کی طرف سب کا دھیان دلایا۔

"ہاں اور لائٹ نہ ہونے کی وجہ سے اندھیرا بھی ہے۔" ایمن نے کہا۔

"یہ معمول ہی بن گیا ہے جب بھی حملہ ہوتا ہے تو لائٹ غائب ہو جاتی ہے۔ ویدار نے کہا۔

"امی...... دیکھیں ہمارے گھر پر راکٹ گرا ہے۔" ابوبکر نے کہا۔

"نہیں ہمارے گھر پر نہیں لیکن کہیں قریب ہی گرا ہے۔" ویدار نے کہا۔

"ہاں مگر ایسا ہی لگتا ہے کہ ہمارے گھر پر گرا ہو اس کی آواز اتنی ہی شدید ہوتی ہے۔" ایمن نے کہا۔

اس رات گھر کا کوئی فرد سو نہیں سکا تھا اور جب صبح اٹھ کر دیکھا تھا تو قریب کے کئی گھر راکٹوں سے مسمار ہو چکے تھے بچے خوفزدہ تھے رات ہوتے ہی ان کے چہرے پر خوف کے سائے نظر آنے لگتے تھے۔

"کبھی بھی ان حملوں کا پتا نہیں چلتا کوئی وارننگ بھی نہیں دی جاتی۔" ویدار کی ماں نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا جب دوسرے دن وہ سب ایک کمرے میں جمع تھے اور ایک رات قبل ہونے والے واقعہ پر گفتگو کر رہے تھے۔

"کیا فلسطینی ہونا گناہ ہے امی۔" ابوبکر نے ویدار سے پوچھا۔

"شاید بیٹا ہمارے ساتھ جو سلوک ہوتا ہے اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ فلسطینی ہونا گناہ ہے۔" ویدار نے افسردگی سے کہا۔

"ہم رات بھر ایک کمرے سے دوسرے کمرے

میں بھاگتے رہتے ہیں لیکن کیا ہم اس طرح محفوظ ہیں کیا ایسا کرنے سے ہم راکٹ حملے سے بچ جائیں گے۔" ایمن نے پوچھا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ راکٹ گھر کے کس کمرے پر لگا وہ کسی کمرے پر بھی لگے گھر تو پورا تباہ ہی ہوگا۔" ویدار نے اس کی بات کو آگے بڑھایا۔

"یوں لگتا ہے جب تک چٹائیاں اور گدے کمرے میں ایک جگہ بچھا کر وہاں بیٹھ جاتے ہیں جیسے اس طرح ہم اکٹھے مرنے کا انتظار کر رہے ہوں۔" ایمن نے کہا۔

"ہاں، ایسا ہو بھی تو چکا ہے۔ غزہ کی کئی فیملیاں اسی طرح اکٹھی شہید ہو گئی ہیں کہ ان کے گھروں میں ان کی کہانی سنانے والا بھی کوئی باقی نہ رہا۔" ویدار نے جواب دیا۔

"امی میں بڑا ہو کر دشمن کے ڈرون جہاز توڑ دوں گا۔" ابراہیم کی گود میں بیٹھے ابوبکر نے کہا تو وہ ویدار مسکرا دی۔

"جب راکٹ مارے جا رہے ہوتے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ اب اگلا شکار ہم ہی ہوں گے اگلا نشانہ ہمارا گھر ہی ہوگا۔" ایمن بولی۔

"ہاں اللہ ہماری حفاظت کرے۔" ویدار نے کہا تو قریب بیٹھی اس کی ماں نے بھی اثبات میں سر ہلایا۔

"او غزہ کے محافظو...... او محافظو

او قصام کے بہادرو...... او بہادرو

ویدار نے گنگنانا شروع کیا سب بغور سن رہے تھے۔

"قرآن پر ایمان ہے تلوار تمہاری شان ہے

الدیف تمہاری جان ہے تم اس پر قربان۔

ایمن نے ویدار کا ساتھ دیا۔

او غزہ کے محافظو...... او محافظو

قصام کے بہادرو...... او بہادرو

اب دونوں مل کر گنگنا رہی تھیں۔

اس روز کافی دیر تک وہ لوگ غزہ اور اس کے مستقبل کی باتیں کرتے رہے تھے لیکن وہ مایوس نہیں تھے انہیں امید تھی کہ ایک نہ ایک دن ان کے مجاہدین انہیں اس مصیبت سے نجات دلا دیں گے جو اسرائیل نے ان کے سر پر مسلط کی ہوئی تھی۔

اس بار جب ویدار گھر گئی اور الدیف سے ملی تو وہ بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔

"کیا بات ہے دیف تم کچھ پریشان نظر آ رہے ہو۔" ویدار نے اس سے پوچھا۔

"ہاں، میں پریشان نہیں بلکہ غمزدہ ہوں دراصل ان حملوں میں اسرائیل نے سارے پچھلے ریکارڈ توڑ دیئے ہیں۔"

"کیوں کیا ہوا؟" ویدار نے پوچھا۔

"میں غزہ کے لوگوں کے لیے بہت پریشان ہوں ہم بہت ڈٹ کر اسرائیلیوں کا مقابلہ کر رہے ہیں لیکن خاطر خواہ نتائج حاصل نہیں ہو رہے اور اسرائیل جو کارروائیاں کر رہا ہے اس میں بہت سے بے گناہ مارے جا رہے ہیں ایک عورت کی کہانی نے مجھے بہت متاثر کیا ہے مجھے پتا چلا کہ غزہ میں ایک عورت اپنی فیملی کے ساتھ اپنے گھر کے ایک کمرے میں بیٹھی تھی جب اسرائیلیوں نے Knock on the roof کا حملہ کیا۔"

"Knock on the roof"۔ ویدار نے حیرت سے دہرایا۔

"فوجی اصطلاح میں اس حملے کا نام ہے جس میں ڈرون آ کر سیدھا کسی خاص مکان کی چھت کو نشانہ بناتے ہیں اس حملے میں اس عورت کا مکان بالکل تباہ ہو گیا وہ عورت بہت زیادہ زخمی ہے اور اسپتال میں

ہے اس کا علاج ہو رہا ہے اس کی آنکھوں کی بینائی ضائع ہوگئی ہے اور اسے یہ علم نہیں کہ اس حملے میں اس کا شوہر اور دونوں بیٹے مارے جا چکے ہیں وہ امید کرتی ہے کہ ٹھیک ہو جائے گی تو اپنے بیٹوں اور شوہر سے ملے گی۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو الدیف ایسے اور بھی بہت سے لوگ ہیں لیکن ہم ان کا غم بانٹ نہیں سکتے ان کے بچھڑے ہوؤں کو واپس نہیں لا سکتے۔" ویدار نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"ہاں...... لیکن ان کے اپنے دل کو اداس ہونے سے بچا بھی نہیں سکتے۔" الدیف نے تاسف سے کہا۔

"میں اسرائیلیوں سے ایک ایک ظلم کا حساب لوں گا ان کی قبر تک ان کا پیچھا کروں گا۔" الدیف کے لہجے میں غصہ تھا۔

"تمہارے غصہ میں بھی ایک حسن ہے۔" ویدار نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔

"غصے میں حسن؟"

"ہاں تم نہیں جانتے جب تم ایسی باتیں کرتے ہو اور تمہیں غصہ آتا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ تمہارے چہرے پر اعتماد کی جو جھلک نظر آتی ہے وہ تمہیں حسین بنا دیتی ہے۔" ویدار نے اس کی تعریف کی۔

"ویدار کہیں ایسا تو نہیں کہ مجھ سے شادی کر کے تمہیں افسوس ہو رہا ہو کہ کس سے شادی کر لی جو تمہارے ساتھ ہر وقت نہیں رہ سکتا۔"

"نہیں ایسا نہیں ہے تمہاری خدمت کر کے مجھے سکون ملتا ہے۔" ویدار نے کہا تو الدیف کے چہرے پر خوشی کے آثار نظر آئے۔

پھر آہستہ آہستہ ویدار اس طرح زندگی گزارنے کی عادی ہوگئی تھی اب الدیف کا یوں آنا جانا اسے برا نہیں لگتا تھا جب الدیف نہیں ہوتا تھا تو وہ اس کی یادوں میں کھو جاتی تھی اور یہ سوچتی رہتی تھی کہ اس بار وہ آئے گا تو وہ اس کے لیے کون سے روایتی کھانے پکائے گی اسے پتا تھا کہ الدیف کو روایتی کھانے بہت پسند تھے۔

اسی طرح الدیف کی خدمت اس کے انتظار اور اسرائیلیوں کے گولوں کی بوچھاڑ میں دو سال گزر گئے کہ ایک روز اس نے الدیف کو بتایا وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے وہ دن الدیف کی زندگی کا خوش گوار دن تھا۔

"ویدار تم نے مجھے خوش کر دیا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مجھے تم سے یہ خوشی مل جائے گی میں تو مایوس ہو چکا تھا۔" الدیف نے کہا۔

"میں اپنے بیٹے کو اپنی طرح مجاہد بناؤں گا۔" الدیف نے پرعزم لہجے میں کہا۔

"ضرور کیوں نہیں، دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بیٹے سے نوازے۔"

2010ء میں پھر ایک بار اسرائیل کے حملوں میں تیزی آ گئی وہ بغیر وارننگ کے حملہ کر دیتے تھے یا ان کے حملہ کرنے کا طریقہ یہ بھی ہوتا تھا کہ علاقے کے کسی بھی گھر کا فون بجتا اور ریسیو کرنے پر پتا چلتا کہ حملہ ہونے والا ہے اس علاقے کے لوگوں کے پاس بھاگنے کا وقت بھی نہیں ہوتا تھا۔ پانچ منٹ بھی نہیں گزرتے تھے کہ حملہ ہو جاتا تھا۔

ایسی ہی ایک رات جب سب سوئے ہوئے تھے ویدار کے علاقے میں جہاں اس کا گھر تھا ایک گھر کے فون کی گھنٹی بجی اور انہیں اطلاع دی گئی کہ حملہ ہونے والا ہے۔

"جلدی نکلو، گھر سے باہر نکلو۔" ہر طرف شور مچ گیا گلیوں اور گھروں میں لوگوں کی چہل پہل ہوگئی سب گھبرا گئے تھے بچے بوڑھے اور جوان سب گلیوں

میں نکل آئے تھے اور محفوظ مقام کی طرف بھاگ رہے تھے لیکن ویدار پرسکون اپنے گھر میں بیٹھی تھی اس وقت محمد الدیف بھی گھر پر موجود نہیں تھا اسے گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں تھی ویسے بھی وہ محلے والوں تک سے نہیں ملتی تھی کسی کو یہ پتا نہیں تھا کہ اس محلے میں رہنے والی اس عورت کا شوہر محمد الدیف ہے جو حماس کی ملٹری ونگ قصام کا کمانڈر ہے ابھی لوگوں کا شور تھمنے بھی نہیں پایا تھا کہ اسرائیل کی طرف سے راکٹوں کی بوچھاڑ شروع ہوگئی تھی اور لوگوں کی آوازیں چیخوں اور کراہوں میں تبدیل ہوگئی تھیں۔

ان حملوں میں غزہ کے لوگوں کا بہت جانی نقصان ہوا تھا محمد الدیف اسرائیل کی، کی گئی اس تباہی سے بہت غمزدہ تھا اس نے ان حملوں کے فوراً بعد حماس کے تیئس ویں یوم تاسیس پر اپنے ایک آفیشل بک لیٹ کے ذریعے اسرائیل کے فوجیوں کو مخاطب کیا تھا۔

اس بک لیٹ کا عنوان تھا ''فتح کا راستہ'' اور اس میں حماس کے دوسرے ملٹری لیڈرز کے تاثرات بھی موجود تھے محمد الدیف نے لکھا تھا

''حماس کی قصام ملٹری بریگیڈ بالکل تیار اور چاق و چوبند ہے اور اپنے راستے پر گامزن ہے اس راستے کا کوئی اور نعم البدل نہیں اور وہ راستہ جہاد کا راستہ ہے ہماری جنگ مسلمانوں اور انسانیت کے دشمنوں کے ساتھ ہے ہم اپنے دشمنوں کو بتا دینا چاہتے ہیں ان کا راستہ انہیں صرف اور صرف تباہی اور زوال کی طرف لے جا رہا ہے اور فلسطین ہمارا ہے صرف ہمارا اپنے القدس (یروشلم) اور الاقصیٰ (مسجد) کے ساتھ فلسطین کے شہر اور گاؤں بحیرہ احمر سے لے کر دریائے اردن تک تمام علاقے شمال سے جنوب ہمارے ہیں تمہارا اس سرزمین کے ایک انچ حصے پر بھی حق نہیں ہے۔''

یہ پیغام فلسطین کے ریڈیو سے بھی نشر ہوا اور اس کے پمفلٹ بھی بانٹے گئے ویدار نے بھی ریڈیو پر اس پیغام کو سنا تھا اور اس کا سر فخر سے بلند ہوگیا تھا اسے اپنے بہادر شوہر پر ناز تھا۔

اس رات محمد الدیف گھر آیا تو اندھیرا ہو چکا تھا وہ اپنی حماس کی فوجی وردی میں تھا اور بہت خوب صورت اور اسمارٹ لگ رہا تھا اس کے چہرہ سے عزم و بہادری جھلک رہی تھی ویدار تو حیرت اور خوشی سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

''میں کتنی خوش قسمت ہوں کہ مجھے تم جیسا بہادر اور وجیہہ نوجوان ملا ہے۔'' ویدار کی باتوں پر الدیف مسکرا رہا تھا۔

''تم کپڑے تبدیل کرلو اور فریش ہو جاؤ میں تمہارے لیے کھانے کا انتظام کرتی ہوں۔'' ویدار نے کہا اور اس کے لیے کھانے کی تیاریوں میں مصروف ہوگئی وہ محمد الدیف کے ساتھ خوش تھی اتنی خوش کہ وہ اپنی شادی سے پہلے تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔

2010ء میں ہی خدا نے اسے چاند جیسے بیٹے سے نوازا تھا اس وقت اس کی ماں اس کے پاس تھی۔

''ویدار اللہ کا شکر ادا کرو تمہارا بیٹا بہت خوب صورت اور تندرست ہے بالکل اپنے باپ محمد الدیف پر گیا ہے۔'' اس کی والدہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''اللہ تعالیٰ کا بہت شکر ہے ماں کہ اس نے مجھے الدیف سے اولاد جیسی نعمت سے نوازا ہے اور میں اس کی اولاد سے محروم زندگی میں بہار لانے کا سبب بنی ہوں۔''

''ہاں ویدار دیکھو میرا فیصلہ ٹھیک تھا نا تم نے کتنی مخالفت کی تھی کہ الدیف تمہارے ساتھ شاید اچھا سلوک نہ کرے اور اس ڈر سے تم شادی کے لیے ہامی نہیں بھر رہی تھیں گھر کے ہر فرد نے تمہیں سمجھایا تھا۔''

''ہاں ماں مجھے یاد ہے میں تمہاری یہ باتیں بھول

نہیں سکتی میں تمہاری احسان مند ہوں۔"
"نہیں، نہیں احسان مند ہونے کی ضرورت نہیں اگر کوئی ماں اپنے بچوں کے لیے کچھ اچھا سوچتی ہے تو وہ اس کا احسان نہیں ہوتا وہ ان کی بھلائی کے بارے میں سوچ رہی ہوتی ہے چنانچہ اولاد کو چاہیے کہ اپنے ماں باپ پر احسان کرے۔" اس کی والدہ نے پیار بھرے لہجے میں اسے سمجھایا۔

"الدیف سنے گا تو اسے کتنی خوشی ہوگی وہ تو خوشی سے پاگل ہو جائے گا۔" ویدار نے کہا۔

"اسے پتا چل گیا ہے میں نے اسے بتایا تھا وہ تمہارے لیے پریشان تھا اس وقت اللہ تعالیٰ کے حضور شکرانے کے نفل ادا کر رہا ہے۔" ویدار کی ماں نے اسے بتایا تو اس کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو آگئے اس نے سوچا واقعی اللہ تعالیٰ اگر کسی سے کچھ لیتا ہے تو اس سے بہتر اس کو عطا کرتا ہے وہ مہربان ہے وہ اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے بھی زیادہ پیار کرتا ہے اور اگر وہ دنیا میں کسی کو بھیجتا ہے تو اس کا اس میں کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے وہ کسی کو بھی اس دنیا میں بے مقصد نہیں بھیجتا۔

"میں اللہ کا جتنا شکر بھی ادا کروں وہ کم ہے ماں۔" ویدار نے آنسو بھری آنکھوں سے کہا۔ اسی وقت اس کی بہن ایمن کمرے میں داخل ہوئی تھی اس کے ہاتھ میں ایک پلیٹ تھی جس میں شہد رکھا ہوا تھا۔

"میں اپنے بھانجے کو شہد کی گھٹی اپنے ہاتھ سے دوں گی۔" اس نے ایک روئی کے پھوئے میں شہد لگاتے ہوئے کہا اور پھر لیٹے ہوئے بچے کو شہد چٹا دیا تھا۔

کچھ دیر بعد محمد الدیف کمرے میں داخل ہوا تھا اس نے گھریلو لباس پہنا ہوا تھا سر پر ٹوپی تھی اور ہاتھ میں تسبیح وہ ابھی نماز ادا کر کے آیا تھا اس نے پیار بھری نظروں سے ویدار کی طرف دیکھا اور پھر بچے پر جھک گیا۔

دوسرے ہی لمحے اس نے بچے کو اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا تھا جو کپڑے میں لپٹا ہوا تھا اور اسے پیار کیا تھا۔

"اللہ تیرا شکر ہے۔" الدیف نے جذبات سے رندھی ہوئی آواز میں کہا تھا اور پھر اپنے بیٹے کے کانوں میں اذان دی تھی۔

"اس کا نام عمر ہوگا۔ عمر الدیف۔" محمد الدیف نے بچے کو لٹاتے ہوئے کہا۔

"ہاں، عمر، اچھا نام ہے اسلام کے بہترین بہادر خلیفہ اور صحابی رسول کا نام جنھوں نے جہاد کیا اور اسلام کے لیے بہت سی فتوحات کیں۔ یہ بہت اچھا نام ہے۔" ویدار کی ماں نے کہا تو محمد الدیف کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

"ان شاء اللہ یہ بھی میری طرف بہادر مجاہد بنے گا۔" محمد الدیف نے کہا۔

"یقیناً بہادر باپ کا بیٹا بہادر ہی ہوگا۔" ویدار نے جواب دیا۔

اس واقعہ کے بعد محمد الدیف کے رویے میں اور بھی اچھی تبدیلیاں آگئی تھیں۔ اب اس کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ زیادہ وقت گھر پر ویدار اور عمر کے ساتھ گزارے وہ عمر کے ساتھ رہ کر بہت خوش اور مطمئن نظر آتا تھا اس نے عمر کے لیے کھلونوں، کپڑوں اور ضروریات زندگی کی دوسری چیزوں کے ڈھیر لگا دیے تھے ویدار کو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی تھی اسی طرح دو سال گزر گئے اس عرصے میں ویدار کو کئی گھر بدلنا پڑے محمد الدیف کسی ایک مقام پر زیادہ عرصہ نہیں رہتا تھا یہاں تک کہ 2012ء میں اللہ تعالیٰ نے اسے ایک خوب صورت بیٹی سارا سے نوازا۔

"بیٹیاں اللہ کا تحفہ ہوتی ہیں جو وہ اپنے خوش نصیب بندوں کو عطا کرتا ہے۔" سارہ کی پیدائش پر محمد

الدیف نے کہا اور دیدار کی جان میں جان آ گئی وہ تو سمجھ رہی تھی کہ یہ لڑکی کی پیدائش پر الدیف خوش نہیں ہوگا لیکن الدیف نے اسے حیران کر دیا تھا وہ تو لڑکی کو اللہ کی نعمت کہہ رہا تھا پھر الدیف نے سارہ کو بھی اسی طرح سینے سے لگا کر رکھا تھا جیسے عمر کو اب یہ دونوں بچے اس کے دل کا ٹکڑا تھے۔

2012ء میں جب اسرائیل نے غزہ پر پھر حملہ کیا اس وقت دیدار اسپتال میں تھی اس کی طبیعت محمد الدیف کے بارے میں ایک بری خبر ملنے پر بگڑ گئی تھی اسرائیل نے ایک بار پھر جنگ بندی کی خلاف ورزی کرتے ہوئے غزہ پر حملہ کر دیا تھا اس بار اس جنگ کا نام Operation Pillar of Defence رکھا گیا تھا یا اکتوبر 2012ء کا زمانہ تھا اور اسرائیل نے یہ حملہ محمد الدیف کے ٹھکانوں پر کیا تھا۔

اس حملے میں محمد الدیف تو بچ نکلا تھا لیکن حماس ملٹری کے غزہ ونگ کا چیئرمین احمد جبری شہید ہو گیا تھا اس حملے میں 156 فلسطینی مارے گئے تھے جن میں 102 شہری اور 55 مجاہدین شامل تھے یہ جنگ زیادہ تر اسرائیل کی طرف سے فائر کیے جانے والے بموں کے ذریعے لڑی گئی تھی۔

جس علاقے میں دیدار کی رہائش تھی وہاں بھی بہت سے گھر تباہ ہوئے تھے اور بچے، عورتیں اور مرد مارے گئے تھے دیدار بھی زخمی ہوئی تھی لیکن جب اس تک محمد الدیف کی شہادت کی خبر پہنچی تھی تو اس کی حالت بگڑ گئی تھی اور اسے اسپتال پہنچایا گیا تھا بعد میں اسرائیل کے ریڈیو سے ہی ایک اعلان ہوا تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ محمد الدیف اس بار بھی بچ نکلا ہے اور اس کی جگہ حماس کا چیئرمین احمد جباری مارا گیا ہے۔

"میرا الدیف کس حال میں ہوگا، کہاں ہوگا؟" دیدار نے کراہتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہوگا۔" ایمن نے جواب دیا جو اس کے بیڈ کے سرہانے موجود تھی۔

"بچے کہاں ہیں؟" دیدار نے پوچھا اس کا اشارہ عمر اور سارا کی طرف تھا۔

"وہ امی کے ساتھ ہیں اور اپنے دوسرے بہن بھائیوں ابوبکر اور بنیان کے ساتھ مگن ہیں۔"

"تم سب نے میرا کتنا ساتھ دیا ہے ایمن جیسا کہا تھا ویسا ہی کر کے دکھا دیا۔" دیدار نے تشکرانہ انداز میں کہا۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو ایمن، ہم تمہارے اپنے ہیں تمہارا خون ہیں بھلا ہم تم سے دور کیسے رہ سکتے ہیں۔" ایمن نے اسے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔

"اس بار اسرائیل بری طرح ان سرنگوں کو نشانہ بنا رہا ہے جن میں حماس اور اس جیسی دوسری محب وطن جہادی تنظیموں کے ٹھکانے ہیں، بہت لوگ مارے گئے ہیں وہ سرنگیں جو انہیں دشمن سے پناہ دیتی ہیں وہی اب ان کے لیے موت کا جال بھی بن رہی ہیں۔" ایمن نے کہا۔

"تمہیں کوئی خبر ہے محمد الدیف وہ کہاں ہے؟" دیدار نے فکرمندی سے پوچھا۔

"وہ اپنی بریگیڈ کے ساتھ نہیں تھا جب حملہ ہوا وہ کسی اور آپریشن کے لیے گیا ہوا تھا اس وقت وہاں احمد جباری موجود تھا جو حماس کے ملٹری ونگ کا چیئرمین ہے وہ شہید ہو گیا ہے یہ خبر اسرائیل ریڈیو سے نشر ہوئی ہے۔" ایمن نے بتایا۔

"اگر محمد الدیف وہاں نہیں تھا تو ہو سکتا ہے کہ وہ محفوظ ہو۔" دیدار نے پرامید لہجے میں کہا۔

"ہاں...... ہاں ممکن ہے...... اللہ اس کی حفاظت کرے۔" ایمن نے کہا۔

"ہاں اور اگر اس کی قسمت میں شہادت ہے تو وہ

ایک بہادر شہید کا درجہ حاصل کرے۔" ویدار نے کہا۔

"میں جتنا الدیف کو جانتی ہوں وہ اتنا بہادر ہے کہ کبھی دشمن اس کی پیٹھ پر وار نہیں کرے گا وہ ہمیشہ سینہ تان کر دشمن کا سامنا کرے گا۔" ویدار نے کہا۔

چند روز بعد ویدار اسپتال سے گھر آ گئی تھی اسے محمد الدیف کا شدت سے انتظار تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کہاں ہوگا اور کب اس کے پاس آئے گا وہ بس خدا سے اس کی حفاظت کی دعا ہی کر سکتی تھی۔ ایسا اس نے ویدار کی خواہش پر ہی کیا تھا۔ وہ اپنے سب بچوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے خوش و خرم کھیلتے ہوئے دیکھنا چاہتی تھی۔ غزہ کے حالات نے غیر یقینی کی صورت حال پیدا کر دی تھی کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ آنے والا دن ان کے لیے کیا لاتا ہے۔ ایمن کن حالات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ اسرائیل جنگ بندی کی خلاف ورزی کرنے کے بعد مسلسل حملے کر رہا تھا۔

"میں کل اسرائیلی ریڈیو سن رہی تھی ان کا کہنا ہے کہ وہ حماس اور دوسری جہادی تنظیموں کی طرف سے ان پر ہونے والے حملوں کے جواب میں ہی غزہ پر فائر کرتے ہیں۔" ایمن نے اسے بتایا۔

"وہ جھوٹ بولتے ہیں وہ کرتے تو اس کے برخلاف ہیں اور دنیا کو کچھ اور بتاتے ہیں تاکہ دنیا ان کو مظلوم سمجھے وہ خود غزہ کے لوگوں کے ساتھ جو ظلم کرتے ہیں اسے دنیا والوں کی نظروں میں درست ثابت کرنے کے لیے اس طرح کے جھوٹ بولتے ہیں۔" ویدار نے کہا۔

ویدار سے ملنے اس کی ساس بھی اس کے گھر آئی تھی وہ خاصی پریشان لگ رہی تھی۔

"ویدار تم کیسی ہو، مجھے پتا چلا تو میں فوراً ہی آ گئی ہو۔ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں کہلوایا میں تمہارے پاس اسپتال میں آتی اور وہیں تمہارے ساتھ رک جاتی تمہاری دیکھ بھال کرتی۔" انہوں نے کہا۔

"میں نے آپ کو پریشان کرنا ضروری نہیں سمجھا جو ہونا تھا وہ ہو گیا تھا آپ کو پریشان کرنے سے کیا فائدہ ہوتا آپ کی عمر اتنی محنت کرنے کی نہیں ہے ایمن میرے پاس آ گئی تھی۔" ویدار نے انہیں جواب دیا۔

"کیا محمد الدیف کی کوئی خبر ہے۔" انہوں نے پوچھا۔

"بس اتنا پتا ہے کہ وہ ٹھیک ہیں لیکن کہاں ہیں یہ نہیں معلوم۔" ویدار نے کہا۔

"اللہ اس کی حفاظت کرے۔" الدیف کی ماں نے ہاتھ دعائیہ انداز میں بلند کرتے ہوئے کہا۔

"آمین۔" ویدار اور ایمن نے ایک ساتھ کہا۔

چند روز بعد محمد الدیف گھر آیا تھا۔ وہ سادے کپڑوں میں تھا لیکن وہ بہت میلے اور جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔

"اللہ خیر کرے، تم کہاں تھے کس حال میں تھے۔" ویدار نے پریشانی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بچے کہاں ہیں؟" الدیف نے اس کی بات کا جواب دیے بغیر سوال کیا۔

"وہ اپنے کمرے میں ہیں آج سب یہاں موجود ہیں۔" ویدار نے بتایا۔

"یہ بہت اچھا ہوا؟ میں ایک ہی وقت میں سب سے مل لوں گا۔" الدیف نے بچوں کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے کہا ویدار بھی اس کے پیچھے بڑھی تھی۔

جب الدیف بچوں کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ سب سو رہے تھے اس نے باری باری ہر ایک کے قریب جا کر پیار کیا تھا عمر، سارہ اور پھر بالکل اسی طرح ابو بکر اور رجیان کو بھی ویدار حیران رہ گئی تھی وہ تو

سمجھتی تھی کہ محمد الدیف اپنے بچوں کے سامنے شاید اس کے بچوں کو اہمیت نہ دے وہ تو ان کا سوتیلا باپ تھا لیکن اس وقت والہانہ انداز میں انہیں پیار کرتے دیکھ کر دیدار کو خوشی بھی ہوئی اور حیرت بھی۔

"الدیف..... تم..... تم ان بچوں سے بھی ایسی ہی محبت کرتے ہو؟" اس نے حیرت سے پوچھا تو الدیف اس کی طرف مڑا۔

"کیا اتنے سال میرے ساتھ گزارنے کے بعد بھی تم مجھے نہیں سمجھیں دیدار۔"

"نہیں..... میں..... میں.....!"

"دیدار عمر اور سارہ کی طرح ابو بکر اور ربیان بھی تمہارے ہی بچے ہیں تم سے پیدا ہوئے ہیں اور میں جتنا تمہیں چاہتا ہوں انہیں بھی چاہتا ہوں جتنا عمر اور سارہ کو چاہتا ہوں اتنا ہی ابو بکر اور ربیان کو بھی چاہتا ہوں۔" الدیف نے کہا۔

"آج میرے سارے شکوک دور ہو گئے ہیں الدیف۔" دیدار نے سکون کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"اتنے سال بعد، دیدار کیا تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں تم نہیں جانتی جب میں گھر سے دور ہوتا ہوں تو تم مجھے کتنی یاد آتی ہو اور تمہارے ساتھ ساتھ ان سب بچوں کی بھی مجھے فکر رہتی ہے عمر اور سارہ کی طرح اب ابو بکر اور ربیان بھی میری ذمہ داری ہیں اور یہ ذمہ داری مجھے کسی اور نے نہیں میرے خدا نے دی ہے بالکل اسی طرح جس طرح غزہ کی ذمہ داری دی ہے کہ میں اس کے بے قصور لوگوں پر اسرائیل کے ظلم کا بدلہ لوں اور اپنی سرزمین فلسطین کو ان اسرائیلیوں سے پاک کرنے میں اپنے باقی مجاہدین کا ساتھ دوں۔"

"تم اپنی ذمہ داری بخوبی ادا کر رہے ہو الدیف ہمیں تم پر فخر ہے۔ دیکھو غزہ کے لوگوں نے 2006ء کے انتخابات میں حماس کو منتخب کیا کہ وہ ان کے صحیح نمائندے ہیں انہوں نے اپنے حماس کے مجاہدین کے لیے رزمیہ نغمے ریکارڈ کرائے ہیں جو فلسطین ریڈیو سے نشر ہوتے ہیں اور بچے بچے کی زبان پر ہیں میں نے بھی یہ نغمہ فلسطین ریڈیو پر سن کر ہی یاد کیا ہے۔

اوغزہ کے محافظو..... او محافظو

قصام کے بہادرو..... اور بہادرو

اوغزہ کے.....

"ہاں میں جانتا ہوں۔" الدیف نے کہا۔

"میری طرح تم میں بھی حب الوطنی کا جذبہ ہے اور میری دعا ہے کہ میرے بچے بھی اپنی سرزمین فلسطین کے وفادار ہوں اور دشمن سے اس کی حفاظت کریں۔" الدیف نے کہا تو دیدار نے اثبات میں سر ہلایا۔

اس رات کھانا کھاتے ہوئے الدیف نے دیدار کو ایک اور خبر دی تھی۔

"دیدار مجھے شک ہے کہ اسرائیلی مجھ پر کئی ناکام جان لیوا حملوں کے بعد بہت محتاط ہو گئے ہیں اور میری ہر وقت نگرانی ہو رہی ہے کسی بھی وقت مجھے پھر نشانہ بنایا جا سکتا ہے اور میرے ساتھ تم سب کی جان کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"وہ لوگ اگر میرے پیچھے پیچھے تم لوگوں تک پہنچ گئے تو؟"

"لیکن ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ ہم نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ جب عمر اور سارہ کی پیدائش کے کاغذات بنوائے اور تمہارا نام محمد الدیف ولدیت میں لکھوایا تو لکھنے والا کلرک چونکا تھا اور اس نے مجھ سے حیرت سے پوچھا تھا کہ کیا میں مشہور حماس کمانڈر محمد الدیف کی بیوی ہوں تو میں نے ہنس کر کہا تھا کہ کیوں کیا ایک جیسے نام نہیں ہوتے گویا میں نے یہ بات چھپائی

تھی اس طرح اور موقعوں پر بھی ہمیشہ احتیاط سے کام لیا پھر بھلا کسی کو کیا پتا؟" ویدار نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"تم نہیں جانتیں ویدار ان کی انٹیلی جنس بہت ہوشیار ہے وہ قبر سے بھی مطلوبہ شخص کو نکال لاتے ہیں یونہی تو مجھ پر اتنے جان لیوا حملے صحیح وقت اور صحیح جگہ پر نہیں ہوئے اس کا مطلب یہ کہ وہ لوگ چین سے نہیں بیٹھے ہوئے۔ وہ کام کر رہے ہیں اور ہمیں بھی ان کے انداز میں سوچتے ہوئے پیش قدمی کے طور پر احتیاطی تدابیر کر لینا چاہیے۔" الدیف نے اسے سمجھایا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" ویدار نے پوچھا۔

"میں چاہتا ہوں کہ ہم ایک بار پھر اپنا ٹھکانہ بدل لیں۔"

"لیکن ہم کہاں جائیں گے۔ ہم غزہ میں کہیں بھی ہوں محفوظ تو نہیں ہیں۔" ویدار نے کہا۔

"ہاں لیکن میں اسی لیے ٹھکانے بدلتا رہتا ہوں اور جب مجھے شک ہوتا ہے کہ انہیں میرے نئے ٹھکانے کا علم ہونے والا ہے یا ہو چکا ہے تو میں اس جگہ سے ہٹ جاتا ہوں اسی لیے اب تک وہ مجھے ڈھونڈنے میں ناکام رہے ہیں۔"

"یہ کب تک ہوگا الدیف؟" ویدار نے پوچھا۔

"جب تک ہماری سرزمین آزاد نہیں ہو جاتی یا میں شہید نہیں ہو جاتا۔" الدیف نے پرعزم لہجے میں کہا۔

"پھر اب ہم کہاں جائیں گے؟" ویدار نے سعادت مندی سے پوچھا۔

"میں تمہیں جلد ہی بتاؤں گا لیکن تم ہر وقت تیار رہنا میں کسی بھی وقت یہاں سے روانگی کے لیے کہہ سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" ویدار نے کہا۔

"ویدار کہیں تم روز روز کی اس تنگ کر دینے والی زندگی سے بور تو نہیں ہو گئی ہو؟" الدیف نے اس سے پوچھا۔

"نہیں الدیف۔ تم نے ایسا کیوں سوچا؟ تمہیں پتا ہے جب شادی کے بعد ہمارے چند قریبی رشتہ داروں کو پتا چلا کہ میں جس محمد الدیف کی بیوی ہوں وہی محمد الدیف ہے جو اسرائیلیوں کے لیے Most Wanted ہے تو انہوں نے میرے ماں باپ کو بہت برا بھلا کہا کہ تم نے اپنی بیٹی کے ساتھ اچھا نہیں کیا اس کا ایک شوہر مر چکا ہے اور دو بچے اسے پالنے ہیں اور اب تم نے اس کا ہاتھ ایسے شخص کے ہاتھ میں دے دیا ہے جس کی زندگی کا کوئی پتا نہیں تم نے اس کی موت پر دستخط کیے ہیں اس کے نکاح نامے پر نہیں۔"

"کیا تم بھی ایسا ہی سمجھتی ہو؟" الدیف نے پوچھا۔

"نہیں، میں اور میری ماں اگر ایسا سمجھتی تو میں اس رشتے کے لیے تیار نہ ہوتی اور میری ماں ضد کر کے مجھے مجبور نہ کرتی کہ میں تم سے شادی کروں میری ماں نے ان کو جواب دیا تھا کہ موت اور زندگی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اگر ویدار کی قسمت میں یہی لکھا ہے تو اسے کوئی نہیں بدل سکتا لیکن ایک جہادی کی زندگی ایک قابل تعریف زندگی ہے اور اپنے ملک کے لیے جان دینے والوں کی قدر زمانہ بھی کرتا ہے اور اللہ بھی۔"

"ویدار میں جانتا ہوں کہ میں تمہیں محبت بھری پرسکون زندگی نہیں دے سکا ہوں۔" الدیف نے کہا۔

"نہیں الدیف مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں ہے تم اپنی مصروفیت کے باوجود تم نے میرا بہت خیال رکھا ہے اکیلی ہونے کے باوجود میں اکیلی نہیں ہوتی۔"

"تم بہت شکر گزار بیوی ہو جبھی تم نے مجھ سے کوئی شکوہ نہیں کیا۔"

"شکوہ کیسا الدیف۔ تم میرے ہیرو ہو۔" ویدار

نے کہا۔

"ہاں میں ہیرو ہوں مجھ جیسے ہیرو کا کوئی ایک ٹھکانہ نہیں ہوتا اسے آزادی سے عام لوگوں کی طرح پبلک میں نکلنے کی اجازت نہیں ہوتی وہ اپنی فیملی کے ساتھ انجوائے نہیں کرسکتا اسے اگر کبھی اکیلے بھی سمندر کے کنارے چہل قدمی کا موقع مل جائے تو اسے اپنے پیروں کے نشان مٹا دینا پڑتے ہیں۔" الدیف نے کہا۔

پھر جلد ہی الدیف نے ویدار کی رہائش کا نیا انتظام کردیا تھا اور ایک بار پھر وہ غزہ کے کم آبادی والے علاقے میں منتقل ہوگئی تھی اس انتظام سے فارغ ہونے کے بعد ایک بار پھر اپنے کاموں میں مصروف ہوگیا تھا۔

2014ء میں فروری کے مہینے میں اللہ تعالیٰ نے ویدار کی پھر ایک خوب صورت بیٹا عطا کیا تھا جو بالکل عمر پر گیا تھا ویدار محمد الدیف کے دو بیٹوں اور ایک بیٹی کی ماں بن چکی تھی الدیف بہت خوش تھا اس بار جب اس نے گھر بدلا سینٹرل غزہ کے قریب جبالیہ رفیوجی کیمپ کے نزدیک ایک 6 منزلہ بلڈنگ میں ایک فلیٹ کا انتخاب کیا تھا یہ جگہ الدیف کی ان سرنگوں سے قریب تھی جہاں سے چھپ کر وہ اور اس کے جہادی اسرائیلی حملوں کا جواب دیتے تھے۔

اس بار ویدار کے ساتھ اس کی بیٹی سارہ اور بیٹا علی وہاں آئے تھے اس کا بڑا بیٹا عمر اپنے والد سے اجازت لے کر ویدار کی ماں کے گھر ہی ٹھہر گیا تھا اس کی دوستی ابوبکر اور بنیان سے بہت زیادہ تھی اور ان کے ساتھ بہت خوش رہتا تھا۔

یہاں رہائش کے دوران ویدار کو خیال آیا کہ وہ بہت سی باتیں الدیف سے کر ہی نہیں سکتی وہ کافی کافی دن کے بعد اس کے پاس آتا تھا اور ہمیشہ جلدی میں رہتا تھا اس نے سوچا کہ ایک ڈائری میں وہ سب لکھ دے جو وہ الدیف سے کہنا چاہتی ہے اور پھر اس نے ایسا ہی کیا الدیف کے بارے میں اپنے جذبات لکھنے بیٹھ گئی۔

"میرے دل کے کمانڈر میرے پیارے، تم نے اسرائیل کو پاگل کردیا ہے تمہاری بہادری کے کارنامے دیکھ دیکھ کر وہ اپنے ہوش کھو چکے ہیں اور پاگل کتوں کی طرح تمہاری بو سونگھتے پھر رہے ہیں، خدا کرے تم خیریت سے رہو اور کبھی میری یہ تحریر بھی تمہاری نظروں سے گزر جائے تمہیں میرے دل کا حال معلوم ہوجائے تمام غزہ کے لوگ تمہارا چہرہ دیکھنے کے خواہش مند ہیں وہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ان کا محسن کیسا ہے جو ان کے لیے اسرائیلیوں سے برسر پیکار ہے میرے ہیرو، تم مجھ سے دور ہو لوگ تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتے لیکن اس دنیا میں صرف اور صرف میں ہوں جو تمہارے بارے میں چھوٹی سے چھوٹی تفصیل جانتی ہوں۔ میں جانتی ہوں تمہاری آنکھوں کا رنگ کیسا ہے گہرے سمندر کی طرح نیلا، جن میں، میں ڈوب جاتی ہوں تمہارے چہرے کے خدوخال کیسے ہیں جن کی میں دیوانی ہوں۔ تم کیسے ہو تمہارا رنگ، تمہارا قد، تمہارے انداز، تمہاری عادتیں تمہاری پسند ناپسند میں سب جانتی ہوں۔ مجھے پتا ہے کہ تم چائے میں کتنی چینی پیتے ہو تمہیں کھانے میں کیا پسند ہے تم اپنے بچوں سے کتنی محبت کرتے ہو میں کبھی یہ باتیں تم سے کھل کر نہیں کرسکتی تم میری روح ہو میری آنکھوں کا تل ہو تم قوم کے وہ بہادر ہو جس نے اپنے الٹے ہاتھ کی انگلی میں میرے نام کی انگوٹھی پہنی ہوئی ہے۔ میں تم سے جب جب ملی میں نے وہ لمحے کسی خزانے کی طرح اپنی یادوں میں محفوظ کرلیے ہیں میں تمہارے ساتھ اپنی

زندگی کے خوشگوار ترین دن گزارے ہیں۔"

الدیف حقیقی ستارے آسمان سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ زمین پر بنی غزہ کی سرنگوں سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ایک دن آئے گا جب انہیں روشنی ملے گی اور آخر کار دنیا کے لوگ ان کی چمک کی خوب صورت کی جھلک دیکھیں گے مجھے یاد ہے الدیف تم سے میری شادی کے بعد میری ماں بہت خوش ہوئی تھی اور اس نے کہا تھا کہ ویدار ان لوگوں میں سے ہے جو دھنک کے آخری سرے پر پہنچ کر سونے کا برتن پالیتے ہیں۔ واقعی میرے معاملے میں ایسا ہی ہوا تھا میں بہت خوش قسمت تھی کہ تم سے میری شادی ہوئی۔

میں نے ہمیشہ تمہیں خوش رکھنے کی کوشش کی ہے الدیف میں نے سوچ لیا تھا کہ تمہاری خوشی تمہارے کپڑوں تمہاری خوراک اور تمہارے آرام میں پوشیدہ ہے چنانچہ میں ہمیشہ ان چیزوں کا خیال رکھتی ہوں تمہیں میرے ہاتھ کے بنائے ہوئے روایتی کھانے بہت پسند ہیں اسی لیے تو ہر بار جب تم گھر آتے ہو تو میں تمہارے لیے یہ روایتی کھانے بناتی ہوں۔

مجھے یاد ہے میری شادی کے شروع کے دنوں میں تمہارے چہرے پر میرے لیے کتنے اچھے تاثرات ہوتے تھے تم نے مجھ میں اعتماد پیدا کیا تم کہتے ہو ویدار ممکن ہے میرے دن جو تمہارے ساتھ گزارے ہیں وہ کم ہوں اور میں کسی لڑائی میں مارا جاؤں اور یہ بھی ممکن ہے کہ میں کسی ایسے جرنیل جیسی لمبی زندگی پاؤں کہ جس نے اپنی زندگی میں بہت سے معرکے لڑے ہوں اور فتح کیے ہو لیکن وہ بستر پر اپنی طبعی موت مرا ہو لیکن میری خواہش ہے کہ میری موت ایک شہید کی طرح ہو اور تمہاری اس بات پر میں ہمیشہ یہی کہتی ہوں الدیف کہ تمہاری ویداری کی عمر بھی تمہیں لگ جائے۔ تم سے شادی کے بعد میری زندگی ہی بدل گئی الدیف میں بلبل کی طرح چہکنے لگی مجھے تمہاری اور اپنی عمروں کی بھی پروا نہیں تھی جب تم گھر نہیں ہوتے تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے تم مجھے کوئی پیغام بھیجو گے اور کہو گے کہ میں تمہاری منتخب کی ہوئی جگہ پر تم سے ملوں پھر میں تمہیں وہاں پا کر حیران رہ جاؤں گی تم مجھ سے ملنے آؤ گے مگر یہ سب بچکانہ خواہش تھیں بھلا تمہارے پاس اتنا وقت اور آزادی کہاں ہے لیکن میرا تم سے وعدہ ہے کہ اگر وقت پڑا تو میں تمہارے لیے اپنی جان بھی قربان کردوں گی۔

میں اکثر خود سے پوچھتی ہوں کہ تم نے اپنے احساسات پر کیسے کنٹرول کیا ہوا ہے تم کسی سے نفرت یا حسد کا اظہار کیوں نہیں کرتے تو دوسروں کے دکھ سننے کا وقت کیسے نکال لیتے ہو جیسے تم نے مجھے موقع دیا کہ میں تمہیں اپنے پہلے شوہر اور اس کے بچوں کے بارے میں بتاؤں اور مجھ پر پچھلی زندگی میں کیا گزری یہ بھی بتاؤں بعض اوقات مجھے حیرت ہوتی ہے کہ جو شخص جنگ کے میدان میں اسرائیلیوں کے چھکے چھڑا دیتا ہے وہ ذاتی زندگی میں اتنا حساس بھی ہوسکتا ہے۔ تم جو ایک کمانڈر ہو اور سمندروں، ہواؤں اور زمین پر جنگ لڑتے ہو اپنے بچوں کے درمیان بالکل بچوں کی طرح خوش رہتے ہو اور کھیلتے ہو اور ان کا کتنا خیال رکھتے ہو۔

ہمیں اب تک موقع نہیں ملا ہے کہ ہم پوری فیملی کی ایک ساتھ تصویر بنوا سکیں بس چند ہی تصویریں ہیں جو اسرائیلی دکھا دکھا کر لوگوں سے تمہارے بارے میں پوچھتے رہتے ہیں ان تصویروں میں ہم لوگ نہیں ہیں، میں تمہارے ساتھ رہتے ہوئے جدید زندگی کی سہولتوں سے محروم ہوں لیکن میں کبھی پریشان نہیں ہوئی نہ موبائل فون نہ فیس بک یا نیٹ کسی بھی چیز کی مجھے کمی نہیں محسوس ہوئی جن پر تمہاری وجہ سے سیکیورٹی لگی ہے میں نے تم سے انسانیت،

صبر، قربانی اور مضبوطی کا سبق سیکھا ہے۔"

دیدار ابھی اتنا ہی لکھ پائی تھی کہ فضا اچانک میزائیلوں کے دھماکوں سے گونجنے لگی وہ اچانک چونک اٹھی تھی۔ کافی رات گزر گئی تھی اور اسے احساس ہی نہیں ہوا تھا وہ دوڑتی ہوئی بچوں کے کمرے کی طرف گئی تھی وہ سارے جاگ گئے تھے وہ ان کے قریب آ گئی اور انہیں سینے سے لگا لیا کہ کہیں وہ ڈر نہ جائیں لیکن یہ دھماکے ان کے لیے نہیں تھے وہ پیدا ہونے کے بعد سے یہ سنتے آئے تھے اس وقت ان کی عمر تین سال اور سات ماہ تھی۔

"کیا بات ہے؟" سارہ نے ماں سے پوچھا۔

"کچھ نہیں بیٹا آؤ میں تمہارے پاس بیٹھ جاتی ہوں۔" دیدار نے کہا اور بچوں کے پاس ہی بیٹھ گئی وہ ان کا دھیان ہٹانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن یہ نا ممکن تھا پھر کئی گھنٹے یونہی گزر گئے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی وہ حیران رہ گئی کہ اس وقت کون ہو سکتا ہے۔ اس کا دھیان محمد الدیف کی طرف بھی گیا تھا کہ شاید وہ آیا ہو لیکن جب اس نے دروازہ کھولا تو سامنے ایمن کھڑی تھی اس کے ساتھ اس کا بھائی ابراہیم بھی تھا۔

"خیریت۔" دیدار نے انہیں گھر میں بلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں جیسے ہی پتا چلا کہ اس علاقے میں حملہ ہوا ہے تو ہم تمہاری خیریت لینے چلے آئے ویسے ابوبکر، عمر اور بنیان تمہیں بہت یاد کر رہے ہیں۔"

"اوہ میرے بچے، چلو میں ابھی چلتی ہوں۔" دیدار نے کہا اور فوراً جانے کے لیے تیار ہو گئی پھر وہ عمر اور سارہ کو بھی ساتھ لے کر اپنی ماں کے گھر چلی گئی تھی۔

"کہاں ہیں میرے بچے۔" اس نے پوچھا اور اسی لمحے ابوبکر اور بنیان دوڑتے ہوئے آ کر اس سے چمٹ گئے عمر بھی ان کے ساتھ تھا۔

"امی آپ کہاں چلی جاتی ہیں۔" بنیان نے کہا۔ "میں آپ کو یاد کر رہی تھی۔" وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

"پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔" دیدار نے سوچا اور سوالیہ نظروں سے ایمن کی طرف دیکھا۔

"دراصل حملے کی خبر سے یہ پریشان تھی۔" ایمن نے کہا۔

"بنیان بہت رو رہی تھی اسے ڈر تھا کہ کہیں اس کے ابو کی طرح تم بھی اس سے نہ بچھڑ جاؤ۔"

"نہیں میرے بچوں میں تمہارے ساتھ ہوں دیدار نے بچوں کو تسلی دلائی پھر رات کو وہ وہیں رک گئی تھی لیکن صبح ہوتے ہی اس نے بچوں کو سمجھایا تھا۔

"دیکھو ابوبکر آپ بڑے ہو گھر میں کوئی نہیں ہے میں یہاں آ گئی ہوں اگر آپ کے ابو آئے تو وہ پریشان ہوں گے کہ میں کہاں چلی گئی ہوں اس لیے میں گھر جا رہی ہوں پھر آؤں گی۔"

"جی ٹھیک ہے۔" ابوبکر نے کہا پھر دیدار علی اور سارہ کے ساتھ واپس اپنے فلیٹ آ گئی تھی یہ واقعہ 18 اگست کو پیش آیا تھا اور پھر 20 اگست کو اسرائیل نے ایک اور حملہ کیا تھا یہ حملہ دراصل اس نے غزہ میں واقع "الدایل" کیمپ کے سرنگوں کے نیٹ ورک پر کیا تھا لیکن اس میں قریبی عمارتیں بھی متاثر ہوئی تھیں اور ایسی عمارتوں میں سے ایک میں دیدار بھی تھی جو اپنے دونوں بچوں علی اور سارہ کے ساتھ ان کے کمرے میں تھی مگر وہ کمرہ اب کمرہ نہیں رہا تھا ساری بلڈنگ زمین بوس ہو گئی تھی اور اس کے ملبے میں کہیں دیدار بھی سسک رہی تھی وہ جس حصے میں تھی وہاں تاریکی تھی اور بلڈنگ کی چھت کے ملبے تلے وہ دبی ہوئی تھی اسے پتا نہیں تھا کہ اس کے بچے کہاں تھے اس کی ڈائری اور قلم اس کے قریب ہی پڑے ہوتے تھے۔ اس کے خط کا

آخری حصہ کھلا ہوا تھا جو اس نے کچھ ہی دیر پہلے بلڈنگ پر حملہ ہونے کے بعد لکھا تھا۔ جب بلڈنگ بم کے دھماکے کو دور سے کاٹ رہی تھی اور اس کے بچے اس سے چمٹے ہوئے تھے وہ الدیف کو نہیں بھولی تھی وہ اسے اپنا آخری پیغام دینا چاہتی تھی۔

"الدیف مجھے معلوم ہے کہ تم بہت جلدی میں ہو وقت تمہیں اجازت نہیں دے رہا۔ اندھیرے تمہارا پیچھا کر رہے ہیں خدا تمہارا حامی و ناصر ہو تم سکون سے رہو تم ہمارے دشمن اسرائیل کو ضرور شکست دو گے۔ میں جانتی ہوں کہ کوئی نہیں جان سکے گا کہ آج کے حملے میں حماس کے کمانڈر کی بیوی اور دو بچے بھی شہید ہوئے ہیں لیکن تم تو جانتے ہو نا کہ ہم تمہارے گم نام سپاہی ہیں میرا عمر تمہارے ساتھ رہے گا وہ تمہاری امانت ہے وہ تم جیسا بنے گا اور میرے بچے ابو بکر اور بیٹیاں ہمیشہ پھول جمع کریں گے کسی گمنام قبر پر چڑھانے کے لیے لیکن وہ اللہ سے ہمارے لیے دعا ضرور کریں گے۔

"مجھے یقین ہے تم ہمیں نہ پا کر افسردہ ضرور ہو گے میں تمہارے آنسوؤں کو دیکھ سکتی ہوں لیکن عمر تمہارے گالوں پر بہنے آنسو پونچھ دے گا۔ الدیف تم اپنی بندوق کا ٹرائیگر دشمن کے خلاف دبا دینا تمہارے آنسوؤں کو تمہاری کمزوری نہیں بلکہ طاقت بننا چاہیے۔ اس کے لیے تمہیں عزم پیدا کرنا ہوگا اور اپنے انتقام کے شعلوں سے دشمن کو جلا دینا اگست کے اس مہینے کو قصور وار نہ کہنا جس میں تمہارے دشمن نے تمہاری آنکھ کے تاروں کو ہٹ کیا ہے تم جانتے ہو کہ مجھے اگست کے مہینے سے پیار ہے کیونکہ یہ وہ مہینہ ہے جس میں تم جیسا بہادر شخص پیدا ہوا ہے جو اپنے خدا سے کیے ہوئے وعدے کے مطابق اپنی ٹیم کی رہنمائی کر رہا ہے خدا تمہارا حامی و ناصر ہو۔

اوغزہ کے محافظو...... او محافظو
قصام کے بہادرو...... او بہادرو
قرآن پر ایمان ہے تلوار تمہاری شان ہے
الدیف تمہاری جان ہے تم اس پر قربان
اوغزہ کے محافظو...... او محافظو
قصام کے بہادرو...... او بہادرو

حملے کے تیسرے روز بلڈنگ کے ملبے سے ستائیس سالہ ویدار، سات ماہ کے علی اور تین سالہ سارہ کی لاشیں ملی تھیں جن کے ساتھ ہی ویدار کی ڈائری بھی ملی تھی جس میں اس نے اپنے محبوب شوہر کے لیے خط لکھا تھا الدیف اس حملے میں بچ نکلا تھا یہ اسرائیل کی چھٹی کوشش تھی جو اس نے الدیف کو مارنے کے لیے کی تھی الدیف کی بیوی ویدار اور اس کے بچوں کو جبالیہ رفیوجی کیمپ میں اگلے روز ہی دفنا دیا گیا تھا ان کے سامان سے ڈائری مل گئی تھی جس میں موجود خط کو پڑھ لیا گیا تھا اور پھر ریڈیو فلسطین پر بھی نشر کر دیا گیا تھا لوگوں کو جب یہ علم ہوا تھا کہ ان کے محبوب کمانڈر کی بیوی اور بچے اس حملے میں مارے گئے ہیں تو غزہ کے شہری بے تحاشہ روئے تھے اور ان کی تدفین کے موقع پر ہزاروں کی تعداد میں موجود تھے جن کی کراہوں اور رونے کی آواز سے فضا گونج رہی تھی اور اپنی گمنام شہید سپاہی کو سلام پیش کر رہے تھے۔

(اسرائیل نے اپریل 2015ء میں سرکاری طور پر اعلان جاری کیا تھا جس میں لکھا تھا کہ الدیف اس حملے میں بچ گیا ہے اور اب بھی غزہ کی سرنگوں میں اپنی جہادی بریگیڈ کے ساتھ موجود ہے اور اپنی زمین کے لیے جہاد میں مصروف ہے)

تکمیل تمنا

راوی: وسیم قریشی
تحریر: حسام بٹ

یہ دنیا ایک گورکھ دھندا ہے' نہ سمجھ میں آنے والا کھیل اور ہم اس کھیل کے کھلاڑی ہیں جو ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے اپنی خواہشات کی تکمیل کی خاطر اپنے ہی جیسے انسان کو نوچنے میں مصروف ہیں' انجام سے بے خبر' اللہ کی ناراضگی اور رضا کو خاطر میں لائے بغیر......

ایک گل لالہ کا فسانہ' اس نے محض دولت کی خاطر اپنے جوان بچوں کی موجودگی میں دوسری شادی کر لی تھی۔

معروف آسٹرولوجسٹ کے قلم سے ایک بے چین آتما کی روداد۔

وہ اپنی پہلی بیوی سے بہت ڈرتا تھا اور دوسری بیوی کو ڈراتا تھا۔ یہ بات مجھے اس کی دوسری بیوی نورین نے بتائی تھی۔ نورین ایک دل کش اور حسین عورت تھی لیکن وہ جن حالات کا شکار تھی اس نے نورین کی ساری رعنائی اور دل کشی کو گہنا کر رکھ دیا تھا۔

گزشتہ رات میں سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ میرے گھریلو فون کی گھنٹی بج اٹھی میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا اور ماؤتھ پیس میں کہا۔

"ہیلو......"

"قریشی صاحب! السلام علیکم!" دوسری جانب میرے ایک دوست اظہر تھے۔

"وعلیکم السلام!" میں نے جواباً کہا۔ "اللہ کا کرم ہے میں ٹھیک ہوں آپ سنائیں۔"

"میں بھی خیر و عافیت سے ہوں۔" انہوں نے بتایا پھر کہا۔ "میں اپنی کلائنٹ آپ کو ریفر کر رہا ہوں، آپ ذرا ان کے مسئلے کو دیکھ لیجیے گا۔"

اظہر جوکھیو سے میرے بہت پرانے مراسم ہیں، پیشے کے اعتبار سے جوکھیو صاحب ٹیرو کارڈ ریڈر ہیں اور اپنے فن میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ آسٹرولوجی اور پامسٹری کی طرح ٹیرو کارڈ ریڈنگ بھی ایک دل چسپ علم ہے۔ ٹیرو کارڈ کا ماہر اپنی ذہنی اور روحانی طاقت کو بیک وقت استعمال کر کے مسائل کے ماضی، حال اور مستقبل کا احوال بیان کرتا ہے۔ اگر آپ نے کسی ٹیرو کارڈ ریڈر کو اس فن کا مظاہرہ کرتے دیکھا ہو تو آپ کو یقیناً یہ علم ہوگا کہ اس کے ہاتھ میں موجود کارڈز پر مختلف تصاویر بنی ہوتی ہیں۔ ہر تصویر اپنے اندر کئی کہانیاں سمیٹے ہوتی ہے اور انہی کہانیوں میں سے اچھوتے اشاروں کو پکڑ کر ٹیرو کارڈ کا ماہر پیش گوئی کرتا ہے۔

"ضرور دیکھ لوں گا جناب!" میں نے اظہر جوکھیو سے کہا پھر پوچھا۔ "اظہر بھائی! آپ کی کلائنٹ کا ایشو کیا ہے؟"

"میاں بیوی کا معاملہ ہے۔" انہوں نے بتایا۔ "کوئی تیسرا ان کے بیچ میں آ گیا ہے۔"

"تیسرا یا تیسری؟" میں قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔

"تیسری۔" ہلکے سے قہقہے کے ساتھ اظہر صاحب نے جواب دیا۔ "دراصل وہ مجھ سے دو تین بار ریڈنگ کروا چکی ہیں اور میں نے محسوس کیا ہے کہ پوری طرح مطمئن نہیں ہیں۔ چند روز پہلے خود ہی انہوں نے مجھ سے کہا کہ کسی اور ماہر کے بارے میں بتائیں۔ میں سیکنڈ اوپینین لینا چاہتی ہوں۔ آپ کو تو پتا ہی ہے کہ مارکیٹ میں کیسے کیسے لٹیرے بیٹھے ہوئے ہیں جو بندش اور کالے پیلے کا خوف دلا کر ہزاروں لاکھوں بٹور لیتے ہیں۔"

"جی میں ان سب کو اچھی طرح جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "بعض نگینہ فروش تو باقاعدہ ان نجومیوں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں اور چار پانچ سو والا پتھر پندرہ بیس ہزار میں فروخت کر دیتے ہیں۔"

"بس جناب! اللہ رحم کرے۔" انہوں نے کہا۔ "اسی لیے میں نے ان خاتون کو آپ کا بتایا ہے، وہ کل آفس میں آ کر آپ سے ملیں گی۔ آپ خصوصی توجہ دیجیے گا۔"

"جی آپ فکر نہ کریں۔" میں نے کہا۔ "صرف یہ بتا دیں کہ وہ آپ سے مطمئن کیوں نہیں ہیں؟"

"میری جو ریڈنگ ہے وہ ان کی توقعات اور خواہش کے عین مطابق نہیں ہے۔" اظہر جوکھیو نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں انہیں جھوٹے خواب نہیں دکھا سکتا، آپ میری بات سمجھ گئے ہوں گے۔"

"بالکل سمجھ گیا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اس وقت جو اُن کی ذہنی کیفیت ہے اگر وہ کسی عامل کامل بابا کے پاس پہنچ گئیں تو بُری طرح ٹھگ لی جائیں گی۔" انہوں نے کہا۔ کوئی بھی "پہنچا ہوا" بابا انہیں اپنے مقصد میں کامیابی کا یقین دلا کر لاکھوں بھی لوٹ سکتا ہے کیوں کہ پارٹی پیسے والی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ ان کے ساتھ کوئی فراڈ ہو مجھے ان خاتون سے ہمدردی ہے۔"

"میں آپ کی ہمدردی اور خلوص کو سمجھ رہا ہوں سائیں!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ صبح انہیں بھیج دیں میں ان کی تسلی کر دوں گا۔"

اظہر جوکھیو نے میرا شکریہ ادا کیا اور ہمارے بیچ ٹیلی فونک سلسلہ موقوف ہو گیا۔

اور اب نورین میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی' جی میں انہی خاتون کی بات کر رہا ہوں جو اظہر صاحب کی باقاعدہ کلائنٹ تھیں اور رائے ثانی کے لیے میرے پاس آئی تھیں۔

"قریشی صاحب! اظہر بھائی نے آپ کی بہت تعریف کی ہے۔" نورین نے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ آپ میرا مسئلہ حل کر دیں گے۔"

"تعریف کے قابل تو وہی ذات ہے جو آپ کا' میرا' اظہر جوکھیو کا اور کُل جہان کا خالق اور مالک ہے۔" میں نے بڑے رسان سے کہا۔ "اور جہاں تک مسائل کو حل کرنے کا معاملہ ہے تو یہ بھی اسی ذات کی مرضی کے بغیر ممکن نہیں۔"

"بے شک۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

"ہاں...... اس مالک کائنات نے مجھے جو علم عطا کر رکھا ہے میں اس کی روشنی میں پوری دیانت داری سے آپ کی راہ نمائی کروں گا۔" میں نے کہا۔

"میں بھی یہی چاہتی ہوں۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "باقی جو اللہ کو منظور۔" میں نے رف پیڈ اور قلم سنبھال لیا اور سوالیہ نظروں سے نورین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کا مسئلہ کیا ہے؟"

"میں فاروق کی دوسری بیوی ہوں۔" اس نے بتایا۔ "ہماری شادی کو دو سال ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک فاروق نے اس شادی کو باقاعدہ اناؤنس نہیں کیا بس میں یہی جاننا چاہتی ہوں کہ میری زندگی میں بہار کب آئے گی؟"

"فاروق صاحب کیا کرتے ہیں؟" میں نے ایک ضمنی سوال کیا۔

جوکھیو صاحب رات مجھے بتا چکے تھے کہ پارٹی پیسے والی ہے اور ان میں اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ رہا تھا۔ نورین ادھیڑ عمر کی عورت تھی تاہم معاشی آسودگی نے اس عمر کے فکر پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ وہ تیس سے زیادہ کی نظر نہیں آتی تھی۔ قیمتی پہناوے کے علاوہ کم از کم آدھا کلو سونے کے زیورات بھی اس کے بدن پر سجے دکھائی دیتے تھے جن میں زیادہ تر جیولری پلاٹینم یعنی وائٹ گولڈ کی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ میں تین چار قیمتی پتھروں سے مزین انگوٹھیاں بھی پہن رکھی تھیں۔

"فاروق کا امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار ہے۔" اس نے بتایا۔ "یہ بزنس پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے' فاروق مہینے میں ایک دوبار بیرون ملک بھی جاتے ہیں۔ ان کے بزنس کا نیٹ ورک یورپ' افریقہ اور جنوبی ایشیا کے تمام قابل ذکر ممالک میں موجود ہے۔"

"اوکے۔" میں نے اثبات میں گردن ہلائی پھر پوچھا۔ "آپ نے یہ شادی چھپ کر کی تھی یا علی الاعلان کی تھی؟"

"یہ شادی چھپ کر ہوئی تھی۔" اس نے جواب دیا۔ "لیکن فاروق کے چند دوست نکاح کے وقت

موجود تھے اور فاروق نے مجھے یقین دلایا تھا کہ چند روز بعد وہ اس شادی کا اعلان کر دے گا مگر دو سال گزر نے کے باوجود بھی میری شادی معاشرے کی نگاہوں سے اوجھل ہے۔" اس کی آواز بھرآ گئی۔" حالانکہ میں نے اس شادی کے لیے بہت بڑی قربانی دی ہے مگر...... اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں نے غلطی کر دی۔"

"آپ نے کسی قربانی کا ذکر کیا ہے۔" میں نے کہا۔" کیا میں اس قربانی کی تفصیل جان سکتا ہوں؟"

"جی ضرور...." وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔" جیسے میں فاروق کی دوسری بیوی ہوں ویسے ہی وہ بھی میرا دوسرا شوہر ہے۔ میں نے اپنے شوہر سے طلاق لے کر فاروق سے شادی کی تھی لیکن میرے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔" اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔" فاروق نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ پہلے سلمٰی کو طلاق دے گا اس کے بعد مجھ سے شادی کرے گا لیکن ایسا ہوا نہیں سلمٰی آج بھی اس کے گھر میں راج کر رہی ہے اور میں دربدر ہوں۔"

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔" جب آپ لوگوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ پہلے فاروق اپنی بیوی سلمٰی کو طلاق دے گا اس کے بعد آپ کا اس سے نکاح ہوگا تو پھر آپ نے اپنی تسلی کرنے سے پہلے کیسے شادی کر لی؟"

"یہی تو دھوکا کیا ہے فاروق نے میرے ساتھ۔" وہ بُرا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔" میں نے بڑی مشکل سے وحید سے طلاق لی' چند روز بعد فاروق نے مجھے بتایا کہ اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے' میں نے کہا میں تمہاری بات کا کیسے یقین کر لوں؟ اس نے کہا میری بات کا یقین مت کرو' یہ دیکھو پھر اس نے مجھے طلاق نامہ دکھایا جس کی رو سے وہ سلمٰی کو طلاق دے چکا تھا۔ میں مطمئن ہو گئی اور اس سے شادی کر لی لیکن بعد میں پتا چلا کہ فاروق نے مجھ سے شادی کرنے کے لیے وہ جعلی طلاق نامہ تیار کرایا تھا۔ میں نے پوچھا تم نے ایسا کیوں کیا؟ وہ بولا اس کے بغیر تم مجھ سے شادی کے لیے تیار نہ ہوتیں اور میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یقین کرو میں تمہاری محبت میں پاگل ہو چکا ہوں۔"

"ٹھیک ہے' میں پچویشن کو سمجھ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔" لیکن آپ کو جب فاروق نے طلاق نامہ دکھایا تھا تو آپ اس بات پر اصرار کر سکتی تھیں کہ جب سلمٰی اس کی زندگی میں نہیں رہی تو پھر چھپ کر نکاح کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ شادی کھلم کھلا ہونا چاہیے۔"

"جی میں نے یہ بات فاروق سے کی تھی۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"پھر اس نے کیا کہا؟" میں نے پوچھا۔

"سلمٰی تو اب میری زندگی میں نہیں رہی لیکن اس کی اولادوں کی وجہ سے خاصی پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں۔" نورین نے فاروق کے جواب سے مجھے مطلع کرتے ہوئے بتایا۔" وہ لوگ بہت غصے میں ہیں اور صبح و شام مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ ہوتی ہے۔ اگر میں نے فوری طور پر دوسری شادی کا اعلان کر دیا تو یہ جلتی پر تیل ڈالنے کے مترادف ہوگا۔ وہ سب اور ان کی اولادیں بھی میرے دشمن بن جائیں گے' صرف میرا ہی نہیں وہ لوگ تمہارا جینا بھی حرام کر دیں گے اور تمہیں پتا ہے۔ میرے بزنس میں داماد بھی شامل ہیں' ایک طرف ہماری زندگی عذاب بنے گی تو دوسری جانب بزنس کا بھی بیڑا غرق ہو جائے گا۔" اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

"جو صورت حال تھی اس میں فاروق مجھے سچا اور

کھر انظر آیا اور اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ جیسے ہی اس ہنگامے کی گرد بیٹھے گی وہ پوری شان و شوکت کے ساتھ مجھے اپنے گھر لے جائے گا اور اپنی بیوی کی حیثیت سے سب سے میرا تعارف کرائے گا۔ میں نے فاروق کی بات کا یقین کرتے ہوئے اس سے شادی کر لی تھی۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "اور اب آپ یہ معلوم کرنا چاہتی ہیں کہ فاروق کب آپ کو اپنی بیوی کی حیثیت سے منظر عام پر لائے گا؟"

"جی بالکل۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "اور مجھے یہ بھی جاننا ہے کہ میری آئندہ زندگی کیسی گزرے گی؟"

"آپ مجھے اپنا اور فاروق کا ڈیٹا دیں۔" میں نے کہا۔ "اور اگر ممکن ہو تو سلمیٰ اور وحید کا بھی۔"

"ڈیٹا سے آپ کی کیا مراد ہے؟" اس نے پوچھا۔

"تاریخ پیدائش' پیدائش کا وقت اور پیدائش کی جگہ۔" میں جواب دیا۔

"پیدائش کی جگہ تو ہم چاروں کا کراچی ہے۔" اس نے بتایا۔ "میں اپنی اور فاروق کی جائے پیدائش اور وقت پیدائش سے تو اچھی طرح واقف ہوں لیکن وحید اور سلمیٰ کی صرف تاریخ پیدائش ہی مہیا کر سکوں گی۔"

"کام چل جائے گا" میں نے کہا۔ "لیکن شرط یہ ہے کہ ڈیٹا بالکل درست ہونا چاہیے۔"

"اس سلسلے میں آپ فکر نہ کریں۔" وہ پرشوق لہجے میں بولی۔ "ہمارے یہاں خاندان کے ہر بچے کی تاریخ پیدائش بالکل درست ہے۔"

"گڈ......" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔

نورین نے مجھے مطلوبہ ڈیٹا فراہم کر دیا تو میں زائچے بنانے کے لیے اپنے کمپیوٹر کے ساتھ مصروف ہو گیا۔

جب تک میں دوبارہ آپ کو اپنی اور نورین کی میٹنگ کا احوال سناتا آپ اس کیس کے پس منظر سے معلومات حاصل کریں تاکہ کہانی پڑھنے کے دوران میں آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔ ان میں سے بہت سی باتیں تو پہلی ملاقات میں نورین نے مجھے بتادی تھیں اور باقی بعد میں رفتہ رفتہ میرے علم میں آتی رہیں۔ میں نے اس میں سے غیر ضروری باتوں کو حذف کر دیا ہے اور صرف خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

❁......❁......❁

فاروق پاکستان کا ایک معروف اور کامیاب بزنس مین تھا۔ اس کا کاروبار اندرون ملک کے علاوہ بیرون ملک بھی تقریباً آدھی دنیا میں پھیلا ہوا تھا۔ عزت' دولت' شہرت الغرض سب کچھ اس کے پاس تھا لیکن اس کی زندگی میں سکون کا فقدان تھا۔ یہ قدرت کا اپنا ایک نظام ہے وہ کسی کو سب کچھ ایک ساتھ عطا نہیں کرتا اور کائنات میں طاقت کے توازن کو برقرار رکھنے کے لیے وہ ہر انسان کو کسی نہ کسی محرومی میں ضرور مبتلا رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کسی فارمولے کے تحت یہ سسٹم چلا رہا ہے اس بارے میں لب کشائی کر کے میں کسی نئی بحث کا دروازہ نہیں کھولنا چاہتا کیوں کہ قارئین کی اکثریت کے ذہن اور نئے افق کا پلیٹ فارم اس بحث کے مابعد اثرات کا متحمل نہیں ہو سکتا لہٰذا میں یہاں پر اپنا ایک سادہ سا تجربہ بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

"ت" پر ختم ہونے والی چھ چیزیں (عزت' دولت' شہرت' طاقت' صحت اور عورت) کسی بھی انسان کو ایک ساتھ عطا نہیں ہوتیں اگر کسی کو ان میں سے چار بھی میسر ہیں تو وہ دنیا کا خوش قسمت ترین شخص ہے باقی کا حساب آپ خود لگالیں۔

فاروق کی پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں تھا کہ اچانک اسے اپنے ایک ملازم کی بیوی سے محبت ہوگئی اس ملازم کا نام تھا وحید یعنی نورین کا پہلا شوہر۔

وحید فاروق کی کمپنی میں ایک اچھی پوسٹ پر فائز تھا اور دو لاکھ سے اوپر اس کی تنخواہ تھی۔ زندگی امن و سکون کا گہوارہ تھا' ان کی دو اولادیں تھیں ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ بیٹا بڑا تھا جو اس وقت ایم بی اے کے فائنل اسٹیج پر تھا' بیٹی اگرچہ بیٹے سے دو تین سال چھوٹی تھی تاہم اس کی شادی ہوچکی تھی۔ بیٹی یعنی نازیہ اپنے گھر میں خوش تھی اور بیٹا جنید تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد شادی کا ارادہ رکھتا تھا' بیٹے کی شادی میں ابھی وقت باقی تھا کہ ماں نے خفیہ شادی رچالی۔

نورین اکثر و بیشتر اپنے شوہر سے ملنے آفس آیا کرتی تھی اور یہیں پر فاروق کی اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ فاروق کو وہ پہلی ہی نظر میں بہت اچھی لگی ان کے درمیان خوش اخلاقی سے شروع ہونے والی گفتگو رفتہ رفتہ کوئی اور رخ اختیار کرنے لگی۔ کچھ ہی عرصے کے بعد ایک روز تنہائی میں موقع پا کر فاروق نے اپنی محبت کا اظہار کردیا۔

"میں آپ کو محبت کرنے سے نہیں روک سکتی۔" نورین نے بے حد محتاط لہجے میں کہا۔ "لیکن آپ کو پتا ہے میں ایک شادی شدہ عورت ہوں' میری اولادیں جوان ہیں اگر کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔"

"اونچ نیچ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" فاروق نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "میں عشق و محبت کی اس کہانی کو طول نہیں دینا چاہتا بلکہ......"

"کیا بلکہ؟" فاروق بولتے بولتے رکا تو نورین نے پوچھا۔

"بلکہ یہ کہ میں باقاعدہ آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" فاروق نے دھماکا کردیا۔ "آپ کو اپنی بیوی بنانا چاہتا ہوں۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر!" نورین کے ذہن کو جھٹکا لگا۔ "ہم دونوں شادی شدہ ہیں' یہ کیسے ممکن ہے؟"

"اس دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے نورین!" وہ اس کی آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے بولا۔ "یہ ٹھیک ہے کہ ہم دونوں شادی شدہ ہیں مگر یہ بھی سچ ہے کہ ہم اپنی شادی شدہ زندگی سے خوش نہیں ہیں' ہم صبح و شام ایک عذاب میں مبتلا ہیں۔" نورین یک ٹک اسے دیکھتی چلی گئی فاروق اپنے مخصوص ٹرانس میں کہہ رہا تھا۔

"سلمٰی نے میری زندگی کو جہنم بنادیا ہے اور میں جانتا ہوں آپ بھی وحید کے ساتھ خوش نہیں ہیں۔ وہ بہت شکی مزاج اور غصہ ور ہے ذرا ذرا سی بات پر وہ آپ کی بے عزتی کردیتا ہے۔ ایک دو بار اس نے آپ پر ہاتھ بھی اٹھایا ہے اس کے ساتھ جیسے تیسے گزارہ کررہی ہیں۔" لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ "کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

فاروق نے کچھ بھی غلط نہیں کہا تھا' وحید واقعی ایک شکی مزاج اور سخت گیر شوہر تھا۔ اس کی آمدنی اچھی تھی معاشی مسئلہ کوئی نہیں تھا لیکن کسی بھی انسان کی ضرورت صرف کھانا پینا ہی نہیں ہوتی۔ اسے اس کے علاوہ بھی کچھ بھی چاہیے ہوتا ہے جس میں سب سے اہم ہے خودداری کا تحفظ اور جذبات کا احترام اور نورین ان دونوں نعمتوں سے محروم تھی۔ وحید نے کبھی اس کے جذبات اور احساسات کی پروا نہیں کی تھی اور جب بھی موقع ملتا وہ اس کی انا کو مجروح کرنے سے نہیں چوکتا تھا۔ یہ سب کچھ وحید کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت نہیں کرتا تھا بلکہ وہ طبعاً ایسی ہی خصوصیات کا حامل

تھا۔ اس کا مزاج اکھڑ اور انداز بہت رف تھا تاہم وہ بدنیت نہیں تھا۔ اسے اپنی فیملی کی ضروریات کا پورا پورا خیال تھا۔ فطری احتیاط پسندی اور احساسِ تحفظ اس کے پیش نظر تھا۔

فاروق نے آج نورین کی زندگی کے انتہائی نازک پہلو کو چھیڑ دیا تھا۔ فاروق کی باتیں اسے اچھی تو لگیں لیکن عملاً ایسا کر گزرنا بہت خطرناک اور دشوار گزار محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے گول مول جواب دے کر فاروق کو ٹال دیا۔

وقتی طور پر فاروق ٹل تو گیا تھا لیکن اس نے ہار نہیں مانی تھی اُسے جب بھی نورین سے ملاقات کا موقع ملتا وہ اس کی برین واشنگ کے لیے وحید کی ایک ایک خامی اور زیادتی گنوانے بیٹھ جاتا۔ کچھ ہی عرصے کے بعد وحید اس کی نگاہ سے گر گیا۔ فاروق نے نورین کے سہانے مستقبل کو اس طرح اجاگر کر کے پیش کیا تھا کہ وحید کے ساتھ گزرا ہوا ایک ایک پل اسے عذاب محسوس ہونے لگا اور بالآخر اس نے فاروق کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

ایک دن جب وہ تنہائی میں بیٹھے اسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے تو فاروق نے ایک عجیب حرکت کی وہ اپنی جگہ سے اٹھا پھر نورین کے قدموں میں بیٹھ کر اس کے پاؤں چھوتے ہوئے بولا۔

''اگر آپ کے دل و دماغ میں میرے لیے گنجائش نہیں ہے تو مجھے اپنے قدموں میں تھوڑی سی جگہ دے دیں میں آپ سے دوری برداشت نہیں کر سکتا۔''

نورین سکتے میں آ گئی تھی' ایک ارب پتی کامیاب بزنس مین اس کی محبت کی بھیک مانگ رہا تھا اور اسے اپنی زندگی کا ساتھی بنانا چاہتا تھا۔ ان لمحات میں وحید اسے دنیا کا سب سے ظالم اور سنگ دل شوہر محسوس ہوا۔ یک بہ یک اس نے وحید سے چھٹکارا حاصل کر کے فاروق کو اپنانے کا فیصلہ کر لیا تاہم عورت کی

''فاروق صاحب! آپ یہاں سے اٹھیں اور میرے سامنے آ کر بیٹھیں۔'' وہ اضطراری لہجے میں بولی۔ ''آپ مجھے شرمندہ اور گناہ گار کر رہے ہیں۔''

''فاروق صاحب نہیں صرف فاروق.....'' وہ نورین کے پاؤں کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے بولا۔ ''اور میں اس وقت تک یہاں سے ہلوں گا نہیں جب تک آپ میری بات نہیں مانیں گی۔''

یہ ایسی صورت حال تھی کہ نورین کے پاس انکار کی گنجائش باقی نہ رہی' اگر وحید کا رویہ اس کے ساتھ اچھا ہوتا تو وہ اپنے ازدواجی رشتے کے تحفظ کے لیے شیرنی بن جاتی اور دو منٹ میں فاروق کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی لیکن یہاں تو معاملہ ہی دیگر تھا۔ وحید نے اس کے جذبات اور احساسات کو اتنی بے دردی سے روندا تھا کہ اسے فاروق کی محبت میں قارون کا خزانہ دکھائی دینے لگا۔ وہ فاروق کو وحید پر ترجیح دینے میں خود کو حق بجانب سمجھ رہی تھی۔

''ٹھیک ہے' میں وعدہ کرتی ہوں کہ آپ کی بات مان لوں گی۔'' وہ اپنے پاؤں کھینچتے ہوئے بولی۔ ''لیکن آپ کو بھی مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔''

''ایک نہیں' میں دس وعدے کروں گا۔'' فاروق اس کے پاؤں چھوڑ کر واپس اپنی جگہ پر جا بیٹھا اور ملتجیانہ لہجے میں بولا۔ ''بتائیں آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟''

''صرف ایک شرط ہے میری۔'' نورین نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کی سیکنڈ وائف نہیں بن سکتی۔''

''کیا مطلب؟'' فاروق نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

کہاں جاؤں

تارا سنگھ کی حویلی جو بہت سوں کو اپنی آغوش میں پناہ دیتی رہی۔ اسے عام طور پر کلکی ہی کہا جاتا ہے اس کے پرکھوں نے بھی خدمت اور خدمت گزاری ہی کا حکم دیا تھا سبق پڑھایا تھا۔ کلکی عمر کی بھی چھوٹی تھی مگر حویلی میں اِدھر سے اُدھر سے بھاگتی پھرتی اور بہت سے مکینوں کے کام کرتی رہتی۔ تکا کرانی اور بڑے صاحبان سب ہی اس سے محبت ہی سے ملتے تھے اور اس کا حویلی میں کہیں بھی آنا جانا منع نہیں تھا سوائے بڑے ٹھاکر کی خواب گاہ میں کلکی بھی صبح سویرے اٹھ جاتی اور پھر رات گئے تک کام کاج کرتی پھرتی۔ اس کے معصوم دل میں بھی کسی قسم کا خوف نہ آتا تھا اس کی اپنی ہم عمر، ہمجولیاں اس کے ساتھ فرصت کے وقت کھیل کود میں مصروف رہتی تھیں۔

اب کلکی سولہ' سترہ سال کی ہو رہی تھی اور جون کے ماہ میں زبردست آزادی ہند کا شور اٹھا اور ملک میں ہنگاموں کا آغاز ہوگیا۔ کبھی کبھی تارا سنگھ حویلی آتے تو بے حد فکر مند ہوتے تھے اور بہت سی احتیاطی تدبیروں کو اختیار کرتے رہتے۔ ارد گرد کے بے شمار لوگ آہستہ آہستہ حویلی میں آنا شروع ہوگئے۔ خاص کر مسلمانوں کو تو عذاب لگ رہا تھا کہ آخری وقت میں تقسیم ہند میں دھوکا بازی کی گئی تو پنجاب میں بھی بے حد قتل و غارت ہوگیا اور پھر آہستہ آہستہ یہ آگ تو پورے ہند میں پھیل گئی کہ مسلمانوں کو اِدھر اور غیر مسلموں کو اُدھر آخر کار ہجرت کرنا ہی ہوگی۔

کلکی کے ماں باپ مسلمان ہونے کے باوجود تارا سنگھ کی حویلی ہی میں پناہ گزیں تھے۔ تارا

"مطلب یہ کہ پہلے آپ اپنی بیوی سلمیٰ کو طلاق دیں گے' اس کے بعد مجھ سے شادی کریں گے۔"

نورین نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"ڈن۔" وہ قطعی لہجے میں بولا۔ "میں سلمیٰ کو طلاق دینے کے لیے تیار ہوں' آپ بھی وحید سے چھٹکارا حاصل کرلیں۔"

وحید کے ساتھ صبح وشام کھٹ پٹ تو ہوتی ہی رہتی تھی لیکن اب نورین کی آنکھوں میں عیش وآرام سے مزین سنہرے مستقبل کے خواب سجے تھے لہٰذا وحید کے حوالے سے اس کی برداشت کی لچک جواب دے گئی۔ کھٹ پٹ' لڑائی جھگڑے میں بدلی اور یہ معاملہ اس حد تک آگے بڑھ گیا کہ وحید نے نورین کو طلاق دے دی۔ اس پورے پروسس میں چھ آٹھ ماہ لگ گئے تھے تاہم نورین' وحید سے چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔

اس موقع پر فاروق نے وحید کا تبادلہ انڈونیشیا والے آفس میں کردیا۔ اس ٹرانسفر پر وحید اپنے باس کا شکر گزار بھی تھا کیوں کہ اس تکلیف دہ واقعے کے بعد وہ خود بھی کراچی میں نہیں رہنا چاہتا تھا۔ اس وقت تک وحید یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کا گھر تباہ کرنے میں خود اس کے باس فاروق کا ہی ہاتھ تھا اس کے لیے کراچی سے کوالالمپور شفٹ ہونا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ نازیہ شادی شدہ تھی اور اپنے گھر میں خوش تھی' چند ماہ بعد جنید اپنی تعلیم سے فارغ ہوجاتا اور وہ جنید کو بھی اپنے پاس بلالیتا۔ فی الحال وہ اپنے باس کے حکم پر کوالالمپور گیا تھا لیکن اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ مستقلاً وہیں سیٹل ہوجائے گا۔ کوالالمپور بھیجتے وقت فاروق نے اس کی تنخواہ میں لگ بھگ ایک لاکھ روپے کا اضافہ کردیا تھا

سنگھ نے بڑی سختی سے انتظام کردیا تھا کہ اس کی حویلی کے اندر مسلمانوں کو اگر کسی بھی غنڈے نے یا قاتلوں نے نقصان پہنچایا تو میرے جل نثار نہ صرف اس کو بلکہ اس کے تمام گھر والے، مکان اور فصلوں کو تہس نہس کریں گے۔ اب کلکی بھی روزانہ ہی دیکھتی کہ گلیوں میں یا باہر یہ ظالم لوگ مسلمانوں کو یرغمال بنا لیتے تھے اور پھر ان کے ساتھ جو انسانیت سوز سلوک کیا جاتا وہ تو کلکی صرف سن کر ہی کانپ جاتی۔ یہ غیر مسلم ہی اتنے ظالم، بے حس اور بربریت کے حامل تھے کہ کلکی کے دل میں تو نفرت ہی نفرت بسی ہوئی تھی۔

اور پھر کلکی کی کئی ملنے والیاں اور خاندان واہگہ کی طرف روانہ ہوئے۔ پھر معلوم ہوا کہ تمام لوگ واہگہ پار کر گئے۔ مگر واہگہ کے بعد بہت سی جگہوں میں نئے وطن کے اندر بھی بے حد سختی دیکھی جب تک لوگ پوری سرحد کو پار کر کے بہت آگے جا کر بحفاظت والٹن تک نہیں پہنچتے سکون ان کو نہیں آتا۔ اسی طرح کے واقعات سنتے سنتے کلکی کے دل میں یہ چیز بیٹھ گئی کہ واہگہ کے بعد چین ہی چین ہے۔ حالانکہ ایسی بات نہ تھی۔ ادھر نئے وطن میں بھی غلط اور بدمعاش لوگ لوٹ مار اور عورتوں کو اغوا کرنا اپنا پیشہ بنا لیا تھا۔

اب کلکی بھی سوچنے لگی کہ اگر میرے ماں باپ یہاں سے ہجرت کرنا چاہیں گے تو میں بھی ساتھ ہی ہوں گی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے آباؤ اجداد لاہور کے نواحی گاؤں سے کسی زمانہ میں یہاں آکر بس گئے اور تارا سنگھ کے ہاں برسوں سے خدمات انجام دے رہے تھے۔ یہاں رہنے سے کلکی ہر چیز سے مانوس ہوگئی تھی اور جوان ہونے تک وہ دنیاوی نشیب و فراز کو سمجھتی چلی گئی تھی اور اپنی ہمجولیوں اور حویلی کے تمام لوگوں سے بول چال تھی وہ اس

اب اس کی تنخواہ تین لاکھ کے قریب ہوگئی تھی۔

وحید کے منظر سے ہٹنے کے بعد فاروق اور نورین کی ملاقاتوں میں تیزی آگئی۔ وحید سے طلاق کے بعد نورین کو وہ گھر چھوڑنا پڑا تھا۔ فاروق نے اسے کراچی کے ایک پوش ایریا میں ایک اپارٹمنٹ کرائے پر لے دیا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ بہت جلد وہ اس سے شادی کر کے اپنے بنگلے پر لے جائے گا۔ طلاق والے اس افسوسناک واقعے کے بعد نازیہ کو اپنی ماں سے شدید ترین نفرت ہوگئی تھی تاہم جنید کبھی کبھار اس کا فون اٹینڈ کر لیتا تھا مگر بڑے جارحانہ انداز میں بات کرتا تھا۔ نورین نے وحید سے چھٹکارا حاصل کرنے میں اپنے دونوں بچوں کو بھی کھو دیا تھا آگے کیا ہوتا تھا یہ تو صرف خدا ہی کو معلوم تھا لیکن فی الحال نورین خاصے پیچیدہ حالات میں گھر گئی تھی۔

اس واقعے کے دو ماہ بعد فاروق نے جعلی طلاق نامہ دکھا کر نورین سے شادی کر لی تھی۔ نکاح عین شرعی اسلامی طریقے سے ہوا تھا اور فاروق کے چند دوستوں نے نکاح کی اس تقریب میں شرکت بھی کی تھی تاہم نورین بیاہ کر فاروق کے بنگلے پر نہیں جاسکی تھی بلکہ شب زفاف منانے کے لیے فاروق اس کے اپارٹمنٹ پر پہنچ گیا تھا۔

اس کے بعد فاروق ہفتے میں ایک آدھ رات اس کے ساتھ گزارتا تھا اور ہر بار یہ وعدہ کرتا تھا کہ بس بہت جلد وہ اس شادی کو اناؤنس کردے گا لیکن یہ بہت جلد دور سے دور ہوتا چلا گیا جب نورین کی تشویش بڑھی تو اس نے اپنے طور پر کچھ تحقیقات کیں اور اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ اس پر یہ روح فرسا انکشاف ہوا کہ فاروق نے سلمیٰ کو طلاق نہیں دی تھی، سلمیٰ ابھی

ہجرت کو عجیب نظروں سے دیکھتی تھی۔
اور آہستہ آہستہ محسوس کرنے لگی کہ ایک ہی جیسی قوموں میں یہ تفریق کیوں؟ مگر یہ چیزیں اس کے ذہن میں صاف ہوتی چلی گئیں اور لوگوں کی ایک دوسرے کی طرف نقل مکانی میں تیزی آرہی ہے۔
چند روز ہی گزرے تھے کہ جولائی میں بڑے بڑے کنبہ کے کنبہ اِدھر سے اُدھر، مختلف سواریوں میں نقل مکانی شروع ہوگئی۔ کلکی نے کئی دفعہ ان لوگوں کی آپس کی باتیں سن رکھی تھیں کہ یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کے بد ترین دشمن بن چکے ہیں اور قریب ترین بھی لوگ کسی قسم کی رعایت نہیں کرتے اور جتھے کے جتھے ایک دوسرے کو منتقل کرنے میں پہل کر رہے ہیں۔ ریڑھے، تانگے، گھوڑا، گدھا گاڑیاں، سائیکل سوار چھوٹی بڑی بسیں اور ٹرکوں میں بھرے ہوئے انسان گاجر مولی کی طرح کاٹے جا رہے ہیں۔ کوئی لحاظ نہیں تھا عورتیں اغوا ہو رہی تھیں۔ کنویں اور جوان اور دوسری عورتوں سے اٹے پڑے تھے اور آخر کار اس کے بڑوں نے واپس لاہور کے نواحی گاؤں جانے کی ٹھان لی۔ کلکی کو اس کا ادراک تو تھا کہ بے حد ظلم ہو رہا ہے پھر بھی اپنے لوگوں کے ساتھ ایک دن روانہ ہوگئی۔ واہگہ تک خیریت ہی رہی پھر واہگہ کے اندر پہنچے تو راتوں کو ہی قتل و غارت شروع ہوگئی اور پھر قیامت ہی تو ٹوٹ پڑی۔ صبح وہ اپنے لوگوں سے بچھڑ چکی تھی مگر اب غنڈے قسم کے لوگوں کے پاس تھی۔ چند روز گزرے اور جسمانی ظلم کی انتہا ہوگئی اور جیسے اس کے جسم میں جان نہ رہی۔ چند روز میں ہی

تک طمطراق کے ساتھ فاروق کے بنگلے پر رہ رہی تھی اس کی بیوی کی حیثیت سے۔

اب کی بار جب فاروق اس کے پاس رات گزارنے آیا تو ان کے بیچ شدید قسم کا جھگڑا ہوا فاروق مختلف حیلوں بہانوں سے اسے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا مگر نورین کا دماغ گھوما ہوا تھا۔

"آپ نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے فاروق۔" وہ برہمی سے بولی۔

"میں مجبور تھا۔" وہ صفائی پیش کرنے لگا۔

"کیسی مجبوری؟" اس کا غصہ بڑھ گیا۔ "جب میں آپ کے ساتھ فیئر تھی تو آپ کو بھی فیئر ہی رہنا چاہیے تھا۔ میں نے آپ پر واضح کر دیا تھا کہ میں آپ کی سیکنڈ وائف بن کر نہیں رہ سکتی۔"

"میں بہت جلدی سلمٰی سے جان چھڑا لوں گا۔" وہ بولا۔ "آپ کو مجھ پر بھروسہ کرنا چاہیے۔"

"بھروسہ کیا تھا تو اس کا صلہ آپ نے مجھے یہ دیا ہے۔" وہ شکایتی نظر سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"میں نے آپ کی خاطر اپنا بسا بسایا گھر اجاڑ دیا اور آپ کو میری کوئی پروا نہیں ہے۔"

"پروا ہے تو اس وقت آپ کے ساتھ ہوں نا۔" فاروق اپنی لچھے دار باتوں سے اسے بہلانے کی کوشش کرنے لگا۔ "میں بہت جلد آپ کو اس اپارٹمنٹ سے نکال کر کسی بنگلے میں شفٹ کر دوں گا۔"

"کسی بنگلے میں نہیں، مجھے اس بنگلے میں جانا ہے جہاں آپ رہتے ہیں اور آپ کی بیوی کی حیثیت سے وہاں جانا ہے۔" نورین نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"بالکل آپ میرے بنگلے میں جائیں گی مگر آپ کی شرط بھی تو پوری کرنا ہے نا۔" فاروق نے کہا۔

"آپ کو میری سیکنڈ وائف بن کر نہیں رہنا اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب میں پہلی بیوی کو اپنی زندگی سے

کلکی رات کی تاریکی میں ہمت مجتمع کرکے رات کی تاریکی میں بارڈر کی طرف تیر کی طرح بھاگ چلی۔

ٹھوکریں کھاتے، گرتے پڑتے وہ اس ظلم سے دور بھاگتی چلی گئی کہ یہاں تو سب قسم قسم کے درندے ہیں اور عزت کو بچانا ناممکن تو ہو ہی گیا تھا اب بھاگتی رہتی ہوں تاکہ اپنے پرانے دیس جس میں تارا سنگھ کی حویلی تھی کم از کم اگر بھاگ کر واھگہ کے بعد بھارت کی سرزمین پر پہنچ جاؤں تو یہ ظلم شاید نہ ہو۔ وہ بھاگ رہی تھی اور چھپ چھپا کر بارڈر کراس کر کے خاصی اندر چلی گئی کہ اب تو ہمت بھی جواب دے گئی تھی اچانک تکلیف سے چیخ نکل گئی اور پھر گشت کرتے بھارتی جوانوں نے کھیت میں زبردست ہلچل مچتے دیکھی اور اس سے پہلے کہ کلکی کچھ سمجھ سکتی کئی گولیاں اس کی پشت میں پیوست ہوتی چلی گئیں۔ کلکی گر گئی اور آنکھیں کھلی تھیں اور آسمان کو حسرت سے دیکھتے ہوئے جان دیتے دیتے سوچنے لگی اور جو آخری خیال آیا کہ نہ وہاں چین آیا اور یہاں اپنوں نے ہی جان لے لی۔ ایک ہچکی لی اور آسمان کھلی آنکھوں پر رونے لگا، برسنے لگا

جاوید احمد صدیقی ..... راولپنڈی

نکال دوں۔"

"تو انتظار کس بات کا ہے؟" نورین نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ نے جھوٹا طلاق نامہ مجھے دکھا کر میرے اعتماد کا خون کیا ہے فاروق!"

"وہ میری انتہائی مجبوری تھی۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "میں آپ کے بغیر رہ نہیں سکتا تھا اور بغیر طلاق کے آپ مجھ سے نکاح نہ کرتیں لہٰذا میں نے آپ کی تسلی کی خاطر سلمٰی کا جعلی طلاق نامہ تیار کروالیا۔"

"ٹھیک ہے میں آپ کی مجبوری کو مان لیتی ہوں۔" نورین نے مصلحت بھرے لہجے میں کہا۔ "لیکن اب تو میں آپ کو حاصل ہو چکی ہوں پھر آپ تاخیری حربوں سے کیوں کام لے رہے ہیں۔ دو منٹ میں اسے طلاق دے کر فارغ کریں، اللہ اللہ خیر سلا۔"

"یہ کام اتنا آسان نہیں ہے جو دو منٹ میں ہو جائے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اگر میں نے کسی پلاننگ کے بغیر سلمٰی کو طلاق دے دی تو میرے کروڑوں ڈوب جائیں گے۔"

"کروڑوں ڈوب جائیں گے میں سمجھی نہیں؟"

نورین نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"سلمٰی میرے بزنس میں کافی دور تک ملوث ہے۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اگر میں یک لخت اسے اپنی زندگی سے نکالنے کا فیصلہ کرلوں تو مجھے کروڑوں روپے کے کاروبار سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ آپ کچھ عرصہ صبر کرلیں، میں بڑی صفائی سے سلمٰی سے نجات حاصل کرلوں گا۔"

"یہ ساری باتیں آپ کو پہلے پتا نہیں تھیں؟" نورین نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ "آپ نے مجھ سے غلط بیانی کیوں کی؟"

"میں بتا چکا ہوں کہ اگر یہ ساری باتیں میں آپ کے علم میں لے آتا تو آپ بدک جاتیں۔" وہ اسے اپنی چھپے دار باتوں کے شیشے میں اتارتے ہوئے بولا۔ "پھر تم وحید سے طلاق نہ لیتیں اور میں تمہیں حاصل نہ کر پاتا۔"

"آپ بہت خود غرض ہیں فاروق!" نورین نے دکھی لہجے میں کہا۔ "قدم قدم پر آپ نے اپنے جذبات

اور اپنی خواہشات کا خیال رکھا ہے اور میں......" وہ روہانسی ہوگئی۔ "میں بے وقعت ہو کر رہ گئی۔"

"ایسی باتیں نہ کریں نورین!" وہ اس کی دل جوئی کرتے ہوئے بولا۔ "آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ میری نظر میں آپ کی کیا قدر و قیمت ہے۔ آپ دیکھ لینا میں بہت جلد آپ کے سارے گلے شکوے دور کردوں گا۔ میں آپ کو اتنی پُرسکون اور فرحت بخش زندگی دوں گا کہ آپ ماضی کی تمام تر تلخ یادوں کو فراموش کردیں گی۔" نورین ایک بار پھر اس کی باتوں میں آگئی۔

اس روز ان کے بیچ جو گرما گرمی ہوئی تھی اس کی صدا پڑوس میں بھی گئی تھی۔ وہ ایسا پوش علاقہ تھا کہ کوئی اپنے پڑوسی کے معاملات سے دلچسپی نہیں رکھتا تھا لیکن پھر بھی ایک پڑوسن بڑی بی کو نورین سے ہمدردی ہوگئی اور وقتاً فوقتاً گپ شپ کے لیے اس کے اپارٹمنٹ میں آنے لگی یہ بات فارق سے چھپی نہ رہ سکی۔

ایک روز وہ بغیر اطلاع کے نورین کے پاس آیا تو مذکورہ بڑی بی نورین کے اپارٹمنٹ میں موجود تھی۔ فاروق کو دیکھ کر وہ بڑی بی تو کھسک لی لیکن اس رات نورین اور فاروق میں خاصی تلخ کلامی ہوگئی۔

"میں نے تمہیں سختی سے منع کیا تھا کہ آس پڑوس کے لوگوں سے تعلقات نہیں بڑھانا۔" وہ غصیلے لہجے میں آپ سے تم پر آتے ہوئے بولا۔ "لیکن تمہیں میری بات کا ذرا بھی خیال نہیں ہے۔"

"آپ کو تو جیسے میری ہر بات کا بڑا خیال ہے" نورین بھی پھٹ پڑی۔ "میں ایک قیدی جیسی زندگی گزار رہی ہوں' ایسے میں اگر وہ نرم دل خاتون مجھ سے دو چار باتیں کرنے آجاتی ہے تو اس میں کون سی قیامت والی بات ہے۔"

"مجھے یہ پسند نہیں کہ لوگوں کو ہمارے معاملات کی خبر ہو۔" جب کچھ سمجھ نہ آیا تو فاروق نے سرسری لہجے میں کہا۔ "بس......"

"کون سے معاملات کی بات کررہے ہو فاروق؟" وہ بھی آپ جناب کو ایک طرف رکھ کر بولی۔

"یہی ہماری شادی والا معاملہ۔" وہ خفگی آمیز لہجے میں بولا۔ "اگر یہ خبر کسی طرح اس اپارٹمنٹ سے نکل کر سلمیٰ تک پہنچ گئی تو بنا بنایا کھیل بگڑ کر رہ جائے گا۔"

"آپ کو سلمیٰ کی بہت پروا ہے۔" نورین نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "میں نے تم سے شادی کی ہے' تمہاری بیوی ہوں میں اور میں یہ حقیقت اپنے پڑوسیوں سے نہیں چھپا سکتی ورنہ لوگ مجھ پر انگلیاں اٹھائیں گے کہ میں تمہاری رکھیل ہوں اور تم گاہے بگاہے میرے پاس وقت گزارنے آجاتے ہو۔ تمہیں میری عزت کا ذرا سا بھی احساس نہیں ہے فاروق۔"

نورین کا احتجاج نما مطالبہ جائز تھا' عورت ہر قسم کی تنگی ترشی برداشت کرلیتی ہے مگر اپنے پندار کی توہین وہ کبھی گوارا نہیں کرتی۔ نورین نے فاروق کے ساتھ باقاعدہ نکاح کیا تھا۔ وہ اس کی قانونی اور شرعی بیوی تھی لہٰذا اس بات پر اس کا چراغ پا ہونا برحق تھا کہ لوگ اسے فاروق کی داشتہ سمجھیں۔

اس رات ان کے درمیان اچھی خاصی جنگ ہوئی جس کے نتیجے میں اگلے روز فاروق نے اسے ایک لگژری ہوٹل میں شفٹ کردیا۔ مذکورہ ہوٹل شارع فیصل پر واقع تھا جس کا ایک دن کا کرایہ دس ہزار سے کچھ اوپر ہی تھا۔ فاروق کے پاس پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی جس وقت نورین سے میری پہلی ملاقات ہوئی وہ اسی عالی شان ہوٹل میں قیام پذیر تھی جہاں اسے رہنے سہنے اور کھانے پینے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ آمدورفت کے لیے فاروق نے اسے ایک آٹومیٹک شاندار گاڑی دے رکھی تھی۔ ازیں علاوہ پاکٹ منی کے نام پر بھی وہ اسے ایک ہینڈسم اماؤنٹ دے رہا تھا الغرض اس کی

زندگی میں عیش و آرام تو تھا مگر اطمینان اور سکون نہیں تھا۔ عیش اور آرام کی یہ خوبی ہے کہ اسے پیسے سے خریدا جاسکتا ہے مگر اطمینان اور سکون بکاؤ مال نہیں' اگر یہ بھی کوئی برائے "فروخت جنس" ہوتی تو دنیا میں کوئی بھی صاحب ثروت شخص دکھی نہ ہوتا۔

❀ .... ❀ .... ❀

میں زائچوں کی جمع تفریق سے فارغ ہوا تو نورین نے اضطراری لہجے میں سوال کیا۔

"جی قریشی صاحب! آپ نے کیا ریڈنگ کی ہے؟"

"اپنی ریڈنگ میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس سے پہلے میں یہ جاننا چاہوں گا کہ اظہر صاحب نے آپ کو کیا بتایا تھا' اگر آپ کو بتانے میں کوئی حرج محسوس نہ ہو تو۔"

"کوئی حرج نہیں ہے۔" وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔ "اظہر بھائی کا کہنا یہ ہے کہ ہمارے بیچ کوئی تیسری عورت آگئی ہے یعنی میرے اور فاروق کے بیچ۔"

"کیا ان کا اشارہ سلمٰی کی طرف ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی' وہ کہتے ہیں کہ فاروق سلمٰی سے پیچھا نہیں چھڑا سکے گا۔"

"ایسی بات ہے تو پھر سلمٰی کے لیے تیسری عورت کا لفظ استعمال نہیں کیا جاسکتا۔" میں نے کہا۔ "وہ تو آپ لوگوں کے تعلقات اور شادی سے پہلے فاروق کی زندگی میں موجود تھی۔"

"آپ کیا کہتے ہیں؟" اس نے استفسار کیا۔

"میں کیا کہتا ہوں......" میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ "میں ضرور کچھ نہ کچھ کہوں گا' اظہر صاحب کا اپنا حساب ہے میں ان کی ریڈنگ کا احترام کرتا ہوں لیکن میں آپ کو وہی بتاؤں گا جو میرا علم راہ نمائی کرے گا۔"

"میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ آپ مجھے حقائق سے آگاہ کریں۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔ "دوٹوک اور سیدھی بات کرنے والے لوگوں کو میں پسند کرتی ہوں ورنہ ایک بابا تو بڑے دعوؤں کے ساتھ میرا مسئلہ حل کرنے کا دعویٰ کررہا تھا۔" بابا کے نام پر میں چونک اٹھا' میں نے پوچھا۔

"کیا آپ اپنی پریشانی کے سلسلے میں کسی بابا سے ملی تھیں۔"

"پریشان آدمی تو ہر جگہ سکون کی تلاش میں بھٹکتا ہے۔" اس نے کہا۔ "میں بھی ایک عامل کامل کے پاس گئی تھی۔"

"پھر اس نے کیا کہا؟" میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"بابا نے کہا دو لاکھ خرچ ہوں گے۔" نورین نے بتایا۔ "وہ دو تعویذ دے گا تین دن کے وقفے سے ان تعویزات کو جلانا ہوگا' بس ایک ہفتے کے اندر سلمٰی خون کی الٹیاں کرکے اناللہ ہوجائے گی۔ اس کے ساتھ ہی وہ بابا ٹوٹی ہوئی قبر میں بیٹھ کر ایسا عمل کرے گا کہ ایک ماہ کے اندر فاروق مجھے اپنے بنگلے میں بیوی کی حیثیت سے لے جائے گا۔"

"واہ واہ' سبحان اللہ۔" میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس بابا کی پروڈکٹس تو کافی مہنگی ہے یعنی ایک لاکھ کا ایک تعویز۔" میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر پوچھا۔ "آپ نے ان بابا جی کو دو لاکھ روپے دیئے یا نہیں؟"

"میں نے یہ سارا قصہ اظہر بھائی کو بتایا تو انہوں نے کہا کہ کسی کو ایک روپیہ بھی نہیں دینا۔" نورین نے کہا۔ "پھر انہوں نے مجھے آپ کے پاس بھیج دیا۔"

"نورین جی! میں اصلی باباؤں کا بہت احترام کرتا ہوں' اصلی بابا اللہ کا دوست اور محمد ﷺ کا غلام ہوتا ہے اور وہ اپنی ذات کا فراموش کرکے مخلوق خدا کے لیے سوچتا ہے' انہیں آسانیاں فراہم کرتا ہے لیکن ڈھونگی بابا محض اپنے پیٹ کے دوست اور نفس کے غلام ہوتے ہیں۔ انہیں صرف مال ودولت چاہیے ہوتا ہے' چاہے کوئی کہیں سے بھی لاکر دے۔ اس کی نظر اپنے پاس آنے والے افراد کی جیب اور ان کی عورت پر ہوتی ہے۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ہمارے ملک میں ہندوانہ ناموں سے آستانے چلانے والے اکثر بابا مسلمان ہیں۔ یہ ان کا فریب کا ایک اندازہ ہے کیوں کہ ہماری عوام کے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ اگر عامل کوئی ہندو ہو تو وہ زبردست سفلی کرے گا۔ اس کمزوری کا فائدہ اٹھانے کے لیے انہوں نے اپنا ہندوانہ نام رکھ لیا ہے اور وہ پریشان حال لوگوں سے دوگنا' تین گنا معاوضہ وصول کرتے ہیں۔"

"ان معاشرتی ناسوروں کے خلاف قانون حرکت میں کیوں نہیں آتا قریشی صاحب!" وہ بڑی تکلیف سے بولی۔

"قانون اور حرکت......" میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "ان دونوں الفاظ کا استعمال صرف فزکس کی کتابوں میں نیوٹن کے چیپٹر میں نظر آتا ہے۔ باقی سب دل جلانے والی باتیں ہیں' خیر......" میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔

"میں پہلے آپ کو فاروق اور سلمٰی کے حوالے سے چند باتیں بتاؤں گا آپ نے ہاں یا نہ میں جواب دینا ہے تاکہ میں زائچے کی درستی کا اندازہ لگاسکوں' اس کے بعد باقی باتیں ہوں گی۔"

"جی ٹھیک ہے۔" وہ ہمہ تن گوش ہوگئی۔

"کیا فاروق کا قد چھوٹا ہے اور جب وہ غصے میں ہو تو اس کے ہاتھ یا زبان میں کپکپاہٹ آجاتی ہے؟"

"جی بالکل ٹھیک کہا آپ نے' وہ غصے کی حالت میں عجیب سا ہوجاتا ہے۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "اس کی زبان میں لکنت اور ہاتھوں میں رعشہ آجاتا ہے۔"

"فاروق پیدائشی جھوٹا ہے۔" میں نے کسی مصلحت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے کہا۔ "جھوٹ بولنا اس کی عادت بلکہ فطرت کا حصہ ہے اور وہ اپنی اس عادت سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔"

"اس کے کئی جھوٹ مجھ پر کھل چکے ہیں۔" اس نے کہا۔ "یہ بات میں نے محسوس کی ہے کہ وہ مجھے بہلانے کے لیے اکثر غلط بیانی سے کام لیتا ہے۔"

"وہ دوسروں کی دولت اور پرائی عورتوں پر گہری نظر رکھتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور اسے بجلی کا کرنٹ بھی لگ چکا ہے جس میں اس کی جان کے لالے پڑگئے تھے یا اسے کبھی کسی زہریلے سانپ نے ڈس لیا تھا اور جان پر بن آئی تھی؟"

"جی ایسا واقعہ ہوا تھا۔" اس نے تصدیق کی پھر پوچھا۔ "کیا یہ باتیں کسی انسان کے زائچے سے پتا چل جاتی ہیں؟"

"بالکل پتا چل جاتی ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "اگر کسی شخص کے زائچے میں آٹھویں گھر کا حاکم آٹھویں ہی گھر میں موجود ہو تو حامل زائچہ پر بجلی گرنے' کرنٹ لگنے' سانپ یا بچھو کے کاٹنے کا خدشہ موجود ہوتا ہے۔"

"اوہ......" وہ حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "آپ کا علم تو بہت خطرناک ہے' یہ ایسی ایسی نازک باتیں بھی بتادیتا ہے۔"

"آپ اس علم کو خطرناک نہ کہیں۔" میں نے کہا۔

''ورنہ میڈیکل کا سارا علم بھی انتہائی خطرناک شمار ہوگا کیوں کہ اس علم کے استعمال سے ہمیں پتا چل جاتا ہے کہ کسی شخص کو کینسر یا ٹی بی یا ایڈز ہے۔''

''فاروق کے بارے میں کچھ اور بتائیں؟'' وہ مستفسر ہوئی۔

''فاروق کا کوئی ایسا ایکسیڈنٹ ہو چکا ہے جس میں کولہے کی ہڈی پر چوٹ لگی ہو کیوں کہ اس کے زائچے میں زحل اور کیتو بڑی خراب پوزیشن میں قران کر رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اور یہ شخص اولاد نرینہ سے بھی محروم ہے۔''

''واقعی.....'' وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ ''فاروق کی چار اولادیں ہیں اور چاروں ہی بیٹیاں ہیں اور اس کا ایکسیڈنٹ بھی ہوا تھا جس کی وجہ سے ہپ جوائنٹ کا آپریشن کرنا پڑا تھا اور اسی سبب وہ تھوڑا لنگڑا کر بھی چلتا ہے۔''

''فاروق کے زائچے کا سب سے اہم اور مثبت پہلو یہ ہے کہ دولت و ثروت ساری زندگی اس کے ساتھ رہے گی۔'' میں نے فاروق کے ہارواسکوپ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''کیوں کہ پانچویں گھر کا حاکم عطارد آٹھویں گھر پر قابض ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسے ترکے میں بھی بہت زیادہ دولت و جائیداد حاصل ہوگی اور اس کی زندگی کا آخری حصہ کسی متبرک مقام پر گزرے گا۔''

''اور میرا زائچہ کیا کہتا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''آپ کے پہلے گھر میں قمر بیٹھا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی شادی کم عمری میں ہوگئی تھی۔'' میں نے کہا۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''وحید سے شادی کے وقت میری عمر صرف سولہ سال تھی۔''

''آپ کا زائچہ دو شادیاں بھی ظاہر کرتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور ایسا ہو بھی چکا ہے۔''

''کیا میرا زائچہ فاروق کے زائچے سے میچ کرتا ہے؟''

''جی بالکل میچ کرتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن یہ آئیڈیل میچنگ نہیں ہے البتہ تھوڑی سی تکلیف و پریشانی اٹھانے کے بعد یہ گاڑی آگے بڑھ جائے گی اور پھر کچھ عرصے کے بعد پوری رفتار سے دوڑنے لگے گی۔''

''میرا اور فاروق کا ساتھ کب سے شروع ہو رہا ہے؟'' اس نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے علی الاعلان ایک بیوی کی حیثیت سے؟'' ہمارے درمیان یہ گفتگو گزشتہ سال دسمبر کے آخری ہفتے میں ہوئی تھی۔ میں نے مختلف سیاروں کی پوزیشن کا جائزہ لینے کے بعد جواب دیا۔

''میرا علم یہ بتاتا ہے کہ اگلے سال مئی کی اکتیس تاریخ سے پہلے کسی بھی وقت فاروق آپ کو اپنی بیوی کی حیثیت سے متعارف کروا دیں گے۔'' میں نے کہا۔ ''اور آپ کو اپنے تمام جائز حقوق حاصل ہو جائیں گے۔''

''اوہ.....'' وہ قدرے مایوس ہوگئی۔ ''ابھی پانچ ماہ مزید مجھے یہ عذاب جھیلنا ہوگا۔''

''آپ تو پچھلے دو سال سے غیر یقینی صورت حال میں سانس لے رہی ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''جہاں دو سال گزر گئے وہاں یہ پانچ ماہ بھی پر لگا کر اڑ جائیں گے۔''

''کیا اکتیس مئی سے پہلے سلمیٰ فاروق کی زندگی سے نکل جائے گی؟'' اس نے ایک اہم سوال کیا۔

''سلمیٰ..... سلمیٰ..... سلمیٰ.....'' میں نے سلمیٰ کے زائچے پر نگاہ ڈالی اور نورین سے پوچھا۔ ''کیا یہ عورت

گہرے سانولے رنگ کی بھاری بھر کم ہے؟''

''ایسی ویسی بھاری بھر کم......'' اس نے تمسخر اڑانے والے انداز میں کہا۔''اگر آپ نے پاکستان کی پرانی فلمیں دیکھی ہوں تو ماضی کی ایک اداکارہ چھن چھن آپ کو یاد ہوگی۔''

''جی بڑی اچھی طرح یاد ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''بس تو سلمٰی اسی چھن چھن کی کاپی ہے۔'' اس نے بتایا۔''میں نے اس کا نام کالی ماتا رکھا ہوا ہے۔''

''کسی کا نام رکھنا اچھی بات نہیں۔'' میں نے سرزنش کرنے والے انداز میں کہا پھر پوچھا۔''کیا سلمٰی اکثر بیمار رہتی ہے۔اسے پیٹ کی کوئی تکلیف ہے؟''

''جی' فاروق اکثر اس کی بیماری کا ذکر کرتا رہتا ہے۔'' نورین نے جواب دیا۔''اس کے مطابق سلمٰی مکر کرتی ہے' اسے پریشان کرنے کے لیے خوامخواہ بیماری کے بہانے کرتی رہتی ہے۔''

''میرا خیال ہے' وہ بہانے نہیں کرتی بلکہ وہ واقعی بیمار ہے۔'' میں نے ٹھہری سنجیدگی سے کہا۔''اور اسے مناسب علاج کی بھی ضرورت ہے' اگر آپ کہیں تو میں اس کے لیے ایک نسخہ تجویز کر دیتا ہوں۔''

''تو کیا آپ ڈاکٹر بھی ہیں؟'' وہ حیرت بھرے لہجے میں مستفسر ہوئی۔

''میں ڈاکٹر نہیں ہوں لیکن آسٹرولوجی کی ایک شاخ میڈیکل سے متعلق بھی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''جس میں ہم سیاروں کی مختلف پوزیشن سے انسانی جسم پر مرتب ہونے والے اثرات کا جائزہ لیتے ہیں جس سے مختلف بیماریوں کی نشان دہی ہوتی ہے اور ان کے علاج کے بارے میں راہ نمائی بھی ملتی ہے۔''

''بہت خوب۔'' وہ سراہنے والے انداز میں بولی۔ ''تو آپ سلمٰی کے لیے کس قسم کا علاج تجویز کر رہے ہیں؟''

''اگر سلمٰی روزانہ رات کو سونے سے پہلے ایک کپ سبز چائے میں دو چائے کے چمچ زیتون کا تیل اور دو انگلیوں کی ایک چٹکی ہلدی ملا کر پی لیا کرے تو اسے حیرت انگیز فائدہ ہوگا۔'' میں نے کہا۔''اس کے علاوہ وہ گاجر کے جوس اور کھمبیوں کا بھی مستقل استعمال جاری رکھے۔''

''ٹھیک ہے' جب فاروق میرے پاس آئے گا تو میں اسے آپ کی تجویز سے آگاہ کر دوں گی۔'' وہ مسکراہٹ بھرے انداز میں بولی۔''قریشی صاحب! آپ بھی کمال کرتے ہیں' میں سلمٰی سے نجات حاصل کرنے کی کوشش میں لگی ہوئی ہوں اور آپ اس کی صحت اور درازی عمر کے جتن کر رہے ہیں۔''

''ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔'' میں نے اس کے کانوں کے کیڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔ ''زندگی اور موت پر صرف اللہ کا اختیار ہے اور ڈاکٹر ہو یا کوئی بھی کنسلٹنٹ' جب وہ اپنی سیٹ پر بیٹھا ہوتا ہے تو کوئی اس کا دوست ہوتا ہے اور نہ دشمن۔ وہ اپنے پاس آنے والوں کی یک ساں داد رسی کرتا ہے لہٰذا اگر سلمٰی کی بیماری کا ذکر ہوگا تو میں اس کی صحت کی بحالی ہی کے لیے جتن کروں گا چاہے اس کے دشمن ہر پل اس کی موت کے خواہاں کیوں نہ ہوں۔''

''میں سلمٰی کی موت کی خواہش مند نہیں ہوں۔'' وہ جلدی سے بولی۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ میں نے اس کی بات کا بُرا منایا ہے۔

''بس میں یہ چاہتی ہوں کہ وہ میرے اور فاروق کے بیچ سے ہٹ جائے۔''

''آپ کو دو ٹوک اور کھری بات کرنے والے لوگ پسند ہیں۔'' میں نے اسی کے الفاظ دہراتے ہوئے کہا۔''لہٰذا میں آپ کی ناراضی کی پروا کیے بغیر یہ ضرور

کہوں گا کہ زمینی حقائق کے مطابق آپ نے بھی کافی غلطیاں کی ہیں مثلاً آپ نے جوان اولاد کی موجودگی میں زبردستی اپنے شوہر سے طلاق لی اور اولاد کو گنوایا۔ یہ ٹھیک ہے کہ آپ کا پہلا شوہر وحید کوئی اچھا انسان نہیں تھا لیکن اس میں اولاد کا کیا قصور انہیں آپ نے ماں سے محروم کر کے کس گناہ کی سزا دی ہے پھر فاروق کے ساتھ شادی کے معاملے میں بھی آپ سے کافی کوتاہیاں ہوئی ہیں۔"

"میں اپنی تمام غلطیوں اور کوتاہیوں کو مانتی ہوں۔" وہ ندامت بھرے لہجے میں بولی۔ "آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ میں پچھلے دو سال میں کتنا روئی ہوں۔" بولتے بولتے اس کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے پھر وہ سسک سسک کر رونے لگی۔

"آپ پچھلے دو سال میں یقیناً روئی ہوں گی لیکن یہ رونا آپ کی دوستوں یا اظہر جوکھیو یا وسیم قریشی کے سامنے سامنے ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اپنے جیسے بے بس اور لاچار انسانوں کے سامنے آنسو بہا کر انسان خود ہی کو بے وقعت کرتا ہے۔"

"پھر میں کیا کروں؟" وہ ٹشو پیپر سے اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے بولی۔

"اپنے خالق، اپنے مالک اور اپنے رازق کے سامنے روئیں، گڑگڑائیں۔" میں نے کہا۔ "بے شک وہی بگڑی کو بنانے والا ہے۔ میں، اظہر جوکھیو یا آپ کے دیگر خیر خواہ تو صرف مشورہ ہی دے سکتے ہیں۔ کرنے والی ذات تو صرف اللہ کی ہے اور وہ...... قادر مطلق ہے۔"

"آپ کی باتوں سے مجھے بہت حوصلہ ملا ہے قریشی صاحب!" وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔ "بس اتنا بتا دیں کہ سلمٰی سے مجھے نجات مل جائے گی نا؟"

بار بار اس کی سوئی سلمٰی پر آ کر اٹک جاتی تھی جب سے وہ میرے پاس بیٹھی تھی، مسلسل اپنی ایک انگوٹھی کے ساتھ کھیلتی بھی جا رہی تھی۔ یہ اس کے اندرونی اضطراب کا اظہار تھا اس کے سوال کا جواب دینے سے پہلے میں نے پوچھ لیا۔

"یہ زمرد آپ نے بہت عمدہ پہنا ہوا ہے مگر......؟"

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ اضطراری لہجے میں مستفسر ہوئی۔

"مگر کیا قریشی صاحب؟ کیا اس میں کوئی خرابی ہے؟"

"اس پتھر میں اگر کوئی عیب یا خرابی ہوتی تو میں اسے عمدہ کیوں کہتا؟"

"پھر...... پھر آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟" اس کی بے چینی بڑھ گئی۔

"کیا آپ نے یہ پتھر کسی کے مشورے سے پہنا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"جی، کافی عرصہ پہلے ایک صاحب نے بتایا تھا کہ زمرد میرا پیدائشی پتھر ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "بس اسی وقت سے میں نے پہنا ہوا ہے۔"

"اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ زمرد آپ کا برتھ اسٹون ہے۔" میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "مزاجاً زمرد ٹھنڈے پتھروں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ غصے کو کم کرتا ہے، اعصاب کو سکون بخشتا ہے، بلڈ پریشر کو قابو میں رکھتا ہے اور روحانی صلاحیت کو بڑھاتا ہے۔ آپ نے اسے اس کی متعلقہ دھات یعنی وائٹ گولڈ میں جڑوایا ہے لیکن اسے رنگ فنگر میں پہننا مناسب نہیں۔"

"اوہ......" وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ "کیا اس سے کوئی بھی فرق پڑتا ہے کہ کون سا پتھر کس انگلی میں پہنا جائے؟"

"اس کائنات میں کوئی بھی چیز بے مقصد اور بے معنی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "لہٰذا ہر چیز سے فرق تو لازمی پڑتا ہے۔" میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"ہر سیارے کا ایک پتھر مخصوص ہوتا ہے اور اس پتھر کو پہننے کے لیے انگلی بھی مخصوص ہوتی ہے بلکہ کس دن اس پتھر کو پہلی مرتبہ پہنا جائے یہ دن بھی مخصوص ہوتا ہے۔ میں زیادہ تفصیل میں تو نہیں جاؤں گا بس اتنا بتادوں کہ زمرد کو ہمیشہ عطارد یا زحل کی انگلی میں پہننا چاہیے اور اس کے لیے بدھ کا دن مخصوص ہے۔"

"عطارد اور زحل کی انگلیاں کون سی ہیں؟" اس نے سوال کیا۔

"چھنگلی عطارد کے لیے مخصوص ہے اور درمیانی انگلی زحل کی انگلی کہلاتی ہے۔" میں نے بتایا۔ "لہٰذا آپ اس انگوٹھی کو اگر چھنگلی یا درمیانی انگلی میں پہنیں تو حیرت انگیز اثرات مرتب ہوں گے۔"

"جی میں آپ کے مشورے کے مطابق عمل کروں گی۔" وہ فرماں برداری سے بولی۔

"ایک کام اور بھی کرنا ہے آپ کو۔" میں نے کہا۔ اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا میں نے بتایا۔ "مہینے میں ایک بار زمرد کی انگوٹھی کو اتار کر ایک رات کے لیے بکری کے کچے دودھ میں ڈبو دیا کریں۔"

"اس سے کیا ہوگا؟" نورین نے پوچھا۔

"سمجھ لیں اس کی سروس ہو جائے گی۔" میں نے کہا۔ "جس سے اس کی کارکردگی میں کئی گناہ اضافہ ہو جائے گا۔"

"اوہ فنٹاسٹک۔" وہ حیرت بھرے لہجے میں بولی۔ "کیا اسی طریقے سے میں دوسری انگوٹھیوں کی سروس بھی کر سکتی ہوں۔"

"نہیں......" میں نے قطعی لہجے میں کہا۔ "مختلف پتھروں کی سروس یا اوور ہالنگ کا طریقہ بھی جدا جدا ہے جیسے یاقوت کو لیموں کے رس میں ڈبونا مرجان کو صابن کے پانی ڈبو کر رکھنا اور فیروزہ کو کٹے ہوئے کھوپرے میں دبا کر رکھنا مفید ثابت ہوتا ہے پھر پہننے والے شخص کو ہر ماہ ایک رات کے لیے یہ عمل ضرور کرنا چاہیے۔"

"یہ تو باقاعدہ ایک سائنس ہے۔" وہ متعجب نظر سے مجھے تکنے لگی۔

"اللہ کی تخلیق کردہ ہر چیز میں سائنس موجود ہے۔" میں نے کہا۔ "بس اگر انسان غور و فکر کرے تو آپ نے تو وہ محاورہ سن یا پڑھ رکھا ہوگا۔"

"کون سا محاورہ قریشی صاحب؟" اس نے پوچھا۔

"No Pressure, No Diamond" میں نے کہا۔ "کیونکہ ہزاروں سال تک لاکھوں ٹن وزن کے نیچے دبا رہتا ہے اس کے بعد جا کر وہ ہیرا بنتا ہے اور ہیرا اس وقت دنیا کا سب سے زیادہ قیمتی پتھر ہے۔" اس کی قیمت انٹرنیشنل مارکیٹ میں ایک ہزار ڈالر فی کیرٹ سے شروع ہوتی ہے یعنی ایک لاکھ روپے فی کیرٹ اور مزے کی بات یہ ہے کہ ڈائمنڈ کو پتھروں میں شمار بھی نہیں کیا جاتا۔ جوہری اسے کاربن کا نام دیتے ہیں اس کی قدر و قیمت کا سہرا اس کی کٹنگ کے زاویے کے سر بندھتا ہے۔ ڈائمنڈ کا ہر کٹ ساٹھ درجے کا ہوتا ہے۔"

"قریشی صاحب! آپ کے پاس بیٹھ کر تو وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔" وہ رسٹ واچ پر نگاہ دوڑاتے ہوئے بولی۔ "مجھے باجی کی طرف بھی جانا تھا ان شاء اللہ آپ سے دوبارہ ملاقات ہوگی۔ بس آپ میری تسلی کے لیے اتنا بتا دیں کہ سلمٰی سے میری جان چھوٹ جائے گی نا اور کیا فاروق مجھے بیوی کی

حیثیت سے اپنے بنگلے پر لے جائیں گے نا۔"
"میں اس بات کی وضاحت تو نہیں کر سکتا کہ یہ معاملہ ہوگا کیسے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لیکن مجھے یقین ہے کہ اکتیس مئی کے بعد سلمٰی فاروق کے ساتھ نہیں ہوگی۔"
"مطلب طلاق' علیحدگی یا......؟" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔
"کچھ بھی ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔
"یعنی اس کی موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔" دل کی بات اس کی زبان تک آ ہی گئی۔ "مجھے پتا چلا ہے کہ وہ آج کل بہت زیادہ ڈرنک بھی کر رہی ہے۔ اسموکنگ تو وہ کئی سال سے کر رہی ہے۔"
"میں نے عرض کیا ہے نا کہ میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "بس یوں سمجھ لیں کہ اکتیس مئی 2015ء کے بعد سلمٰی مجھے فاروق کے ساتھ نظر نہیں آ رہی۔"
"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ فاروق اسے کسی اور ملک میں شفٹ کر دے۔" اس نے ایک امکان کی طرف اشارہ کیا۔ "اس طرح وہ فاروق سے دور ہو جائے۔"
"میں نے کہا نا' کچھ بھی ہو سکتا ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کسی بھی معاملے کے تاریک پہلوؤں کو بہت زیادہ کھوجنے لگتی ہیں جو اچھی بات نہیں' اپنی سوچ کو مثبت رکھیں اور اپنے خدا پر کامل یقین رکھیں' وہ آپ کے مسئلے کو یقیناً حل کر دے گا۔"
"ان شاء اللہ۔" اس نے کہا۔
میں نے پوچھا۔ "اس وقت آپ کا اسٹیٹس کیا ہے' مطلب یہ کہ آپ کے پاس صرف نکاح نامہ ہی ہے کہ یا آپ کسی اور ذریعے سے بھی خود کو فاروق کی بیوی ثابت کر سکتی ہیں۔ مائنڈ نہیں کیجیے گا جس طرح فاروق نے آپ کو سلمٰی کا جعلی طلاق نامہ دکھایا تھا تو آپ کا نکاح نامہ بھی تو جعلی ہو سکتا ہے نا؟"
"اس سلسلے میں' میں نے غلطی کی ہے اور نہ ہی کوئی کوتاہی۔" وہ بڑے فخر سے بولی۔ "آپ منطقی انداز میں سوچ رہے ہیں لیکن میں نے نکاح کے فوراً بعد رجسٹریشن آفس میں جا کر اپنی آنکھوں کے سامنے اس نکاح کا اندراج کروایا ہے اور ازاں بعد نادرا کے آفس میں بھی اپنے اسٹیٹس کو اپ ڈیٹ کروا لیا تھا۔ اس وقت میں اپنے شناختی کارڈ سے فاروق کی بیوی ہوں اور میرے پاسپورٹ پر بھی شوہر کے خانے میں فاروق ہی کا نام لکھا ہوا ہے۔"
"گڈ......" میں نے ستائشی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "یہ کام آپ نے بہت اچھا کیا ہے۔"
"میں کوئی بہت زیادہ ذہین عورت تو نہیں ہوں۔" وہ کسر نفسی سے کام لیتے ہوئے بولی۔ "بس کبھی کبھی دماغ چل پڑتا ہے اور میں درست فیصلے کر لیتی ہوں۔"
"اگر میں آپ کو کوئی تعویز دوں تو کیا آپ اسے اپنے پاس رکھ لیں گی؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
"تعویز۔" اس نے حیرت اور بے یقینی کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ "قریشی صاحب! کیا آپ بھی......"
"میں کوئی بابا وابا نہیں ہوں۔" میں نے اس کے ادھورے جملے کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔ "اور نہ ہی میرا تعویز ایک لاکھ روپے مالیت کا ہے۔ یہ تعویز میں آپ کو فری آف کاسٹ دوں گا لیکن اس کے لیے میری ایک کڑی شرط ہے۔"
"کیسی شرط قریشی صاحب؟" اس نے پوچھا۔
"آپ اس تعویز کو کبھی کھول کر نہیں دیکھیں گی۔" میں نے تنبیہ کرنے والے انداز میں کہا۔ "اور کسی سے

اس کا ذکر بھی نہیں کریں گی۔"

"منظور ہے۔ میں آپ کی ہدایت پر لازی عمل کروں گی۔" اس نے کہا۔ "اب یہ بھی بتادیں کہ آپ کا یہ جادوئی تعویز کرے گا کیا؟"

"یہ تعویز مختلف سیاروں کے اثرات کا حامل ہوگا۔" میں نے بدستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "اگر آپ نے اس تعویز کو اپنے پاس محفوظ کرلیا اور کبھی اسے کھول کر نہیں دیکھا اور نہ ہی کبھی کسی سے اس تعویز کا ذکر کیا تو یہ مجھے یقین ہے کہ میرا تعویز بہت جلد آپ کو آپ کی منزل کی اطلاع فراہم کرے گا۔"

"ونڈر فل۔" وہ پُر مسرت لہجے میں بولی۔ "میں اس تعویز کی اپنی جان سے زیادہ حفاظت کروں گی' کیا میں اسے اپنے پرس میں رکھ سکتی ہوں؟"

"بالکل رکھ سکتی ہیں۔" میں نے کہا۔

اس کے بعد میں نے ایک سادہ کاغذ پر چند سطریں تحریر کیں اور اسے تہہ کر کے ایک چھوٹے لفافے میں ڈالا یہ لفافہ میرے آفس کی اسٹیشنری کا حصہ تھا اور اس کے ایک کونے پر میرا نام اور پیشہ مع ٹیلی فون نمبر کے پرنٹ تھا۔ تعویز کو مذکورہ لفافے میں رکھنے کے بعد میں نے گلو اسٹک سے اسے بند کردیا اور احتیاطاً اس پر اسٹیپل پن بھی لگادیں۔ یہ اہتمام میں نے محض اس لیے کیا تھا کہ نورین کے ذہن میں یہ بات نقش ہوجائے کہ اگر اس نے لفافہ کھولا تو مجھے پتا چل جائے گا۔

اس نے تعویز والا لفافہ لے کر میرے سامنے اپنے قیمتی لیدر کے پرس کی ایک اندرونی پاکٹ میں رکھا پھر میرا شکریہ ادا کر کے دفتر سے رخصت ہوگئی۔

❁......❁......❁

چند روز بعد نورین نے مجھے فون کیا اور بتایا۔ "قریشی صاحب! میں نے ہوٹل چھوڑ دیا ہے۔"

اس نے اپنی مرضی سے ہوٹل میں رہائش اختیار نہیں کی تھی اور یقیناً چیک آؤٹ کا فیصلہ بھی اس کا ذاتی نہیں ہوسکتا تھا' وہ پوری طرح فاروق کے رحم و کرم پر جی رہی تھی تاہم میں نے پوچھ لیا۔

"ہوٹل چھوڑنے کی کوئی خاص وجہ؟"

"فاروق سے جھگڑا ہوگیا ہے۔" اس نے بتایا۔ "بس مجھے بہت غصہ آگیا تھا اور بات بڑھ گئی۔"

"میں نے آپ کو سمجھایا بھی تھا کہ اکتیس مئی تک آپ نے شانت رہنا ہے۔"

"میں کیا کروں قریشی صاحب؟" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "یہ شخص بس ٹال مٹول کررہا ہے' کبھی کوئی بہانہ تو کبھی کوئی بہانہ' مجھ سے اب برداشت نہیں ہوتا' سلمٰی نے اس کے بنگلے اور کاروبار کو پوری طرح اپنی مٹھی میں لے رکھا ہے اور میں ہوٹل میں بے سروسامانی کی زندگی گزار رہی ہوں۔" لمحے بھر کو رک کر اس نے سانس ہموار کی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولی۔

"فاروق سلمٰی سے بہت ڈرتا ہے' سلمٰی کے سامنے وہ بھیگی بلی بن جاتا ہے اور میرے سامنے آکر شیر کی طرح غرانے اور دہاڑنے لگتا ہے۔"

"فاروق سے آپ کا جھگڑا کس بات پر ہوا تھا؟" میں نے ایک اہم سوال کیا۔

"بس وہی پرانا موضوع ہے۔" نورین نے بتایا۔ "میں اس سے اپنے حقوق کی بات کررہی تھی اور وہ اپنی مجبوریاں گنوا رہا تھا کہ میں نے کہہ دیا آپ کو میری ذرا بھی پروا نہیں ہے' بس پھر وہ بھتے سے اکھڑ گیا۔" اس کی آواز بوجھل ہونے لگی' لمحاتی توقف کے بعد اس نے بتایا۔

"مجھ سے بہت زیادہ بدتمیزی کی' غصے میں بہت چیخا اور مجھے کھری کھری سناڈالیں کہ میں ایک احسان فراموش اور بے صبری عورت ہوں۔ مجھے اس کی

مجبوریوں کا احساس نہیں ہے پتا نہیں میں کس موڈ میں تھی کہ میں نے جو منہ میں آیا وہ بک دیا' وہ غصے سے اٹھا اور چلا گیا۔"

"اوہ......" میں نے ایک گہری سانس لی اور پوچھا۔ "اور آپ نے ہوٹل چھوڑ دیا' اب آپ کہاں ہیں؟"

"میں اب اپنی باجی کے گھر میں ہوں۔" اس نے بتایا۔ "وہ خالد بن ولید روڈ پر ایک بنگلے میں رہتی ہیں۔ کل رات فاروق نے فون کیا تھا وہ اس بات پر مجھ سے سخت ناراض تھا کہ میں نے ہوٹل کیوں چھوڑ دیا۔ اس نے بڑے واضح الفاظ میں مجھ سے کہہ دیا ہے اگر میں حالات نارمل ہونے کا انتظار نہیں کر سکتی تو پھر میں جہاں چاہوں چلی جاؤں وہ مجھے آزاد کر دے گا ہمیشہ کے لیے۔"

"پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بس میں تو آپ کی پیش گوئی پر تکیہ کیے بیٹھی ہوں۔" اس نے کہا۔ "مجھے بڑی شدت سے 31 مئی 2015ء کا انتظار ہے۔"

"آپ بالکل غلط کر رہی ہیں۔" میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "اگر آپ میری پیش گوئی پر تکیہ کیے بیٹھی ہوتیں تو پھر آپ کسی بھی صورت میری ہدایت کو فراموش نہ کرتیں۔ میں نے آپ کو تلقین کی تھی کہ بے صبر نہیں ہونا اور اکتیس مئی تک فاروق سے کوئی جھگڑا نہیں کرنا۔"

"پھر میں کیا کروں قریشی صاحب! اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔" وہ بے بسی سے بولی۔ "ادھر فاروق کے بنگلے میں سات آٹھ ٹاپ آرڈر گاڑیاں کھڑی ہیں' کالی ماتا عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ وہ فاروق کے کاروبار اور ہر چیز پر قابض ہے اور میں......" وہ بولتے بولتے رک گئی پھر قدرے سنبھلتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں کہیں کی نہیں رہی میرا سب کچھ ختم ہو گیا ہے اور فاروق ہر بار ایک نیا بہانہ کر کے مجھے ٹال دیتا ہے۔"

"جب انسان اپنی کشتیاں جلا کر میدان جنگ میں اترا ہو تو پھر اسے پلٹ کر پیچھے دیکھنا چاہیے اور نہ ہی آنسو بہانا چاہئیں بلکہ حالات جیسے بھی ہوں' ڈٹ کر ان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے قریشی صاحب! اب میں آپ کی ہدایت پر عمل کرنے کی کوشش کروں گی۔" اس نے ایک بار پھر وعدہ کرتے ہوئے کہا۔ "اگر کسی نے میرا دماغ خراب نہ کر دیا تو۔"

"مثلاً......کون آپ کا دماغ خراب کرتا ہے؟"

"بہت سارے لوگ ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"فاروق کے علاوہ اور کون ہے؟"

"ایک تو میری باجی ہی ہیں۔" اس نے بتایا۔ "اور دوسری دوست بھی ہیں۔"

"باجی آپ سے کیا کہتی ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ وہ کس طرح آپ کا دماغ خراب کرتی ہیں؟"

"میرے بہنوئی کے ایک کزن کینیڈا میں ہوتے ہیں۔" نورین نے بتایا۔ "ابھی حال ہی میں ان صاحب کی تازہ تازہ طلاق ہوئی ہے ان کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ نہایت ہی معقول اور شریف انسان ہیں وہ باجی کا اصرار یہ ہے کہ میں فاروق کو چھوڑ دوں اور ان صاحب سے شادی کر لوں۔"

"پھر آپ نے باجی سے کیا کہا؟" میں نے پوچھا۔

"قریشی صاحب! میری شادی ہوئی یا کوئی مذاق ہو گیا" وہ تیز آواز میں بولی۔ "میں نے باجی سے

صاف اور دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ میں ہر قیمت پر فاروق کو حاصل کر کے رہوں گی۔ اس کے بعد باجی کے رویے میں سرد مہری آ گئی ہے' انہیں میرا انکار پسند نہیں آیا۔ دوسری دوست بھی ایک ایک کر کے مجھے چھوڑ چکی ہیں' بس اب صرف ایک دوست سے میرا رابطہ ہے جو اسلام آباد میں رہتی ہے اس کا نام شمائلہ ہے۔ شمائلہ کا بھی یہی کہنا ہے کہ فاروق کبھی بھی سلمٰی کو طلاق نہیں دے گا اور نہ ہی وہ شخص مجھے کبھی بیوی کا مقام دے گا۔ شمائلہ نے مجھے کینیڈین صاحب سے شادی کا مشورہ تو نہیں دیا تاہم اسے اس بات کا یقین ہے کہ فاروق کبھی مجھے وہ عزت اور مقام نہیں دے گا جس کی میں اس سے توقع رکھتی ہوں' آپ کیا کہتے ہیں قریشی صاحب!'' اپنی بات کے اختتام پر اس نے میرے لیے ایک سوال چھوڑ دیا تھا' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

اپنی بات کے اختتام پر اس نے میرے لیے ایک سوال چھوڑ دیا تھا۔ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''نورین جی! اگر آپ روزانہ مجھ سے دس بار بھی یہ سوال کریں گی تو میرا جواب یہی ہوگا کہ اکتیس مئی کے بعد سلمٰی مجھے فاروق کے ساتھ نظر نہیں آتی اور یہ کہ فاروق آپ کو آپ کے تمام جائز حقوق ضرور دے گا۔''

''کبھی کبھی تو میرا جی چاہتا ہے کہ خودکشی کرلوں۔'' وہ جذباتی لہجے میں بولی۔ ''ایسی زندگی سے تو موت اچھی ہے۔''

''خودکشی حرام ہے نورین جی!'' میں نے کہا۔ ''لیکن اگر آپ نے خودکشی کا ارادہ کر ہی لیا ہے تو میں آپ کو روکوں گا نہیں' بس اتنی عرض ضرور کروں گا کہ.....'' میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ تڑپ کر بولی۔

''کہ.....کیا؟''

''کہ یہ کہ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اکتیس مئی کے بعد کی کسی تاریخ کا انتخاب کیجیے گا۔''

''آپ کو اپنی پیش گوئی پر اس قدر پختہ یقین ہے؟'' وہ حیرت بھرے لہجے میں بولی۔

''اس کائنات میں سارا کھیل ''یقین'' ہی کا تو ہے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ کو یقین ہے کہ خدا ہے تو آپ کے لیے خدا ہے اور وہی خدا آپ کے سارے کام کر رہا ہوتا ہے۔ ایک اتھیز ATHIES (منکر خدا) کو یقین ہے کہ خدا نہیں ہے لہٰذا وہ خدا سے کوئی توقع بھی نہیں رکھتا۔ اپنے سارے کام خود ہی نمٹا لیتا ہے کسی بھی کام کے لیے وہ خدا کی طرف نہیں دیکھتا۔''

''حقیقت کیا ہے قریشی صاحب!'' اس نے پوچھا۔ ''کیا خدا ہے؟''

''یس..... خدا ہے۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''کوئی اسے مانے یا نہ مانے' اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا' فرق اس وقت پڑتا ہے جب آپ خدا کو کسی مادی شے کی طرح تصور کرتے ہیں اور اسے سمجھنے کے لیے خارجی راستے اختیار کرتے ہیں۔ میرا خدا تو نہ مسجد میں ہے اور نہ ہی ساتویں آسمان پر۔ وہ میرے اندر ہے' وہ میرا کل ہے میں اس کا جز ہوں۔ خدا کے وجود سے انکار اپنی ذات سے انکار ہے اور جو شخص اپنی ذات کو پہچان لیتا ہے' وہ اپنا خدا کو پا لیتا ہے۔ خدا اس کائنات کے ذرّے ذرّے اور پتے پتے میں جلوہ گر ہے' بس دیکھنے والی آنکھ ہونا چاہیے۔ وہ بصارت سے نہیں' بصیرت سے دکھائی دیتا ہے' کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

آنکھ ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر
منہ نظر آتے ہیں دیواروں کے بیچ

نورین نے میرا شکریہ ادا کیا اور فیس ادا کرنے کے

لیے میرا اکاؤنٹ نمبر مانگ لیا۔ میں نے اسے اکاؤنٹ نمبر دینے میں کوئی تامل نہیں کیا کیوں کہ میں کسی سیانے کے اس قول کا قائل ہوں۔

''دولت کے پیچھے کبھی بھاگو نہیں اور جب یہ خود دستک دے تو اس کی راہ میں روڑے نہیں اٹکاؤ۔''

❀......❀......❀

اس سال فروری کے اختتام پر نورین مجھ سے ملنے آئی' اس کی دیگر خوبیاں اپنی جگہ لیکن ایک اصول یہ بھی تھا کہ وہ جب بھی میری سروس لیتی تھی تو فیس ضرور ادا کرتی تھی' آج وہ خاصی خوش نظر آرہی تھی۔ میں نے پوچھا۔

''کوئی خاص خبر۔''

''اگلے مہینے میں عمرے پر جا رہی ہوں فاروق کے ساتھ۔'' اس نے بتایا۔

''اوہ یہ تو بڑی سعادت کی بات ہے۔'' میں نے کہا۔

''میری طرف سے آپ کو ایڈوانس میں مبارک ہو۔''

''جی شکریہ قریشی صاحب!'' وہ تشکرانہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''حالات میں کچھ ہل جل تو ہو رہی ہے۔''

''کیسی ہل جل؟'' میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''کل میں ٹریول ایجنٹ کے پاس گئی تھی۔'' وہ بتانے لگی۔ ''یہ ٹریول ایجنٹ سال ہا سال سے فاروق کے ساتھ منسلک ہے۔ فاروق اپنے تمام ٹکٹ اسی سے بنواتا ہے اور ویزا وغیرہ کے معاملات بھی اسی ایجنٹ کے توسط سے انجام پاتے ہیں۔ فاروق ہی نے مجھے اس کے پاس بھیجا تھا کہ میں عمرے کے ویزا کے لیے پاسپورٹ اسے دے دوں۔'' وہ تھوڑی دیر کے لیے رکی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

''جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میں نے اپنا شناختی کارڈ اور پاسپورٹ فاروق کی بیوی کی حیثیت سے بنوالیا ہے تو وہ ٹریول ایجنٹ میرے پاسپورٹ پر فاروق کا نام دیکھ کر پہلے تو بہت حیران ہوا اس کے بعد بھابی بھابی کہتے ہوئے اس نے مجھے پورا پروٹوکول دیا۔'' ائرپورٹ تک تو ہم الگ الگ جائیں گے لیکن جہاز میں ساتھ ہوں گے۔''

''مطلب یہ کہ آپ کی اور فاروق کی شادی کی خبر خود بخود منظر عام تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور آپ کی نظر میں یہ ہل جل ہے۔''

''جی بالکل۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''میں نے اسی ہل جل کی بات کی ہے۔''

''ہل جل ہو یا ہل جل اگر از خود ہوتا ہے تو پھر ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ نے اپنے طور پر کوئی کوشش نہیں کرنا۔''

''جی میں آپ کی بات سمجھ رہی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''شمائلہ نے بھی ایک آئیڈیا دیا تھا لیکن میں نے انکار کر دیا۔''

''آپ اپنی اسلام آباد والی دوست کی بات کر رہی ہیں نا؟''

''جی وہی شمائلہ۔'' اس نے تائیدی انداز میں کہا۔

''شمائلہ نے آپ کو کیا آئیڈیا دیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''شمائلہ کا خیال ہے کہ اگر کسی طرح سلمٰی کو اس بات کا یقین دلا دیا جائے کہ فاروق نے مجھ سے شادی کر لی ہے تو اس کے بہت اچھے نتائج برآمد ہوں گے۔''

''شمائلہ نے ان اچھے نتائج کی تفصیل بھی بتائی ہوگی؟'' میں نے پوچھا۔

"جی بالکل بتائی ہے۔" اس نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ "اس کا کہنا ہے کہ اگر سلمٰی کو یقین آ گیا کہ فاروق نے مجھ سے شادی کرلی ہے تو وہ کالی ماتا گھر میں ایک ہنگامہ کھڑا کردے گی اور اس کے بعد وہ فاروق سے طلاق کا مطالبہ کردے گی' اگر کالی ماتا نے طلاق کے لیے اصرار کیا تو فاروق انکار نہیں کر سکے گا کیوں کہ فاروق اس سے ڈرتا ہے۔"

"فاروق' سلمٰی سے ڈرتا ہے اور آپ کو ڈراتا ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن سلمٰی' فاروق سے نہیں ڈرتی چنانچہ اگر اس آئیڈیا کے نتائج شمائلہ کی توقع کے بالکل برعکس ہوئے تو پھر کیا ہوگا۔"

"میں سمجھی نہیں قریشی صاحب!" وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔

"میں سمجھاتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "بہت سیدھی سی بات ہے' اگر آپ کی اور فاروق کی شادی سے بھڑک کر سلمٰی نے فاروق سے یہ مطالبہ کردیا کہ وہ آپ کو طلاق دے دے تو پھر کیا ہوگا؟ وہ ایسی ضد بھی تو کرسکتی ہے۔"

"ہاں واقعی......" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "اس طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔"

"اپنے دھیان کو گیان کے ساتھ جوڑ کر رکھیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اکتیس مئی تک کسی مہم جوئی کی ضرورت نہیں' اس کے بعد جو دل چاہے ضرور کیجیے گا' ہاں البتہ......" میں نے تھوڑا توقف کر کے اس کی خوب صورت آنکھوں میں جھانکا اور کہا۔

"اگر قدرت کی طرف سے خود ہی کوئی چچوئشن بنتی ہے جس سے آپ کی خفیہ شادی منظر عام پر آجاتی ہے تو پھر ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ کو فاروق کی نظر میں ڈبل فالٹر نہیں ہونا' اس کی خواہش پر آپ نے شادی کی خبر کو خفیہ رکھا ہوا ہے' اسے یہ موقع نہیں ملنا چاہیے کہ آپ کی وجہ سے کام خراب ہوا ہے اور یہ احتیاطاً آپ کو اکتیس مئی تک برتنا ہے۔"

"جی' میں خیال رکھوں گی۔" اس نے یقین دہانی کرائی' کچھ دیر کے بعد وہ رخصت ہوگئی۔

میں روزمرہ کے معمولات میں مصروف ہوگیا' کافی دنوں تک نورین نے مجھ سے رابطہ نہیں کیا۔ یہ بات تو میرے ذہن میں تھی کہ وہ عمرہ کرنے جارہی تھی لہٰذا میں اس کی طرف مطمئن تھا۔

اپریل کے مہینے میں وہ مجھ سے ملنے آئی' میں نے اسے عمرے کی مبارک باد دی اور پوچھا۔

"آج کل کیا چل رہا ہے؟"

"بس وہی چل رہا ہے جو پہلے تھا۔" اس نے بتایا۔ "میں جب عمرہ کرنے گئی تھی تو اس وقت اپنی باجی کے گھر میں تھی' فاروق نے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ واپسی پر وہ میرے لیے کسی مناسب رہائش کا بندوبست کردے گا۔ آج کل میں نئے گھر کی سیٹنگ میں لگی ہوئی ہوں۔"

"تو کیا فاروق نے آپ کو نیا گھر خرید کردیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"خرید کر تو نہیں دیا' کرائے ہی کا اپارٹمنٹ ہے۔" اس نے بتایا۔ "لیکن بہت اچھی لوکیشن پر ہے' تین تلوار کے قریب ہے اور کھڑکیوں میں سے سمندر کا نظارہ کیا جاسکتا ہے۔"

"بہت خوب۔" میں نے کہا۔ "اور فاروق کے ساتھ تعلق کیسے چل رہے ہیں؟"

"نارمل ہی ہیں۔" اس نے بتایا۔ "ہفتے میں ایک آدھ رات کے لیے وہ میرے پاس آجاتا ہے' گزشتہ ایک اس نے ایک عجیب بات بتائی ہے۔"

"کیسی عجیب بات؟" میں نے پوچھا۔

"اس کا کہنا ہے کہ جب بھی وہ میرے پاس آنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے ذہن میں عجیب سی کشمکش کا آغاز ہو جاتا ہے۔" نورین نے بتایا۔ "اس کا دل بار بار واپس جانے کو کہتا ہے اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی اس کی سوچ کو کنٹرول کر رہا ہو۔"

"پھر اس سے آپ نے کیا نتیجہ اخذ کیا ہے؟" میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"مجھے تو سلمٰی پر شک ہو رہا ہے۔" وہ رازدارانہ لہجے میں بولی۔

"کیسا شک؟"

"وہ فاروق پر کوئی سفلی وغیرہ کروا رہی ہے۔" نورین نے دبی دبی زبان میں بتایا۔ "یہ کالی ماتا اس قسم کے چکروں میں بہت رہتی ہے فاروق بتا رہا تھا کہ کالی ماتا ایک شاہ صاحب کی بہت معتقد ہے اور انہی شاہ صاحب کے بتائے ہوئے عمل وغیرہ بھی پڑھتی رہتی ہے آپ ذرا کالی ماتا کا زائچہ تو چیک کریں۔"

کالی ماتا سے اس کی مراد فاروق کی پہلی بیوی سلمٰی تھی اس نے جب پہلی مرتبہ سلمٰی کے لیے کالی ماتا کے الفاظ استعمال کیے تھے تو میں نے اسے ٹوک دیا تھا کہ کسی کا نام رکھنا اچھی بات نہیں ہوتی لیکن اس نے میری سرزنش کو سنجیدگی سے نہیں لیا تھا اور جب بھی سلمٰی کا ذکر ہوتا تو وہ گاہے بگاہے یہ الفاظ استعمال کر لیتی تھی۔ میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا' ظاہر ہے وہ کوئی ننھی بچی تو نہیں تھی جو میں زبردستی اپنی بات منوانے کی کوشش کرتا۔ میں چند لمحات تک سلمٰی کے زائچے کا مطالعہ کرتا رہا پھر نورین سے کہا۔

"میرے حساب کے مطابق سلمٰی کو ابھی تک یہ نہیں معلوم کہ فاروق نے آپ سے شادی کر لی ہے لہٰذا جب اسے آپ کی شادی کا پتا نہیں تو پھر وہ آپ پر یا فاروق پر کسی قسم کا سفلی کیوں کرائے گی چنانچہ آپ اپنے ذہن کو تمام منفی خیالات سے آزاد کر دیں' جو بھی ہوگا اچھا ہی ہوگا۔"

"اللہ کرے اچھا ہی ہو۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی' پھر پوچھا۔ "ذرا میرا زائچہ دیکھ کر بتائیں کہ کیا سترہ مئی کو فاروق میرے پاس آئیں گے یا نہیں؟"

"سترہ مئی؟" میں نے ٹیبل کلینڈر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "سترہ مئی کو ایسی کیا خاص بات ہے' وہ اتوار کا دن ہوگا؟"

"سترہ مئی کو کونڈے ہیں۔" اس نے بتایا۔ "فاروق کے بنگلے پر ہر سال کونڈے بڑے اہتمام کے ساتھ منائے جاتے ہیں اور پورا دن فاروق اپنے گھر پر ہی رہتا ہے لیکن میری یہ خواہش ہے کہ اس سال فاروق کونڈے میرے گھر پر کرے۔" نورین کا سوال ایسا تھا کہ آسٹرولوجی کی مدد سے اس سوال کا جواب نہیں دیا جا سکتا تھا تاہم میں نے اس کا دل توڑنا مناسب نہ سمجھا اور کہا۔

"میرے علم کے مطابق اس سال آپ کی یہ خواہش ضرور پوری ہوگی۔" وہ خوشی خوشی میرے دفتر سے رخصت ہوگئی۔

بعض لمحات ایسے ہوتے ہیں کہ اس وقت انسان کی زبان سے جو بھی نکلے وہ پورا ہو جاتا ہے یا یوں کہہ لیں کہ جب کسی کام کے ہونے کا وقت آجاتا ہے تو اس کا ذکر کسی بھی شخص کی زبان سے پھسل جاتا ہے۔

مئی کے دوسرے ہفتے میں نورین میرے پاس آئی اور اس نے بتایا کہ سلمٰی امریکا جا رہی ہے۔

"فاروق علاج کے لیے اسے امریکا بھیج رہا ہے۔" اس نے کہا۔ "سلمٰی کے ساتھ کوئی سیریس ایشو ہے۔"

"کیسا ایشو؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تو فاروق نے نہیں بتایا۔" وہ بولی۔ "مگر وہ مجھے کافی الجھا ہوا لگا ہے کہہ رہا تھا' سلمٰی کم از کم ایک ماہ تک

امریکا میں رہ کر اپنا علاج کرائے گی یعنی اس کی واپسی جون میں ہوگی اور میں اس سال فاروق کے ساتھ کونڈے منا سکوں گی' آپ نے بالکل درست پیش گوئی کی تھی۔"

وہ اس بات کو لے کر بہت خوش ہو رہی تھی کہ اس سال کونڈوں پر سلمٰی کراچی میں نہیں ہوگی لیکن میرا ذہن کسی اور انداز میں سوچ رہا تھا۔

"کیا آپ نے وہ نسخہ سلمٰی تک پہنچا دیا ہے؟" میں نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

"کون سا نسخہ قریشی صاحب!" وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔

"بھئی وہی سبز چائے' زیتون کے تیل اور ہلدی والا۔" میں نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی۔

"اوہ..... وہ تو میں بھول ہی گئی۔" وہ خجالت آمیز لہجے میں بولی۔ "اصل میں پچھلے دنوں میرے اپنے حالات ایسے دگرگوں رہے کہ میں کسی اور چیز پر توجہ ہی نہیں دے سکی۔"

"چلیں کوئی بات نہیں۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "اب آپ کونڈوں کی تیاری میں لگ جائیں' سترہ مئی کو آپ کی سوتن کراچی میں نہیں ہوگی۔"

❁.....❁.....❁

بائیس مئی کو میں نے اپنے آفس میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ نورین کی کال آ گئی' وہ خاصی گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی' رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے پوچھا۔

"سب خیریت تو ہے نا؟"

"قریشی صاحب! آپ کی پیش گوئی اکتیس مئی سے پہلے ہی پوری ہوگئی ہے۔" اس نے بتایا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" میں نے پوچھا۔

"سلمٰی فاروق کو چھوڑ کر بہت دور چلی گئی ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "اب وہ کبھی بھی فاروق کے ساتھ کسی کو نظر نہیں آئے گی' اس کی ڈیتھ ہوگئی ہے..... وہاں امریکا کے ایک اسپتال میں' فاروق گزشتہ رات کی فلائٹ سے گیا ہے۔"

"موت کا سبب کولن کینسر تھا نا؟" میں نے بے ساختہ پوچھا۔

"کولن کینسر....." وہ چونک اٹھی۔ "بالکل اس کی موت کولن کینسر سے واقع ہوئی ہے مگر آپ کو یہ بات کس نے بتائی ہے؟"

"میرے علم نے....." میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیا مطلب..... میں سمجھی نہیں؟" وہ الجھ کر رہ گئی۔

"اس وقت آپ کہاں ہیں؟" اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے میں نے اس سے پوچھ لیا۔

"اپنے اپارٹمنٹ پر ہوں۔" اس نے بتایا۔

"اور آپ کا وہ پیور لیدر پرس کہاں ہے جس میں آپ نے میرا دیا ہوا تعویز رکھا تھا؟"

"میرے قریب ہی رکھا ہے۔"

"آپ اس لفافے کو کھولیں جس میں وہ تعویز رکھا ہوا ہے۔" میں نے کہا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی الجھی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"قریشی صاحب! میں نے لفافہ کھول کر اس میں سے تعویز نکال لیا ہے۔"

"اب آپ اس تہہ شدہ تعویز کو کھول کر دیکھیں۔"

"جی....." اس نے کہا پھر چند سیکنڈ کے بعد بتایا۔

"میں نے تعویز کھول لیا ہے مگر یہ کوئی تعویز نہیں۔"

"پھر کیا ہے؟" میں نے انجان بن کر استفسار کیا۔

"یہ تو کسی رقعہ کی تحریر ہے۔" اس نے بتایا۔ "جو آپ نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے لکھا ہے۔"

"اس تحریر کو پڑھ کر سنائیں۔" میں نے کہا۔

"نورین جی!" اس نے میری تحریر مجھے ہی سنانی شروع کی۔ "سلمٰی کے زائچے کے چھٹے گھر میں زحل، مشتری اور کیتو ایک ہی ڈگری پر نجوگے بنا رہے ہیں۔ ان کا یہ ملن آسٹرولوجی کی زبان میں قران کہلاتا ہے۔ مشتری اور زحل کا قران سرطان کا مرض پیدا کرتا ہے اور اگر ان کے ساتھ مریخ یا کیتو بھی شامل ہو جائے تو پر سرطان سو فیصد ہوتا ہے چونکہ یہ قران زائچے کے چھٹے گھر میں ہے جو پیٹ کی خصوصاً آنتوں اور معدے کی نمائندگی کرتا ہے لہٰذا مجھے اس امر میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ سلمٰی اس وقت کولن کینسر (بڑی آنت کا سرطان) میں مبتلا ہے اور آج کل زحل اور مریخ کا جو ٹرانزٹ چل رہا ہے اس کو دیکھتے ہوئے میں کہہ سکتا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ مزید پانچ ماہ تک سلمٰی زندہ رہے گی اور اکتیس مئی سے پہلے کسی بھی وقت اس کا بلاوا آسکتا ہے۔ میں نے اسی لیے آپ کو اکتیس مئی تک صبر کرنے کے لیے کہا تھا اور میں نے سلمٰی کے لیے آپ کو جو نسخہ لکھ کر دیا تو وہ کولن کے سرطان میں بہت اچھا کام کرتا ہے۔" اس نے تحریر ختم کی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس دوران میں نم ناک آواز میں بولتی جارہی تھی۔

"فاروق نے اپنی بیوی کی بیماری کو مجھ سے چھپا کر رکھا ہوا تھا' رات اس نے امریکا روانہ ہونے سے پہلے بتایا کہ سلمٰی کا مرض آخری اسٹیج پر تھا اور وہ جانتا تھا کہ اس کی زندگی زیادہ نہیں ہے اسی لیے وہ ہماری شادی کا اعلان کر کے سلمٰی کو کوئی صدمہ نہیں دینا چاہتا تھا' پورے خلوص نیت کے ساتھ اس نے مجھ سے شادی کی تھی لیکن سلمٰی ڈاکٹروں کے دیئے گئے وقت سے دو سال زیادہ جی گئی۔ اس دوران میں' میں فاروق پر شادی کے اعلان کا دباؤ ڈالتی رہی اور وہ اپنی مشکلات میں گھرا رہا اسی لیے وہ میری باتوں پر جھنجلا جاتا تھا اور بعض اوقات اعصاب پر اس کا قابو نہیں رہتا تھا اور وہ بدتمیزی پر اتر آتا تھا۔ اس نے امریکا جانے سے پہلے ساری باتوں کا اقرار کیا ہے اور اپنے سابق دو سال کے رویے پر مجھ سے معافی بھی مانگی ہے اور یہ یقین دلایا ہے کہ ان شاءاللہ بہت جلد ہم دنیا والوں کی نظر میں بھی ایک ہو جائیں گے۔"

"یہ ایسا موقع نہیں کہ میں آپ کو بہ بانگ دہل مبارک باد دوں۔" میں نے کہا۔ "ان شاءاللہ پھر کبھی یہ فرض ادا کردوں گا۔"

"فاروق میرے ساتھ فیئر تھا۔" وہ ایک مرتبہ پھر بلک اٹھی۔ "میں نے ہی اسے غلط سمجھا تھا اور اس سے جھگڑا کرتی رہی۔ وہ سلمٰی کی بیماری کی وجہ سے بہت زیادہ چڑچڑا ہو گیا تھا۔ کاش میں اس کی باتوں پر ری ایکٹ نہ کرتی' خیر...... قدرت کے کاموں میں بھی کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔"

میں نے اسے تسلی دلاسا دے کر چپ کرا دیا' اس کی تمنا کی تکمیل ہو گئی تھی۔ اس بات میں کسی شک کی گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی کہ قدرت کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے اگر انسان قدرت کی مصلحتوں کو سمجھ جائے یا اپنے اندر انہیں سمجھنے کا عزم پیدا کرلے تو یہ دنیا یوٹوپیا بن سکتی ہے۔

ذوقِ آگہی

سباس گل

قارئین کرام! آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ نئے افق میں شائع ہونے والا کالم "ذوقِ آگہی" [illegible] معروف مصنفہ اور شاعرہ سباس گل اپنی نگرانی میں مرتب کریں گی۔ سباس گل کا مختصر تعارف حاضر خدمت ہے۔

اسلام علیکم قارئین! "ذوقِ آگہی" میں [illegible] پیدائش اور رہائش رحیم یار خان ہے۔ لکھنے کا شوق بچپن سے ہی تھا 15 سال سے ڈائجسٹ میں تحریر کر رہی ہیں۔ 200 سے زیادہ ناول، افسانے لکھ چکی ہیں [illegible] 8 ناول [illegible] میں آ چکے ہیں۔ 9 [illegible] کتب [illegible] شاعری [illegible] [illegible] خوشی ہے۔

zooqeaagahi@gmail.com
www.facebook.com/naeyufaqonlinemagzine

محترم قارئین! آپ کے ذوق کو دیکھتے ہوئے ادارہ "نئے افق" نے منتخب اقتباس پر انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

کوئی مانگے تو سہی
(انعام یافتہ)

رات کے پچھلے پہر
سب جہانوں کا خدا
دے رہا تھا صدا
کوئی پکارے تو مجھے
وہ ذکر اس کی سنوں
کوئی مانگے تو سہی!
جھولیاں بھر بھر کر دوں
کوئی توبہ تو کرے
معاف میں جھٹ سے کروں
اور ہم نیند میں
اس صدا سے بے خبر......
اس خدا سے بے خبر
جنتوں کی چاہ میں خواب دیکھتے رہے
اور......
سورج کی تپش اپنے گھر تک آ گئی
اپنے سر تک آ گئی

آسیہ اشرف......گنگا پور

سبز گنبد

سبز گنبد جو دیکھو گے زمانہ بھول جاؤ گے
کبھی جو طیبہ جاؤ گے تو آنا بھول جاؤ گے
تمہارے سامنے ہوگا کبھی جب گنبد خضراء
نظر جم جائے گی اس پر ہٹانا بھول جاؤ گے
نہ اتراؤ زیادہ حسن پر اے چاند تاروں تم
رخ انور کے آگے جگمگانا بھول جاؤ گے
نبی ﷺ کے در کی سوکھی روٹیوں میں ایسی لذت ہے
شہنشاہوں کے در کا آب و دانہ بھول جاؤ گے

علمہ شمشاد حسین......کورنگی کراچی

ایک بے وفا فرزند کا قصہ

حضرت سعدی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ایک دفعہ میں ایک ضعیف العمر آدمی کا مہمان تھا جو بہت مال اور ایک خوب صورت لڑکا رکھتا تھا۔ رات کو اس نے سنایا میری تمام عمر میں سوائے اس لڑکے کے اور کوئی بچہ نہیں ہوا۔ اس جنگل میں ایک جگہ پر لوگ مرادیں مانگنے جاتے ہیں میں نے بھی وہاں جا کر خدا

کی بارگاہ میں دیر دیر تک گڑگڑا کر دعا کی ہے تب خدا نے مجھ کو یہ بیٹا عطا کیا ہے۔ میں نے سنا وہ بیٹا اپنے دوستوں سے آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ کیا اچھا ہوتا مجھے وہ جگہ معلوم ہو جاتی تاکہ میں وہاں جا کر باپ کے مرنے کی دعا کرتا۔ (گلستان ص ۱۷۹)

فائدہ: باپ کو بوجھ سمجھنے والا بیٹا اپنی اولاد سے کیا خیر کی امید رکھ سکتا ہے۔

مرسلہ: گل خان...... مانسہرہ

ایک نجومی کا قصہ

ایک نجومی (آسمان کے ستارے دیکھ کر لوگوں کو اچھے بُرے نصیب کی خبر دینے والا) اپنے گھر میں داخل ہوا' ایک غیر آدمی کو اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھا ہوا دیکھا۔ اس نے گالی دی اور سخت سست کہا' دونوں لڑ پڑے ایک فتنہ اور ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ ایک اللہ والے کو معلوم ہوا تو اس نے کہا: تو کیا جانے آسمان کی بلندی پر کیا ہے جب تو یہ نہیں جانتا کہ تیرے گھر میں کون ہے؟ (گلستان ص ۱۴۳)

فائدہ: علم نجوم ظنی علم ہے اس لیے نجومیوں کی باتوں پر اعتقاد نہیں کرنا چاہیے۔

مرسلہ: محمد امجد...... سیالکوٹ

دو بھائیوں کا قصہ

ایک سردار کے دو لڑکے مصر میں تھے۔ ایک نے علم حاصل کیا' دوسرے نے مال جمع کیا۔ آخر کار ایک بہت بڑا عالم بن گیا اور دوسرا بادشاہ ہو گیا۔ اس کے بعد یہ مال دار اپنے بھائی عالم کی طرف ذلت کی نظر سے دیکھتا تھا اور کہتا تھا کہ میں سلطنت تک پہنچ گیا اور تو ویسے ہی عاجزی اور غربت میں رہا۔ اس عالم نے جواب دیا: اے بھائی! اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر مجھ پر تجھ سے زیادہ واجب ہے اس لیے کہ میں نے پیغمبروں کی میراث یعنی علم حاصل کیا اور تجھ کو فرعون اور ہامان کی میراث ملی یعنی ملک مصر کی بادشاہت۔ (گلستان ص ۱۰۶)

فائدہ: قناعت (تھوڑے پر مطمئن رہنا) بڑی نعمت ہے اس کے ذریعہ غریب بھائی نے علم نبوت کی دولت حاصل کر لی تھی۔

مرسلہ: عبدالرشید...... پشاور

کھٹے میٹھے ٹوٹکے

❖ اگر آپ کا وزن زیادہ ہے اور لوگ آپ پر ہنستے ہیں نیز آپ پتلا ہونا چاہتی ہیں تو نیوز چینل باقاعدگی سے دیکھیں' امید ہے وزن کم ہوگا۔

❖ اگر آپ کو خوش گوار خواب نظر نہیں آتے اور ڈر لگتا ہے تو سونے سے پہلے آئینہ ضرور دیکھیں' کبھی ڈر نہیں لگے گا۔

❖ اگر آپ چھوٹے بچے ہیں' گلی کا کوئی انکل یا بزرگ آپ کو بلاوجہ ڈانٹتا ہے تو مسکرا کر ڈھیٹ بن کر ڈانٹ سنیں اور ذرا دور جا کر کانوں سے ٹشو نکال لیں۔

❖ اگر آپ میٹھے خواب دیکھنا چاہتی ہیں تو سونے سے پہلے آنکھوں میں چینی ڈال لیا کریں اس سے آپ کو میٹھے خواب نظر آئیں گے۔

❖ اگر آپ کے شوہر گھر سے زیادہ تر باہر رہتے ہیں بلکہ اکثر راتوں کو بھی غائب ہو جاتے ہوں تو فکر نہ کریں' اپنے آپ کو خوش رکھیں اور ہر وقت خوب بن سنور کر تیار رہیں' شوہر گھبرا کر گھر پر رہنا شروع کر دیں گے۔

❖ اگر آپ کھانا بناتے ہوئے اکثر جلا دیتی ہیں اور گھر والوں کے طعنے سننے پڑتے ہیں تو گھبرائیں نہیں' جلے ہوئے سالن کو باربی کیو کا نام دے کر پیش کریں' اس طرح گھر والوں کی جلن بھی ختم ہو گی اور سالن کی بھی۔

انتخاب: اکبر چوہدری...... گجرات

☺

خوشبوئے سخن

نوشین اقبال نوشی

قارئین کرام آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ خوشبوئے سخن کے کالم اس ماہ سے ملک کی معروف شاعرہ نوشین اقبال نوشی اپنی نگرانی میں مرتب کریں گی۔ ان کا مختصر تعارف حاضر خدمت ہے۔

میرا حوالہ، پہچان نوشین اقبال نوشی ہے۔ تخلص بھی نوشی ہے۔ میرا تعلق کھاریاں سے ہے میں نے ایم اے اردو کیا ہے اور اب گھر پر ہی ہوتی ہوں۔ کام کاج ساتھ لکھنا لکھانا بھی ہوتا رہتا ہے۔
گو کہ میرا تعلق ادب کے اس قبیلے سے ہے جو لفظوں کو اشعار کی شکل میں ڈھال کر کبھی غزل کہتا ہے اور کبھی نظم لیکن یہ سمجھ نہیں آتی کہ میں اس قبیلے کی فرد کب سے بنی شاید میری حساس طبیعت کا اثر ہے کہ آس پاس کے ماحول کا اثر لیا یا پھر ادبی تخلیقات میرے خون میں شامل ہو گئیں۔ اب میرے نئے افق نے ایک ذمہ داری ڈالی ہے کہ میں نئے افق کا کالم خوشبوئے سخن مرتب کروں تو میں انکار نہیں کر سکی اس لیے اب ہم ہوں گے اور آپ کا پسندیدہ کالم۔

kushbooshukan@gmail.com
www.facebook.com/naeyufaqonlinemagzine

محترم قارئین! آپ کے ذوق کو دیکھتے ہوئے ادارہ "نئے افق" نے منتخب کلام پر انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

(انعام یافتہ)

وہ کون ہیں اور ہم کون ہیں؟
وہ شہزادے اور سلطان ہیں
ان کے پاس دولت ہے اور طاقت ہے
ہم قلاش مفلس ہیں، ہم محروم تمنا ہیں
اپنے دماغ کو استعمال کرو اور اندازہ لگاؤ
اندازہ لگاؤ کہ کس پر کس کا راج ہے
وہ کون ہیں، ہم کون ہیں؟
ہم اپنی لمبائی اور چوڑائی میں، افق اور عمود میں
انسان ہیں
اپنی محنت سے دھرتی کی اٹھان تک
اپنی مٹھاس سے دھرتی کے سبزہ زاروں تک
اپنا دماغ استعمال کرو اور اندازہ لگاؤ
کون کس کا خادم ہے اور کون کس کا آقا ہے؟
وہ کون ہیں، ہم کون ہیں؟
وہ شہزادے اور سلطان ہیں
ان کے اپنے بنگلے اور کاریں ہیں
اور عالم میں انتخاب دوشیزائیں ہیں
صارفین کو لبھاتے جانوروں کی طرح
ان کا کام محض اپنی پونجی کو بڑھانا ہے
اپنا دماغ استعمال کرو اور اندازہ لگاؤ
کون کیسے کھا رہا ہے
وہ کون ہیں، ہم کون ہیں؟
ہم جنگ ہیں، اس کا ایندھن ہیں اور آگ ہیں
ہم دھرتی کو آزادی بخشی فوج ہیں
ہم شہید ہیں

ایم جے قریشی ...... ڈی آئی خان

شہر تمنا

اک شہر تمنا ہو
جہاں پھولوں کا بسیرا ہو
کانٹوں کی چبھن زخموں کی رفوگر ہو
سورج کی تپش ہر گھر کے لیے شبنم ہو
جہاں چاند کی کرنیں
ہر دل کے لیے روشن ہو
اک ایسا شہر تمنا ہو
سب موسم اللہ کی عنایت ہو

جہاں مقدر کا ستارہ
ہر اک کے لیے چمکتا ہو
اک ایسا شہر تمنا ہو
اک ایسا شہر تمنا ہو

ریحانہ سعیدہ......لاہور

ادھورا پن

ابر نیساں کی پھوار ہے
یوں تو ہر طرف بہار ہے
مہکی ہوئی سحر تو ہے
خوشبو کے بھیس میں مگر
کوئی پھول تک کھلا نہیں
پھیلی ہے چادر چاندنی کی بھی
سیاہی کو ڈھانپا روشنی نے بھی
پورے چاند کا پہر تو ہے
رات کے پیالے میں پر
چاند کا چہرہ نہیں
گزرے ہیں ماہ و سال پھر
عمروں پہ آیا زوال پھر
ختم امید سفر تو ہے
وجود زخم ہے جواں مگر
جیسے سے نے سانس بھرا نہیں
چلے تہواروں کے سلسلے
رکھے دنیا سے بھی واسطے
گھوما دل نگر نگر تو ہے
پر خوشیوں کا دخل ممنوع رہا
در روح پر سکوں اترا نہیں
بڑی بے رونق ہوئی زندگی
شرارتیں، غموں سے گلے ملیں
قائم ابھی تک صبر تو ہے
سسکیوں پر ہے آ و نیم کش
پر اشکوں کو ظاہر کیا نہیں
سب یقیں سے عاری عاری سا ہے
استعجاب دل بھاری سا ہے
ہے موسموں کی چال وہی
دن، ماہ و سال وہی
عالم سکوت میں ہے جو گوشہ نشیں
وہ دھڑکتا دل، زندہ نہیں
تمہیں محسوس اتنا کیا
اب محسوس کچھ ہوتا نہیں
جو ملے تو آنکھ کھل اٹھے
جو بچھڑے تو ہو دل غم زدہ
ایسا کوئی اپنا نہیں
ایسا کوئی رشتہ نہیں
تم گئے ہو جب سے جان جاں
آنکھوں میں کوئی سپنا نہیں
لبوں پہ کوئی قہقہہ نہیں
کچھ کھونے کا
اب رونے کا
اس دل کو دھڑکا نہیں
تم گئے ہو جب سے جان جاں
یوں تو ہے زندگی رواں دواں
پر کسی شے میں ذائقہ نہیں

حمیرا لضا......رحیم یار خان

قسط نمبر ۹

فلسطین

الیاس ایم اے

بیت المقدس مسلمانوں کا قبلہ اول' وہ شہر جہاں ہمارے پیغمبر حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ والہ وسلم معراج پر تشریف لے گئے۔ وہ شہر جسے سیکڑوں نبیوں نے اپنی آخری آرام گاہ کے طور پر چنا۔ وہ شہر جو تین مذاہب کے ماننے والوں کے لیے مقدس ترین ہے۔

اسی تاریخی شہر کے پس منظر میں لکھا جانے والا ایک ایسا ناول جسے آپ بار بار پڑھنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

الیاس ایم اے کے قلم سے تاریخی کہانیاں پسند کرنے والوں کے لیے بطور خاص۔۔

نہر سویز کے متعلق مصر اور برطانیہ میں معاہدہ ہو گیا۔ جس میں برطانیہ نے ۱۹۵۷ء میں مصر سے اپنی فوجیں نکالنے کا معاہدہ کیا۔ اب ملک میں ایک مضبوط حکومت قائم تھی۔ ۱۹۶۷ء میں امریکہ اور برطانیہ کی شہ پر اسرائیل نے مصر پر حملہ کر دیا۔ اردن کو بھی اسرائیل نے نشانہ بنایا۔ پھر اقوام متحدہ کی کوششوں سے جنگ بندی ہو گئی۔

مصر کی مشہور شخصیات میں بخور ڈرامہ نویس، مغنیہ ام کلثوم، ڈاکٹر طٰہٰ حسین مشہور عالم کے نام قابل ذکر ہیں۔

۴۔ سوڈان:

انیسویں صدی کے اختتام پر سوڈان میں انگریزوں اور مصریوں کی مشترکہ حکومت قائم ہو گئی۔ ۱۷ نومبر ۱۹۵۸ء تک سوڈان میں پارلیمانی نظام حکومت قائم رہا۔ مگر اسی دن جنرل عبود کی قیادت میں فوجی انقلاب برپا ہوا۔ جنرل نے فوجی حکومت بنا لی جو آٹھ سال تک قائم رہی۔ پھر چند سیاسی جماعتوں کی متحدہ کوششوں سے ایک انقلاب برپا ہوا۔ جس نے فوجی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ پھر ۱۹۶۵ء میں امتہ پارٹی نے حکومت بنائی اور اسلامی شریعت کو قانون سازی کا اساسی مصدر قرار دیا۔

پھر ۱۹۶۹ء میں یہاں فوجی انقلاب آیا اور جملہ اختیارات انقلابی کونسل نے سنبھال لیے۔ سوڈان نے ۱۹۷۳ء میں تین جنوبی صوبوں کو علاقائی خود مختاری دے دی۔

۵۔ لیبیا:

طرابلس یا لیبیا، سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ تھا۔ اٹلی نے ۱۹۱۱ء میں اس پر قبضہ کر لیا۔ دوسری عالمگیر جنگ میں اتحادیوں نے یہ ملک فتح کر لیا اور اس کی قسمت کا فیصلہ اقوام متحدہ پر چھوڑ دیا گیا۔ ۱۹۵۱ء میں اس کے لیے ایک نظام مرتب ہوا جس کی رُو سے لیبیا کا نظام موروثی بادشاہت کے ساتھ وفاقی قرار پایا اور یہ ملک اقوام متحدہ کا ممبر بن گیا۔ آزادی کے وقت اس ملک میں دس لاکھ کی آبادی میں صرف چودہ گریجویٹ تھے۔ ۱۹۶۹ء میں کرنل قذافی بادشاہ ادریس کو تخت سے اتار کر خود برسر اقتدار آ گئے۔ انہوں نے برٹش پٹرولیم کمپنی کو قومی ملکیت قرار دیا۔ امریکہ اور برطانیہ کے فوجی اڈوں کا خاتمہ کر دیا۔ بنک قومی ملکیت بن گئے۔ اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت شروع کی گئی اور ۱۹۷۳ء میں لیبیا اور تیونس کو ملا کر اسلامی عرب جمہوریہ قائم ہو گئی۔ اس وقت یہ ملک اقوام متحدہ کا ممبر ہے۔

۶۔ تیونس:

یہ ملک دراصل سلطنت عثمانیہ کے مقبوضات کا حصہ تھا۔ ۱۸۸۱ء میں اس پر فرانس نے قبضہ کر لیا۔ یہاں کی تمام زرخیز زمینیں فرانسیسی زمینداروں نے آپس میں تقسیم کر لیں۔ دوسری جنگ عظیم میں محوری طاقتوں نے اسے فتح کر لیا۔ پھر جب محوریوں کو شکست ہوئی تو یہ فرانس کا حصہ بن گئی۔ فرانسیسیوں کو کمزور دیکھ کر امریکنوں اور برطانیہ والوں نے یہاں اپنے قدم جما لیے۔ جنگ کے بعد یہاں آزادی کی تحریک شروع ہوئی۔ فرانس نے تشدد کی پالیسی اختیار کی۔ آخر بڑی قربانیوں کے بعد ۱۹۵۷ء میں تیونس کو مکمل آزادی ملی اور اسی سال بادشاہت کا خاتمہ کر کے یہاں جمہوری حکومت قائم ہو گئی۔ پھر ۱۲ جولائی ۱۹۷۴ء کو لیبیا اور تیونس متحد ہو کر "اسلامی عرب جمہوریہ" بن گئے۔

عمار فرحت اور جلال بن عبداللہ تیونس کے مشہور مصور ہیں۔

۷۔ الجیریا:

اس ملک کو الجزائر بھی کہتے ہیں۔ یہاں زیادہ آبادی بربر قوم کی ہے۔ اس ملک پر ۱۸۲۷ء میں فرانس نے قبضہ کیا تھا۔ اس کی آبادی تقریباً ۶۵ لاکھ ہے۔ جس میں دس لاکھ فرانسیسی اور پچپن لاکھ مسلمان ہیں۔

۵۷۔۱۹۵۶ میں فرانسیسیوں اور الجیریا والوں میں بڑے خونریز معرکے ہوئے۔ ۱۹۶۴ء نپولین سوم نے ایک شاہی اعلان کے تحت الجزائر کو فرانس کا صوبہ قرار دے دیا مگر آزادی کی تحریک شروع ہوگئی۔ ۱۹۶۲ء کے الیکشن میں الجزائر کو ایک آزاد ریاست کا درجہ دے دیا گیا۔ ۱۹۶۳ء میں احمد بن بیلا یہاں کے صدر ہوئے مگر ۱۹۶۵ء میں فوجی انقلاب آیا۔ بن بیلا کو گرفتار کرلیا گیا اور نائب صدر بومدین نے اقتدار سنبھال لیا۔ بعد میں حواری "بومدین" ملک کے صدر بن گئے۔

۸۔ مراکش

۱۹۰۴ء میں یہ ملک دو حصوں میں تقسیم ہوا۔ ایک حصہ فرانسیسیوں کے زیر اثر اور دوسرا حصہ اسپین والوں کے زیر اثر تھا۔

۱۹۱۲ء میں اس ملک کے تین حصے ہوئے۔

۱۔ جرمنی ۲۔ برطانیہ ۳۔ فرانس۔

فرانسیسی مراکش میں ۱۹۲۶ء تک مارشل ل ڈیوٹی ریزیڈنٹ جنرل کی حیثیت سے مقیم رہے۔ انہوں نے گیارہ سو میل لمبی ریل کی پٹڑی، سڑکیں، بندرگاہیں اور ہوائی اڈے بنوائے۔ ریذیڈنٹ کے جانے کے بعد وہاں آزادی کی تحریک شروع ہوگئی۔ استقلال پارٹی بنی۔ فرانس جبر و تشدد پر تلا ہوا تھا۔ یکم مارچ ۱۹۷۲ء کو نیا آئین نافذ ہوا۔

۱۹۷۵ء میں ۲۱۱ مجرموں کو عام معافی دینے کا اعلان ہوا۔

اس وقت مراکش عرب لیگ، افریقی اتحاد کا ادارہ، اسلامی سیکرٹریٹ اور اقوام کی انجمن کا ممبر ہے۔

ملک کی مشہور شخصیتوں میں شاہ حسین اور عبدالکریم خطابی قابل ذکر ہیں۔ خطابی نے فرانسیسی اور ہسپانوی فوجوں کی مزاحمت کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

۹۔ نائیجیریا:

سترہویں اور اٹھارویں صدی عیسوی میں پرتگیزیوں، انگریزوں اور دیگر یورپی اقوام نے اس اسلامی مملکت میں تجارتی اڈے قائم کیے مگر انیسویں صدی کے آخر میں برطانیہ نے اس ملک پر یونین جیک لہرایا اور مسلمانوں کی طاقت ختم کرنے کے بعد برطانیہ نے اس ملک میں اپنے انتظامی ادارے قائم کردیئے۔ اور نائیجیریا کی وفاقی مملکت تین انتظامی حصوں میں تقسیم ہے۔

موجودہ وقت میں وفاقی جمہوریہ نائیجیریا کی ریاست میں تقریباً چھ کروڑ انسان آباد ہیں۔ ملک کی اس آبادی میں ۴۸ فیصد مسلمان ہیں۔ صدر مقام لاگوس ہے۔ اس وقت نائیجیریا دولت مشترکہ، افریقی یونین ساتھی قوموں کی انجمن کا ممبر ہے۔

۱۰۔ جبوتی:

۱۸۶۲ء میں فرانسیسیوں نے جبوتی کی سرزمین پر قدم رکھا۔ عفر قبیلہ کے سلطان احمد ابوبکر کو معزول کرنے کے بعد انہوں نے اوبوک کے علاقہ پر قبضہ کرلیا۔ اس طرح مشرقی افریقہ میں یہ پہلی فرانسیسی نو آبادی قائم ہوئی۔ وہاں فرانس نے جنوب مشرقی ایشیاء کی طرف بحری جہازوں کی روانگی کا مرکز بنایا۔ اٹلی اور برطانیہ کی سیاسی سرگرمیوں کے پیش نظر فرانس نے بہت جلد اوبوک کے علاوہ تاجورہ، علی صبیح اور دیگر بڑے بڑے شہروں پر قبضہ کرلیا۔

اس ملک کا دارالحکومت جبوتی ہے۔ یہاں سیاسی رہنما اپنی رہائش رکھتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں عوام

جھونپڑیوں میں رہتے ہیں جن کا معیار زندگی پست ہے۔ یہ لوگ جاہل اور مفلوک الحال ہیں ان میں اجتماعی زندگی بسر کرنے کے آثار نہیں پائے جاتے۔ ان کمیوں کے باوجود یہ لوگ کٹر روایتی مسلمان، سخی اور مہمان نواز ہیں۔ صحرائی علاقہ ہونے کی وجہ سے ان کی اقتصادی زندگی کا انحصار چراگاہوں پر ہے۔

جبوتی کے باشندے عیس اور عفر قبیلوں میں تقسیم ہیں۔ ان میں عیس ساٹھ فیصد اور عفر چالیس فیصد ہیں۔ ان میں قبائلی عصبیت زوروں پر ہے۔ دونوں قبیلے ملک کے الگ الگ حصوں میں رہتے ہیں۔ یہ لوگ سال میں ایک ہفتہ جشن مناتے ہیں۔ ان دنوں میں یہ اعلیٰ قسم کا کھانا کھاتے اور پیتے ہیں۔ ان ایام میں ہر قسم کی کاروباری سرگرمیاں بند کر دی جاتی ہیں۔ ان میں کافی لوگ سرمایہ دار ہیں۔

پایہ تخت جبوتی میں کوکا کولا کی فیکٹری اور آئس فیکٹری کے مالکان ملک کے امیر ترین لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ سربراہ مملکت علی عارف کے خاندان والے بھی کافی مالدار ہیں۔

۱۱۔ صومالیہ:

اس ریاست کا علاقہ بحر ہند اور خلیج عدن کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا ہے۔ اس کا رقبہ ۶۲۰ا مربع میل ہے۔ اور آبادی ۳۲ لاکھ ہے۔ یہاں کے لوگوں کا مذہب اسلام ہے اور قومی زبان صومالی ہے۔ مگر تعلیم عربی، انگریزی اور اطالوی زبانوں میں دی جاتی ہے۔ اس ریاست کی آب و ہوا گرم خشک ہے۔ بارش کا اوسط دس انچ ہے۔ زرعی پیداوار مکئی، چاول اور نیشکر پر منحصر ہے اور معدنیات میں قلعی، لوہا اور نمک ہیں۔ ۱۹۵۰ء تک اس ریاست کا نظم و نسق برطانیہ کے ہاتھ میں رہا۔ اس کے بعد دس سال تک اقوام متحدہ اور اٹلی کی زیر نگرانی رہا۔ پھر ۱۹۶۰ء میں جمہوریہ صومالیہ کے نام سے دنیا کے نقشہ پر اُبھرا۔ جون ۱۹۶۱ء میں یہاں جدید آئین نافذ ہوا۔ پھر جنرل محمد سعید باری فوجی کمانڈر کو پچیس ممبروں پر مشتمل انقلابی کونسل کا چیئرمین بنایا گیا۔ ۱۹۷۰ء میں یہاں سوشلزم نافذ کرنے کی کوشش کی گئی۔ ایک قانون پاس ہوا جس کی رُو سے سرکاری ملازمین ایک سے زیادہ مکان نہیں رکھ سکتے تھے۔ ڈاکٹروں کو پرائیویٹ پریکٹس سے منع کر دیا گیا۔

اس ملک کا دارالسلطنت "موگادیشو" ہے۔ اس وقت صومالیہ اسلامی سیکرٹریٹ، اقوام متحدہ اور افریقی اتحاد کے ادارہ کا ممبر ہے۔

۱۲۔ تنزانیہ:

مشرقی افریقہ کا یہ اسلامی ملک متحدہ جمہوریہ تنزانیہ کے نام سے مشہور ہے۔ رقبہ ۳۶۳۸۲۰ مربع میل ہے اور آبادی ایک کروڑ چالیس لاکھ ہے۔ ملک کی سرکاری زبانیں انگریزی اور سواحلی ہیں۔ ان کے علاوہ دوسری ہندوستانی زبانیں بھی بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ ریاست کا مذہب اسلام اور پایہ تخت "ڈودوما" ہے۔

اس ریاست کے تجارتی تعلقات زمانہ قدیم سے ہندوستان اور عرب ممالک سے چلے آرہے ہیں۔ اہل عرب نے یہاں اسلام کی خوب اشاعت کی اور اسلامی حکومت قائم کرلی۔ سولھویں صدی عیسوی میں پرتگیزیوں نے اس ملک سے عربوں کا تسلط ختم کر دیا۔ پھر تھوڑے عرصے کے بعد اہل عرب نے پھر اپنی حکومت بحال کر دی۔ انیسویں صدی میں یہاں جرمنوں کا زور بڑھ گیا اور ۱۸۸۵ء میں اسے جرمنوں کا زیر تحفظ علاقہ قرار دیا گیا۔

پھر ۱۹۱۴ء میں یعنی پہلی جنگ عظیم میں برطانیہ نے یہ علاقہ جرمنوں سے چھین لیا۔ پھر ۱۹۴۶ء میں اس ملک نے اقوام متحدہ کے تولیتی علاقے کی

صورت اختیار کرلی۔

اس وقت تنزانیہ دولت مشترکہ اور اقوام متحدہ کا ممبر ہے اور دن بدن ترقی کر رہا ہے۔اس کی مشہور پیداوار لونگ، کپاس اور نیشکر ہیں۔ معدنیات میں ہیرے، سونا اور ٹین مشہور ہیں۔ یہاں چمڑا سازی، پارچہ بافی، اور المونیم کے برتن وغیرہ کی صنعت ہے۔

۱۳۔ چاڈ:

یہ اسلامی ملک ''ری پبلک ڈی چاڈ'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا رقبہ ۴۹۵۸۰۰ مربع میل ہے اور آبادی تقریباً چالیس لاکھ ہے۔ اس میں پچاسی فیصد مسلمان ہیں یہاں کی سرکاری زبان فرانسیسی ہے۔ زرعی پیداوار، چاول، کپاس باجرہ وغیرہ پر مشتمل ہے اور سب سے بڑی معدنی دولت قلعی ہے۔

اس ملک پر ۱۹۱۳ء میں فرانس نے قبضہ کرلیا۔ ۱۹۶۰ء میں یہ ریاست خود مختار ہوگئی اور نیا آئین نافذ ہوا۔ ۱۹۶۹ء میں صدر گوبیلے نے فرانسیسی فوجوں کی مدد سے ملک میں انتشار ختم کیا۔ اس وقت چاڈ افریقی اتحاد، اقوام متحدہ اور اسلامی سیکرٹریٹ کا ممبر ہے۔

۱۴۔ ماریطانیہ کی اسلامی جمہوری ریاست:

یہ اسلامی ریاست افریقہ کے مغربی ساحل پر واقع ہے۔ اس کا رقبہ سوا چار لاکھ مربع میل اور آبادی بارہ لاکھ ہے۔ اس کا صدر مقام ''نوآکاٹ'' ہے۔ سرکاری مذہب اسلام ہے لیکن دوسرے مذاہب کو مکمل آزادی حاصل ہے۔ ریاست میں مسلمانوں کی آبادی ننانوے فی صد ہے۔ پیداوار گندم، چاول، جو اور کھجور ہے۔ یہاں چینی تیار کرنے، کپڑا بننے اور سمندری پانی کو صاف کرنے کی صنعتیں ہیں۔ یہاں قدیم زمانے سے حبشی اور بربر قوم کے لوگ آباد ہیں۔ اس ملک نے پوری آزادی حاصل کرلی۔ ۱۹۷۲ء میں ماریطانیہ سات قوموں کی اقتصادی انجمن میں شامل ہوگیا۔ ملک کی سرکاری زبان فرانسیسی ہے اور قومی زبان عربی ہے۔

۱۵۔ دولت سعودیہ عربیہ:

دولت سعودیہ عربیہ، نجد اور حجاز کے علاقوں پر مشتمل ہے۔ رقبہ کے لحاظ سے عرب ممالک میں سب سے بڑی ریاست ہے۔ سعودی عرب تیل کی پیداوار میں دنیا بھر میں پانچویں نمبر پر ہے، اس کا رقبہ دس لاکھ مربع میل ہے اور آبادی ایک کروڑ ہے۔ صدر مقام ریاض ہے۔ اس ملک میں سارے مسلمان آباد ہیں۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ سے پہلے اس سرزمین پر ترکوں کی حکومت تھی۔ اس جنگ کے دوران ہاشمی خاندان کے ایک فرد شریف حسین نے ترکوں سے بغاوت کر کے اتحادیوں کا ساتھ دیا۔ چنانچہ جنگ کے اختتام پر شریف حسین کو حجاز کا حکمران تسلیم کیا گیا۔ شریف مکہ کی حکومت کا انتظام اچھا نہ تھا۔ حاجیوں کو لٹیروں کے ہاتھوں بہت تکلیف اٹھانا پڑتی تھی۔ چنانچہ سلطان عبدالعزیز والی نجد نے حجاز پر حملہ کردیا اور برطانیہ نے عبدالعزیز بن سعود کو عرب کا حکمران تسلیم کرلیا۔

پھر گیارہ سال بعد ۱۹۶۴ء میں شرعی طور پر شاہ فیصل کو عرب کا حکمران تسلیم کیا گیا۔ سعودی عرب سے پاکستان کے سفارتی تعلقات قائم ہیں۔ عرب ریاستیں باہمی امداد اور تعاون سے اپنے دفاعی انتظامات کرنے کے قابل ہوگئی ہیں۔ سعودیہ نے ۱۹۷۸ء میں اسرائیل سے ایک معاہدہ کیا جس میں یروشلم کو اسرائیلی ریاست کی نگرانی میں حق خود ارادیت دیا گیا۔ اس پر فلسطینی عربوں نے ۱۹۸۱ء میں انور سادات کو قتل کردیا کیونکہ اومان اور سوڈان کے سوا باقی تمام عرب ممالک نے انور سادات کو غدار قرار دیا تھا۔

عالم اسلام کے سیاسی حالات کے ایک سرسری جائزہ سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ دولت سعودیہ عربیہ کو بین الاقوامی حلقہ میں فیصلہ کن اثر و

رسوخ حاصل ہے کیونکہ مقامات مقدسہ اس کی تحویل میں ہیں۔ اس لیے اسے تمام عالم اسلام کا روحانی پیشوا ہونے کا فخر حاصل ہے۔

۱۶۔عرب کی اہم اسلامی ریاستیں:۔

(ا) اومان:

اس کا پرانا نام عمان ہے۔ سولہویں صدی میں اس ریاست کو پرتگیزیوں نے فتح کیا۔ مگر سترہویں صدی میں یہ ریاست ایران کے قبضے میں آئی۔ ستمبر ۱۹۵۰ء میں پاکستان نے بندرگاہ گوادر کو آٹھ سو ملین ڈالر میں خرید لیا۔ اس ریاست کا مذہب اسلام ہے۔ زبان زیادہ تر عربی ہے مگر وہاں اردو، بلوچی اور ہندی بھی بولی جاتی ہے۔

(ب) کویت:

یہ چھوٹی سی ریاست خلیج فارس کے بالمقابل واقع ہے۔ اس کا رقبہ ۶۲۰۰ مربع میل ہے اور ۹۴ فیصد مسلمانوں کی آبادی ہے۔ آب و ہوا گرم مرطوب ہے۔ خاص پیداوار کھجور، پیاز، مولی اور تربوز وغیرہ ہیں۔ یہاں کی صنعتیں سیمنٹ سازی اور فرنیچر سازی وغیرہ ہیں۔ یہ ملک موتیوں کی تجارت کے لیے خاص طور پر مشہور ہے۔ کویت، عرب لیگ اور اسلامی سیکرٹریٹ کی انجمن کا ممبر ہے۔

(ج) یمن:

حضور رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں یمن کے گورنر باذان نے ۶۲۸ء میں اسلام قبول کیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں یہاں بغاوتیں ہوئیں جنہیں عکرمہ بن ابوجہل اور شرجیل بن حسنہ نے فرو کیا۔ ۱۸۳۹ء میں برطانیہ نے عدن پر قبضہ کر لیا۔ یمن کے حکمران امام احمد کو ۱۹۶۲ء میں قتل کر دیا گیا۔ جدید یمن کا مجموعی رقبہ ۱۸۶ مربع میل اور کل آبادی چونسٹھ لاکھ ہے۔ دنیا کا بہترین قہوہ یہاں پیدا ہوتا ہے۔

(د) قطر:

۱۹۱۵ء قطر عثمانی ترکوں کے زیر اثر رہا۔ ۱۹۷۲ء میں قطر نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا اور احمد بن علی اس ریاست کے حاکم اعلیٰ بن گئے۔ پھر کچھ عرصہ بعد ان کے چچازاد بھائی خلیفہ بن حماد ثانی نے ان کی جگہ لے لی۔

ریاست کا رقبہ ساڑھے آٹھ ہزار مربع میل ہے اور آبادی ایک لاکھ کے قریب ہے۔ سرکاری زبان عربی اور مذہب اسلام ہے۔ قطر کی معدنی دولت پیٹرول ہے۔ سمندر سے موتی بھی نکالے جاتے ہیں۔ زرعی پیداوار بہت کم ہے۔

(ہ) بحرین:

یہ کویت سے دو سو میل جنوب مشرق میں واقع ہے۔ یہ چند جزیروں کا مجموعہ ہے۔ سب سے بڑا جزیرہ بحرین ہی ہے۔

اہل عرب نے ساتویں صدی عیسوی میں ان جزائر پر اپنا قبضہ جما لیا تھا۔ سولہویں صدی میں ان پر پرتگیزیوں نے قبضہ کر لیا۔ ۱۷۵۲ء میں انگریزوں نے اس ریاست کو اپنے اثر میں لے لیا۔ پھر ۱۹۷۱ء میں بحرین کو آزادی ملی۔ اس وقت بحرین میں برطانیہ کا ایک بحری اڈہ ہے۔ بحرین کا رقبہ ۲۳۱ مربع میل اور آبادی تقریباً بیس لاکھ ہے۔ اس کا صدر مقام منامہ ہے۔ زبان عربی ہے۔ تقریباً ۹۵ فیصد مسلمان ہیں۔ ان میں اکثر لوگ شیعہ مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔

بحرین کی اہم ترین صنعت تیل صاف کرنا ہے اور زرعی پیداوار مویشیوں اور مچھلیوں پر مشتمل ہے۔ یہاں کی آب و ہوا گرم اور مرطوب ہے۔

متحدہ عرب امارات

دوسری چھوٹی ریاستیں لج، حضرموت، دبئی، شارجہ، فجیرہ، ام القوین، راس الخیمہ اور عجمان ہیں۔

ان ریاستوں کے حکمران شیخ کہلاتے ہیں۔
سیاسی لحاظ سے یہ تمام امارتیں انگریزوں کے زیر اثر تھیں۔ انیسویں صدی عیسوی میں ان علاقائی اکائیوں نے برطانیہ کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے برطانیہ نے اعلان کیا کہ وہ یہ معاہدہ ختم کر دے گا۔ پھر چھ ریاستوں یعنی ابوظہبی، دبئی، شارجہ، فجیرہ، ام القوین اور عجمان نے مل کر متحدہ عرب امارات کی تشکیل کی۔ بہت جلد ہی راس الخیمہ نے بھی اس میں شرکت کر لی۔ جدید مملکت کا صدر شیخ زید بن سلطان النہیان کو منتخب کر لیا گیا۔ اس کا رقبہ ۳۲۲۷۸ مربع میل اور آبادی بیس لاکھ ہے۔ ان اکائیوں کی سرکاری زبان عربی اور سرکاری مذہب اسلام ہے۔ یہاں کے لوگوں کا عام پیشہ ماہی گیری ہے۔ تیل یہاں کی سب سے بڑی معدنی دولت ہے۔ ان ممالک میں کوئی قابل ذکر صنعت نہیں، یہ متحدہ امارتیں عرب لیگ، ساتھی قوموں کی انجمن اور اسلامی سیکرٹریٹ کی ممبر ہیں۔ عرب امارتوں کی آبادی عرب باشندوں، ایرانی، بھارتی اور پاکستانی لوگوں پر مشتمل ہے۔

۱۶۔ سلطنت اردن

سلطنت عثمانیہ کے زمانہ میں اردن کا علاقہ شام کے صوبے کا ایک غیر معروف سب ڈویژن تھا مگر ۱۹۲۰ء میں اسے شام سے الگ کر کے ایک علیحدہ ملکی اکائی کا تصور دیا گیا۔ برطانیہ کی سرپرستی میں شریف مکہ کا بیٹا امیر عبداللہ ۱۹۲۱ء میں اس کا فرماں روا تسلیم کیا گیا۔ پھر ۱۹۴۶ء میں اسے بھی سیاسی آزادی نصیب ہوئی لیکن برطانیہ کو یہاں ہوائی اڈے بنانے کا حق حاصل رہا۔
پھر ۱۹۶۸ء کی فلسطینی لڑائی میں امیر عبداللہ کی فوجوں نے بہت بہادری دکھائی۔ جب جنگ ختم ہوئی تو امیر عبداللہ کی سلطنت کا رقبہ تقریباً دوگنا ہو گیا جس میں چار لاکھ مہاجرین کو بسانے کا انتظام کیا گیا اور انہیں اردن کی شہریت کے حقوق دیے گئے مگر مالی لحاظ سے اردن کا حکمران برطانیہ کا دست نگر رہا۔
پھر ۲۰ جولائی ۱۹۵۱ء کو امیر عبداللہ کو قتل کر دیا گیا اور ولی عہد طلال تخت نشین ہوا مگر اپنی مسلسل بیماری کی وجہ سے اسے ۱۹۵۲ء میں معزول کر دیا گیا اور ان کا بڑا لڑکا حسین، ملک کا فرماں روا بنا دیا گیا۔ پھر شاہ حسین نے شام و مصر کے ساتھ ایک دفاعی معاہدہ کیا جس کی رو سے اسرائیلی ریاست کے خلاف جنگ کی صورت میں تینوں ممالک نے متحد ہو کر لڑنے کا فیصلہ کیا۔
نہر سوئیز کے سلسلے میں جب جنگ ہوئی تو اردن کے برطانیہ اور فرانس سے تعلقات کشیدہ ہو گئے اور برطانیہ نے اردن کی مالی امداد بند کر دی۔ گو مصر اور شام کے ساتھ سیاسی تعلقات میں گڑبڑ ہوئی مگر امریکی حکومت نے اردن کو امداد دینا شروع کر دی جو ۱۹۶۰ء میں پانچ کروڑ ڈالر سالانہ تک پہنچ گئی۔ اردن کا رقبہ ۳۷۷۳۸ مربع میل اور آبادی پچیس لاکھ سے زیادہ ہے۔ اس کا پایہ تخت عمان ہے۔ سرکاری زبان عربی، آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ اردن عرب لیگ، اقوام متحدہ اور اسلامی سیکرٹریٹ کا ممبر ہے۔
ان کے علاوہ بیسویں صدی کی اسلامی سلطنتوں میں مندرجہ ذیل ریاستیں اور حکومتیں بھی شامل ہیں جن کے ہم صرف ایک سطری حوالے درج کر رہے ہیں۔ ان کی تفصیل ہم کسی اور موقع پر لکھیں گے۔
بیسویں صدی کی باقی ریاستیں مندرجہ ذیل ہیں۔

ملک	دارالسلطنت	زبان
۱۷۔ لبنان	بیروت	انگریزی
۱۸۔ شام	دمشق	عربی
۱۹۔ عراق	بغداد	عربی
۲۰۔ ایران	تہران	فارسی

۲۱۔افغانستان	کابل	پشتو	
۲۲۔ملائیشیا	کوالالمپور	ملائی	
۲۳۔پاکستان	اسلام آباد	اردو	
۲۴۔فلسطین	تل ابیب	عربی	

ان صفحات میں دنیائے اسلام کے جن چوبیس پچیس ملکوں کے نام اوران کا مختصر تذکرہ کیا گیا ہے وہ محض تفنن طبع یا یاداشت کے لیے نہیں بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ بیت المقدس (فلسطین) پر ۱۹۴۸ء اور ۱۹۶۷ء میں یہودیوں نے جو قیامت صغریٰ برپا کی اور جس کے کرب سے آج بھی بیت المقدس ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا ہے۔ وہ قیامت دن دہاڑے ان چوبیس مسلم ریاستوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اور سر پر چڑھ کر برپا کی۔ وہ سب کچھ ان مسلم ریاستوں نے سنا اور دیکھا ہے اور آج بھی دیکھ رہے ہیں۔

ان مسلمان ریاستوں اور ملکوں میں چھوٹے بڑے اور امیر اور اوسط درجے کی ریاستیں اور ملک شامل ہیں اور اگر خدا نے وہ دن دکھایا کہ یہ تمام ریاستیں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ظالم یہودیوں کے خلاف کھڑی ہوگئیں تو پھر نہ امریکا اور نہ برطانیہ یہودیوں کو بچا سکتا ہے اور نہ ان کی حفاظت کرسکتا ہے۔ آج ہم جب ٹی وی پر بیت المقدس میں مسلمانوں کے مکانوں، دکانوں اور بازاروں کو جلتے دیکھتے ہیں اور سڑکوں پر یہودی ٹینکوں کو دوڑتے اور نہتے مسلمانوں پر گولیاں برساتے دیکھتے ہیں تو ہمارے سینے جل اٹھتے ہیں۔

یہ بات نہیں کہ مسلمان بزدل ہیں اور یہودیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکا اور برطانیہ، یہودیوں کی مدد دامے، درمے اور سخنے کر رہے ہیں۔ بلکہ انہوں نے یہودیوں کے لیے اسرائیل میں جدید ترین اسلحہ کے ڈھیر لگا دیے ہیں۔ جبکہ مسلمان یہودیوں کے مقابلے میں بالکل نہتے نظر آتے ہیں۔ مسلمان اگرچہ یہودیوں کے مقابلے میں دل والے اور بہادر ہیں مگر وہ یہودیوں سے اسلحہ کی مار کھاتے ہیں۔ پھر جب مسلمانوں کو زیادہ غصہ آتا ہے اور وہ رسائل میں یہودیوں کے مظالم پڑھتے اور ٹی وی پر دیکھتے ہیں تو ان کا خون کھول اٹھتا ہے اور کوئی جوان اپنے جسم پر بم باندھ کر کلاشنکوف سنبھال کر یہودیوں کے ہجوم میں گھس پڑتا ہے پھر اس کے جسم سے بندھے بم پھٹتے ہیں تو دس بیس یہودی ڈھیر ہو جاتے ہیں اور خود اس کے جسم کے ٹکڑے بھی بکھر جاتے ہیں۔

جان دو اور جانیں لو کا یہ سلسلہ آج نہیں بلکہ ۱۹۴۸ء سے شروع ہوا اور اس میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ آیئے اب ہم یہودی اور مسلم چپقلش کو اس کے آغاز یعنی کم از کم ۱۹۴۸ء سے ایک بار پھر دیکھتے ہیں تاکہ ہم یہودیوں کی پشت پر بیٹھے ہوئے ان عیسائیوں کے چہرے بھی دیکھ سکیں جن کے زور اور شہ پر یہودی بیت المقدس میں مسلم آبادی کے محلوں میں اسلحہ بردار ٹینک دوڑاتے دکھائی دیتے ہیں۔

مسلم سرشت

ہم جانتے ہیں کہ تاریخ، قوموں کے عروج و زوال کی سچی کہانی ہے۔ ایمان اور عمل صالح اپنانے والوں سے خالق عالم کا وعدہ ہے کہ وہ انہیں زمین پر اپنا خلیفہ بنائے گا۔ چنانچہ بلندی اور پستی کا یہ چکر امت مسلمہ کے ساتھ بھی چلتا رہا ہے۔ اور جب ہم مسلمانوں کے عروج و زوال پر نظر ڈالتے ہیں تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس قوم کی تخلیق قدرت نے ایک خاص غرض سے کی تھی۔ چنانچہ جب تک قوم اپنے نصب العین کے مطابق میدان جہاد میں رہتی ہے اسے عروج ملتا

ہے اور جب وہ اپنے مقصد یا حکم خداوندی سے سرتابی کرتا ہے تو وہ ناکام اور رسوا ہو جاتا ہے۔

خلافت عباسیہ میں جب بغداد کو ایشیا کا ''پیرس'' کہا جاتا تھا اور کتاب وسنت کے وارث معمولی معمولی باتوں پر آپس میں لڑنے جھگڑنے اور ایک دوسرے پر کفر وشرک کے فتوے لگانے لگے تو تاتاریوں نے اس قوم یعنی مسلمانوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی لیکن اس دور میں امام ابن تیمیہ کی للکار نے جس میں کتاب وسنت کی پوری روح جلوہ گر تھی، بڑھتے ہوئے تاتاری طوفان کا رخ پھیر دیا تھا۔ ہماری تاریخ کی کتابیں پکار پکار کر کہتی ہیں کہ امت رسول ہاشمی ایک خاص امتیاز رکھتی ہے جو اسے دوسری قوموں سے ممتاز اور بالاتر رکھتا ہے۔ یہ امتیازی وصف ہی دراصل اللہ کی کتاب وسنت سے وابستگی ہے۔ جب تک مسلمان کتاب وسنت کی چھاؤں میں رہتا ہے اس پر کفر کی دھوپ کام نہیں کرتی مگر جب مسلمان کی بنیاد یعنی ایمان میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے تو اس کی طاقت کا سوتا سوکھ جاتا ہے۔ عظمت کا سورج گہنا جاتا ہے اور وہ کمزور سے بھی مار کھا جاتا ہے۔

ماضی میں جب تاتاری یلغار مشرق وسطیٰ کو اپنے سیلاب میں بہالے جانا چاہتی تھی کہ کتاب وسنت کی روح سے سرشار ایک گروہ نے اسے للکارا اور وہ طوفان جو شمع توحید کو بجھانے کے لیے اٹھا تھا، بلبلے کی طرح بیٹھ گیا۔

یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ آج پھر مشرق وسطیٰ ایک نئے طوفان کی لپیٹ میں آ گیا ہے۔ یہ سیلاب صیہونیت کا ہے، یہودیت اور اسرائیلیت کا ہے۔ اور یہ سیلاب ماضی کے تاتاری فتنے سے بھی شدید تر ہے۔ ماضی اور حال کے ان دو فتنوں میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف اتنا کہ تاتاری فتنہ اپنے وجود میں مستقل تھا اور عہد حاضر کا صیہونی فتنہ، استعماری طاقتوں کا ایک بہروپ ہے۔ چہرہ پر نظر ڈالیے تو اسرائیل لیکن دل ودماغ عزائم اور ارادے سب کے سب استعماری طاقتوں کے ہیں۔ ان میں ساری طاقت وتوانائی استعماری ہے اور اسے جنم ہی استعمار ہی نے دیا ہے۔ لطف یہ کہ نمو وپرداخت بھی اس نے کی اور حفاظت بھی وہی کر رہا ہے۔

''بیت المقدس''

بیت المقدس ہمارا ''قبلہ اول'' ہے۔ یہ ہماری نسل کی بڑی بدقسمتی ہے کہ اسے ''قبلہ اول'' کے چھن جانے کے حادثے سے دوچار ہونا پڑا۔ اس سے زیادہ دل شکن حادثہ ''مسجد اقصیٰ'' کی توہین کا ہے۔ یہودی اس عظیم، مبارک اور مقدس مسجد کو گرا کر اپنا ایک معبد تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ اس پر بس نہیں بلکہ اب تو یہودی حرمین الشریفین پر بھی حریصانہ نظریں ڈالنے لگے ہیں۔ مزید برآں یہ نادان نیل سے فرات تک توحید پرستوں کو نابود کرنے کی آرزو بھی رکھتے ہیں لیکن ہم ابھی تک اس کے عزائم کو نہیں سمجھ سکے اس لیے کہ ہمیں اس مسئلہ کی نزاکت کا احساس نہیں۔ ہم اس شہر کی عظمت اور فضیلت کو نہیں جان سکے جس کے لیے حضرت عمرؓ نے سفر کیا اور غازی اسلام صلاح الدین ایوبی اور ان کے جاں نثار ساتھی برسوں لڑتے رہے اور داد شجاعت دیتے رہے۔ یہاں تک کہ اس شہر کے ذرے ذرے میں ان کا خون رچ بس گیا جو آج بھی مضطرب وبے چین ہے اور ایک نئی کروٹ کا منتظر ہے۔

یہ ناول اس شہر کی عظمت اور فضیلت کی داستان ہے جس کے حصول کے لیے ہمارے اسلاف، ہمارے آباؤ اجداد ایک سو سال تک اپنا خون بہاتے رہے اور آج بھی اس کی خوں چکاں داستان، مسلمان

بچے، جوان اور بوڑھوں کی زبان پر ہے۔ ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء کو اقوام متحدہ نے بیت المقدس اور اس کے گردا گرد کے علاقوں کو عالمی اہمیت کا علاقہ قرار دیتے ہوئے فلسطین کی تقسیم کے ساتھ بیت المقدس کو بین الاقوامی تولیت میں دینے کا فیصلہ کر دیا۔

یہودیوں نے اس فیصلہ کو خوش دلی سے منظور کیا لیکن عربوں نے اس ناانصافی کے سامنے سر جھکانے سے انکار کیا۔ اس کے ساتھ ہی یہودیوں نے مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ مفتی اعظم کی مختصری فوج آزادی لاکھوں یہودیوں کے مقابلہ میں ڈٹ گئی۔ یہودیوں کو عالمی صہیونی ایجنسی اور بعض ممالک مثلاً چیکوسلواکیہ، یوگوسلاویہ اور رومانیہ کھلے عام اسلحہ فراہم کر رہے تھے۔ برطانوی حکومت نے بھی انہیں ٹینکوں سمیت جدید ترین ہتھیاروں سے لیس کیا۔ انہیں (یعنی یہودیوں کو) عرب علاقوں پر قبضہ کرنے میں مدد دی اور عرب آبادی کو محفوظ مقام پر پہنچانے کے بہانے شہر خالی کرا لیے۔ چنانچہ ۱۴ مئی ۱۹۴۷ء کو جب برطانیہ رخصت ہوا تو دیرسین، طبریہ، حیفہ، عکہ، سلامہ، بیان، سفد، یافا اور بیت المقدس (نیا شہر) ایسے شہر عرب آبادی سے بالکل خالی ہو چکے تھے۔

برطانیہ کی معاشی جنگ (۱۹۴۸ء)

برطانیہ اور یہودیوں کی ملی بھگت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ برطانیہ نے اعلان کیا تھا کہ وہ فلسطین کو ۱۴ مئی کو خالی کر دے گا اور حیفہ کی بندرگاہ سے فوجیں اگست میں ہٹائے گا مگر اس نے اس اعلان کے برعکس حیفہ کو بھی ۱۴ مئی کو خالی کر دیا اور ۱۵ مئی کو اسلحہ اور بارود سے لدے ہوئے جہاز حیفہ کی بندرگاہ پر پہنچ گئے۔ اس کے ساتھ ہی یہودیوں کی ایک زبردست فوج نے بیت المقدس کا محاصرہ کر لیا۔ اخوان مجاہدین گزشتہ چار ماہ سے پرانے شہر میں یہودیوں سے جنگ کر رہے تھے۔ ان کے پاس ہتھیار تھوڑے تھے اور وہ بھی پرانی قسم کے تھے مگر وہ اپنے جوشِ ایمان، خلوص نیت، شوقِ شہادت اور توکل اللہ کی بدولت لڑتے رہے۔ اس وقت مقامی آبادی کے علاوہ گرد و پیش کے بیس ہزار مسلمان بیت المقدس میں پناہ گزین تھے۔ چند ہفتے پہلے ہی یہودی دیریاسین میں قتل عام کر چکے تھے۔ القدس کے ہاتھ سے نکل جانے کا مطلب یہ تھا کہ یہاں بھی دیریاسین کی دہشت ناک کہانی دہرائی جائے گی۔ اخوان کے پاس گولہ بارود کا آخری ذخیرہ ختم ہو رہا تھا۔ چنانچہ انہوں نے عرب لی جن سے مدد مانگی لیکن جنرل گلب پاشا نے بعض سیاسی اور مذہبی وجوہ کی بناء پر ایک فوجی بنیاد کی آڑ میں شہر کو خالی کرنے کا مشورہ دیا جسے اخوان نے مسترد کر دیا۔ اخوان دستوں کے قائد نے کہا۔

"یہودی ہماری لاشوں پر سے گزر کر ہی بیت المقدس میں داخل ہوں گے۔"

عرب لی جن سے مایوس ہو کر پوری عرب آبادی گھروں سے نکل آئی۔ رات بھر شدید جنگ ہوتی رہی اور صبح کے وقت یہودی پسپا ہونے لگے۔ اردنی فوج کے ایک افسر کو اس صورت حال کی خبر ملی تو جنرل گلب پاشا کی مخالفت کے باوجود یہودیوں کی تازہ دم فوج کے پہنچنے سے پہلے پچھلے پہر اردنی فوج شہر میں داخل ہو گئی۔ یہودیوں نے ہتھیار ڈال دیے اور اخوان کے ثبات، استقلال اور جانفروشی نے بیت المقدس کو مسلمانوں کے لیے محفوظ کر لیا۔

۸ جولائی کو یہودیوں نے دوبارہ حملہ کیا لیکن شدید جنگ اور زبردست نقصان اٹھانے کے بعد پسپا ہو گئے۔ اس وقت اقوام متحدہ یہودیوں کی مدد کو آگے بڑھی لیکن اقوام متحدہ کی قرارداد کے احترام میں عربوں نے ابھی ہتھیار رکھے ہی تھے کہ ۲۵ جولائی کو

یہودیوں نے ایک زبردست حملہ کر کے بیت المقدس کے چوراسی فیصد رقبہ پر قبضہ کر لیا اور مسلمان صرف قدیم شہر تک محدود ہو کر رہ گئے۔

پھر ۱۹ اگست ۱۹۴۸ء کو اقوام متحدہ نے بیت المقدس کو غیر مسلح قرار دینے کی قرارداد منظور کی جسے اسرائیل نے مسترد کر دیا اور مطالبہ کیا کہ بیت المقدس کی حالیہ پوزیشن کو برقرار رکھا جائے۔ پھر چند یوم بعد اقوام متحدہ پر الزام لگا کہ وہ اپنی قراردادوں پر عمل درآمد کرانے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ اسرائیل نے بیت المقدس سے متعلق اقوام متحدہ کی تمام قراردادوں کو ماننے سے بالکل انکار کر دیا اور بیت المقدس کو اسرائیلی دارالسلطنت بنانے کی باتیں شروع کر دیں۔

اقوام متحدہ نے ایک اور قرارداد کے ذریعے یہودیوں پر واضح کر دیا کہ بیت المقدس کو دارالسلطنت نہیں بنا سکتے لیکن اسرائیل نے اسے بھی نظر انداز کر دیا اور پارلیمنٹ کی منظوری سے بیت المقدس کو اسرائیل کا مستقل دارالسلطنت قرار دے کر وزارت خارجہ کے سوا اکثر دفاتر نئے بیت المقدس میں منتقل کر دیئے اور جون ۱۹۵۲ء میں وزارت خارجہ بھی بیت المقدس منتقل ہو گئی۔

۹ جولائی ۱۹۵۲ء کو امریکا نے برطانیہ، مشرقی جرمنی، روس، فرانس، اٹلی، جاپان، ترکی، کینیڈا، آسٹریلیا، سوئٹزرلینڈ، چیکوسلواکیہ اور رومانیہ کی طرح اپنا سفارت خانہ تل ابیب سے بیت المقدس منتقل کرنے سے انکار کر دیا لیکن اکثر ممالک کے سفارتی مشن بیت المقدس آ گئے۔

اسرائیل میں انضمام

اسرائیل نے قدیم بیت المقدس پر ۷ جون ۱۹۶۷ء کو قبضہ کر لیا اور ۴ جولائی ۱۹۶۷ء کو اقوام متحدہ نے قرارداد نمبر ۲۲۵۳ ای۔ ایس۔ وی کے ذریعے بیت المقدس کو اسرائیل میں مدغم کرنے کے اقدام کو غیر قانونی قرار دیا۔ اس قرارداد کے حق میں ۹۹ ووٹ آئے۔ کسی نے مخالفت نہیں کی مگر امریکا اور اسرائیل غیر جانب دار رہے۔ پھر ۱۴ جولائی کو جنرل اسمبلی نے اس قرارداد کی توثیق کر دی۔

اس سے اگلے سال یعنی ۲۱ مئی ۱۹۶۸ء کو سلامتی کونسل نے اسرائیل کے رویئے کی مذمت کی اور ۴ جولائی اور ۱۴ جولائی کی قراردادوں پر اصرار کرتے ہوئے اسرائیلی اقدام کو بین الاقوامی قانون اور رائے عامہ کے خلاف قرار دیا۔ مگر اسرائیل نے اقوام متحدہ کی ہر قرارداد کو اقوام متحدہ کے منہ پر دے مارا جس کے نتیجے میں آج تک بیت المقدس اسرائیلی ظلم و استبداد کا شکار ہے اور اسے کسی ایسے صلاح الدین ایوبی کا انتظار ہے جو اسرائیل اور اقوام متحدہ دونوں کے کلے چیر کے رکھ دے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ بیت المقدس کئی بار اجڑا اور پھر آباد ہوا ہے۔ اس عرصہ میں اس کی شہر پناہ بھی کئی بار تعمیر ہوئی۔ بیت المقدس کی پہلی شہر پناہ (فصیل) عہد داؤدؑ میں تعمیر ہوئی تھی اور اس کے خستہ ہونے پر حضرت سلیمانؑ نے اس کے گرد ایک مضبوط فصیل تعمیر کرائی۔ پھر حضرت سلیمانؑ کے چار سو سال بعد یہ شہر پناہ شاہ بابل بخت نصر کے ہاتھوں تباہ ہوئی جس نے فصیل کو گرا کر وہاں ہل چلوا دیے۔

دوسری فصیل کا کام ۴۳۵ ق۔م میں شروع ہوا یہ شہر پناہ یہودی قبائل نے آپس میں تقسیم کاری کے اصول پر بنائی اور اس کی تعمیر میں مقامی لوگوں کے علاوہ اہل فارس، رومیوں، شامیوں اور مصریوں نے مداخلت کی مگر تعمیر کا کام کسی نہ کسی طرح جاری رہا اور آخر اسے مکمل کیا گیا۔ یہ شہر پناہ پہلی فصیل کے کھنڈرات ہی پر اٹھائی گئی تھی اس لیے شہر کے محل

وقوع میں کوئی زیادہ فرق نہ آیا۔ اس شہر پناہ کی تعمیر شہر کے شمالی حصے سے شروع ہوئی۔ اس کی مغربی حد موجودہ باب دمشق کی جگہ تھی۔ یہاں سے جنوب کو مڑ گئی تھی۔ لیکن یہ شہر پناہ بھی زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکی اور حملہ آوروں کی ستم رانیوں کا شکار ہو گئی۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ شہر پناہ کی تیسری تعمیر ہیرود کے جانشین ہیرود اغریپا نے شروع کی۔ اس کا تعمیراتی کام اس قدر شاندار تھا کہ شام کے رومی حکمران کے ذہن میں شک پیدا ہوا کہ یہ سب کچھ ایک نئی بغاوت کی تیاری ہے۔ چنانچہ اس نے کلاڈیس سیندر کو ایک خط لکھا جس میں اس شک کا اظہار کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کلاڈیس نے اغریپا کو مزید تعمیر سے روک دیا۔ پھر یہودیوں نے اپنے روایتی حربوں (مکاری) سے کام لیتے ہوئے اس کی جزوی تعمیر کا اجازت نامہ حاصل کر لیا۔

جوسیفس اس شہر کی بہت تعریف کرتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ اس کی تعمیر میں ۲۰ ہاتھ لمبے اور دس ہاتھ چوڑے پتھر لگائے تھے جن کا اٹھانا اور بلند کرنا انسانی طاقت سے ممکن نظر نہ آتا تھا۔ یہ فصیل ۷۱ء میں طیطس اور رومی حملوں کا شکار ہو گئی اور ملبے کا ڈھیر بن گئی۔

اس کی موجودہ فصیل ترکان عثمان کے دوسرے بادشاہ سلیمان اعظم نے تعمیر کرائی۔ سلیمان اعظم کے والد سلطان سلیم نے ۱۵۱۷ء میں اس شہر کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ سلیمان اعظم نے اس کی تعمیر دو بھائیوں کو سونپی تھی جنہوں نے ۱۵۳۶ء میں کام کا آغاز کیا اور وہ اس کی تکمیل تک ایک دوسرے سے نہ مل سکے۔ سات سال بعد یعنی ۱۵۴۲ء میں موجودہ سینٹ اسٹیفن گیٹ پر ان کی ملاقات ہوئی۔ اس خوشی میں انہوں نے دروازہ پر چار شیر بنائے مگر کیوں؟ اس کی کوئی تفصیل نہیں بتائی گئی۔

تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ شہر پناہ کی ہر تعمیر کے ساتھ اس کے دروازوں کے ناموں میں تھوڑا ردوبدل ہوتا رہا۔ بیشتر عرب جغرافیہ نویسوں نے ان دروازوں کا ذکر ضمناً کیا اور صرف دو عرب مصنفین نے اس کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

ان میں مقدسی نے ۹۸۵ء میں اور مجیر الدین نے ۱۴۹۶ء میں اس کی تفصیل بتائی ہے۔ ان تاریخوں کے درمیان یہ مقدس شہر تقریباً ایک صدی تک صلیبیوں کی آماجگاہ بنا رہا۔ ان دونوں تذکرہ نگاروں نے جو نام لکھے ہیں وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مقدسی نے جن دروازوں کا ذکر کیا ہے وہ آج تک کھلے ہوئے ہیں اور استعمال میں ہیں۔

مقدسی نے بالاحصار کے آٹھ دروازے بتائے ہیں جن کے نام یہ ہیں۔

۱۔ باب صیہون ۲۔ باب التیہ (دشت) ۳۔ باب البلاط ۴۔ باب ارمیہ (حضرت ارمیہ کا گڑھا)، ۵۔ باب سلوان (صلوان)، ۶۔ باب العمود (ستون) ۸۔ باب محراب داؤد۔

ان میں سے باب محراب داؤد آج کل یافہ گیٹ کہلاتا ہے۔ مقامی لوگ اسے باب الخلیل یا باب حبرون کہتے ہیں۔ مقدسی نے اس سلسلے میں بالاحصار کا ذکر کیا ہے۔ وہ اس دروازے سے ذرا اوپر کے رخ اب تک موجود ہے اور اس میں وہ محراب بھی سلامت ہے جس سے یہ دروازہ منسوب کیا جاتا ہے۔

مقدسی کا باب صیہون جنوبی دیوار میں باب حبرون کے بعد دوسرا دروازہ ہے جسے آج کل باب النبی داؤد کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ جبکہ مجیر الدین نے اسے "باب حارۃ الیہود" کہا ہے۔ اس کے قریب ہی حضرت داؤد علیہ السلام کا مزار مبارک ہے۔

اسی طرح باب ''اریحا'' وہ ہے جسے چودھویں صدی سے سینٹ اسٹیفن گیٹ کا نام دیا گیا ہے۔ یہ دروازہ دسویں صدی عیسوی میں ''جریکو گیٹ'' کہلاتا ہے۔ اسے باب الاسباط یا ''مریم متی'' کا دروازہ بھی کہتے ہیں۔ برکتہ اسرائیل اس دروازے کے باہر ہے جو نہایت قدیم تالاب ہے۔

''باب جب ارمیہ'' شمال کا چھوٹا سا دروازہ باب الساہرہ ہے قدیم زمانہ میں ''ہیروڈ'' گیٹ کہلاتا تھا۔ اس کے قریب ہی وہ میدان ہے۔ یہاں بعض روایات کے مطابق روزِ محشر (قیامت) ساری مخلوق جمع ہوگی۔ اور ایک خندق بھی ہے۔ جس کے بارے میں عام روایت ہے کہ اسے سلطان صلاح الدین ایوبی نے کھدوایا تھا لیکن مقدسی نے اسے ''گڑھے کا دروازہ'' کہا ہے۔ جس کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ یہ خندق قدیم زمانہ سے ہے۔ البتہ اتنا ضرور ممکن ہے کہ سلطان صلاح الدین ایوبی نے اسے مزید مستحکم اور استوار کیا ہو۔

باب عمود آج بھی اسی نام سے شمالی دیوار کے وسط میں واقع ہے۔ اسے باب دمشق کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ کیونکہ یہاں سے ایک سڑک نابلس اور دمشق کو جاتی ہے۔

عیسائی روایات کے مطابق قبول مسیحت کے بعد ''سینٹ پال'' اس دروازے سے شہر میں داخل ہوئے تھے۔ محاربات صلیب کے وقت یہ دروازہ سینٹ اسٹیفن سے منسوب تھا کیونکہ وہ جگہ جہاں یہود نے سینٹ اسٹیفن کو سنگسار کیا وہ اس دروازے کے باہر چند قدم دور ہے۔ اس جگہ تھیوڈوسیس ثانی کی ملکہ اُدوسیا نے ۴۵۵ء ایک گرجا بنا دیا تھا۔ ملکہ اس گرجا میں دفن ہے۔ اس گرجا سے کچھ فاصلے پر بادشاہوں کے مقبرے ہیں جو مشرقی میسوپوٹانیا کی ملکہ ہیلینا کے لیے تعمیر ہوئے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دین موسیٰ قبول کرنے کے بعد ملکہ اپنے بیٹے ازیتس کے ساتھ شہر قدس آئی اور ازیتس کے بیس بیٹے اس شہر میں آباد ہوگئے۔ ملکہ اور ازیتس ان مقبروں میں مدفون ہیں ان سے کچھ فاصلہ پر مسلمانوں کا قبرستان اور حضرت سلیمانؑ کی بھٹیاں ہیں۔

مقدسی کا ''باب التیہ'' اور ''باب صلوان'' آج کل معدوم ہے لیکن قیاس کیا گیا ہے کہ باب التیہ مجیر الدین کا باب السرب (چور دروازہ) ہے جو کبھی باب صیہون اور باب حبرون کے درمیان ارضی خانقاہ کے قریب کھلتا تھا لیکن آج کل بند ہے۔

باب صلوان، مشرقی دیوار میں آج کا ''باب المغاربہ'' ہے جسے فرنگیوں نے کوٹھری دروازے کا نام دیا تھا۔ باب البلاط غالباً مجیر الدین کے باب الرمیہ (میدان) کا قدیم نام ہے جو کبھی باب حبرون کے شمال میں شہر پناہ کے مغربی پہلو پر تھا لیکن پچھلی صدی میں اسے بند کر دیا گیا۔ اوبکی ۱۱۴۵ء میں باب الرحمہ کا ذکر بھی کرتا ہے جسے مسیحی ''گولڈن گیٹ'' کہتے ہیں۔ اوبکی لکھتا ہے۔

''یہ دروازہ شہر کے مشرقی پہلو پر ہے مگر عام طور پر بند رہتا ہے اور صرف شاخ زیتون کے میلے کے دن کھولا جاتا ہے۔''

''کتاب زیارات یروشلم'' میں اوا یچ پیری لکھتا ہے۔

''یہ معبد سلیمانی کے مشرقی دروازے کی جگہ قائم ہے۔ حضرت عیسیٰ پام سنڈے کو اس دروازے سے ہیکل میں داخل ہوئے۔ یہ دروازہ ۶۲۹ء میں مقدس صلیب ملنے کی یادگار کے طور پر ہرکولیس نے تعمیر کرایا تھا۔ عہد صلیبی میں یہ دروازہ دو مرتبہ کھلتا تھا۔ ایک

مرتبہ پام سنڈے کے جشن کے لیے اور دوسری مرتبہ ۱۴ ستمبر کو مقدس صلیب ملنے کے روز۔ ترکوں نے اسے دوبارہ تعمیر کرایا لیکن کبھی استعمال نہیں ہوا۔"

اس باب کے باہر ایک محراب بنی ہوئی ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حضرت مہدی الزماں بعثت کے بعد اس جگہ تشریف لائیں گے۔

پیری مزید لکھتا ہے۔

"اس دیوار کا جو حصہ مسجد اقصیٰ سے ملحق ہے۔ اس جگہ ایک مینار سے سینٹ جیمز کو گرا کر ہلاک کیا گیا تھا۔ مجیر الدین کے باب الداعیہ کی آج کل نشاندہی ممکن نہیں ہے۔ البتہ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ باب ہیرود سے کسی قدر مغرب میں ہوگا۔"

آگے چل کر پیری، قصر جلو سے متصل باب الحمید کا ذکر کرتا ہے۔ جو ۱۸۸۹ء میں تعمیر ہوا۔ اس کے مطابق "نیا یروشلم" اسی دروازے سے باہر ہے۔ عہد ہیرود میں تھیٹر، سرکس اور جمناسٹک کے مقابلے مغربی دیوار سے باہر میدان میں ہوتے تھے۔ اس دیوار میں آج کل باب السلسلہ ہے۔ مجیر الدین نے خانقاہ ابن عبداللہ کے قریب باب الزادیہ اور شہر کے شمال مشرقی گوشے میں "باب خارہ طوز" کا ہونا بھی بیان کیا ہے لیکن آج کل ان کا کوئی نشان نہیں۔

پہاڑیوں اور وادیوں کا شہر

بیت المقدس کو پہاڑیوں اور وادیوں کا شہر کہنا بالکل درست ہے۔ اس شہر کے تین اطراف میں وادیاں پھیلی ہوئی ہیں جنہوں نے اسے ایک عظیم اور منفرد شہر بنا دیا ہے۔ یہاں کیدرون اور ہنوم کی وادیاں خاص طور سے بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ اگر ان وادیوں کا رخ کسی اور سمت ہوتا تو بیت المقدس یہاں آباد نہیں ہو سکتا تھا۔

یہاں کی وادی ہنوم کتاب مقدس کے مطابق اپنے مالک کائی بن ہنوم سے منسوب ہے۔ ہنوم نے پہلے اس جگہ ڈیرے ڈالے پھر آگے بڑھ کر شہر پر قابض ہو گیا۔ یہاں مسلمانوں کا ایک قبرستان ہے جس کے وسط میں صیہون کا بالائی تالاب جسے اب "برکتہ المیلہ" کہا جاتا ہے۔ واقع ہے۔ پھر اترائی میں چوتھائی میل کے فاصلہ پر صیہون کا زیریں تالاب یعنی "برکتہ السلطان" واقع ہے۔

وادی میں ایک سمت اونچی ڈھلوان چٹانیں ہیں جن میں پتھر تراش کر مزارات بنائے گئے ہیں جنہیں بادشاہوں کے مقبرے کہا جاتا تھا۔ آج کل ان عمارتوں کو ملازمین کی رہائش کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یہاں سے باب دمشق ایک میل سے بھی کم فاصلے پر ہے۔

"یروشلم"

اسلامی دور حکومت سے پہلے حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے عہد میں یروشلم اپنی سلطنت کا صدر مقام رہا ہے لیکن عہد اسلامی میں اس کی یہ حیثیت ختم کر دی گئی تھی۔ خلیفہ حضرت عمرؓ نے جب شام کی انتظامی تقسیم کی تو بیت المقدس، جند فلسطین کا حصہ بنا۔ فلسطین، شام کا ایک صوبہ تھا لیکن اہل شام "جند" کو فوجی اضلاع کے معنی میں استعمال کرتے تھے۔ عہد فاروقی میں جند فلسطین میں میدان عکہ کے جنوب میں خلیج اردن اور بحر لوط تک کا سارا علاقہ شامل تھا۔ اس جند کی مغربی سرحد پر سمندر، جنوب میں دشت تیہ اور مصر کا راستہ حد بندی کرتا تھا۔ اموی دور حکومت میں جند فلسطین کی حدود میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی البتہ عہد سلیمان بن عبدالملک میں اس کا دارالحکومت الرہا سے رملہ تبدیل کر دیا گیا۔ رملہ، سلیمان نے ہی بسایا تھا۔ عہد عباسیہ میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی مگر جب صلیبی قابض ہو گئے تو ایک

بار پھر سیاسی حیثیت اور اہمیت اختیار کر گیا اور اسے یروشلم کی ریاست کا دارالحکومت بنایا گیا۔

چودھویں صدی عیسوی میں ابوالفدا نے الجفار اور تیہ کو بھی اس کے ماتحت اضلاع میں شامل کر دیا۔ رفع سے اسلجون تک اس کی لمبائی ایک سوار کم از کم دو روز میں طے کرتا ہے اور اس کی چوڑائی یافہ سے اریحا تک طے کرنے کے لیے بھی اتنا ہی وقت لگتا ہے۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ جند فلسطین میں زغر اور دیار قوم لوط الجبال اور الشراہ تک کا علاقہ شامل ہے۔

اسی طرح اصطخری کے مطابق ولایت شام میں فلسطین میں سب سے زرخیز ہے۔

تیرھویں صدی میں یاقوت نے یروشلم کو ولایت فلسطین کا دارالحکومت لکھا ہے۔

سیوطی کا بیان ہے کہ فلسطین کا صدر مقام ایلیا (بیت المقدس) رملہ سے اٹھارہ میل پر واقع ہے۔

ترکمان عثمانی کے دور میں ولایت فلسطین کے پاشا (لیفٹیننٹ گورنر) کے اکثر دفاتر یہیں تھے اور جب اسے برطانیہ کا ذیلی علاقہ قرار دیا گیا تو برطانیہ نے اس کے انتظام کے لیے جنرل مقرر کیا۔

۱۹۴۸ء کی جنگ کے بعد یہ شہر اور فلسطین کے دوسرے علاقے مملکت ہاشمیہ اردن کا حصہ بنے۔

شرعی حیثیت

کلام پاک میں بیت المقدس یا یروشلم وغیرہ کے الفاظ کے ساتھ تو کہیں ذکر نہیں بلکہ اس کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے:۔

"پاک ہے وہ رب جو لے گیا اپنے بندے کو رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف جس کے گرد ہم نے برکت نازل کی ہے تاکہ ہم اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ تحقیق وہ سنتا اور دیکھتا ہے۔"

یہاں مسجد الحرام سے خانہ کعبہ اور اس کے آس پاس کی جگہ یعنی صحن اور مسجد اقصیٰ سے مراد بیت المقدس ہے۔ اور قرآنی آیات میں جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے وہ وہی واقعہ معراج مبارک ہے، جس سے ہر مسلمان واقف ہے۔

محققین کے نزدیک ہجرت سے ایک سال پیشتر رجب کی ۲۷ تاریخ کو (واقعہ معراج) پیش آیا۔ مسجد اقصیٰ حضرت سرور کائنات ﷺ اور مسلمانوں کا پہلا قبلہ بھی رہ چکی ہے۔ اس کے گرد و پیش اللہ تعالیٰ نے برکتیں نازل فرمائیں، وہ دینی بھی ہیں اور دنیاوی بھی جیسے کہ صاحب روح البیان نے اس کی تصریح کرتے ہوئے لکھا:

"بیت المقدس کے گرد دین و دنیا کی برکتیں نازل کی ہیں کہ وحی اور فرشتوں کے اترنے کا مقام اور انبیاءؑ کی عبادت گاہ اور انبیاءؑ کا قبلہ ہے...... اور قیامت کو مخلوق اس سرزمین میں محشور ہوگی (حساب کتاب دے گی)۔ اور ہر طرف نہریں اور باغات اسے گھیرے ہوئے ہیں۔"

اس نواح میں خدا کا مظہر تجلی جبل طور اور ایسی ہی مقدس وادیٔ طویٰ ہے جن کا مندرجہ ذیل آیات میں عزت و احترام کے ساتھ ذکر ہے۔

جب موسیٰؑ نے مدت پوری کر لی اور اپنی اہلیہ کو لے کر چلے گئے، طور کی جانب ایک آگ دیکھی۔ اپنی اہلیہ سے فرمایا۔

"ٹھہرو۔ میں نے آگ دیکھی ہے۔ شاید میں اس کے پاس سے کوئی خبر یا چنگاری لے آؤں تاکہ تم تاپ لو۔"

پھر جب آگ کے پاس گئے تو برکت والی زمین میں وادی ایمن کے کنارے درخت کی طرف سے آواز آئی۔

"اے موسیٰ! بے شک میں ہوں اللہ۔ رب

سارے جہانوں کا۔"

یہ وادیٔ طویٰ وہی مقدس وادی ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جوتے اتارنے کا حکم دیا گیا تھا۔

"جب موسیٰ نے آگ دیکھی تو اپنی اہلیہ سے کہا تھا کہ بلاشبہ میں نے آگ دیکھی ہے شاید کہ میں تمہارے پاس اس سے انگارہ لے آؤں یا کوئی راہ بتانے والا مل جائے۔"

پھر جب آگ کے قریب آئے تو پکارے گئے۔

"اے موسیٰ! میں تمہارا پروردگار ہوں۔ پس اتار دو دونوں جوتیاں اپنی۔ بے شک تم مقدس وادیٔ طویٰ میں ہو۔"

حضرت حسنؓ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک میں جس وادیٔ طویٰ کا ذکر ہے۔ یہ فلسطین کی وادی ہے جو یکے بعد دیگرے دو مرتبہ پاک و مقدس کی گئی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جوتیاں اتارنے کا حکم اس لیے دیا گیا کہ ان کے تلوے اس پاک و مقدس زمین سے مس ہو کر برکت حاصل کریں۔

اللہ تعالیٰ مزید فرماتا ہے:۔

"اور جب کہا ہم نے داخل ہو تو اس گاؤں میں۔ پس کھاؤ اس سے جہاں سے چاہو تم بافراغت اور داخل ہو دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے اور کہو بخشش مانگتے ہیں ہم۔

بیضاوی کہتے ہیں:

"یہ گاؤں جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کے ساتھ داخل ہونے کا حکم دیا گیا۔ بیت المقدس (یروشلم) تھا۔

قرآن کہتا ہے:۔

"یا مانند اس شخص کے کہ گزرا او پر ایک گاؤں کے اور وہ گرا ہوا تھا او پر چھتوں اپنی کے۔ کیونکر زندہ کرے گا اللہ پیچھے موت اُس کی کے۔"

ایک حدیث میں ہے کہ حضرت الیائق یا حضرت خضرؑ نے بیت اللہ کو تباہی کے بعد دیکھا جسے بخت نصر نے تباہ کیا تھا۔ چنانچہ یہ آیت اسی سلسلے میں ہے:۔

"اے قوم! ارضِ مقدس میں جو اللہ پاک نے تمہارے لیے لکھ دی ہے، داخل ہو جاؤ اور پیٹھ دکھاتے الٹے نہ پھرو ورنہ نقصان میں پڑ جاؤ گے۔"

یہ ارضِ مقدس فلسطین کا ہی علاقہ ہے۔ اس پاک سرزمین کے ساتھ مسلمانوں کی دائمی وابستگی حدیثوں سے ثابت ہے۔ چنانچہ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:۔

سوائے تین مسجدوں کے اور کسی (مسجد کے لیے) طویل سفر نہ کیا جائے۔ مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور مسجد نبوی۔"

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ مسجد حرام (کعبۃ اللہ) مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ ایک ہی لڑی کے تین انمول موتی ہیں۔ چنانچہ مشکوٰۃ میں آیا ہے کہ نبی کریمؐ نے فرمایا۔

"آدمی کے اپنے گھر کی نماز تو ایک نماز ہے۔ مسجد کی نماز پچیس نمازوں کے برابر ہے اور جامعہ مسجد کی نماز پانچ سو نمازوں کے برابر ہے اور مسجد اقصیٰ میں ایک نماز پچیس ہزار (بعض روایت کے مطابق پچاس ہزار) نمازوں کے برابر ہے اور میری مسجد (مسجد نبوی) میں ایک نماز پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہے اور مسجد حرام کی ایک نماز ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے۔" (ابن ماجہ، مشکوٰۃ)

صحیح مسلم میں آیا ہے کہ:۔

"پہلے مسلمان بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے مگر سولہ ماہ نماز پڑھنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ وہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کریں۔ یعنی جب سے نماز فرض ہوئی اس وقت

سے سولہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کی جاتی تھی۔ پھر حکم خداوندی کے تحت مسلمان بیت المقدس کے بجائے کعبۃ اللہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے لگے۔"

اس سے صاف ظاہر ہوا کہ پہلے ہمارا کعبہ، بیت المقدس تھا۔ اس لیے اسے "قبلہ اول" کہا جاتا ہے۔

اسرا اور معراج کا تذکرہ

نبی کریم ﷺ نے معراج سے واپس آنے کے بعد اس کا ذکر اس طرح فرمایا۔

"معراج کی شب میرے پاس براق لایا گیا۔ براق ایک چوپایہ جانور ہے۔ اس کا رنگ سفید، قد گدھے سے بڑا اور خچر سے چھوٹا۔ اس کا قدم حد نظر تک تیرتا تھا۔ میں براق پر سوار ہوا اور بیت المقدس میں آیا۔ براق کو میں نے اس زنجیر سے باندھا جس سے انبیاء اس کو باندھا کرتے تھے۔ پھر میں مسجد میں گیا اور دو رکعت نماز مسجد میں پڑھی۔ پھر میں مسجد سے باہر آیا اور جبرائیلؑ میرے پاس ایک برتن شراب کا اور ایک دودھ کا لے کر آئے۔ میں نے دودھ لے لیا۔ جبرائیلؑ نے کہا۔" آپ نے فطرت کو اختیار کیا ہے۔" (مسلم شریف)

اسی طرح احادیث اور روایات سے یہ بھی ثابت ہے کہ مسجد اقصیٰ میں انبیائے سابق نے آپ کی متابعت میں نماز ادا کی۔ اور یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے فتح بیت المقدس کے بعد کہا تھا۔

"اس شہر کے ہم مالک ہیں اور ہم عیسیٰؑ اور موسیٰؑ کے عیسائیوں اور یہودیوں سے بہتر وارث ہیں۔"

علاوہ اس کے قیامت تک کے تعلق کا یوں پتہ چلتا ہے کہ قرب قیامت کی ایک علامت یہ ہوگی کہ موذن قریب سے اذان دے گا (یعنی اس جگہ سے جہاں سے سب سن سکیں۔ حسینؓ کا ارشاد ہے کہ اس قریب مقام سے مراد بیت المقدس ہے۔

بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کے بارے میں تفسیر جلالین میں علامہ جلال الدین سیوطی نے اس طرح لکھا ہے کہ۔

"بیت المقدس اعلیٰ عبادت گاہ اور زیارت گاہ ہے۔ یہی وہ اعلیٰ اور برتر مقام ہے جہاں خداوند تعالیٰ نے اپنے فرشتے جبرائیلؑ کو حضرت سلیمانؑ کے پاس بھیجا تھا۔ یوحنا اور زکریا کو بشارت دی تھی۔ حضرت داؤدؑ کو مسجد اقصیٰ کا نقشہ دکھایا تھا۔ روئے زمین کے کل چرند و پرند کو آپ کے طابع بنایا تھا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پیغمبروں نے قربانیاں دیں۔ حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے اور پالنے میں گفتگو فرمائی اور یہاں سے آسمانوں پر اٹھائے گئے۔"

"یاجوج ماجوج"

آپ نے یاجوج ماجوج کا نام تو ضرور سنا ہوگا یہ وہ بلائیں ہیں جو روئے زمین پر قابض ہو جائیں گی مگر یہ بیت المقدس میں داخل نہ ہو سکیں گی۔ کیونکہ بیت المقدس وہ پاک جگہ ہے جہاں یہ بلائیں داخل ہوتے ہی خدا کے حکم سے نیست و نابود کر دی جائیں گی کیونکہ بیت المقدس وہ متبرک مقام ہے جہاں حضرت آدمؑ، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسحاقؑ اور حضرت مریمؑ دفن ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں یوم حشر میں تمام بنی آدم دوبارہ زندہ ہو کر فیصلے کے لیے اکٹھا ہوں گے اور اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کے ساتھ مسجد اقصیٰ میں اپنا دربار لگائے گا اور انصاف فرمائے گا۔

مختصر یہ کہ بیت المقدس سیکڑوں انبیاء اور مرسلین کی جائے پیدائش اور ان کا مسکن اور مدفن ہے، اس لیے مسلمان اور مسلمان ہی اس کے مالک ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ صرف مسلمان ہی ایک ایسی قوم ہیں جو بلا تفریق اور تخصیص تمام انبیاء کرام اور مرسلین پر ایمان

لاتے اور انہیں برحق سمجھتے ہیں۔

اب جہاں تک یہودیوں کا یہ دعویٰ کہ بیت المقدس ان کے باپ دادا کی میراث ہے جو خدا نے انہیں عطا کی ہے تو اس کی تاریخی حقیقت اور حیثیت یہ ہے کہ حضرت مسیح کی پیدائش سے تقریباً تین ہزار سال پہلے فلسطین کے علاقوں میں کنعانی قبائل آباد تھے۔ یہ قبائل عرب سے ہجرت کر کے فلسطین پہنچے تھے اور خود فلسطین کا پرانا نام بھی کنعان تھا۔ مزید یہ کہ بارہ سو سال قبل مسیح جب بنی اسرائیل (جنہیں اہل فلسطین عبرانی کہتے تھے) فلسطین میں داخل ہوئے تو عرب قبائل نے ان کی شدید مزاحمت کی اور دو اڑھائی سو سال کی جدوجہد کے بعد ہی وہ فلسطین اور بیت المقدس پر قابض ہو سکے (۱۰۴۹ ق۔م) یہودی بیرونی قوم تھے اور انہیں اس وجہ سے عبرانی کہا جاتا تھا کہ وہ نسل کشی کے مرتکب ہو کر فلسطین پر قابض ہوئے تھے۔ شمالی فلسطین میں وہ صرف پانچ سو سال تک آباد رہے اور جنوبی فلسطین میں تقریباً دو ہزار سال سے آباد چلے آ رہے ہیں۔ اس لیے یہ سرزمین عربوں کی ہے نہ کہ یہودیوں کی۔

"مسجد اقصیٰ، مسجد حرام، مسجد نبوی"

نبی پاک ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ صرف تین مسجدوں کی زیارت کے لیے (حصول ثواب کی خاطر) رخت سفر باندھنا چاہیے۔ یعنی مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ۔ وہ مقدس مقامات (مساجد) ہیں جن کی بدولت یہ مقدس شہر مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کی عقیدت کا مرکز ہے وہ شہر کی مشرقی پہاڑی (موریہ) پر ایک احاطہ میں ہیں جسے اہل اسلام (حرم شریف) کے نام سے پکارتے ہیں اور جو بیت المقدس کا مقدس ترین حصہ ہے۔

ڈاکٹر برکلے کے بیان کے مطابق حرم شریف ۱۳۶ ایکڑ پر پھیلا ہوا ہے۔ مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ بھی جو صدیوں سے شہر کی عظمت اور تقدس کا نشان ہیں اسی حرم میں ہیں۔ حرم میں جگہ جگہ بلند مقامات ہیں جنہیں مسلمان "محراب" کہتے ہیں۔ مقدس سمجھتے ہیں اور ان کے سامنے نوافل ادا کرتے ہیں۔

قدیم مورخوں نے حرم شریف کی محرابوں اور گنبدوں کا جس انداز میں ذکر کیا ہے وہ موجودہ حالات سے قطعاً مختلف ہے۔ آج ان میں سے کئی ناپید یا مشکوک ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صلیبیوں نے اپنے ۹۰ سالہ دور میں حرم شریف میں بعض غیر معمولی تبدیلیاں کیں اور تین نسلیں گزرنے کے بعد جب صلاح الدین ایوبی نے اسے بحال کرایا تو اکثر مقامات غائب اور روایات محو ہو چکی تھیں۔

"حرم شریف"

ابن الفقیہ نے ۹۰۳ء میں لکھا ہے کہ حرم شریف کی لمبائی ایک ہزار اور چوڑائی سات سو ذرع ہے۔ اس کی عمارتوں میں چار ہزار چوبی شہتیر، سات سو سنگی ستون اور پانچ سو پیتل کی زنجیریں ہیں۔ ہر رات ایک ہزار چھ سو فانوس روشن ہوتے ہیں اور ان کے لیے ایک سو چالیس (۱۴۰) غلام مامور ہیں۔ ہر ماہ ایک سو قسط (سوا تین سیر کی ایک قسط) روغن زیتون خرچ ہوتا ہے۔ حرم شریف کے اندر سولہ بڑے صندوق ہیں جو کلام پاک کے نسخوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ وضو کرنے کے لیے چار حوض اور وعظ دینے والوں کے لیے پانچ منبر ہیں۔ مسجد اور گنبدوں کی چھتوں پر مٹی کی بجائے جست کی ۴۵ ہزار چادریں چڑھائی گئی ہیں۔ مسجد کے اندر مستورات کے لیے ستر گز لمبے تین عدد مقصورے ہیں۔ حرم شریف کے اندر باہر کے تمام دروازوں کی تعداد پچاس ہے۔

ایک اور مورخ ابن ابدریہ دس سال کے بعد یہ

لکھتا ہے کہ:۔

"حرم شریف کی عمارتوں میں ڈیڑھ ہزار فانوس روشن کیے جاتے ہیں۔ دروازے پچاس اور ستون ۶۸۴ ہیں۔ صخرہ کے اندر تیس اور باہر اٹھارہ ستون ہیں۔ گنبد پر جست کی ۳۳۹۲ چادریں ہیں جن پر پیتل کی ۱۰۲۱۰ صیقل کی ہوئی تختیاں جڑی ہیں۔ اس رقبہ میں روشنی کے لیے ۴۶۴ فانوس روشن کیے جاتے ہیں جو تانبے کی زنجیروں اور کنڈوں سے لٹکے رہتے ہیں۔ ہر زنجیر ۱۸ گز لمبی ہے۔ بڑی تختی کے چھ قرآن مجید جن کا ہر صفحہ کھال کے پورے قطعہ کا ہے، رحلوں پر دھرے رہتے ہیں۔ حرم محترم میں دس محرابیں ہیں اور پندرہ گنبد، چوبیس حوض اور چار مینار اذان کے لیے ہیں۔ مسجد، گنبد اور میناروں، سب کی چھتوں پر ملمع شدہ چادریں ہیں۔ خدمت کے لیے ۲۳۰ مملوک ہیں جنہیں سرکاری خزانہ سے تنخواہ ملتی ہے۔ روغن زیتون کا ماہانہ سات سو قسط ابراہیمی (ایک قسط برابر نو پونڈ) مقرر ہیں۔ ایک جدید ترین سفرنامے کے مطابق حرم مقدس کی لمبائی ۱۴۰۰ گز اور چوڑائی ۶۶۰ گز ہے۔ حرم میں جا بجا زیتون، سرو اور نارنج کے درخت ہیں۔ اس کے دروازے ۱۴ ہیں جن میں اکثر بند رہتے ہیں۔

"پیمائش"

مقدسی اور ابن الفقیہ، دسویں صدی عیسوی میں اس کا طول و عرض ۱۵۰۰×۱۰۵۰ فٹ ہے۔ ناصر خسرو اور ادریسی ۱۴۰۰×۱۰۸۰ فٹ بتاتے ہیں۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کی فتح کے ایک عرصہ بعد ۱۳۵۵ء میں ابن بطوطہ نے ۷۵۲ اور ۴۳۵ گز مالکیہ، صاحب مثیر الغرام نے ۱۳۵۱ء میں ۴۲۸×۶۲۸ گز لکھا ہے۔ جبکہ ۱۴۹۶ء میں مجیر الدین ۹۱۳×۴۵۴ فٹ بتاتا ہے۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ زمانہ قدیم سے دور جدید تک احاطہ حرم کی حدود میں کچھ زیادہ رد و بدل نہیں ہوا۔ البتہ ۱۹۷۶ء میں مولانا شیر علی نے اس کا طول و ارض ۱۴۰۰×۶۶۰ گز بتایا ہے۔ یہ اضافہ شاہ حسین کے عہد میں حرم کی تزئین کے دوران ہوا۔

حرم شریف کے دروازے

(۱) ابن الفقیہ۔ ۹۰۳ء باب داؤد، باب حطہ، باب النبی، باب رحمت، باب توبہ، باب اسباب، باب ام خالد (۲) ابن عبدربہ۔ ۹۱۳ء باب رحمہ، باب توبہ، باب داؤد، باب حطہ، باب محمد، ابواب الاسباط (چھ عدد) باب ہاشمی، باب ام خالد (۳) مقدسی۔ ۹۸۵ء باب داؤد، باب حطہ، باب النبی، ابواب مریم، ابواب رحمہ، باب برکہ نبی، باب اسرائیل، ابواب ہاشمیہ، باب الولید، باب ام خالد، باب السکینہ (۴) ناصر خسرو۔ ۱۰۴۷ء باب داؤد، باب حطہ، باب النبی، باب عین الصوان، باب رحمہ، باب توبہ، باب الابواب (۵ عدد) باب زوایائے صوفیہ (۵) مجیر الدین۔ ۱۴۹۶ء باب السلسلہ، باب النبی، باب الاقصیٰ قدیم، باب الرحمہ، باب الحطہ، باب التوبہ، باب الدواریہ (۶) لی سٹرنج۔ ۱۸۹۰ء باب السلسلہ، باب النبی، باب البراق، باب حمہ، باب التوبہ، باب الحطہ، باب القتم، باب شرف الانبیاء

نوٹ:۔

۱۔ ابواب مریم، باب عین الصلوان، صلاح الدین ایوبی نے تیغہ کرا دیا۔

۲۔ باب الوادی، وادی جہنم کی طرف کھلتا تھا اور باب التوبہ کے قریب تیغا کیا ہوا آج بھی موجود ہے۔

ان اختلافات کی اصل وجہ یہ ہے کہ حرم شریف کے اطراف و جوانب میں مختلف ادوار میں بہت کچھ رد و بدل ہوا مثلاً۔

ا۔ محاربین صلیبی حکومت کے زمانے میں

ب۔ مسلمانوں کی دوبارہ تسخیر کے وقت
ج۔ سلطان سلیمان کے سولہویں صدی میں دوبارہ تسخیر کے وقت چہار دیواری کو از سرِ نو تعمیر کیا گیا تو ان کے نام بدل دیے گئے۔
ابن فقیہ، ابن عبدربہ، ناصر خسرو اور مقدسی کے "باب حطہ" کا نام اس وقت "باب البراق" یا "باب النبی محمد" ہے۔ جس کا آدھا حصہ زمین کے اندر ہے۔ ناصر خسرو نے اس سلسلے میں یہ روایت بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اس دروازے سے حرم شریف میں داخل ہونے کا حکم دیا تھا جبکہ مقدسی، ابن الفقیہ اور ناصر خسرو کے باب النبی اور ابن عبدربہ کے باب محمد کو تیغا کر کے بند کر دیا گیا ہے۔
ناصر خسرو نے اس دروازے کے بارے میں لوگوں کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ یہ حضرت سلیمان کے زمانہ کی تعمیر ہے اور نبی کریم ﷺ شب معراج کو اسی دروازے سے گزر کر مسجد اقصیٰ میں تشریف لائے تھے۔ یہ دروازہ مکہ معظمہ کی جانب کھلتا ہے۔ حرم شریف کے اس زمین دوز راستے کی ڈیوڑھی دوہرے پٹ کے دروازے ہیں۔ اس کو زمین دوز بنانے کی وجہ یہ ہے کہ مضافات میں جو لوگ رہتے تھے وہ لوگ شہر کے دوسرے محلوں کا چکر لگائے بغیر حرم شریف میں آسکیں۔ لیکن اس مقام پر زمین دوز حجرے آج بھی نظر آتے ہیں جو مجیر الدین کے عہد میں "الاقصیٰ القدیمہ" کہلاتے تھے اور ان حجروں کے سروں پر ایک دوہرا پرانا دروازہ موجود تھا۔
ناصر خسرو کا "باب العین صلوان" محراب مریم کے قریب واقع تھا۔ سلطان صلاح الدین نے بیت المقدس پر قبضہ کیا تو مغرب اور شمال کی سمت سوائے حرم میں آنے جانے والے تمام راستے بند کر دیے اور ان دروازوں پر بھی تیغا کرا دیا گیا۔ ابن الفقیہ کا باب الوادی، حرم شریف کے مشرقی جانب وادی جہنم کی طرف کھلتا تھا اور قبۃ الصخرہ کے چبوترے کے براق کا زینہ اس کے مقابل تھا۔
بعض لوگوں کا یہ بھی بیان ہے کہ نبی کریم ﷺ شب معراج اسی دروازے سے داخل ہوئے۔ یہ "باب البراق" اور "باب الجنائز" بھی کہلاتا اور باب الذہب سے ذرا مغرب کی طرف ہٹ کر حرم کی دیوار کے اس حصے میں اب بھی تیغا کیا ہوا موجود ہے۔
ابن الفقیہ اور ابن عبدربہ کا باب الرحمت اور مقدسی کے باب الرحمہ، ناصر خسرو کے باب توبہ، باب رحمہ، مشرقی دیوار کے وہ بند پھاٹک ہیں جنہیں فرنگی گولڈن گیٹ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مگر مسلمان آج بھی انہیں باب الرحمہ اور باب التوبہ کے نام سے پکارتے ہیں۔ باب توبہ کے بارے میں ناصر خسرو نے لکھا ہے کہ یہی وہ دروازے ہیں جہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد کی توبہ قبول فرمائی تھی۔ ناصر کے عہد میں اس کے قریب ایک مسجد بنی ہوئی تھی اور آج کل اس کی جگہ "کرسی سلیمان" ہے۔
سیوطی نے باب الرحمہ کے بارے میں لکھا ہے کہ مسجد اقصیٰ کے مشرق کی طرف اس دیوار میں واقع ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے یوں ذکر کیا ہے۔
"اس کے سامنے کی وادی کو "وادی جہنم" کہتے ہیں۔ خود یہ دروازہ یعنی باب الرحمہ حرم شریف کی چہار دیواری میں اندر کے رخ پر ہے۔"
اس آیت میں جس دروازے کی طرف اشارہ ہے اسے بند کرا دیا گیا ہے۔
اب رہا باب التوبہ یہ باب الرحمت سے مل کر ایک ہی دروازہ بن جاتا ہے لیکن ان دونوں دروازوں میں سے آج کل کسی میں بھی آمد و رفت نہیں۔ باب التوبہ کے قریب اور باب الرحمہ الاسباط کے درمیان حضرت

خضرؑ اور الیاسؑ کا مسکن ہے۔ یہ دروازہ چھٹی صدی عیسوی میں تعمیر ہوا اور صلیبیوں نے اسے گولڈن گیٹ (باب الذہب) کا نام دیا۔

اب رہا مقدسی کا باب سرکہ بنی اسرائیل اور ناصر خسرو کا "باب الابواب" محاربات صلیبیہ کے بعد سے باب الاسباط کے نام سے مشہور ہے اور حرم شریف کی شمالی دیوار کے مشرقی سرے اور مسکن خضرؑ اور الیاسؑ کے قریب ہی واقع ہے۔

مقدسی، ابن الفقیہ، ابن عبدربہ کا باب الاسباط اور ناصر خسرو کا باب الابواب حرم کے مغرب میں شمالی دیوار کو لے جانے والا دروازہ ہے جو محاربات صلیبیہ سے اب تک باب الحطہ کے نام سے موسوم ہے۔

سیوطی لکھتا ہے:۔

"اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اس دروازے سے حرم شریف میں داخل ہونے کا حکم دیا تھا۔ مقدسی کا ابواب ہاشمیہ، ابن عبدربہ کا باب الہاشمی، ناصر خسرو کا باب زوائے صوفیہ اور مجیر الدین کا باب الدیواریہ، آج کل باب صوفیہ یا باب شرف الانبیاء کہلاتا ہے۔

سیوطی کہتا ہے: "یہ حرم کے شمالی رخ سے کھلتا ہے۔"

مقدسی اور ابن عبدربہ کا باب الولید، اس زمانہ کا باب الغوانمہ ہے جو مغربی دیوار کے شمالی سرے پر واقع ہے۔ سیوطی اسے باب الخلیل بھی کہتا ہے۔ لیکن مقدسی کے بیان کے مطابق باب الخلیل یا باب ابراہیم باب الولید سے آگے جنوب کا دروازہ تھا جسے ناصر خسرو نے باب السقر لکھا ہے اور آج کل باب الناظرہ کہلاتا ہے۔

سیوطی لکھتا ہے:۔

باب الناظر کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ کبھی نہیں کھلا۔ پہلے زمانہ میں اسے باب میکائیل کہتے تھے اور ایک خبر کے مطابق حضرت جبرائیل نے شب معراج کو اسی دروازے پر براق کو باندھا تھا۔ باب الحدید، سلطان صلاح الدین نے حرم شریف کی موجودہ مغربی دیوار میں باب الناظر کے جنوب میں بنایا تھا۔ کسی زمانہ میں اسے باب ارغون الکاملی بھی کہا جاتا تھا۔ مقدسی اور ابن الفقیہ کا باب اُم خالد، موجودہ باب القطانین (پنبہ فروشاں) ہے۔ باب القطانین ان دروازوں میں ہے جنہیں از سرنو بنایا گیا ہے۔ سب سے پہلے اسے الملک الناصر بن قلادون نے تعمیر کیا تھا لیکن بعد میں گر کر بے کار ہو گیا اور تنکیر الہاشمی الناصری والی شام نے سلطان محمد ابن قلادون کے حکم سے دوبارہ تعمیر کیا تھا۔ اس کے جنوب میں مڑتے ہی باب التوضی (طہارت) یا باب المطارہ (بارش) ہے۔ موجودہ ڈیوڑھی مرحوم علام الدین بصیر نے بنائی تھی۔

مقدسی اور ناصر خسرو کا باب داؤد موجودہ باب السلسلہ ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت داؤد اسی راستے حرم میں تشریف لاتے۔ باب السلام یا باب سکینہ اسی دروازے کے قریب بنا ہوا ہے۔ موجودہ دور میں ۱۹۶۷ء حرم کے چودہ دروازے ہیں۔ ان میں سے بہت سے مقفل ہیں۔ صرف شمالی جانب دو دروازے کھلے رہتے ہیں۔ اردن کی فوجی چھاونی اسی طرف دیوار حرم کے ساتھ تھی۔

دالان:

حرم مبارک کے اندر چہار دیواری کے ساتھ ساتھ جو حرم بنے ہوئے ہیں وہ مسلمانوں کے ابتدائی عہد میں بھی اسی حالت میں اسی جگہ موجود تھے۔ یہ دالان مغربی اور شمالی دیوار کے ساتھ ساتھ ہیں۔ جبکہ وادی جہنم کے رخ پر مشرقی دیوار میں جس میں باب الرحمہ بنا ہوا ہے کوئی دالان نہیں نہ اس کے جنوبی حصہ

میں کوئی دالان ہے۔

مغربی چہار دیواری کے اندر تمام کے تمام دالان الملک الناصر ابن قلادون کے عہد ۱۳۱۰ء تا ۱۳۴۱ء کی تعمیر ہیں۔

باب مغاربہ موجودہ باب النبی کے قریب سے باب السلسلہ تک کا دالان ۱۳۷ھ میں باب السلسلہ کے قریبی مینار سے باب الناظرہ کا دالان ۷۲۷ھ میں اب الغونمہ تک بنایا گیا۔

شمالی دیوار سے ملحقہ دالان ان عمارتوں کے ساتھ تعمیر ہوئے جو ان میں سے ہر ایک ساتھ بنی ہوئی ہے۔

اس کے بعد ان کی وقفہ وقفہ سے مرمت ضرور ہوتی رہی لیکن مجموعی طور پر بالکل اسی حالت میں ہیں جیسے کہ ۱۴۹۶ء میں تھے۔

''مسجد اقصیٰ''

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ صرف تین مسجدوں کی زیارت کے لیے رخت سفر باندھنا چاہیے۔ ایک مسجد حرام، دوسری مسجد اقصیٰ اور تیسری مسجد نبوی، یہ ایک ایسی حدیث ہے جسے تمام مسلمان تسلیم کرتے ہیں۔ بیت المقدس کا مقدس ترین حصہ ''حرم شریف'' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ حرم شریف ۱۳۶ ایکڑ کے رقبہ پر پھیلا ہوا ہے۔ مسجد الاقصیٰ اور قبۃ الصخرا اسی حرم میں ہیں۔ حرم شریف میں جگہ جگہ بلند مقامات ہیں جنہیں ہم مسلمان ''محراب'' کہتے ہیں۔ مقدس سمجھتے ہیں اور ان کے سامنے نوافل پڑھتے ہیں۔

آج ان محرابوں اور گنبدوں میں سے کئی ناپید یا مشکوک ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صلیبیوں نے اپنے نوے سالہ دور میں حرم مقدس میں بہت سی تبدیلیاں کر دی ہیں اور جب تین نسلیں گزرنے کے بعد صلاح الدین ایوبی نے اسے بحال کرایا تو اکثر مقامات غائب ہو چکے تھے۔

مسلمانان عالم کو دنیا کے تین شہر اپنی جان سے زیادہ عزیز ہیں۔ ان میں ایک مکہ شریف، دوسرا مدینہ شریف اور تیسرا بیت المقدس ہے اور بیت المقدس کو اپنے سینے پر مسجد اقصیٰ رکھنے کا فخر حاصل ہے۔

اقصیٰ کے معنی دور کے ہیں۔ پس مسجد اقصیٰ کے معنی دور کی مسجد ہوا۔ یہاں مسجد سے مراد بیت المقدس کے حرم مقدس کا پورا رقبہ ہے۔ شب معراج کی روایت کے مطابق آنحضرت ﷺ ایک پردار گھوڑے (براق) پر سوار ہو کر حضرت جبرائیل کے ساتھ مکہ معظمہ سے طور سینا گئے۔ وہاں سے بیت لحم پہنچے اور پھر بیت المقدس تشریف لائے۔

رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

''ہم جس وقت بیت المقدس کے دروازے پر پہنچے تو جبرائیل نے مجھے براق سے اتارا اور براق کو ایک کنڈی سے باندھ دیا جس سے انبیائے سابق نے بھی اپنے گھوڑے باندھے تھے۔''

پھر نبی کریمؐ باب محمد میں داخل ہو کر اس چٹان پر چڑھے جسے قبۃ الصخرہ کہا جاتا ہے اور جو یہودی روایات کے مطابق ہیکل سلیمانی کے وسط میں تھی۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ یہاں مذبح تھا۔ اس کے قریب ہی آپ کی ملاقات انبیائے کرامؑ کی جماعت سے ہوئی۔ حضور پاکؐ نے حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور دوسرے انبیائے کرام کے ساتھ نماز ادا فرمائی۔

اسی مقدس چٹان سے نبی کریمؐ ایک نور کے زینے سے آسمان پر چڑھے اور جنت الفردوس اور اس کی نعمتوں کو دیکھا۔ پھر ہفت افلاک طے کر کے حضور حق تعالیٰ میں پہنچے اور وہاں احکام صلوٰۃ ملے۔ اس کے بعد دوبارہ زمین پر تشریف لائے اور اُسی نور کے

زینے سے اتر کر صخرۂ مقدسہ پر قیام فرمایا۔ پھر جس طرح تشریف لائے تھے۔ اسی طرح براق پر واپس ہوئے اور رات ختم ہونے سے قبل مکہ معظمہ پہنچ گئے۔

یہ معراج کی رات کا خلاصہ ہے۔ اس روایت نے اہل اسلام کے لیے اس چٹان اور حرم مبارک کے رقبہ کو مبارک اور متبرک بنا دیا ہے۔

یہودی روایت

جس جگہ آج مسجد اقصیٰ واقع ہے۔ یہودی روایت کے مطابق اس جگہ کبھی ''ہیکل سلیمانی'' قائم تھا۔ اس ہیکل سلیمانی کو شاہ بابل بخت نصر نے چھٹی صدی ق۔م میں مسمار کر دیا تھا۔ بابل سے واپسی پر یشوع اور زدرو نے ہیکل کو دوبارہ تعمیر کیا لیکن یہ عمارت بھی رومی حملہ آوروں کی یلغار سے تباہ و برباد ہو گئی اور یہودیوں کو شہر سے نکال دیا گیا۔

اس کے ایک زمانہ بعد یہودی پھر شہر میں آباد ہوئے اور ہیرود اعظم کے زمانہ میں اس شہر نے بہت ترقی کی۔ یہاں کئی نئی عمارتیں بنائی گئیں اور یہودیوں کی خوشنودی کے لیے ہیکل سلیمانی از سر نو تعمیر ہوا لیکن یہ ہیکل بھی ۷۰ء میں رومی حکمراں طیطس نے یروشلم کے ساتھ ہی تباہ و برباد کر دیا۔

آثار قدیمہ کے ماہرین کے خیال کے مطابق موجودہ ''دیوار گریہ'' حضرت سلیمانؑ کے ہیکل کی دیوار نہیں بلکہ یہ عمارت ماندہ کے آثار کا حصہ ہے جسے ہیرود نے تعمیر کرایا اور بعد میں جسے رومیوں نے برباد کر دیا۔

سلجوق خاندان:

عرب مؤرخین صاف الفاظ میں کہتے ہیں کہ صلیبیوں نے سلجوقی خاندان کے مظالم کی جتنی بھی داستانیں بیان کی ہیں وہ سراسر جھوٹ اور محض افسانے ہیں اور مغربی مؤرخین نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آل سلجوق نے عیسائی سلطنت کے سرحدی حملوں سے تنگ آ کر بعض جوابی کارروائیاں کی تھیں جنہیں عیسائیوں نے بہت محسوس کیا تھا۔ سب جانتے ہیں کہ آل سلجوق جنگجو تھے۔ وہ وسط ایشیا سے اٹھے اور طوفان کی طرح دوسرے ممالک پر چھا گئے تھے۔ سلطان الپ ارسلان اور اس کے عظیم بیٹے ملک شاہ نے ایشیائے کوچک سے رومیوں کے اقتدار کو ختم کر دیا تھا۔ رومی شہنشاہ ایلکس اپنے زخم چاٹ رہا تھا اور بدلہ لینے کے موڈ میں تھا کہ مسلمانوں کی بدقسمتی یہ ہوئی کہ ملک شاہ کا انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے سلجوقی سلطنت کے حصے بخرے ہو گئے۔

ملک شاہ کے اس دنیا سے اٹھ جانے کے موقع پر رومی شہنشاہ نے خوب فائدہ اٹھایا۔ اس نے یورپ کے جنگ بازوں کے نام پیغام بھیجا اور پوپ کے سامنے فریاد کی اور انہیں مذہب کے نام پر ارض مقدس اور آثار مسیح کی حفاظت کے لیے برانگیختہ کیا۔ خاص طور سے یہ پروپیگنڈہ کیا گیا کہ مسلمانوں کا مقصد عیسائی مذہب کو مٹانا ہے۔ پوپ نے فوراً پلاسینا اور کلیر مونٹ میں یکے بعد دیگرے دو اجلاس کیے۔ ان اجلاسوں میں مکار پیٹر نے خصوصیت سے شرکت کی۔ اس کی پیشین گوئیوں سے متاثر ہو کر تمام حاضرین جلسہ نے اپنے شانوں پر کپڑے کی بنی ہوئی صلیب لگائی اور...... ''خدا کی مرضی یہی ہے...... خدا کی مرضی یہی ہے۔'' کی پکار لگاتے ہوئے بیت المقدس کو چھڑانے کی قسم کھائی۔ فوج کی روانگی ۱۰۹۶ء میں اس دن قرار پائی جس دن عیسائی عقیدے کے مطابق حضرت مریمؑ آسمان پر تشریف لے گئی تھیں۔ عیسائی مورخین اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ''صلیبی جنون'' لوگوں میں اس طرح پھیلا کہ پوری عیسائی دنیا اس جنون میں گرفتار ہو گئی۔ لوگوں کو جنت کی خوش خبری، مال کا لالچ، زرخیز

زمینوں پر قبضہ کا تصور..... ان باتوں نے عیسائیوں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف غیظ و غضب بھر دیا۔ راہبوں نے اسے غنیمت جانا کیونکہ انہیں خانقاہوں کی سخت زندگی سے نجات ملنے کی امید بندھ گئی۔ وہ گلی گلی پکارتے پھرتے تھے کہ۔

"صلیب پہننے والوں کو قرضوں اور ٹیکسوں سے چھٹکارا مل جائے گا اور وہ عیسائیت کا محافظ کہلائے گا۔"

یہ جنون صرف یورپ تک ہی محدود نہ رہا بلکہ دور دراز کے جزیروں تک پہنچ گیا۔ اس لیے کہ عیسائیوں نے اعلان کر دیا تھا۔

"اے نوجوان سپاہیو! تم تو اپنے نیزوں سے شکست دو گے۔ اور ہمیں اپنے دکھ درد کی وجہ سے فتح میں شریک ہونے کا موقع دو۔"

اس کے نتیجے میں تیرہ لاکھ عیسائی فلسطین پر قبضے کے لیے چڑھ دوڑے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پورا یورپ ایشیا پر حملہ آور ہو گیا ہے۔ ان مقدس محاربین نے ہنگری اور بلغاریہ میں شدید لوٹ مار کی۔ قسطنطین کی بیٹی کا بیان ہے کہ ان خونی محاربین کے سامنے جو بچہ آتا یہ اس کی تکا بوٹی کر ڈالتے تھے۔ اس طرح یہ لوگ مقامی لوگوں سے لڑتے جھگڑتے قسطنطنیہ پہنچے۔ اس وقت قیصر الیکس نے انہیں ایشیائے کوچک کی طرف دھکیل دیا۔ یہاں ان کی درندگی اور بڑھ گئی لیکن والیٔ قونیہ، قلیج ارسلان سلجوقی نے انہیں جانوروں کی طرح قتل کرا دیا۔

پھر ۱۵ اگست ۱۰۹۶ء کو یورپی حکومتوں کی باقاعدہ افواج ایشیا کے ساحل پر اتریں۔ ان میں فرانس، برطانیہ، اٹلی، سسلی اور جرمنی کی فوجیں شامل تھیں۔ ان کی قیادت گاڈ فرے ریکس بولون، ہیوغ اعظم ریمنڈ کاؤنٹ ٹولوز، رابرٹ نارمنڈی اور بیگو آف ور یمنڈا جیسے سالاری کر رہے تھے۔ فوجوں کی تعداد تقریباً دس لاکھ تھی۔ صلیبیوں نے قونیہ کا محاصرہ کیا۔ سلطان امیر ارسلان نے مقابلہ کیا مگر شکست اٹھانا پڑی۔ قونیہ سے یہ صلیبی محاربین انطاکیہ کی طرف بڑھے۔ امیر فیروز نے غداری کی اور انہیں راستہ دے دیا۔ صلیبی لشکر رات کے وقت شہر میں داخل ہوئے اور رات بھر مسلمانوں کا قتل عام کرتے رہے۔ انہوں نے مسلمانوں کے مکانات تک مسمار کر دیے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس قتل عام میں دس ہزار مسلمان شہید ہوئے۔

اس کے بعد یہ فوجیں معرة النعمان پہنچیں اور اسے فتح کر کے تین دن تک قتل عام کرتی رہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ وہاں ایک لاکھ آدمی قتل اور اسی قدر گرفتار ہوئے۔ پھر سپہ سالار افضل بدر جمالی نے القدس پر چڑھائی کر دی۔ چالیس دن کے محاصرے کے بعد شہر فاطمیوں کے قبضہ میں آ گیا اور افتخار الدولہ حاکم شہر بنایا گیا۔ پھر ۱۰۹۹ء میں صلیبی کوہ صیہون کی طرف سے شہر میں داخل ہو گئے۔ مسلمانوں نے مسجد اقصیٰ میں پناہ لی۔ عیسائیوں نے پہلے شہر میں قتل عام کیا پھر مسجد کا رخ کیا اور بوڑھے، جوانوں اور بچوں تک کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر شہید کر دیا۔ ایک گروہ محراب داؤد میں جا پہنچا۔ حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر دیے گئے۔ معصوم بچوں کو فصیلوں پر پٹخ پٹخ کر مارا گیا۔ علماء کرام پر تیل اور نفط چھڑک کر جلا دیا گیا۔

ایک بیان کے مطابق صرف مسجد اقصیٰ اور محراب داؤد میں لوگوں کی تعداد ساٹھ ہزار سے زیادہ تھی مگر مورخین یہ تعداد ستر ہزار بتاتے ہیں۔ جگہ جگہ لاشوں کے انبار لگ گئے تھے اور صحن میں خون کا دریا بہہ رہا تھا۔ اس قتل عام کے بعد تیسرے دن مسلمان قیدیوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ مشہور مورخ اسٹینلے پول لکھتا ہے کہ صلیبی بیت المقدس میں گھس پڑے اور وہاں موجود تمام مسلمانوں کو قتل کر دیا۔ بچوں

کو ٹانگیں پکڑ کر دیوار پر مار مار کر ختم کر دیا گیا۔
ٹینکر یڈ نے تین سو قیدیوں کو جان کی امان دی تھی۔ وہ چیختا ہی رہ گیا اور ان قیدیوں کو قتل کر دیا گیا۔
پھر ایک قتل عام ہوا جس میں بچوں، بوڑھوں اور بڑوں کو ریزہ ریزہ کر دیا گیا۔
شیخ سعدیؒ نے اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ۔
"جو عیسائی بیت المقدس میں داخل ہوئے انہیں انسان کہنا، انسانیت کی توہین ہے۔"
اسی طرح ایک عینی شاہد لیانی نے لکھا ہے۔
"ہمارے صلیبی راستوں اور مکانوں کی چھتوں پر دوڑ رہے تھے اور اس شیرنی کی طرح جس کے بچے چھن گئے ہوں۔ قتل عام کر کے خوش ہو رہے تھے۔ بچوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہے تھے۔
ایک دوسرا شاہد بیان کرتا ہے۔
"بیت المقدس کے راستوں میں ہاتھوں، رانوں کے انبار لگ گئے تھے۔ چلنے کا راستہ نہ تھا۔ چلنے والوں کو لاشوں پر سے گزرنا پڑتا تھا۔ کسی کا ہاتھ، کسی کا پیر اور کسی کا دھڑ، ایک طوفانِ شیطانی برپا تھا۔ یہ قتل عام آٹھ دن جاری رہا۔ عورتیں، بچے اور بوڑھے تمام کے تمام قتل کر دیے گئے۔
مسجد اقصیٰ کی چاندی کی چالیس بڑی قندیلیں جن کا وزن ایک سو رطل شامی اور چھوٹی دو سو قندیلیں لوٹی گئیں۔ مسجد اقصیٰ کا مالِ غنیمت اس قدر تھا کہ چھ گاڑیاں بھی بھر جاتیں تو ختم نہ ہوتا۔
اس قتل عام کی اطلاع جب بغداد پہنچی تو اہل بغداد سیاہ ماتمی لباس پہن کر گلیوں میں نکل آئے اور دہائی دی۔
"آہ! بیت المقدس میں تقدیر الٰہی نازل ہوئی۔"
خلیفہ المستنصر نے فوج بھیجی جو لڑے بغیر حلوان سے پلٹ گئی۔ مصر نے امیر الجیوش کی سرکردگی میں ایک لشکر روانہ کیا لیکن وہ بھی شکست کھا گیا۔ یہ مصری لشکر بازاری اور ناتجربہ کار آدمیوں پر مشتمل تھا۔ چنانچہ جب دشمن نے حملہ کیا تو بے جان گھبرا رہا اور دشمن نے آسانی سے اسے قید کر لیا۔ صرف چند سپاہی جان بچا سکے۔
اس المناک واقعہ کے نتیجے میں عیسائیوں نے چار عیسائی سلطنتیں قائم کیں اور ان کا سردار اعلیٰ گاڈ فرے یعنی بیت المقدس کا والی بنایا گیا۔ ان سلطنتوں کے نام یہ تھے۔
ا۔ انطاکیہ، ۲۔ طرابلس، ۳۔ الرہا، ۴۔ بیت المقدس
ان کے سردار اعلیٰ یعنی گاڈ فرے نے اپنا لقب "محافظ قبر مسیح" رکھا مگر وہ کچھ عرصہ بعد یعنی ۱۸ جولائی ۱۱۰۰ء میں مر گیا۔ اس کی جگہ اس کا بھائی بالڈوین الرہا سے آ کر اس کا جانشین بنا۔ وہ اپنی جگہ الرہا میں اپنے بیٹے بالڈوین برگ کو تخت نشین کر آیا تھا۔ عربی تاریخ میں اسے بردویل لکھا جاتا ہے۔
تاریخ بتاتی ہے کہ بیت المقدس پر قبضہ کے بعد جو بھی عیسائی لشکر برابر آتے رہے لیکن مسلمان ان کے مقابلہ میں کوئی متحدہ محاذ قائم نہ کر سکے۔ ادھر فاطمی خلافت بھی دم توڑ رہی تھی۔ پورے عرب میں بے شمار خود مختار ریاستیں قائم ہو گئی تھیں جو آپس میں لڑتی جھگڑتی رہتی تھیں۔ عیسائی ان ریاستوں پر قبضہ کر کے انہیں مسلمانوں سے خالی کرا لیتے تھے اور یہ مسلمان جنگل اور پہاڑوں میں پناہ لیتے تھے۔
لیکن ان مشکلات کے زمانہ میں بھی مسلمانوں کا ایمان چٹان کی طرح مضبوط رہا۔ انہیں یقین تھا کہ مصائب کے یہ دن عارضی ہیں اور جلد ہی پھر وہ وقت آ جائے گا جب مسلمان کھلے عام اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیم کو عام کر سکیں گے اور اس یقین

کو عملی صورت میں پیش کرنے کے لیے بہت سے دل اور ایمان والے کمرکس کے کھڑے ہو گئے اور انہوں نے کفر کی بجلیوں کا منہ پھیر کے رکھ دیا۔ ایسے ہی شجاع اور ایمان والے لوگوں میں ریاست موصل کے والی اتابک عمادالدین زنگی کا نام سب سے اوپر ہے۔ چنانچہ عمادالدین زنگی نے عیسائیوں کی ایک زبردست ریاست "الرہا" کو شکست دے کر اس پر قبضہ کرلیا۔ الرہا کی شکست سے پورے یورپ اور عیسائی دنیا میں کہرام مچ گیا۔ چنانچہ پاپائے روم نے عیسائیوں کو نہ صرف شرم و غیرت دلائی بلکہ ان کے اندر اس قدر اشتعال پیدا کر دیا کہ وہ ایک بار پھر مسلمانوں کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو گئے۔

پس ایک طرف سے فرانس کا فرماں روا لوئی سابع اور دوسری طرف سے المانیہ کا کنراڈ ثالث اپنے لشکروں کو لے کر بیت المقدس کی طرف بڑھے۔ پہلے کنراڈ اپنے لشکر کے ساتھ مسلمانوں کے مقابل ہوا لیکن مسلمانوں کے ہاتھوں شکست کھا کر قتل ہو گیا۔ اس کے شکست خوردہ لشکری بھاگے تو انہیں فرانسیسی لشکر آتے ہوئے مل گیا اور یہ بھگوڑے ان کے ساتھ ہو گئے مگر جب مسلمانوں کا سامنا ہوا تو دونوں کو ہی خوب مار پڑی اور یہ شکست کھا کر بیت المقدس پہنچے۔ یہ ۱۱۴۷ء کا زمانہ تھا۔ دمشق پر مجیر الدین ابق حکمرانی کر رہا تھا۔ اس پر حملہ کیا لیکن عمادالدین زنگی کے دونوں بیٹے سیف الدین اور نورالدین محمود نے انہیں شکست سے دوچار کیا اور یہ پسپا ہو کر بھاگ نکلے۔ یہ دوسری صلیبی جنگ تھی۔

دوسری صلیبی جنگ میں عیسائیوں کا کس قدر نقصان ہوا اس کا حال ایک عینی شاہد کی زبانی سنیے۔

"یورپ کے شہر اور قلعے خالی ہو گئے تھے۔ اس مقدس آگ (صلیبی جنگ) کا ایندھن بننے کے لیے اتنی کثیر تعداد یورپ سے روانہ ہوئی تھی کہ ان کے پیچھے سات عورتوں کے مقابلے میں صرف ایک مرد نظر آتا تھا۔ پھر جب انہیں خبر پہنچی کہ ان کے شوہر، بھائی اور بیٹے اب کبھی واپس نہ آئیں گے تو پورا یورپ نالہ و شیون سے گونج اٹھا۔

یورپی مورخین کہتے ہیں اور سچ ہی کہتے ہیں کہ دوسری صلیبی جنگ سے یورپ کا سر صرف نیچا ہی نہیں بلکہ بیت المقدس کی لاطینی ریاست بھی کمزور ہو گئی اور اگر نورالدین کی موت کچھ دن اور مہلت دیتی تو بیت المقدس میں عیسائی سلطنت کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہوتا۔

عمادالدین کا بیٹا نورالدین زنگی ایمان کی دولت سے مالا مال تھا۔ اس نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ ملک شام سے عیسائیوں کو نکال کے رہے گا مگر موت نے اسے مہلت نہ دی اور اس کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

نورالدین زنگی نے اپنی فوج کو منظم کیا اور قرب و جوار کی ریاستوں کو اپنا تابع بنالیا۔ پھر اس نے شام اور جزیرہ ایک متحدہ ریاست بنائی اور اس نے مصر میں اثر و رسوخ حاصل کیا اور اس کا یہ قدم ہی مستقبل میں مسلمانوں کی خوش بختی کا باعث بنا۔ اس مجاہد کو ہمہ وقت جہاد کا خیال رہتا تھا مگر اس نے عیاری اور مکاری سے کبھی کام نہیں لیا بلکہ عیسائیوں کو ہمیشہ للکار کر مارا۔

نورالدین زنگی نے عیسائیوں کو جب اور جہاں بھی شکست سے دوچار کیا وہاں وہ ہمیشہ کامیاب اور کامران رہا۔ پھر اس کا ایک نوجوان شمشیر زن یوسف جسے نورالدین زنگی نے زبردستی مصر بھیجا تھا وہ اس قدر خوش بختیوں اور عظمتوں کا مالک ہوا کہ جس کا جواب مسلمانوں کی تاریخ میں مشکل ہی سے ملے سکے گا۔ یہ جواں سال اور جواں عمر اپنی شجاعت، دلیری اور بے مثال بہادری کی بدولت سلطنت مصر کا حاکم ہوا بلکہ وہ

سلطان صلاح الدین ایوبی کے نام سے اس قدر مشہور ہوا کہ جس کی مثال دنیا مشکل سے ہی پیش کر سکے گی۔ صلاح الدین کے جوہر، نور الدین زنگی کی زندگی میں ہی نمایاں ہونے شروع ہو گئے تھے۔ مگر اس کے اصل جوہر دراصل اپنے آقا اور مربی کی موت کے بعد پوری طرح کھل کر سامنے آئے۔ تاریخ اسلام اب تک "صلاح الدین ایوبی" کا جواب پیدا نہیں کر سکی۔

قاضی ابن شداد، سلطان صلاح الدین ایوبی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"جہاد کی محبت اور جہاد کا عشق ان کے رگ و ریشے میں سمایا اور ان کے قلب و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ جہاد ان کا حکم اور ان کی گفتگو کا اول و آخر ہوتا تھا۔ صلاح الدین ہمہ وقت جہاد کی تیاریوں میں خود کو مصروف رکھتے تھے اور اسباب و رسائل کی پرکھ کرتے رہتے تھے۔ اس مطلب کے آدمیوں کی انہیں ہر وقت تلاش رہتی تھی۔ وہ ہمیشہ جہاد کی ترغیب دینے والے کی تلاش میں رہتے۔ اسی جہاد فی سبیل اللہ کی خاطر اپنی اولاد، اہل خاندان، وطن، مسکن اور تمام ملک کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ انہوں نے سب کی مفارقت گوارا کی اور ایک خیمہ کی زندگی پر قانع رہے۔ کسی شخص کو اگر ان کا قرب حاصل ہوتا تھا تو وہ ان کو جہاد کی ترغیب دیتا اور اس طرح ان کی نظروں میں وقعت حاصل کرتا۔ اس بات کی قسم کھائی جا سکتی ہے کہ جہاد کا سلسلہ شروع ہونے کے بعد اس مجاہد نے ایک پیسہ بھی جہاد یا مجاہدین کی امداد و اعانت کے علاوہ کسی اور مصرف میں خرچ نہیں کیا۔"

سلطان صلاح الدین کی دردمندی اور ایمان داری کی تصویر قاضی ابن شداد نے ان الفاظ میں بھی کھینچی ہے:۔

"جب سلطان صلاح الدین ایوبی میدانِ جنگ میں ہوتے تو ان کا دل ایک غمزدہ ماں کی طرح دھڑکتا تھا جس نے اپنے اکلوتے بیٹے یا بیٹی کا غم اٹھایا ہو۔ وہ ایک صف سے دوسری صف تک دوڑتے پھرتے اور لوگوں کو جہاد کی ترغیب دیتے۔ وہ خود ساری فوج میں گشت کرتے اور پکارتے پھرتے۔

"اسلام کی مدد کرو...... اسلام کی مدد کرو۔"

اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے...... شاہی طبیب نے مجھے بتایا کہ ایک مرتبہ جمعہ سے اتوار تک سلطان نے صرف چند لقمے کھائے۔ اُن کی طبیعت میدانِ جنگ کے علاوہ کسی اور طرف راغب ہی نہ ہوتی تھی۔

اسی طرح لین پول لکھتا ہے۔

"صلاح الدین نے اپنی تبلیغ کی تمام کوشش اس بات پر صرف کی کہ ایک اسلامی سلطنت قائم کی جائے جس میں کفار کو ملک سے خارج کرنے کی پوری طاقت ہو۔"

سلطان صلاح الدین ۱۱۷۱ء میں مصر کے وزیر اعظم بنے اور اسی سال ستمبر میں فاطمی خلیفہ العاضد کا انتقال ہوا۔ اس کی موت پر صلاح الدین ایوبی نے سلطنت مصر کو عباسی خلافت کے تحت کر دیا۔ بعض شرپسندوں نے ملک میں فساد برپا کرنا چاہا لیکن لیکن صلاح الدین کی عقل و دانش نے ایسی تمام سازشوں کو ناکام بنا دیا۔ شام و مصر متحد ہو گئے اور عیسائی اسکندریہ میں شکست کھانے کے بعد صلح کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس کے نتیجہ میں بارہ سالہ معاہدہ وجود میں آیا لیکن عیسائیوں نے معاہدہ سے انحراف کیا۔ اس کے باوجود سلطان نے کوئی تادیبی یا انتقامی کارروائی نہ کی۔ البتہ مدافعتی جنگیں جاری رہیں۔ لیکن جب سلطان نے نواحی امارتوں پر تسلط پایا تو عیسائیوں پر کاری ضرب لگانے کے انتظامات شروع کر دیے۔

اس بات سے دشمن بھی انکار نہیں کرتے کہ سلطان نے کبھی کسی معاہدہ کے خلاف کوئی قدم اٹھایا۔ اس کے برعکس عیسائی متواتر خلاف ورزیاں کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ اس معاہدہ صلح کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ائی کرک ارناط نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر حملے کا ارادہ کیا اور روضہ اطہر کے بارے میں اپنے مذموم عزائم کی تکمیل کے لیے فوجیں حجاز کے ساحل پر اتار دیں۔

ہیرالڈ لیم لکھتا ہے کہ اس حملے کا منصوبہ کافی دیر سے اس (ارناط) کے ذہن میں پرورش پا رہا تھا۔ وہ اپنے سنگین قلعہ میں بیٹھا جہاز تیار کرواتا رہا۔ جہازوں کے مختلف حصے قلعہ میں بنا کر بحیرہ روم میں پہنچائے جاتے۔ دوست پرور اور سادہ لوح عرب اس پراسرار سامان کو اونٹوں پر لاد کر بحیرہ روم کے شمال میں پہنچا جاتے۔ وہاں اس نے ان مختلف پرزوں کو جوڑ کر جہاز بنائے اور بحیرہ قلزم پر مسلمانوں کی بندرگاہ ایکہ کو اپنے محاصرے میں لے لیا۔ یہ بندرگاہ اور علاقہ پچھلے پانچ سو سال سے اسلامی تسلط میں تھا۔

یہ عیسائیوں کی پہلی مدافعت تھی۔ ارناط (رینجی نالڈ) کے صلیبی ایک سال تک قتل و غارت گری میں مصروف رہے۔ یہ بلتر بند اور عبا پوش رہزن، پر امن حاجیوں کو لوٹنے کی تاک میں لگے رہتے۔ ایک عرب مورخ لکھتا ہے۔

"ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔"

پھر ایک مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ یہ لٹیرے مدینہ منورہ سے صرف ایک دن کے فاصلے تک پہنچ گئے۔ اس مقدس شہر کی سلامتی خطرے میں پڑ گئی تھی کہ سلطان کو خبر لگ گئی۔ وہ تڑپ اٹھا۔ اس نے فوراً مسلم بحری بیڑے کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ اس بیڑے نے بڑی تیزی سے بڑھ کر ارناط کے لشکر کو جا پکڑا اور

شکست دے کر قتل کر دیا یا قید کر لیا۔ یہ ارناط کی خوش قسمتی تھی کہ وہ یہاں سے بچ کر نکل بھاگا۔

عیسائیوں کے اس اقدام نے سلطان کو بہت تکلیف پہنچائی مگر عیسائی اپنی دیدہ دلیریوں اور بدمعاشیوں سے باز نہ آئے۔ آخر مجبور ہو کر سلطان صلاح الدین ایوبی نے کرک کی طرف کوچ کیا۔

پس تیرہ جولائی ۱۱۸۷ء تک حطین کے قریب ایک خونریز جنگ ہوئی جو ۴ جولائی کو شام کے وقت انجام کو پہنچ گئی۔

اس سلسلے میں ہیرالڈ لیم، صلیبیوں کی تباہی کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"حطین کے میدان میں گندم کے ڈھیر کی طرح عیسائیوں کی لاشوں کے انبار لگ گئے تھے۔ صلیب المصلوب ان سے چھن گئی۔ قیدیوں میں ارناط (رنجی نالڈ) اور شہنشاہ بھی شامل تھے۔ صلاح الدین ایوبی نے اسے اپنے ہاتھوں جہنم رسید کیا اور اس گستاخ رسول سے شان رسول ﷺ میں گستاخی کا انتقام لیا۔"

فتح کے بعد

پچھلے صفحات میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ تین اور چار جولائی ۱۱۸۷ء کو حطین کے میدان میں عیسائیوں نے شکست کھائی تھی اور انہوں نے صلح کی درخواست کی تھی۔ مگر سلطان نے انکار کر دیا تھا اور شرط یہ رکھی تھی کہ اگر عیسائی یہ شہر خالی کر دیں تو انہیں زراعت کے لیے زمین دی جائے گی مگر بڑا پادری اس شرط پر رضا مند نہ ہوا اور مسلمانوں نے مجبور ہو کر شہر پر حملہ کر دیا۔ مسلمانوں کو پندرہ جولائی ۱۰۹۹ء کو عیسائیوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا جو قتل عام ہوا تھا وہ آج بھی یاد تھا لیکن سلطان بار بار کی درخواستوں سے نرم پڑ گیا اور اس نے صلح اس شرط پر کی کہ چالیس دن کے اندر ہر مرد دس دینار، ہر عورت پانچ دینار اور ہر بچہ ایک دینار بطور زر فدیہ ادا کرے اور شہر سے نکل جائے ورنہ اسے قیدی بنا لیا جائے گا۔

اس شرط کے تحت سلطان کو زر فدیہ کے تحت تیس لاکھ دینار وصول ہوئے۔ جن لوگوں کے پاس کچھ نہ تھا انہیں بغیر زر فدیہ ادا کیے چھوڑ دیا گیا۔ ایک عیسائی امیر کی دولت بیت المقدس میں رہ گئی۔ اس کے عوض سلطان نے اٹھارہ ہزار آدمی رہا کر دیے۔

روایت ہے کہ یروشلم کی ملکہ سبیلا شہر سے جاتے وقت سلطان سے ملنے آئی تو اس کی بڑی عزت و تکریم کی گئی۔ ملکہ کے ساتھ اور بہت سی خواتین تھیں جنہوں نے روتے بلکتے بچوں کو گود میں اٹھا رکھا تھا۔ ان خواتین نے درخواست کی کہ ان بچوں کے باپ رہا کر دیے جائیں۔ بس سلطان نے دس ہزار عیسائیوں کو جو زر فدیہ ادا نہیں کر سکتے تھے۔ خود ان کا زر فدیہ ادا کر کے انہیں رہائی دلائی۔

سلطان پادریوں کے ساتھ بہت عزت سے پیش آیا۔ لارڈ پادری، مسجد اقصیٰ، قبۃ الصخرہ اور کلیسائے مقدس کا مال و متاع لے کر نکلا۔ سلطان نے اس سے کوئی تعرض نہ کیا۔ غرض یہ کہ سلطان نے عیسائیوں کے ساتھ ایسا شریفانہ سلوک کیا کہ عیسائی تاریخ اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ بقول لین پول، رحم دل سلطان نے صلیبیوں سے نرمی اور شفقت کا برتاؤ کر کے ان سے "شریف نائٹ" کا لقب پایا۔

یروشلم صلیبی دور میں عیاشی، فحاشی اور بدکاری کا مرکز بن گیا تھا۔ سلطان صلاح الدین نے فتح کے بعد عیسائیوں کو امن و امان دیا اور ان ستر ہزار مسلمانوں کا انتقام نہیں لیا جو ایک صدی قبل اسی بیت المقدس میں ذبح کر دیے گئے تھے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ سلطان ہلالی پرچم لہراتا بروز جمعہ بتاریخ ستائیس رجب ۵۸۲ ہجری بمطابق اکتوبر

۱۱۸۷ء بیت المقدس میں داخل ہوا اور مقدس مقامات پر صلیبیوں کی جگہ ہلالی پرچم لہرا لیا۔

مصر میں سلطان کا اقتدار قائم ہوتے ہی فرنگیوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی تھی۔ انہوں نے اس سے مقابلہ کے لیے اندلس اور سسلی کی حکومتوں سے مدد طلب کی تھی لیکن ان کی یہ مدد اس وقت پہنچی جب سلطان بیت المقدس پر قبضہ کر چکا تھا۔ اس کے باوجود عیسائیوں نے اس مدد کے زور پر دمیاط پر حملہ کر دیا لیکن شکست کھائی۔

مسجد اقصیٰ میں نجاست

بیت المقدس کی فتح کے بعد غازی اسلام سلطان صلاح الدین نے مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کو نجاستوں سے پاک کر کے ان کے فرش اور دیواریں گلاب دمشقی سے دھلوائیں۔ ان مقدس مقامات پر صلیبیوں نے حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کی خیالی تصویریں بنوا رکھی تھیں۔ انہیں تلف کرنے اور جمعہ پڑھنے کا حکم دیا۔ ۴ شعبان ۵۸۲ ہجری کو قاضی محی الدین محمد بن علی الشافعی نے خطبہ دیا اور نماز پڑھائی۔ سلطان چوبیس شعبان ۵۸۲ ہجری تک شہر میں رہا اور بعد نماز جمعہ صلاح الدین صور کی طرف روانہ ہو گیا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ صلیبی دور میں فلسطین کی جو اخلاقی حالت تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ولیم آف ٹائر کے مطابق سارے فلسطین میں ایک عورت بھی نہیں تھی جسے باعصمت کہا جائے۔ صلیبیوں اور گرجا کے راہبوں کی زندگی میں جو تضاد تھا اس سلسلے میں اس کا بیان ہے کہ عام شہری محنت و مشقت کی زندگی بسر کرتے تھے مگر گرجوں کی دولت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اسقف اعظم ہرقلیس کے صندوق سیم و زر سے لبریز تھے۔ وہ دولت کا پجاری تھا اور اس کی زندگی حرص و ہوس کا افسانہ تھی۔

ہیر اللہ کے مطابق جو زمین کلیسا کی ملکیت نہ تھی وہ رفتہ رفتہ ہیکل کے محافظوں جیسی نیم مذہبی اور نیم فوجی جماعتوں کے تصرف میں چلی گئی تھی۔ سرزمین قدس کے یہ خادم اس کے حقیقی مالک بن بیٹھے تھے۔ یہ جماعتیں براہ راست پاپائے روم کے ماتحت تھیں۔ قانون کے مجرم ان کے پاس پناہ لے کر محفوظ ہو جاتے تھے۔ گائی ڈی لوسگنام بیت المقدس کا آخری حکمران تھا۔ اس سے پہلے آٹھ شاہ حکومت کر چکے تھے۔

پھر جب شکست خوردہ صلیبی بیت المقدس سے نکلے تو ان کا ایک گروہ مغرب کی طرف روانہ ہوا۔ وہ ہر جگہ یہ پیغام دیتا تھا۔

''اے عالم مسیحیت! دشمن یروشلم پر قابض ہو گئے ہیں...... مقدس صلیب کھو گئی ہے...... ہماری فوج برباد ہو گئی ہے۔''

پوری عیسائی دنیا میں آگ لگ گئی۔ پادری اور راہب تمام مسیحی دنیا کا دورہ کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ انہوں نے مقدس باپ کی دہائی دے دے کر لوگوں کو جنگ پر ابھارا۔ بیت المقدس کا اسقف اعظم جس کے ساتھ سلطان نے نہایت فیاضی کا سلوک کیا تھا، فرانس میں ایک تصویر لیے گھوما۔ اس تصویر میں جنگ مسیح کو زخمی حالت میں اور ایک مسلمان کو حملہ کرتے دکھایا گیا تھا۔

آخر یہ آگ بھڑک اٹھی۔ شاہ جرمنی راڈرک نے سلطان کو خط لکھا۔

''اگر بیت المقدس عیسائیوں کے حوالے نہ کیا گیا تو میں اپنی ساری فوجیں لے کر تمہیں سزا دینے پہنچ جاؤں گا۔''

سلطان نے اس خط کا کوئی اثر نہ لیا۔ لیکن یورپ میں ایک خوفناک جنگ کی تیاریاں زور شور سے جاری رہیں۔ اور اس میں ہر عیسائی نے بڑھ چڑھ کر حصہ

لیا۔ حد یہ کہ عورتیں بھی سپاہی بن گئیں اور قیصر جرمنی فریڈرک، شاہ انگلستان رچرڈ اول اور ڈیوک آف آسٹریا اپنی فوجوں اور رضا کاروں کے ساتھ سلطان صلاح الدین کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوئے۔ اور یہ تھی تیسری صلیبی جنگ......!

اس جنگ کی تیاری جس جوش و خروش سے کی گئی اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جنگ کے مصارف کے لیے انگلستان اور فرانس وغیرہ میں "عشر صلاح الدین" کے نام سے ایک ٹیکس جاری کیا گیا۔ پادریوں نے فتویٰ دیا تھا کہ جو شخص اس کار خیر میں شریک نہیں ہوگا وہ مسیحیت سے خارج ہو جائے گا۔ مشہور مورخ گبن (گبن) لکھتا ہے۔

"صلاح الدین نے یورپ سے اپنی عظمت کا جو خراج اس ٹیکس کی شکل میں لیا وہ آج تک کسی تاج دار کو نصیب نہ ہو سکا۔ رچرڈ نے مصارف جنگ کے لیے اپنی جاگیر فروخت کر دی۔ بڑے بڑے عہدوں کو نیلام کیا گیا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر کوئی خریدار ہو تو لندن تک کو بیچنے کے لیے تیار ہوں۔"

جو لوگ کسی مجبوری کی بناء پر شریک نہ ہو سکے انہوں نے اپنے خرچ پر اپنی جگہ آدمی بھیجے۔ عورتوں نے اپنی اکلوتی اولادوں تک کو نذر کر دیا۔"

بہر حال دو سال کی مکمل تیاری کے بعد یہ لشکر فلسطین کی طرف بڑھا۔ مورخین نے لکھا ہے۔

"یہ فوج نہیں بڑھ رہی تھی بلکہ ہتھیاروں اور سپاہیوں کا ایک سیلاب تھا جو عربوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا دینے کے لیے امڈ آیا تھا۔

اس لشکر کی تعداد بعض مورخین کے قول کے مطابق چھ لاکھ اور بعض کے خیال میں دس لاکھ تھی۔ جتنے یورپی اور مسیحی سربراہ اس جنگ میں شامل تھے کبھی صلیبی محاربے میں اس سے پہلے شریک نہ ہوئے تھے اور اس متحدہ قوت کا سامنا صرف اور صرف صلاح الدین ایوبی کو کرنا تھا۔

اس کے مقابلہ پر قیصر جرمنی تھا مگر اس بدذات کو قدرت نے دریائے سالس عبور کرتے ہوئے ڈبو کر ختم کر دیا۔ اس طرح اب فوج کا ایک حصہ واپس چلا گیا۔ اب برطانیہ اور فرانس کی افواج فلسطین کے ساحل پر اتریں اور انہوں نے عکہ کا محاصرہ کر لیا۔ پھر جرمنی والے بھی ان سے آملے۔ اس طرح محاصرہ کرنے والوں میں آسٹریا، اٹلی، برطانیہ، البانیہ، فرانس وغیرہ کے فوجی دستے صلیبی رضا کاروں میں شامل ہو گئے۔ مگر محصورین نے تمام ناموافق حالات کے باوجود تین سال تک حملہ آوروں کا مقابلہ کیا اور آخر مسلمانان عکہ نے ہتھیار ڈال دیے اور دو لاکھ دینار ادا کرتے ہوئے صلح کر لی۔

تاریخ بتاتی ہے کہ محاصرہ کے ان تین سالوں کے دوران سلطان نے محاصرین کو مدد پہنچانے کی تمام تدبیریں کیں اور ایک مرتبہ محاصرہ توڑ کر ان تک مدد پہنچائی بھی مگر محصورین نے حوصلے چھوڑ دیے تھے۔ دوسری طرف فرنگی بحری بیڑے کی سخت مضبوطی، افواج میں بیماری اور بعض دیگر اسباب کی بناء پر محصورین کی موثر مدد نہ کی جا سکی اور عکہ کے باسیوں نے ہتھیار ڈال دیے۔

سلطان کو اس خبر سے شدید صدمہ ہوا۔ رچرڈ جسے شیر دل کہا جاتا ہے۔ اس نے معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے نہ صرف اسیران جنگ کو بلکہ سفیروں اور یرغمال میں آئے ہوئے امیروں تک کو شہید کر دیا۔ صلیبیوں کی اس بدعہدی پر مورخ لین پول لکھتا ہے۔

"پیشتر اس کے کہ خدا عیسائیوں کو چھوڑتا، عیسائیوں نے خدا کا دامن چھوڑ دیا۔"

اس سلسلے میں ہیرالڈ لیم نے سلطان کے بارے

میں تبصرہ کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔
"سلطان صلاح الدین پر صد آفریں کہ اس عالی حوصلہ انسان نے صرف اعلانیہ جنگ میں دشمن سے بدلہ لیا۔"
اس سے زیادہ تعجب کی یہ بات ہے کہ جب رچرڈ نے سلطان سے سامانِ خوراک کی درخواست کی تو سلطان نے اسے ٹھکرایا نہیں بلکہ شریف دشمن ہونے کا ثبوت دیا۔ مگر اس پر بھی تہذیب کے علم بردار فرنگیوں کو حیا نہیں آئی۔
عکہ کو تباہ و برباد کرنے کے بعد صلیبی لشکر نے عقلان کا رخ کیا۔ سلطان نے مقابلہ کے بجائے ایک انوکھا راستہ یہ اختیار کیا کہ پورے شہر عقلان کو گروا کر زمین کے برابر کر دیا۔ پس جب مسیحی لشکر وہاں پہنچا تو اس کا استقبال شکستہ عمارتوں اور کھنڈرات نے کیا۔
عیسائی لشکر اس سے بہت بددل ہوا۔ رچرڈ اگر چہ دل چھوڑ بیٹھا تھا مگر اس نے پھر بھی بیت المقدس پر حملہ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی رچرڈ نے جنگ سے نجات پانے کے لیے سلطان کو ایک تجویز لکھ کے بھیجی۔ اس تحریر میں درج تھا کہ:۔
"رچرڈ کی بہن کی شادی، سلطان صلاح الدین کے بھائی ملک العادل سے کر دی جائے۔ اور سلطان بیت المقدس ملک العادل کو دے دے۔"
سلطان نے رچرڈ کی تجویز کو منظور کر لیا لیکن پورے یورپ میں کہرام مچ گیا۔ عیسائیوں نے رچرڈ کو مسیحیت سے فارغ کرنے کی دھمکی دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پھر سے جنگ چھڑ گئی۔ نصرانی لشکر بیت المقدس کی طرف بڑھا مگر اس کی دیواروں سے ٹکرا کر ناکام و نامراد لوٹ گیا۔ اس سے عیسائیوں میں بددلی پیدا ہوئی اور وہ باہم دست و گریبان ہو گئے۔"
رچرڈ نے ایک بار پھر صلح کی کوشش کی اور دو ستمبر ۱۱۹۲ء کو سلطان صلاح الدین کے بھائی ملک العادل اور رچرڈ نے معاہدہ صلح پر دستخط کر دیے۔ اس معاہدہ کے تحت یافا، لد، مجدل، یابا، قیساریہ، ارسوف، حیفہ اور عکہ رچرڈ کا مقبوضہ اور عقلان کو آزاد علاقہ قرار دیا گیا۔ طے پایا کہ تین سال تک تمام عیسائی زائرین محصول ادا کیے بغیر بیت المقدس کی زیارت کر سکیں گے۔
اس طرح مسلسل پانچ سال تک خون ریز لڑائیوں کے بعد تیسری صلیبی جنگ کا اختتام ہوا۔ اس جنگ میں یورپ کے لاکھوں آدمی، سیکڑوں نام ور امراء اور عمائدین، متعدد بادشاہ کام آئے۔ بے اندازہ دولت برباد ہوئی۔
مجاڈ نے اس طرح لکھا ہے۔
"یورپ کی تمام مسلح طاقتوں نے عکہ کی فتح اور عقلان کی بربادی سے زیادہ کچھ حاصل نہ کیا۔"
عرب مورخین کا بیان ہے کہ:۔
"عکہ کے سامنے چھ لاکھ کروسیڈ کام آئے اور مشکل سے ایک لاکھ سپاہی گھروں کو واپس جا سکے۔"
لین پول کا بیان ہے:۔
"جولائی ۱۱۸۷ء حطین پر مسلمانوں کی فتح سے قبل دریائے اردن کے مغرب میں مسلمانوں کے پاس ایک انچ زمین نہ تھی۔ ستمبر ۱۱۹۲ء میں جب صلح ہوئی تو صور سے لے کر یافا تک بجز ایک پتلی سی پٹی کے سارا ملک مسلمانوں کے قبضہ میں تھا اور فرنگیوں کو اپنی جانی اور مالی قربانیوں کے مقابلے میں جو کچھ حاصل ہوا وہ نہایت ہی حقیر تھا۔"
مورخین کے بقول یورپ کے ہر قریہ اور گھر میں نالہ و ماتم برپا ہو گیا۔ اس سلسلے میں ہیرالڈ لیم نے لکھا ہے کہ:۔
"برسوں کی خونریزی کے بعد بھی انہیں اپنے

مقامات مقدسہ میں سے کسی پر بھی قبضہ نصیب نہ ہوا۔"

اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت ہے کہ سلطان نے یہ جنگ بے انتہا نامساعد حالات میں لڑی تھی۔ اس کی فوج خود سر ہوگئی تھی۔ جنگ کے دوران عرب خیموں میں گھس آتے اور لوٹ مار کر کے بھاگ جاتے تھے۔ پھر جب سلطان نے اپنی فوج کے مفسدہ پردازوں کو نکال باہر کیا تو رچرڈ نے صلح کی پیش کش کر دی۔ سلطان مکمل اور فیصلہ کن فتح کا خواہاں تھا۔ اس نے بہاؤالدین سے صاف الفاظ میں کہا تھا۔

"میں صلح کرنے سے ڈرتا ہوں۔ نہ جانے میری موت کے بعد حالات کیا ہوں۔

لیکن سلطان کی فوج جنگ سے بے زار ہو چکی تھی اور آخر کار حالات نے اسے مجبور کر دیا۔

مورخین اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ سلطان صلاح الدین ایوبی نے میدان جنگ میں بھی اپنے دشمن کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے یا اس پر اوچھا وار کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ پھر جب رچرڈ نے بیت المقدس پر قبضہ کرنے کے لیے حملہ کیا تو سلطان نے اس کے نحیف و نزار گھوڑے کو دیکھا اور فوراً اسے خوب صورت عربی گھوڑے بھجوائے تاکہ وہ یہ نہ کہہ سکے کہ اس کا گھوڑا کمزور تھا۔

بیرالڈلیم لکھتا ہے۔

"سلطان صلاح الدین جنگ کے دوران بھی ایسا ہی فراخ دل اور بردبار رہا جیسا کہ وہ جنگ سے پہلے تھا۔ جب رچرڈ نے سلطان کو لکھا کہ فرانسیسی معاہدے کے فریق نہیں، اس لیے انہیں یروشلم کی زیارت کی اجازت نہ دی جائے تو سلطان نے جواب میں لکھا کہ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے تمام عیسائیوں کو زیارت کی اجازت بخش دی ہے۔ پھر انہیں کیسے محروم کردوں؟"

بشپ آف سالسبری نے منہ مانگی مراد پائی۔ اس نے پادریوں کے مزار مقدس میں قیام کی اجازت مانگی اور سلطان نے فوراً اجازت دے دی۔

سلطان کی واپسی

جب رچرڈ ساحل شام سے چلا گیا تو سلطان حرم مقدس میں آیا۔ اس نے تمام امیروں کو جمع کیا اور انہیں ایک ایک کر کے رخصت کر دیا۔ سلطان نے پچھلے کئی سال سے روزے نہیں رکھے تھے۔ پس اس نے القدس میں قیام کے دوران مسلسل روزے رکھے۔ اس سے اس کی صحت بگڑ گئی۔ طبیب خاص نے اسے مجاہدہ نفس سے روکنے کی سخت کوشش کی لیکن سلطان نے یہ مشورہ قبول نہ کیا اور کہا۔

"معلوم نہیں کہ آئندہ کیا ہو؟"

پس سلطان نے مسلسل روزے رکھے اور پورا کفارہ ادا کر دیا۔ اس نے اس قیام میں شہر پناہ کی مرمت کرائی۔ خندق کھدوائی۔ نئے اوقاف قائم کیے اور بیت المقدس کا انتظام امیر عزیز الدین جردیک کے سپرد کر کے دمشق روانہ ہو گیا۔

مجاہد اعظم کی وفات

تاریخ بتاتی ہے کہ اس سال سلطان نے اپنی نقاہت کے باوجود دمشق سے باہر نکل کر حج سے لوٹنے والوں کا پرتپاک استقبال کیا۔ وہ اگلے سال خود بھی حج کے لیے جانے کا ارادہ کر رہا تھا لیکن تین مارچ ۱۱۹۳ء میں ملک الناصر سلطان صلاح الدین نے وفات پائی۔

بازاروں میں سناٹا چھا گیا۔

آج وہ عظیم الشان انسان موت کی آغوش میں سو گیا تھا جس نے بیس سال تک دنیائے اسلام کی نہایت ثابت قدمی سے قیادت کی تھی۔

شیخ ضیاء الدین ابوالقاسم نے غسل دیا اور دمشق

کے باغ کی بارہ دری میں عصر کے وقت اس جگہ دفن کیا جہاں انہوں نے انتقال کیا۔ جو تلواریں جہادوں میں ان کے زیب کمر تھیں۔ وہ ان کے برابر رکھ دی گئیں اور وہ انہیں اپنے ساتھ جنت میں لے گئے۔

سلطان نے ہر چیز ختم کردی تھی۔ وہ خالی ہاتھ اس دنیا سے گئے۔ وہ کہتے تھے کہ انسان خالی ہاتھ آتا ہے اس لیے اسے خالی ہاتھ ہی جانا چاہیے۔ سلطان کے کفن دفن کے لیے بھی قرض لیا گیا یہاں تک کہ ان کی قبر میں جو لکڑیاں لگیں وہ بھی قرض سے منگوائی گئی تھیں۔ ان کی موت سے ہر طرف سناٹا سا چھا گیا تھا۔ لوگ دبے دبے الفاظ میں گفتگو کرتے تھے۔ دفن کے بعد ہر شخص خاموشی سے اپنے گھر چلا گیا۔ سڑکوں اور کوچہ و بازار میں سناٹا سا طاری معلوم ہوتا تھا۔

طبیب عبداللطیف کا بیان ہے کہ اس کے علم میں صرف سلطان کی نظیر ہے جس کے لیے واقعی رعایا نے ماتم کیا۔

❁❁❁

پاپائے روم انوسنٹ ثالث نے صلیبیوں کے جذبہ جہاد کو زندہ رکھا اور جنگ کی تیاریاں ہوتی رہیں۔ پوپ ایک آتش بیاں اور اثر آفریں مقرر تھا۔ وہ کہتا تھا۔

"یروشلم کی رہائی مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے۔"

پوپ نے مسیحی برادری کو خبردار کیا کہ مسلمان یروشلم کے قبضہ کے بعد مسیحیت کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی تدبیریں کریں گے۔ اس کی ان باتوں کا یہ اثر ہوا کہ عیسائی دوشیزائیں سرزمین قدس کو آزاد کرانے کا حلف اٹھانے والوں کو صلیبیں پیش کرتی پھرتی تھیں۔ اس دوران ہنری ششم نے ۱۱۹۸ء سے ۱۲۰۳ء کے دوران ساحل فلسطین پر حملے کیے مگر اسے کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ پھر ۱۲۰۴ء میں کاؤنٹ بالڈون کی سالاری میں جرمنی، فرانس، یوروگوئے، انگلستان، روم بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سارے یورپ کی متحدہ فوجیں قسطنطنیہ پہنچیں اور قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا۔ ان کے جنون کا یہ عالم تھا کہ وہ ایک فرانسیسی لڑکے کی قیادت میں یروشلم کو کافروں سے چھڑانے کے لیے روانہ ہوئے مگر ان کا برا حشر ہوا۔ اس لشکر میں بارہ بارہ سال اور چودہ چودہ سال کے لڑکے اور لڑکیاں تھیں اور ان کی مجموعی تعداد تقریباً نوے ہزار تھی۔ یہ لشکر جس شہر سے گزرتا لوگ اس سے نیک فال لیتے اور کہتے۔

"اب یروشلم آزاد ہوجائے گا۔"

مگر اس کا انجام یہ ہوا کہ بچیوں کی عصمتیں لوٹی گئیں اور لڑکوں کو غلام بنا کر بیچ دیا گیا۔ باقی لٹے بچے لڑکوں نے اطالوی شہروں اور قصبوں میں نوکریاں کرلیں۔

اس انجام تک پہنچنے کے باوجود یورپ کا صلیبی جنون سرد نہیں ہوا تھا۔ پورے یورپ میں صلیبی جنگوں کی زوروشور سے تبلیغ ہورہی تھی۔ پھر ۱۲۱۵ء میں پاپائے روم نے ایک کانفرنس بلائی اور ایک نئی جنگ کے لیے جون ۱۲۱۷ء کی تاریخ مقرر ہوئی۔ اس کے نتیجے میں ایک صلیبی لشکر شاہ ہنگری کی قیادت میں ساحل عکہ پر لنگر انداز ہوا۔ اس کے بعد اور لشکر آئے اور ان کا مقابلہ صلاح الدین ایوبی کے بھائی الملک العادل سے ہوا۔ اس کی عمر ۷۰ سال کی ہو چکی تھی مگر اس کے باوجود صلیبی لشکر ساحلی علاقوں سے آگے نہ بڑھ سکا۔

اس دوران الملک العادل کا انتقال ہوگیا۔ اس کا بیٹا الملک الکامل جانشین ہوا۔ سلطان دمشق نے حرم مقدس اور محراب داؤدی کی دیواروں کے علاوہ بیت المقدس کی تمام فصلیں گرادی تھیں تا کہ دشمن شہر کو کھلا پا کر زیادہ نقصان

نہ پہنچانے۔ لیکن صلیبی القدس تک نہ پہنچ سکے۔ پھر بھی انہوں نے دمیاط پر قبضہ کر کے مسلمانوں کا خون بہایا اور مسجدوں کو گرجوں میں تبدیل کر دیا۔

اس خونریزی کے بعد پچاس ہزار سے زیادہ صلیبی قاہرہ کی طرف بڑھے۔ الملک الکامل گھبرا گیا اور اس نے فوراً صلح کی پیش کش کر دی اور وعدہ کیا کہ اگر دمیاط واپس کر دیا جائے تو وہ یروشلم کو عیسائیوں کے حوالے کر دے گا مگر عیسائی رضامند نہ ہوئے اور انہوں نے مطالبہ کیا کہ کرک اور ماؤنٹ ریال بھی ان کے حوالے کیا جائے۔

اس اختلاف نے جنگ کی صورت اختیار کر لی اور منصورہ کے قریب میدان کارزار گرم ہوا۔ اس لڑائی میں عیسائیوں کو تخت شکست کا سامنا کرنا پڑا اور دمیاط خالی کر کے صلح پر آمادہ ہو گئے۔ الملک الکامل نے یافہ سے تلمیس تک کے علاقے پر فریڈرک ثانی کا قبضہ تسلیم کر لیا اور دس سال کے لیے معاہدہ ہو گیا۔ مگر فریڈرک ثانی نے پادریوں کی ناراضگی کی وجہ سے معاہدہ سے آنا کانی شروع کر دی اور واپس جانے پر آمادہ ہوا۔ پھر ۱۲۲۳ء میں سسلی میں ایک نئی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں فریڈرک نے ۱۲۲۵ء میں کروسیڈ پر جانے کا حلف اٹھایا مگر ایک عرصہ تک اسے ٹالتا رہا۔ پھر وہ ۱۲۲۸ء میں وہ فلسطین کی طرف روانہ ہوا مگر راستہ میں بیمار پڑ گیا اور اس نے سفر ملتوی کر دیا۔ اس پر پاپائے روم نے اس کے خلاف کفر کا فتویٰ جاری کر دیا اور اٹلی میں ہونے والی مذہبی رسومات معطل کر دیں۔ اس خبر کو پا کر فریڈرک واپس فلسطین کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ قبرص سے ہوتا ہوا عکہ پہنچا۔ اس وقت اس کے ساتھ ۴۵ ہزار کا لشکر تھا۔

ادھر الملک العادل نے بیٹوں کو خانہ جنگی سے بچانے کے لیے سلطنت ان میں تقسیم کر دی تھی۔ اس نے کرک، اردن، دمشق اور طبریہ اپنے بیٹے معظم کو دیے تھے۔ باپ کی وفات کے بعد الملک الکامل کے چاروں بھائیوں نے اسے اپنا سرپرست تسلیم کیا لیکن بعد میں ان میں اختلاف پیدا ہوا اور معظم باغی ہو گیا۔

جس وقت فریڈرک اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ ساحل فلسطین پر اترا تو القدس پر معظم کا قبضہ تھا۔ اس نے فرنگیوں کو القدس میں داخل نہ ہونے دیا۔ پھر ملک کامل نے مندرجہ ذیل شرائط پر بیت المقدس کو شاہ فریڈرک ثانی کے حوالے کر دیا۔ شرائط یہ تھیں:

۱۔ فرنگی بیت المقدس کی شہر پناہ دوبارہ تعمیر نہیں کریں گے۔

۲۔ مسلمانوں کے مقامات مقدسہ مثلاً قبۃ الصخرہ اور مسجد اقصیٰ میں کوئی تعرض نہیں کریں گے۔

۳۔ بیت المقدس سے ساحل تک عیسائیوں کو راستہ دے دیا جائے گا۔

کامل نے دس سال کے لیے عارضی قبضہ دیا تھا مگر مسلمانوں نے اس کے خلاف نفرت کا اظہار کیا اور یہی چھٹی صلیبی جنگ کہلاتی ہے۔

مصر اور دمشق میں ٹھن گئی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب چنگیز خان دنیا پر چھاتا جا رہا تھا۔ وہ خوارزمیوں کا تعاقب کرتا ہوا سرزمین فلسطین تک آ پہنچا تھا۔ فریڈرک اور الکامل میں دس سال کا معاہدہ ہوا تھا لیکن اس معاہدے سے دونوں فریق خوش نہ تھے۔ چنانچہ ناروے کا بادشاہ ساحل فلسطین پر پہنچا اور لوٹ مار کر کے واپس ہو گیا۔ اس کے جواب میں الکامل کے جانشین الناصر نے آگے بڑھ کر بیت المقدس کا محاصرہ کر لیا۔ وہاں عیسائیوں نے ایک قلعہ بنا لیا تھا جسے تباہ کر دیا گیا۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)